نام کتاب

فتاویٰ راشدیہ

تالیف

محدث العصر فضیلۃ الشیخ ابو القاسم

سید محب اللہ شاہ الراشدی رحمۃ اللہ علیہ

تقریظ

سید قاسم شاہ راشدی حفظہ

[illegible]

الشیخ افتخار احمد تاج الدین الازہری حفظہ

باہتمام

حافظ ثناء اللہ خاں (بیرانی)

تاریخ اشاعت

فروری 2012ء

مطبوعہ

علی آصف پرنٹرز لاہور

ناشر

نعمانی کتب خانہ

لاہور

e-mail: nomania2000@hotmail.com

NOMANI

فہرست مضامین

كتاب الطهارت

نماز کے مسائل

كتاب الجنائز

كتاب الزكاة

نکاح کے مسائل

طلاق کے مسائل

معاملات کے مسائل

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

تقدیم

از:۔فضیلۃ الشیخ سیّد قاسم شاہ الراشدی صاحب

علم الفرائض دین اسلام کا نصف علم ہے اور نہایت دقیق و پیچیدہ علم ہے اس لیے اکثر علماء کرام اس میں کم ہی معلومات رکھتے ہیں اور فتوٰی دینے کے لیے بھی کچھ مخصوص علماء کرام ہوتے ہیں جو اس علم میں مہارت تامہ رکھتے ہوں اور وہی فتوٰی دینے کے اہل ہوتے ہیں۔ ہر عالم دین کے بس کی یہ بات نہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ دینی مدارس اور جامعات میں فتوٰی دینے کے لیے ایک الگ مفتی صاحب مقرر ہوتے ہیں جو فتوٰی دیتے ہیں مدرسہ کا ہر استاد فتوٰی نہیں دیتا۔ اس لیے اس کو حاصل کرنے کے لیے بھی بڑی توجہ اور محنت شاقہ اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ کتنے ہی بڑے بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو بھی کئی مسائل کی معلومات کے لیے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا کہ شاید اس کے بارے میں کسی کو علم ہو جیسا کہ دادی اور نانی کے بارے میں ان کا شرعی حصہ وغیرہ۔

والد ماجد رحمہ اللہ اس علم میں نہایت مہارت تامہ رکھتے تھے اور خصوصی طور پر اس کی

تعلیم بھی دیتے تھے اور بندہ کو بھی جو کچھ حاصل ہوا وہ صرف ان کی مرہون منت ہے اس طرح میرے استاد مولانا دوست محمد لکھمیر اور مولانا گل محمد صاحب اور ہمارے کلاس فیلو مولانا عبدالرحیم لکھمیر کو بھی جو کچھ حاصل ہوا وہ بھی ان کے مرہون منت تھا اور ہمارے مدرسہ دارالرشاد کو سندھ میں جو مقام حاصل تھا اوائل دور میں شاید کسی اور مدرسہ کو نہ تھا اس لیے اس کا فتویٰ بہت زیادہ نکلتا تھا کورٹ کا مسئلہ ہو یا کسی بڑے جاگیردار کی بیٹھک جہاں بھی اس مدرسہ کا فتویٰ پہنچ گیا تو پھر وہی فیصلہ ہوتا تھا۔کوئی کورٹ یا بڑا آدمی اس کو رد کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہاں کا دیا ہوا فتویٰ حرف آخر ہوتا تھا کیونکہ وہ فتویٰ قرآن وحدیث پر مبنی ہوتا تھا اور نہ کوئی فتویٰ کی فیس وغیرہ ہوتی تھی اور نہ کسی بڑے کی لڑائی اس میں اثر انداز ہوسکتی تھی اگر صرف خالص قرآن وحدیث سے فتویٰ لینا ہو تو وہ وہاں سے ہی مل سکتا ہے۔

ہمارے استاد مولانا دوست محمد لکھمیر صاحب پہلے فتویٰ لکھتے تھے پھر والد صاحب رحمہ اللہ اس کو دیکھ کر اس کی تصحیح فرماتے پھر اس پر اپنے دستخط تحریر فرماتے اور والد ماجد رحمہ اللہ کی رہنمائی میں (مولانا دوست محمد رحمہ اللہ) انھوں نے فتویٰ دینے کے لیے کچھ کتابیں بھی منتخب کر لی تھیں جن کو دیکھ کر وہ فتویٰ لکھتے تھے۔کتابوں کے نام یہ تھے:

1. فتاویٰ نذیریہ (محدث نذیر حسین دہلوی)
2. سراجی
3. المحلیٰ لابن حزم وغیرہم۔

اکثر فتاوے وہ ان کتابوں سے اخذ کرتے تھے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ پہلے فتویٰ کسی ایک تحقیق پر دیا لیکن بعد میں جب دوبارہ تحقیق کی تو اس کے خلاف دیا جیسے مسئلہ شغار کے بارے میں وغیرہ اور لوگوں کے فیصلے بھی بہت آتے تھے (اور وہ سارا سلسلہ اب بھی بحمد اللہ سبحانہ وتعالیٰ احسن طریقہ سے جاری ہے) اور مولانا دوست محمد بھی بیٹھتے تھے، پھر دونوں فریقین کی موجودگی میں فیصلہ کیا جاتا تھا۔دونوں کا موقف اچھی طرح

سنا جاتا پھر شواہد اور دلائل کا سلسلہ چلتا پھر اس کے مطابق فتویٰ دے دیا جاتا تھا۔ اکثر فیصلہ کرانے والے جو دوسری جگہ آپس میں نہیں بنتے تھے یہاں آ کر بحمد اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپس میں بھائیوں کی طرح صلح کر جاتے اور رنجشیں دور ہو جاتیں اس لیے لوگ کہتے تھے کہ جن کا آپس کا فیصلہ نہیں ہو پاتا وہ پیر سائیں کے پاس جائیں تو صحیح ہو جائیں گے، کیونکہ لوگوں کی ان سے عقیدت بھی تھی کہ اگر وہاں بھی فیصلہ میں ہم نہیں بیٹھیں گے تو پھر کبھی بھی ہمارا فیصلہ نہ ہو سکے گا اور ہم ہمیشہ بھٹکتے ہی رہیں گے یا ان کا فیصلہ نہ مان کر ہم کبھی بھی کامیاب نہ ہوں گے۔

اکثر فیصلے ایک ہی بیٹھک میں مکمل ہو جاتے تھے لیکن کبھی بھی فیصلہ مکمل نہ ہونے کی صورت میں دوسری تاریخ دے دیتے اور دونوں فریقین کو اپنے سامنے بٹھاتے چاہے ان میں سے کوئی کتنا ہی بڑی حیثیت والا ہو اور فتویٰ دینے میں بھی کبھی یہ نہ دیکھتے کہ جس کے لیے فتویٰ دیا جا رہا ہے وہ کتنی بڑی حیثیت کا ہے۔

ایک دفعہ ایک غریب آدمی آیا کہ میرا مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ پر ایک پلاٹ میں کچھ حق بنتا ہے اس کا فتویٰ تحریر کر کے دیں تو والد ماجد رحمہ اللہ نے کسی صاحب سے کہا کہ ان کی بات سن کر فتویٰ تحریر کر کے لاؤ مولوی صاحب جب تحریر لائے تو آپ نے اس کی تصحیح فرما کر اپنے دستخط تحریر کر دیئے پھر جب وہ اس تحریر کو جناب مخدوم صاحب کی خدمت میں لے گیا تو انھوں نے ان کو ان کا حق دے دیا۔ اگر کبھی کسی فتویٰ میں غلطی ہو جاتی تو اس سے رجوع کرنے میں کبھی بھی پس و پیش سے کام نہ لیا۔

مجھے یاد ہے ایک بار آپ نے کسی شخص کو ایک فتویٰ لکھ کر دیا ان کے چلے جانے کے بعد آپ نے محسوس کیا کہ اس میں ایک جگہ غلطی ہوگئی ہے تو پھر آپ نے اپنا ایک آدمی اس کے گاؤں بھیج کر اس کو واپس بلایا اور تحریر میں غلطی کی تصحیح فرما کر پھر اس کے حوالے کیا۔

کچھ دوست یہ کہتے ہیں کہ لوگ آپ کی تحریر کو غلط استعمال کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنا بیان دے کر جس کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ وہ بیان سچا ہے یا غلط تحریر کی صورت میں فتویٰ

لے کر جاتے ہیں پھر دوسرے فریق پر جا کر دباؤ ڈالتے ہیں کہ آپ کا یہ فتویٰ ہے جس میں ہمارا حق بنتا ہے آپ ہمیں اپنا حق دے دو یا کسی بڑے آدمی کے ذریعے یا کورٹ کے ذریعے اس پر دباؤ ڈلواتے ہیں کہ یہ پیر سائیں کا فتویٰ ہے جس میں ہمارا حق بنتا ہے اس لیے ہمیں ہمارا حق دلوایا جائے حالانکہ اس کا حق نہیں بنتا کیونکہ اس نے جو بیان یا سوال تحریر کروایا وہ اصل واقعہ کے خلاف تھا لیکن کورٹ یا خانگی طرح فیصلہ کرنے والا یہ کہہ کر اس کی بات کو رڈ کر دیتا ہے کہ بھائی یہ پیر سائیں کی طرف سے فیصلہ کیا ہوا ہے، اس لیے اس میں جو کچھ بھی تحریر ہے وہ صحیح ہے۔ اس لیے یک طرفہ تحریر نہ نکالیں جب دونوں فریقین موجود ہوں تب تحریر نکالیں تو اس کے لیے عرض ہے کہ اکثر تحریر لکھوانے کے لیے وہ حضرات آتے ہیں جن کو فریق ثانی نہ اپنا حق دیتے ہیں اور نہ ان کے کہنے پر فیصلہ کرانے کے لیے تیار ہوتے ہیں غریب اور کمزور ہونے کی وجہ سے وہ ان کا حق دبا لیتے ہیں اس صورت میں وہ کیا کریں؟

اس لیے مجبوراً یک طرفہ بیان پر تحریر لکھ کر دی جاتی ہے جس سے وہ اپنا حق وصول کر پاتے ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ جو لوگ غلط بیان لکھتے ہیں تو اس کے لیے ہم تحریر کے شروع میں یہ الفاظ لکھتے ہیں کہ: بشرط صحۃ السوال یعنی اگر یہ سوال صحیح ہے تو اس کا یہ جواب ہے اگر سوال ہی غلط ہے تو جواب بھی غلط ہو جائے گا اور تحریر لکھنے والے مولانا صاحب کا یہ اصول تھا کہ تحریر کی ایک نقل مدرسہ میں بھی رکھتے تھے لیکن جب مولانا دوست محمد لکھمیر صاحب اپنی علالت کی وجہ سے مدرسہ سے چلے گئے اور دوسرے مولانا صاحب نے چارج سنبھالا تو اکثر تحریریں اِدھر اُدھر ہو گئیں اس کے بعد مولانا عبدالرحیم صاحب جو تحریر لکھتے تو کبھی اس کی نقل رکھتے لیکن اکثر اس کی نقل نہیں رکھتے تھے اس لیے اب تک جو مواد بھی باقی رہا اس کو ترتیب دے کر فتاویٰ کی صورت دے دی گئی۔

اس کے علاوہ بہت سارا مواد تحریری صورت میں شیخ الحدیث جناب محترم مولانا افتخار احمد الازہری صاحب نے دوسرے احباب کرام سے رابطہ کر کے لیا جن میں سرفہرست واجب

الاحترام مولانا مولابخش محمدی صاحب آف ٹنوں کوٹ اور محترم مولانا عبدالغنی واجب الاحترام مولانا اللہ بخش ثونیہ صاحب آف لاڑکانہ ہیں ان حضرات اور دیگر علماء سے شیخ افتخار صاحب نے کوشش کر کے جو مواد اکٹھا کیا ہے وہ قابل تحسین ہے اس کے بعد ان سب کو ترتیب دے کر پروف ریڈنگ سے طباعت کے مرحلہ تک پہنچانا بھی ان کے تحسین عمل کا حصہ ہے جن کا اجران کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔

اس وقت مدرسہ کی تحریرات کا کام مولانا عبدالرحیم لکھمیر صاحب آف نواب شاہ اور مولانا نصر اللہ صاحب آف مورو اور مدرسین مدرسہ کے ذمہ ہے اور مولانا نصر اللہ صاحب ان تحریرات کی فوٹو کاپی کر کے رکھتے ہیں جو کہ آئندہ کے لیے ان شاء اللہ ایک اچھا مواد ثابت ہوگا اور تحریر دینے سے پہلے میں یا میرے بیٹے سید احسان اللہ شاہ اور سید محمد انور شاہ اس کی تصحیح کر کے دستخط کرتے ہیں اور اس تحریر کو بھی بحمد اللہ عصر حاضر میں وہی مقام حاصل ہے جو والد ماجد رحمہ اللہ کے وقت میں تھا اور یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ والد صاحب رحمہ اللہ احادیث کے مسائل ہوں یا علم اسماء رجال کے مسائل جہاں بھی ان کو کچھ تردد ہوتا تھا تو اپنے سے کم علم والے سے بھی پوچھنے میں تامل نہ برتتے تھے اگر اس کی بات صحیح ہوتی تو وہ لے لیتے بلکہ اس کا شکریہ بھی ادا کرتے اور وہاں یہ بات لکھ بھی دیتے کہ یہ بات ہم کو فلاں صاحب سے معلوم ہوئی اور یہ بات کہنے میں وہ کبھی اپنی توہین محسوس نہ کرتے۔ کبھی فتویٰ نکالنے والے ہمارے استاد المکرم مولانا دوست محمد صاحب سے بھی کسی مسئلہ پر اختلاف ہوجاتا پھر اگر دلائل کے لحاظ سے ان کی بات میں وزن ہوتا تو بغیر کسی تامل کے مان لیتے اور ان کا شکریہ ادا کرتے۔

مجھے یاد ہے ایک بار ان کا ہمارے چچا بدیع الدین شاہ رحمہ اللہ سے خط وکتابت کے ذریعے کسی مسئلہ پر بحث چل رہی تھی اور آخری خط میں والد ماجد رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا کہ میں اپنے موقف سے رجوع کرتا ہوں اور اس بارے میں آپ کا موقف صحیح ہے اور وہ خط جب میرے چچا زاد بھائی سید رشد اللہ شاہ نے پڑھا تو کہا کہ چچا جان نے ارسال الیدین کے مسئلے سے

رجوع کرلیا ہے اور اب چچا جان رکوع کے بعد دیکھنا ہاتھ باندھیں گے، پھر جب ہم نے دیکھا کہ وہ ارسال الیدین کررہے ہیں تو ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی دوسرا مسئلہ تھا۔

آخر میں ان تمام ساتھیوں کا شکرگزار ہوں جنھوں نے اس علمی ارمغان کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ جزاء ھم اللہ خیرا.

والسلام

ابوالاحسان سید قاسم شاہ الراشدی

حرفے چند

فتاویٰ راشدیہ

پروفیسر مولا بخش محمدی صاحب

علامہ سید محب اللہ شاہ راشدی نور اللہ مرقدہ وجعل الجنۃ مثواہ (۱۹۲۱۔۱۹۹۵) اپنے وقت کے عظیم مفسر، محدث، فقیہ، داعی اور اسلام کے سچے سپوت تھے۔ آپ علم وعمل کے پیکر، قرآن وسنت کے حدی خواں، فن رجال کے امام، تقویٰ وورع کے پیکر، علوم قدیم وجدید کے سنگم، مثالی استاد، اسٹیج کے بادشاہ، قلم وقرطاس کے فرماں روا تھے، علمی وادبی دنیا میں آپ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بلاشبہ زمانہ حال میں عالم اسلام نے جو چوٹی کے چند مفکرین پیدا کیے ہیں اُن میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

آپ متعدد بلند پایہ کتب کے مصنف ہیں۔ آپ کی تعلیمات یا تصانیف سے جو بھی واقف ہوگا وہ آپ کے تبحر علمی، وسعت مطالعہ، دقت نظر، مثالی حافظہ اور سخن فہمی کا بھی قائل ہوگا۔

زیرِ نظر مجموعہ فتاویٰ راشدیہ بھی آپ کی قلمی کاوشوں کا مظہر ہے جس میں تمام شعبہ ہائے زندگی کے متعلق اذہان وقلوب میں اُتر جانے والا روشن تذکرہ ملے گا، یہ فتاویٰ جات شاہ صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں سائلوں کو عطا کیے تھے۔ جن میں عقائد، عبادات، معاملات، حقوق وفرائض، تجارت ومعیشت ملک کے غلط رسم ورواج کے علاوہ دور جدید کے دیگر روزمرہ مسائل پر دیے ہیں۔ جس میں کہیں پر اجمال واختصار سے کہیں قدرے تفصیل سے جوابات عنایت کیے گئے ہیں۔ چونکہ عموماً وادیٔ سندھ میں دیہات کے دور افتادہ علاقوں میں مقیم لوگوں کی مراجع ومصادر تک پوری طرح رسائی نہ تھی، لہٰذا آپ نے مختصر جوابات عنایت فرمائے۔ سوالات وجوابات میں دیہات کے لوگوں میں جو بے جا غلط رواج و

رسومات جاہلیہ تھے شاہ صاحب نے ان کا خوب سدباب کرنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ مقامات پر جدید دور کے غیر اسلامی سائنسی اور ملحدانہ افکار ونظریات کا بھی معقول انداز میں جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ چونکہ اُس دور میں علمی محافل میں انھی مسائل کا تذکرہ زیادہ کیا جاتا تھا جن کی تفصیل سوالات میں ملتی ہے۔ بہرحال ان فتاوے اور جوابات سے شاہ صاحب کا تبحر علمی، دقت نظر، وسعت مطالعہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

زیرنظر مجموعہ کا بڑا حصہ راقم الحروف اور میرے ایک اور انتہائی قریبی ساتھی جماعت اہل حدیث کے سچے سپاہی، داعی اسلام مرحوم مولوی عبدالرحیم بلوچ نے وقتاً فوقتاً شاہ صاحب سے حاصل کیے تھے، چونکہ اُس زمانہ میں ہمارے ضلع تھرپارکر، میرپور خاص عمرکوٹ اور بدین میں شاہ صاحب کے بلند علمی وقار ومنزلت کی وجہ سے پورے صوبہ میں لوگ مختلف احکام ومسائل میں حضرت شاہ صاحب مرحوم اور آپ کے برادر عزیز علامہ سید بدیع الدین شاہ راشدی رحمہ اللہ کے فتاوے پر کلیتاً اعتماد کرتے اور ان حضرات سے ہی جوابات کے حصول کے لیے کوشاں رہتے تھے جن میں علامہ سیّد بدیع الدین شاہ صاحب نہ صرف سندھ بلکہ وطن عزیز اور بیرون وطن بھی تبلیغی دوروں میں بے انتہا مصروف رہتے تھے اور جماعتی امور پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ پھر علامہ سیّد محب اللہ شاہ سے تو میرا ایک مخلص ساتھی اور شاگرد کا تعلق بھی تھا لہٰذا میں اس سلسلہ میں زیادہ تر تکلیف شاہ صاحب ہی کو دیا کرتا تھا، اور شاہ صاحب جو صاحب جود وسخا کے پیکر تھے، انھوں نے ہمارا علمی کشکول کبھی خالی نہ لوٹایا۔ خواہ کتنا ہی مصروف ہوتے یا علیل ہوتے لیکن ہماری ہر صدا پر لبیک کہتے ورنہ کہاں شاہ صاحب کا مرتبہ اور مقام کہاں ہم جیسے علمی کوتاہ قد ؏

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل نسیم صبح تیری مہربانی

پھر شاہ صاحب کے خطوط کی طرح اُن کے اُن فتاویٰ کو بھی میں نے عزیز از جاں سمجھ کر تین جلدوں میں مجلد کر کے محفوظ کرلیا۔

زیرنظر مجموعہ میں، نہ صرف میرے ہی جمع کردہ فتاویٰ ہیں بلکہ اُن کے علاوہ علامہ سیّد محمد

قاسم شاہ راشدی حفظہ اللہ کے کتب خانے میں متعدد فتاوے بھی شامل اشاعت ہیں اُن کے علاوہ دیگر مختلف مقامات سے جستجوئے بسیار کے بعد حاصل کر کے جمیع فتاوے کو شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ اس علمی مجموعے کو نہ صرف راقم الحروف، بلکہ علامہ سیّد محب اللہ شاہ کے فرزندان گرامی قدر بالخصوص علامہ سید قاسم شاہ راشدی مدظلہ تعالیٰ اور اُس کے اعلیٰ علمی حدیث و رجال کے ذوق کے مالک فرزند ارجمند محترم سیّد انور شاہ صاحب حفظہ اللہ کی شدید خواہشیں تھی کہ یہ علمی ارمغان شائع ہوکر قارئین تک پہنچ سکے، چونکہ یہ علمی مواد مدت مدید سے عوام کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ شاہ صاحب مرحوم علامہ سید محب اللہ شاہ کے انتقال پر ملال کو بھی طویل عرصہ بیت چکا تھا۔ ایسے میں ان بیش بہا جواہر پاروں کو قارئین کرام تک پہنچانے میں راشدی برادران کے محب صادق، جامعہ بحر العلوم سلفیہ میر پور خاص کے شیخ الحدیث محترم پروفیسر مولانا افتخار احمد الازہری نے نہ صرف ان جواہر پاروں کو ایک سلک میں منسلک کرنے کا بیڑہ اٹھایا بلکہ ماضی کے بوسیدہ اور دریدہ اوراق علمیہ کو غور سے مطالع کر کے ان کو سندھی سے اردو میں منتقل کرانے کی کوشش کی بلکہ فتاوے کی ترتیب، تبویب، تسوید وغیرہ کے مراحل شب و روز ایک کر کے ادا کیے، اللہ تعالیٰ اُن کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

شیخ افتخار صاحب کے ساتھ علامہ سیّد محمد قاسم شاہ صاحب کی رہنمائی اور مشورے بھی بلاشبہ بڑے مدد و معاون ثابت ہوئے۔ لہٰذا ہم ان ایثار پیشہ شخصیات کے مرہون منت ہیں جو صلہ و ستائش کی تمنا سے بے نیاز ہوکر اور بھی بہت کچھ علمی کام کرنے کے عزم بالجزم جذبہ صادق سے سرشار نظر آتے ہیں۔

میں کہ مری غزل میں آتش رفتہ کا سراغ
میری سرگذشتہ کھوئے ہوؤں کی جستجو

مولانا افتخار احمد الازہری صاحب نے نہ صرف اس مجموعہ پر محنت فرمائی ہے بلکہ اس سے قبل انھوں نے جوان ہمتی کا ثبوت دیتے ہوئے حضرت علامہ سیّد محب اللہ شاہ راشدی کی مفصل سوانح حیات ”محدث العصر“ کے نام سے اپنے ادارے کی جانب سے تقریباً ۷۰۰

صفحات پر مشتمل وقیع کتاب شائع کر کے ادبی اور علمی حلقوں سے داد تحسین حاصل کی، مزید یہ کہ علامہ مرحوم کے منتشر عالی علمی مقالات ومضامین میں بعنوان ''مقالات راشدیہ'' جلد اوّل ساڑھے پانچ سو کے قریب صفحات پر مشتمل مجموعہ میں شاہ صاحب کے گرانقدر ۲۷ مقالات شامل اشاعت کر کے شائع کی۔ اس کے علاوہ حضرت علامہ بدیع الدین شاہ راشدی نور اللہ مرقدہ جیسی عبقری شخصیت کی بھی سوانح حیات ''شیخ العرب والعجم'' کے نام سے بڑے سائز کے ص ۴۴۷ صفحات اور علامہ مرحوم کے علمی ادبی باوقار گرانقدر مضامین و رسائل کو بھی مقالات راشدیہ جلد دوئم کے نام سے ۵۵۸ صفحات پر مجموعہ علمی شائع کیا۔ اُس میں بھی شاہ صاحب کے بیس سے زائد وقیع مقالات ومضامین شامل اشاعت ہیں جسے علمی حلقوں میں بے حد پذیرائی ملی اور اب حال ہی میں مقالات راشدیہ جلد سوم بھی ان کی محنت آپ کے سامنے ۵۵۰ صفحات پر مشتمل موجود ہے۔

بلاشبہ راشدی برادران کی ان منتشر نایاب اور بکھری ہوئی نایاب تحریروں اور جواہر پاروں کو یکجا کر کے اور زیور طباعت سے آراستہ کر کے شائقین علم وادب علماء، طلباء، دانش ور حضرات اور علمی ذوق رکھنے والوں تک پہنچانے میں آپ ہم سب کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو دنیا وعقبیٰ میں فوز وفلاح سے سرفراز کرے۔ آمین

ع این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

جہاں تک علامہ سیّد محبّ اللہ شاہ کا تعلق ہے تو تحدیث بالنعمۃ کے طور پر تعارف کراتا چلوں کہ مجھے کئی عشروں تک حضرت شاہ صاحب کی علمی صحبت اور رفاقت حاصل رہی، اُن سے خط وکتابت کا سلسلہ جو ۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ سے شروع ہوا تھا وہ اُن کے آخری سانسوں تک جاری رہا۔ کبھی بھی منقطع ہونے نہ پایا، سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ مدرسہ ''دارالرشاد'' میں اکتساب علم کے سلسلہ میں مجھے آپ کے سامنے زانوئے ادب کرنے اور اُن کے خصوصی دروس علمیہ کے علاوہ، اہل فکر ونظر کی محافل میں باقاعدہ شرکت کا اعزاز بھی حاصل

ہوا۔ جو میرے لیے رہتی دنیا تک سامان اعزاز ونجاتِ اُخروی کا ایک ظاہری سبب تصور کرتا ہوں ۔

ازما بجز حکایت مھر و وفا میرس
ماقصہ سکندر و دارانہ خواندہ ایم

میں حضرت شاہ صاحب مرحوم کی علمی بزم سے جب بھی رخصت ہوتا تو آپ مجھے اپنائیت میں سینے سے لگانے پر جو خلوص کی حرارت محسوس ہوتی اُس کا احساس آج بھی اپنے اندر پاتا ہوں۔ اُن کی تربیت کا تو کچھ انداز ہی نرالا تھا، انھوں نے اپنے قرب و جوار میں بھی کچھ ماحول ہی ایسا بنا دیا تھا کہ اللہ اور اس کا نام لینے والوں کے لیے دنیا میں بھی محبت واکرام جاگزیں ہوتا گیا، اُن کی صحبت نے تو اپنے ملنے والوں کو بھی مطالعہ کتب کا اسیر اور انسان دوست بنا دیا ۔

تیری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

اللہ والوں سے اٹھنا بیٹھنا اُن کے ہاں کچھ ایسے وفود سے تھا کہ آج تک حیرت ہوتی ہے، ہم جیسے کتنوں کی قلم وقرطاس سے محبت اپنائیت اور زندگی کا حصہ بن گئی، شاہ کے ہاں صرف میں اکیلا ہی عقیدت کیش نہ تھا بلکہ مجھ سے کئی گنا بڑے علماء کرام اور مشائخ عظام بھی سرمایہ دُعاء وتوجہ، گریہ نیم شبی حاصل کرنے کی غرض سے حاضر ہوا کرتے تھے اور اُن کی ہر بات میں متانت، سنجیدگی اور وقار نظر آتا تھا۔

شاہ صاحب کی علمی محفل میں سائل دل کھول کر بے خوف خطر اپنا مدعا پیش کرسکتا تھا، جس کے جواب میں اُسے عزت نفس کے ساتھ کتاب وسنت کی روشنی میں جو رہنمائی حاصل ہوتی تھی، دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے کہ اس پاک طینت بندہ پر اللہ تعالیٰ اپنی بے پایاں انعام واکرام نازل فرمائے۔ جس کی نظر کرامت نے مجھ سے کئی بے زبانوں کو بولنے کا سلیقہ سکھایا آپ وقت کی نبض کو صحیح استعمال کرنے کے فن سے بھی آگاہ تھے۔

شاہ صاحب کے پاس اکثریت ایسے لوگوں کی بھی نظر آتی تھی جو دین فطرت اور آفاقی

نظام اسلام کے خلاف ملحدین اور مغرب زدہ اذہان کی باتیں سن سن کر بددل ہوکر آپ کی بزم میں شفایاب ہونے کی غرض سے آیا کرتے تھے، کچھ ایسے فکر کے مالک بھی حاضر بزم ہوا کرتے تھے۔ جو حصول دعاء اور ناصحانہ حکمات سننے کی متمنی ہوا کرتے تھے ؂

آب رواں کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو

شاہ صاحب کے ہاں ایسے مسائل بھی آیا کرتے تھے جو کفر والحاد کے مارے ماحول میں بیمار ہوکر سنی سنائی ساری اسلام خلاف باتیں تک کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کرتے تھے، جو کسی اور صاحب علم سے کرنے کی ہمت کوئی نہیں کرسکتا تھا، لیکن یہ ساری باتیں سننے کے بعد بھی شاہ صاحب سائل کے ذہن میں فکر اسلامی کا ایسا سایہ دار شجر کی تخم ریزی کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ سائل ساری زندگی اسلام کا ہی ہوکر رہ جائے، بلاشبہ موجودہ دور ایسا پر آشوب دور ہے جس میں مخالفین اسلام ایسا جواب طلب کرتے ہیں جو حدت عقل کو نہ سہی فہم عامہ کو بھی اطمینان خاطر دلا سکے ویسے بھی اللہ تعالیٰ نے طائفہ منصورہ مسلک سلف صالحین ''اہل حدیث'' کو یہ قبول عام شرف اسی وجہ سے عطا ہوا ہے کہ یہاں کتاب وسنت کی بالادستی اور شاہ صاحب جیسے وسعت ظرف و وسعت نظر کے مالک حضرات کی کاوشیں خصوصی کام آتی ہیں، پھر یہ لوگ بھی اتنے بڑے تھے کہ جب حق کی بات سامنے آتی تو وہ ایسے سابقہ دیے ہوئے فتاوے سے بھی علی الاعلان رجوع کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے، جس کی متعدد مثالیں شاہ صاحب کے فتاوے میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ مفتی کی دور رس نگاہ صرف اعلائے حق پر مرکوز ہوا کرتی تھی، شاہ صاحب کا یہ قاعدہ کلیہ تھا کہ ایک مسلمان اپنی زندگی اور معاشرت میں تمام آداب و رسوم حقوق و فرائض، اخلاق وسیرت عبادات و معاملات کو کتاب وسنت کے آئینہ میں ہی درست کرے۔ اُن کی بزم میں جہاں کتاب وسنت کی بالادستی نظر آتی تھی وہاں فکر تازہ کے نظارے بھی موجزن ہوا کرتے تھے، اُن کے ہاں کبھی بھی اندھی تقلید، بزرگوں کے ارشادات وفرامین کو وحی الٰہی کے برابر تصور کرنے کے محیر العقول کشف وکرامات کا سرے سے تصور موجود نہ تھا ؏

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آسماں کے

شاہ صاحب کے ہاں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد، احترام انسانیت اور رواداری کے جذبات بھی یکساں نظر آیا کرتے تھے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو کسی کے مانگنے سے نہیں ملتیں بلکہ عطیہ خداوندی تھیں، شاہ صاحب عالم اسلام کی نمایاں اور غیر معمولی قد آور شخصیت تھیں، آپ کو احکام اسلامی قرآن وسنت کی روشنی میں حالات حاضرہ پر منطبق کرنے کی خصوصی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی، اسلام کی روشنی میں پوری زندگی کے نئے اور پیچیدہ مسائل کا حل اور موجودہ ملحدانہ ماحول میں طاغوتی سازشوں کا مقابلہ کرنے میں شاہ صاحب کو ممتاز مقام حاصل تھا، زندگی کے مختلف مراحل میں پیش آنے والے اہم مسائل کا حل بھی شاہ صاحب کے ہاں بہترین انداز میں ملتا ہے۔ انھوں نے زندگی کے الجھے ہوئے پیچیدہ، معاشی معاشرتی تاریخی اور فقہی مسائل میں ایک رہبر کامل کی حیثیت میں جو رہنمائی فرمائی اُس پر زیر نظر مجموعہ مسائل میں یقیناً پُر معلومات رسائل مسائل کسی علمی خزینہ سے کسی صورت میں کم نہیں جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ اسلام ایک کامل ضابطہ حیات ہے۔ جو ہمارے مادی، روحانی اور اخلاقی تقاضوں کو بہترین انداز میں پورا کرتا ہے اور دنیا و عقبیٰ کا ضامن بھی ہے۔ لہٰذا شاہ صاحب قرآن وسنت کے تمسک کے ساتھ پورے فقہی ذخیرہ سے استفادہ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ پھر جس فقہی رائے کو قرآن وسنت سے ہم آہنگ پاتے اُسے ترجیح دیتے ہیں، بلکہ اُن کے ہاں اجتہاد کا رنگ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

وہ جو بھی بات کہتے ہیں وہ دلائل کی روشنی میں کہتے ہیں۔ فقہی آراء میں بلاشبہ اختلاف کی گنجائش بھی رہتی ہے اور شاہ صاحب سے کہیں پر اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود اُن کے دلائل کو یقیناً موافق و مخالف داد تحسین دے گا، دوسرے لفظوں میں شاہ صاحب کے افکار ونظریات میں نہ تشدد کا رنگ غالب ہے، نہ سہل پسندی کی روش رواں ہے، بلکہ ہر مسئلے میں راہ اعتدال اور افکار سلف ہی صالحین کے ساتھ ہر قدم پر کتاب وسنت کی روشنی میں قدم اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ صاحب کے فتاوے میں اگر کوئی چیز مروجہ فتاوے کے خلاف نظر آئے تو اس تناظر میں نہ ملاحظہ کیا جائے کہ دین میں کوئی نئی تعبیر ہے بلکہ مسئلہ کو

اُسی رخ میں دیکھا جائے جس میں سوال دریافت کیا گیا ہے، یہ بھی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے کہیں پر اگر جوابات میں تشنگی رہ گئی ہے تو اس میں شاہ صاحب کی بے پناہ مصروفیات بھی ایک اہم سبب ہیں، اُن کی زندگی بڑی مصروف ترین تھی، ان کو بہت سارے ضروری فرائض سرانجام دینے پڑتے تھے اور فتاوے کا ہجوم بھی بڑھا ہوا تھا، کثرت کار کے باوجود آپ کسی سائل کو خالی نہیں جانے دیتے تھے، بے پناہ مصروفیات کے باوجود آپ نے ضعف عمری میں بھی قلم وقرطاس سے کبھی رشتہ منقطع نہ کیا، مطالعہ کتب آپ کا محبوب ترین مشغلہ تھا، کتب اور علمی لٹریچر آپ کا عظیم اثاثہ تھا۔ شاہ صاحب عموماً ملاقاتیوں کے ہجوم میں گھرے سے رہتے تھے، ایک یہ بھی سبب تھا کہ جوابات میں مزید تفصیلی علمی مباحث اور حوالہ جات کی کہیں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا کبھی مختصر مگر جامع جواب دیا کرتے تھے، شاہ صاحب بے پناہ مصروفیات کے باعث بعض اوقات اپنے مدرسہ کے لائق اساتذہ کرام کو بھی فتاوے لکھنے کی تاکید کیا کرتے تھے، جس کے آخر میں آپ تصدیق کر دیا کرتے تھے جس کے بعد فتاویٰ متعلقہ افراد کو ارسال کر دیا کرتے تھے۔ عموماً افسوس کہ اس مسودے کی کاپی رکھنے کا اہتمام بھی کم ہوتا تھا جس وجہ سے کافی علمی ذخیرہ ضائع ہوگیا۔ جس کے نہ ملنے پر شدید افسوس ہے۔ شاہ صاحب فتاوے دیتے وقت قرآن وسنت کی روشنی میں تمام ائمہ کے اقوال سے بھی استفادہ کرتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ کے آراء کے ذریعے فتویٰ دیتے وقت صحیح احادیث پر عموماً زیادہ انحصار کرتے تھے چونکہ آپ اپنے وقت کے فن رجال کے امام بھی تھے۔

علامہ سیّد محب اللہ شاہ رحمہ اللہ نے اپنی زندگی میں سیکڑوں تصانیف علمی مضامین ومقالات بڑی تحقیق وتدقیق سے تحریر فرمائے۔ رسائل ومسائل کی صورت میں فتاوے کا بھی ایک بڑا علمی ذخیرہ لکھا جس سے جو مواد میں نے آپ سے سوال وجواب کی صورت میں مختلف اوقات میں حاصل کیا وہ آج قارئین کرام کی نذر کرتا ہوں جن سے کئی مذہبی مسائل، تاریخی عقدے حل ہوتے ہیں۔ جن کے مطالعے سے دل ودماغ میں علمی وسعت پیدا ہوتی ہے۔ شاہ

صاحب کی سب تحریریں سدا بہار گلدستہ سے کسی صورت میں کم نہیں جن میں گلہائے رنگ رنگ سجے ہیں اور ہر پھول کی ایک جدا مسحور کن خوشبو ذہن وفکر کو معطر کیے دیتی ہے۔

شاہ صاحب کے عالی علمی نادر خطوط کا بھی ایک قیمتی حصہ محفوظ کیے ہوئے ہوں۔ اُن تحریروں میں درد بھی ہے اور سوز قلب بھی ہے۔ دلکشی اور دلآویزی بھی تو شورش قلب بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ایسے خطوط سینکڑوں صفحات پر مشتمل ہیں ۔

درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

(میر)

ان فتاوے پر تبصرہ تو اہل نظر ہی کر سکتے ہیں تاہم ہماری ناقص نگاہ میں فتویٰ دینا بے حد نازک اور اہم کام ہے جس میں معمولی لغزش، بے جا رعایت اور آزادی سے بے حد دینی قباحتوں کا اندیشہ رہتا ہے۔ جواز اباحت کی حدود سے تجاوز کر کے معصیت اور حرمت تک جا پہنچنے کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ فتویٰ کے لیے تفقہ فی الدین، علم راسخ، تعمیق نظر، بے حد احتیاط اور خوف خدا دامن گیر ہونا از حد ضروری ہے۔ اس جولان گاہ میں داخل ہونے سے قبل قرآن سنت، رجال، فقہ، اُصول فقہ تفسیر، اصول تفسیر غرضیکہ جمیع علوم شرعیہ معقولات و منقولات پر فاضلانہ نگاہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کی بے انتہا نوازشیں کہ اُس نے علمائے حدیث کو اس اعزاز سے سرفراز فرمایا ہے۔ اُن کے ہاں ظن، تخمین، شخصی آراء وافکار، تقلید جامد پر مبنی فتاوے نہیں دیے جاتے بلکہ حقیقی کتاب وسنت کی روح کے مطابق فتاوے صادر کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمارے اکابرین امت کے فتاوے اس بات کا بین ثبوت ہیں۔ زیر نظر مجموعہ فتاوے میں شاہ صاحب نے بھی امکانی حد تک محققانہ انداز میں ایسے جوابات عنایت فرمائے جس میں متقدمین و متاخرین کی آراء بھی شامل ہیں۔ جن سے جہاں علمائے عظام استفادہ کر سکتے ہیں وہاں پر جدید مفکرین اور متلاشیان حق بھی حق کی بات سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے استاد محترم کو جنت الفردوس کے لیے یہ توشہ آخرت بنائے۔ آمین

بہر حال اس مجموعہ فتاویٰ میں جن احباب کرام نے معاونت فرمائی اور خاص طور پر حافظ ثناء اللہ صاحب فاضل جامعہ بحر العلوم میر پور خاص کہ جنھوں نے اپنی نگرانی میں کتاب کی تمام بنیادی چیزوں کو مدنظر رکھا اور آپ تک پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ بالخصوص مکتبہ نعمانیہ کے روح رواں محترم محمد ضیاء الحق نعمانی صاحب جنھوں نے کتاب کی خوبصورت طباعت میں جذبہ ایمانی، اخلاص اور محبت کا ثبوت دیا وہ لائق تحسین ہے۔

تاہم اگر کتاب میں بشری تقاضوں کے تحت اگر قارئین کرام کوئی لغزش پائیں تو اُس کی نشاندہی فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اُسے درست کر کے شایع کیا جائے۔ ان شاء اللہ

اللہ تعالیٰ اس مجموعے کو صوری و معنوی خصائص کا آئینہ دار بنائے اور عامۃ المسلمین کو اس سے استفادہ کرنے کا اور ہم سب کو جادہ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے ممدوح شاہ صاحب کو اعلیٰ علیین میں بلند مقام عطا فرمائے اور اُن کے درجات کو بلند کرے۔ آمین

والسلام

العبد المذنب

مولا بخش محمدی (شعبہ اسلامیات)
گورنمنٹ ڈگری کالج، مٹھی ضلع تھرپارکر سندھ

پیش لفظ

فتاویٰ راشدیہ علمائے اہل حدیث کے فتاویٰ میں ایک اور گراں قدر علمی اضافہ

اسلام میں فتویٰ نویسی کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ بذات خود اسلام۔ انسانی زندگی جو کہ دنیاوی جھمیلوں کا مجموعہ ہے۔ اس اعتبار سے انسان کو قدم قدم پر رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی انسانی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر انسان کی رشد و ہدایت کے لیے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کے ذریعے رہنمائی کا سامان کیا ہے۔

لغت عرب میں فتویٰ اور فتیا کا معنی رائے اظہار یا مشکل احکام کو واضح کرنا ہے۔

(لسان العرب ۱۵/ ۱۴۸، المعجم الوسیط جلد۲، ص ۲۷۳)

اصطلاح میں فتویٰ سے مراد پیش آمدہ مسائل اور مشکلات سے متعلق دلائل کی روشنی میں شریعت کا وہ حکم ہے جو کسی سائل کے جواب میں کوئی عالم دین اور احکام شریعت کے اندر بصیرت رکھنے والا شخص بیان کرے۔ سوال کرنے والے کو مستفتی اور جواب وفتویٰ دینے والے کو مفتی کہا جاتا ہے۔ پس مفتی دین کے حوالے سے لوگوں کو درپیش مسائل اور دیگر سوالات کا کتاب وسنت کے حوالے سے حل بتاتا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ بھی ہے:

﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ۴۳)

''اگر تم کسی مسئلہ کے بارے میں نہیں جانتے تو علماء سے اس کی بابت پوچھ لیا کرو۔''

فتویٰ پوچھنے اور فتویٰ دینے کا سلسلہ رسول کریم ﷺ کے مبارک دور سے چلا آرہا ہے۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کے طویل عرصے میں علمائے اسلام اور ائمہ عظام نے اس شعبے کی اہمیت کے باوصف ہمیشہ اس کا خاص اہتمام کیا ہے۔ مسلمان اپنے دین و دنیوی امور اور پیش آمدہ مشکلات اور مسائل کے حل کے لیے برابر ان کی طرف رجوع کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان مسائل کا تعلق خواہ عقائد وعبادات سے ہو یا معاملات واخلاق سے یا آپسی

اختلاف ونزاع سے، ہر حال میں وہ شریعت کا حکم معلوم کرنے کے لیے مفتیوں سے فتویٰ لیتے رہے ہیں اور مفتیان کرام نے افتاء کو اپنا منصبی فریضہ سمجھ کر ہمیشہ اُمت کی راہنمائی کی ہے۔ افتاء کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی نسبت خود اپنی ذات کی طرف کی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ﴾ (النساء: ۱۷۶)

''یہ لوگ آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں (انھیں) کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ﴾ (النساء: ۱۲۷)

''آپ سے عورتوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ خود اللہ ان کے بارے میں حکم دے رہا ہے۔''

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سب سے بڑے مفتی ہیں اور اس کے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ بھی دارالافتاء پر فائز ہیں۔ قرآنی آیات میں جہاں بھی یستفتونك اور یسئلونك کے الفاظ آئے ہیں وہ کسی مسئلہ کے بارے میں رسول کریم ﷺ سے کیے گئے سوالات کے جوابات ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے بصورت وحی نازل فرمائے۔ رسول اللہ ﷺ بھی وحی الٰہی کے ذریعے لوگوں کو فتویٰ دیا کرتے اور مسائل و احکام بتایا کرتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ براہِ راست نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر مسئلے کا حل پا لیتے۔ ان احکام الٰہیہ اور فرامین نبویہ کی طرف رجوع بہر حال فرض اور واجب ہے کیونکہ اللہ ربّ العزت نے حکماً فرمایا ہے:

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ (النساء: ۵۹)

''اگر تم کسی معاملے میں باہم جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول (ﷺ) کی طرف لوٹا دو۔''

علامہ ابن قیم جوزی (متوفی ۷۵۱ھ) نے اپنی معروف کتاب "اعلام الموقعین عن رب العالمین" میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں سو سوالات کے جوابات فتاویٰ کی صورت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کو جمع کیا ہے۔ ان کے علاوہ نبی علیہ السلام سے اور بھی بہت سے فتاویٰ ہیں جو آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے پوچھنے پر صادر فرمائے وہ حدیث وسیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔

عہد رسالت کے بعد بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اپنی دینی بصیرت اور تبحر علمی سے مسلمانوں کی راہنمائی کے لیے فتاویٰ صادر فرمائے۔ امام ابن حزم (متوفی ۴۵۶ھ) نے ایسے ۱۴۲ صحابہ اور ۲۰ صحابیات کا تذکرہ کیا ہے جن سے فتاویٰ منقول ہیں۔ مؤرخ اہل حدیث، ذہبی دوران حضرت مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ اصحاب فتویٰ صحابہ اور تابعین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں..... دینی نوعیت کے پیش آئند واقعات ومسائل کے سلسلے میں کسی ماہر شریعت کے دینی فیصلے کو "فتویٰ" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور فتویٰ دینے والے ماہر شرع اور عالم دین کو مفتی اور مجتہد کے پراعزاز لقب سے پکارا جاتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اصل فیصلہ وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جاری کردہ ہو۔ اسی بنا پر اس شخص کے فیصلے کو مستند اور قابل تسلیم گردانا جاتا ہے، جس کے فیصلے کی اساس کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ قرار دی جائے۔ عہد نبوت میں اس قسم کے فیصلے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نافذ فرماتے۔ آپ کی زندگی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی ایک جماعت بھی اس کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ اس مقدس جماعت میں سے بعض کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلے کرنے کی اجازت دی اور بعض کو فیصلے کے اصول سمجھائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلفائے راشدین اور دیگر مفتیان صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے یہ عظیم خدمت انجام دینا شروع کی۔ جن مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے فتاوے محفوظ ہیں اور ہم تک پہنچے ہیں ان کی تعداد ایک سو انچاس ہے۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ فتاویٰ کی نوعیت کے اعتبار سے اس تعداد کو تین حصوں میں منقسم کیا جاتا ہے۔

مکثرین، متوسطین اور مقلین۔

مکثرین سے مراد وہ اہل فتویٰ صحابہ ہیں، جن میں سے ہر صحابی سے منقول ومروی فتاویٰ کا ضخیم مجموعہ اور کثیر مواد موجود ہے۔ وہ سات صحابہ ہیں جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔
امیر المومنین حضرت عمر فاروق، امیر المومنین حضرت علی، اُمّ المومنین عائشہ صدیقہ، عبداللہ بن مسعود، عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن عمر، زید بن ثابت رضی اللہ عنہم۔ یہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن، حدیث اور فقہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

متوسطین سے صحابہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ جماعت مراد ہے، جن میں کے ہر صحابہ سے منقول فتاویٰ کا چھوٹا سا مجموعہ دستیاب ہوتا ہے۔ یہ بیس صحابہ کرام ہیں جن میں سے چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ خلیفہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق، امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان، اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ، حضرت انس، ابوہریرہ، معاذ بن جبل، ابوموسیٰ اشعری، عبد الرحمان بن عوف، زبیر بن عوام، طلحہ، عبادہ بن صامت، ابوسعید خدری، سلمان فارسی، حضرت امیر معاویہ، جابر اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم اجمعین۔

مقلین صحابہ وہ صحابہ، جن سے منقول فتاویٰ کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ بعض سے تو صرف ایک یا دو فتوے منقول ہیں۔ ان سب کے فتاویٰ کو جمع کیا جائے تو بہت ہی چھوٹے سے مجموعے ہر معنوی ہوں گے۔ ان صحابہ کو مقلین کہا جاتا ہے، ان کی تعداد ایک سو بائیس ہے۔ مندرجہ ذیل صحابہ اسی زمرہ مقلین میں شامل ہیں۔ ابوالدرداء، ابوذر غفاری، ابوایوب انصاری، ابوعبیدہ بن جراح، ابی بن کعب، جعفر بن ابوطالب، حضرت حسن، حضرت حسین، اُمّ المومنین حضرت حفصہ، اُمّ المومنین حضرت صفیہ، اُمّ المومنین اُمّ حبیبہ، نعمان بن بشیر، ابومسعود، براء بن عازب، حذیفہ بن یمان، عمار بن یاسر، سعد بن معاذ، خالد بن ولید، عقیل بن ابی طالب، حضرت فاطمۃ الزہراء، عبد الرحمان بن ابوبکر، سعد بن عبادہ، عدی بن حاتم، عوف بن مالک، عبداللہ بن سلام، اُم شریک، حبیب بن سلمہ، مقداد بن اسود، سہل بن سعد الساعدی، عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ (برصغیر پاک وہند میں علم فقہ صفحہ ۶، ۷، ۸)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے اور وہ ہمیشہ قرآنی احکام اور

سنت رسول ﷺ کو ہی مقدم جانتے اور اسی کے مطابق فتویٰ صادر فرماتے تھے۔ ان کے مبارک دور کے بعد تابعین اور تبع تابعین کا مبارک دور آتا ہے اس میں بھی قرآن وسنت کو مقدم جانا جاتا تھا۔ تابعی میں حضرت سعید بن المسیب، حضرت عروہ بن زبیر، حضرت خارجہ بن زید، حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ، حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر، حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن، حضرت سلیمان بن یسار، حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمان اور حضرت سالم بن عبداللہ یہ وہ سات عظیم شخصیتیں ہیں کہ جو فقہ وفتاویٰ میں نامور ہوئے اور ان پر امت مسلمہ بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔ ان فقہائے سبعہ کے حالات کے لیے مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی (وفات ۴ جولائی ۲۰۰۲) کی مرتبہ کتاب ''فقہائے سبعہ'' طبع مارچ ۱۹۷۹ء لاہور میں تفصیل دیکھی جاسکتی ہے اور جماعت اہل حدیث کے عظیم مصنف محمود احمد غضنفر حفظہ اللہ کی ترجمہ کردہ کتاب ''فقہائے مدینہ'' بھی معلوماتی ہے۔ قرونِ اولیٰ کے بعد اُمت محمدیہ انتشار کا شکار ہونا شروع ہوگئی، گروہ بندیاں اور تقلیدی مذاہب وجود میں آگئے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں لکھا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں بعض اصول وقواعد کے اختلاف کی وجہ سے دو گروہ پیدا ہوگئے۔ اہل الحدیث اور اہل الرائے (دیکھئے باب الفرق بین اہل الحدیث واہل الرای) اہل حدیث میں اکثریت اہل حجاز کی تھی۔ جن کے سامنے کتاب وسنت کی نصوص اور آثار سلف تھے۔ اہل حدیث کا یہ گروہ احادیث نبویہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے فتاویٰ کی بنیاد پر فتویٰ دیتا تھا اور جب تک کسی واقعہ کا ظہور نہ ہوجاتا اس وقت تک اس کے بارے میں شرعی حکم بیان کرنے سے گریز کرتا تھا۔

دوسرا گروہ اہل الرائے کا تھا جس میں فقہائے عراق کی غالب اکثریت تھی۔ ان کے پاس چونکہ صحیح احادیث کم تھیں اس لیے انھوں نے فتویٰ دیتے وقت عام طور پر رائے اور قیاس کا کثرت سے استعمال کیا۔ بعض ایسے قواعد وضع کیے جن کو سامنے رکھ کر پیش آمدہ اور آئندہ پیش آنے والے بلکہ محال اور غیر ممکن الوقوع ہزاروں مسائل سے متعلق اپنی رائے ظاہر کی اور انھیں فقہ وفتاویٰ کی کتابوں میں جمع کر گئے۔ ائمہ مجتہدین کے بعد ان کے متبعین ومقلدین

مختلف گروہوں میں بٹ گئے اور ہر گروہ فتاویٰ کے سلسلہ میں اپنے مسلک کی توجیہہ وتائید میں لگ گیا۔ اس طرح فتاویٰ کا اجراء اجتہاد کے بجائے تقلید کی بنیاد پر ہونے لگا اور تقلید کی روش ایسی مرغوب ہوئی کہ ہر مفتی اپنے مذہب کے اصول وفروع کے اردگرد گھومتا رہا۔ اسے براہ راست کتاب وسنت کی طرف رجوع اور دیگر ائمہ مجتہدین وفقہائے امت کی آراء سے استفادہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اس کے برعکس علمائے حدیث کی ایک جماعت ہر دور میں ایسی بھی رہی ہے جو سلف صالحین (صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین) کے طریقہ کار پر کاربند رہی۔ فتویٰ نویسی کے وقت انھوں نے وہی طریقہ اپنایا جو سلف کے یہاں رائج تھا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے فتاویٰ میں اسی طریقے کی پیروی کی ہے یہی وجہ ہے کہ بعض مسائل میں انھوں نے ائمہ اربعہ تک کی مخالفت کی ہے۔ برصغیر پاک وہند میں فقہی مسالک کی تقلیدی روش کے برعکس علمائے اہل حدیث نے ہمیشہ قرآن وحدیث کے فروغ اور بالادستی کے لیے تحریری وتصنیفی کام کیا ہے۔ قرآن مجید کی تفاسیر، احادیث کی شروح وحواشی اور تراجم کے ساتھ ساتھ فتویٰ نویسی میں بھی علمائے اہل حدیث کی کاوشیں لائق تحسین ہیں۔ اس وقت علمائے اہل حدیث کے فتاویٰ کے کئی مجموعے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے فتاویٰ کا تعارف ملاحظہ فرمانے سے پہلے برصغیر میں جماعت اہل حدیث کے محسن حضرت نواب صدیق حسن کا تذکرہ ضروری ہے۔

① ...... فتاویٰ نواب صدیق حسن خاں

مولانا نواب صدیق حسن خاں انیسویں صدی عیسوی کے جلیل القدر عالم دین اور کثیر التصانیف مصنف تھے۔ انھوں نے سوا دو سو کے لگ بھگ اسلامی علوم وفنون پر کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے کتب احادیث بالخصوص صحاح ستہ کے اردو ترجمہ کروا کے شائع کیے اور بعض عربی کتب کو شائع کروا کر علماء میں فی سبیل اللہ تقسیم کیا۔ اس سے ان کی علم پروری اور اسلامی خدمات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت نواب صاحب اسلامی علوم کا بحر ذخار تھے۔

ان کی تین کتابیں (۱)......''ھـدایة السـائـل الـی ادله المسائل'' (صفحات: ۵۶۰) (۲)......''بـدور الاهـلة من ربط المسائل بالادلة'' (صفحات: ۵۲۸) (۳)...... ''دلیـل الـطـالب علی ارجع المطالب'' (صفحات۱۰۱۲) فقہ حدیث میں بے مثال کتب ہیں۔ ان کتابوں میں نواب صاحب نے تمام مسائل مع دلائل درج کیے ہیں اور اختلاف اقوال کی صورت میں راجح قول کا تعین کیا ہے۔ یہ کتابیں کوئی سوا سو سال پہلے بھوپال سے شائع ہوئی تھیں اور بعض فارسی میں ہیں اس لیے ان نادر و نایاب کتب سے اب استفادہ نہیں کیا جاتا۔ حقیقت میں یہ کتابیں اپنے موضوع پر عربی و اردو تالیفات کی ہم پلہ ہیں۔ عصر حاضر کے محقق و متخرج علماء کو چاہیے کہ وہ نواب صاحب کے اس علمی ذخیرے کو از سر نو عربی کو اردو میں مرتب کریں اور ایڈٹ کر کے شائع کر دیں یہ بہت بڑی علمی خدمت ہوگی۔

ان مذکورہ کتب کے مطالعہ سے حضرت نواب صاحب کی علمی استعداد، مطالعہ حدیث میں وسعت، ذہانت اور فقہی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔نواب صدیق حسن خاں نے ۱۸۹۰ء میں وفات پائی اور بھوپال میں آسودہ لحد ہوئے۔

❷......فتاویٰ نذیریہ

شیخ الکل حضرت مولانا میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کا شمار برصغیر پاک و ہند کے فحول علمائے کرام میں ہوتا ہے۔ حضرت میاں صاحب ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۲ء میں وفات پائی۔ ان کی صد سالہ زندگی کے لیل و نہار درس و تدریس وعظ و تذکیر اور تصنیف و تالیف سے عبارت ہیں۔ ان کے نامور تلامذہ میں مولانا محمد لکھوی، مولانا عبد اللہ غزنوی، مولانا غلام رسول قلعہ میاں سنگھ، مولانا عبد الرحمان مبارک پوری، مولانا شمس الحق دیانوی، مولانا عبد الوہاب محدث دہلوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا حافظ عبد المنان محدث وزیر آباد اور مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کے نام نمایاں ہیں۔

حضرت میاں صاحب درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف سے بھی شغف رکھتے تھے۔ فتویٰ نویسی میں بھی انھیں مہارت تامہ حاصل تھی۔ آپ فتویٰ بڑا مدلل اور جامع لکھتے اور قرآن وحدیث کے دلائل کی روشنی میں پوچھے گئے سوالات کا شافی جواب دیتے۔

''فتاویٰ نذیریہ'' حضرت میاں نذیر حسین رحمہ اللہ کے علمی فتاویٰ کا نہایت عمدہ مجموعہ ہے۔ جسے ان کے شاگرد رشید مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے مرتب کیا تھا اور اس کی پہلی اشاعت دہلی سے ہوئی جو دو جلدوں پر محیط تھی۔ اس کی دوسری اشاعت ۱۹۷۱ء میں لاہور سے ہوئی جو تین جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس کے صفحات کی تعداد ۱۹۳۵ ہے اور فتاویٰ کی تعداد ۹۴۳ ہے۔ میاں صاحب کے علاوہ اس فتاویٰ میں بعض دیگر مفتیان کرام کے فتاویٰ بھی شامل ہیں۔ عقائد، تقلید و اجتہاد، سنت و بدعت، طہارۃ و صلوٰۃ، صدقات و زکوٰۃ، نکاح و طلاق، قربانی و عقیقہ، حدود و تعزیرات، صید و ذبائح، روزہ و حج، حظر و اباحت اور بیوع وغیرہ پر تفصیلی جوابات اس فتاویٰ کی زینت ہیں۔

اہل حدیث اہل علم عام طور پر فتویٰ نویسی کے وقت فتاویٰ نذیریہ کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ اس میں اکثر فقہی مسائل مل جاتے ہیں، ان پر بحث بھی نسبتاً تفصیلی ہوتی ہے۔ فتاویٰ نذیریہ میں اس دور کے مذہبی، دینی، فکری اور علمی حالات کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی تکفیر کا سب سے پہلا فتویٰ میاں نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ نے جاری کیا تھا۔ اس کے علاوہ سرسید کے بعض افکار وخیالات پر تنقید، احناف اور اہل حدیث کے درمیان بحث ومباحثہ اور مختلف مذہبی فرقوں اور شخصیات پر تبصرہ بھی اس میں موجود ہے۔ فتاویٰ نذیریہ اپنے مندرجات کے اعتبار سے اہل علم میں خاصے کی چیز ہے اور اہل حدیث فتاویٰ میں اسے قدر ومنزلت کا مقام حاصل ہے۔

۳..... نور العین من فتاویٰ الشیخ حسین الیمنی

شیخ حسین بن محمد محسن یمانی رحمہ اللہ (وفات ۱۳۲۷ھ) اپنے دور کے مشہور اہل علم تھے۔

ان کا شمار شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کے معاصرین میں ہوتا ہے۔ الشیخ حسن یمنی نے نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ کے دور میں یمن سے ہجرت کر کے ریاست بھوپال میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور پھر بھوپال میں ہی علم و تحقیق اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے۔ شیخ نے اپنی زندگی میں بہت سے فتاویٰ جاری کیے۔ شیخ حسین بن محسن بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے، وہ کسی موضوع پر بحث کرتے وقت احادیث رسول ﷺ کی تحقیق تفصیل سے کرتے اور تمام ماخذ رجوع کر لینے کے بعد ہی کسی مسئلہ پر آخری رائے دیتے تھے۔ ان کے فتاویٰ اور فقہی رسائل کا مجموعہ ان کی وفات کے بعد ۲ جلدوں میں ''نور العین من فتاویٰ الشیخ حسین'' کے نام سے ان کے بیٹے شیخ محمد نے تیار کیا۔ اس کی پہلی جلد ۱۳۲۲ھ میں لکھنؤ سے شائع ہوئی جبکہ دوسری جلد کا کوئی پتا نہ چل سکا۔ اس فتاویٰ میں شیخ حسین نے ہر مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے اور پوری تحقیق کے بعد دلائل کی روشنی میں راجح مسلک کا تعین کیا ہے۔

۴ ...... فتاویٰ مولانا شمس الحق عظیم آبادی

مولانا شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ حضرت میاں نذیر حسین دہلوی کے نامور تلامذہ سے ایک تھے، جنھیں اللہ تعالیٰ نے علم و عمل کا حظ وافر عطا کیا تھا اور آپ متعدد اوصاف کے حامل تھے۔ ان کی ولادت ۱۸۵۷ء میں ہوئی اور وفات ۱۹۱۱ء انھوں نے عون المعبود شرح ابی داؤد اور دار قطنی کے شروح و حواشی کی صورت میں علم حدیث کی جو خدمت کی وہ پوری دنیا میں اسلامی تحقیقات سے دلچسپی رکھنے والوں کو فائدہ دے رہی ہے۔ مولانا عظیم آبادی کا کام لکھنا پڑھنا تھا۔ وہ صبح و شام درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے۔ وہ فتاویٰ نہایت مفصل اور جامع لکھتے تھے۔ ان کے فتاویٰ کا نہایت جاندار اور شاندار مجموعہ معروف محقق اور عالم دین مولانا غازی محمد عزیز صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس میں مولانا ڈیانوی کے ۵۰ فتاویٰ ہیں جو اردو، عربی اور فارسی پر مشتمل ہیں۔ ان کے اردو تراجم بھی

ساتھ دے دیے گئے ہیں۔

فتاویٰ کے شروع میں محمد عزیز صاحب کا ایک جامع مقدمہ ہے اس میں فتاویٰ کی تاریخ اور برصغیر میں اہل حدیث فتاویٰ کا تعارف کروایا گیا ہے۔ بیش نگاہ ''فتاویٰ شمس الحق ڈیانوی'' ۱۹۹۴ء میں جماعت غرباء اور اہل حدیث پاکستان کی علمی دانش گاہ جامعہ ستاریہ اسلامیہ گلشن اقبال کراچی کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔ اس کے صفحات کی تعداد ۴۶۶ ہے۔

۵ ...... فتاویٰ سعیدیہ

مولانا محمد سعید بنارسی رحمہ اللہ جماعت اہل حدیث کے عظیم المرتبت عالم دین تھے۔ انھوں نے مسلک اہل حدیث کی اشاعت کو اپنے اوپر فرض قرار دے لیا تھا۔ وہ ہندو مذہب سے تائب ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ قبولِ اسلام کے بعد انھوں نے اپنی دینی تعلیم مکمل کی اور اشاعت دین کے لیے سرگرم ہو گئے۔ بنارس میں انھوں نے ''سعید المطابع'' کے نام سے مطبع قائم کیا اور توحید و سنت کی تائید میں بہت سی کتابیں شائع کیں اور ساتھ ہی ''نصر السنہ'' کے نام سے اخبار بھی جاری کیا۔ اس کے علاوہ مولانا محمد سعید بنارس نے درس و تدریس کے لیے بنارس میں ''مدرسہ سعیدیہ'' قائم کیا، جس کسی نے اسلام اور مسلک اہل حدیث پر اعتراض کیا تو انھوں نے تحریری صورت میں نہایت محققانہ جواب دیا، مخالفین سے مناظرے اور مباحثے بھی کیے اور وعظ و خطابت کے ذریعے بھی انھوں نے دینی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے چھوٹے بڑے کئی رسائل بھی لکھے۔ ان کے فتاویٰ کا ایک مختصر مجموعہ جو کہ ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے ''فتاویٰ سعیدیہ'' کے نام سے چھپا اور یہ فتاویٰ متعدد اختلافی مسائل کے جوابات پر مشتمل ہے۔ مولانا محمد سعید بنارسی نے ۲۷ نومبر ۱۹۰۴ء کو وفات پائی۔

۶ ...... فتاویٰ مولانا عبداللہ غازی پوری

مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری رحمہ اللہ اتباع سنت، تقویٰ، زہد و ورع، تبحر علم، وسعت

نظر اور قرآن وسنت کی تفسیر وتعبیر میں یگانۂ عہد تھے۔ تحصیل علم کے بعد انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ درس وتدریس، وعظ وتقریر اور تصنیف تالیف میں گزارا۔ ابراء اہل الحدیث والقرآن، مقدمہ صحیح مسلم، تسہیل الفرائض، منطق، فصول احمدی، النحو، مسئلہ زکوۃ اور ایک رسالہ رکعات تراویح ان کی علمی وقلمی یادگاریں ہیں۔ فراوانی علم اور کثرت درس وافادہ کے ساتھ ساتھ مولانا غازی پوری فقاہت میں بھی اونچا مقام رکھتے تھے۔ لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے اکثر ان کی طرف رجوع کرتے۔ مولانا کا مجموعہ فتاویٰ کے دو قلمی نسخے بنارس اور مبارک پور میں موجود ہیں۔ دوسرے نسخے میں فتاویٰ کی ترتیب وتبویب کا کام مولانا عبدالرحمان مبارک پوری (وفات ۱۳۵۳ھ) نے کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس علمی مجموعے کو ایڈٹ کر کے شائع کیا جائے۔ (خدمات اہل حدیث نمبر ص ۲۸۷)

مولانا عبداللہ غازی پوری نے ۲۶ نومبر ۱۹۱۸ء کو وفات پائی۔

۷...... فتاویٰ غزنویہ

حضرت مولانا امام عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ عمل بالکتاب والسنہ کے بہت بڑے داعی اور مبلغ تھے۔ انھوں نے اپنے علم وعمل اور تعلیم وتربیت سے ہزاروں لوگوں کے عقائد کی اصلاح کی اور انھیں توحید وسنت کی تعلیم سے آشنا کیا۔ وہ اپنے والد مکرم مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے صحیح معنوں میں جانشیں اور ان کی مسند کے امین و پاسبان تھے۔ حضرت امام عبدالجبار غزنوی نے درس وتدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے طور پر بھی کئی تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔ فتویٰ نویسی میں بھی انھیں یدطولیٰ حاصل تھا۔ "بستان المحققین بشارۃ السائلین" (معروف بہ مجموعہ الفتاویٰ، ملقب بہ العروۃ الوثقی) فتاویٰ کے مشہور مجموعوں میں سے ایک ہے۔ یہ "فتاویٰ غزنویہ" کے نام سے معروف ہے۔ اس کی پہلی جلد امرتسر سے شائع ہوئی تھی جو ۲۵۶ صفحات پر محیط ہے۔ پاکستان میں فتاویٰ غزنویہ کی ازسرنو ترتیب و تبویب اور تسہیل کا کام شیخ الحدیث مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی رحمہ اللہ نے شروع کیا تھا اس کی

تفصیل معلوم نہیں ہو سکی کہ یہ کام کہاں تک پہنچا۔ اس مجموعہ میں عربی، فارسی اور اردو میں فتاویٰ ہیں۔ عقائد سے متعلق سوالات کے جوابات خالص سلفی نقطۂ نظر سے اور بڑی تفصیل کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ صفاتِ الٰہی کے باب میں خاص طور پر غزنوی علماء نے مسلک سلف کو بڑے مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ فروعی مسائل میں بھی وہ ہمیشہ عمل بالکتاب والسنہ کے داعی رہے۔ ان تمام خصوصیات کا اندازہ فتاویٰ کے اس مجموعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

امام عبدالجبار غزنوی ۱۲۶۸ھ میں پیدا ہوئے اور انھوں نے ۱۳۳۱ھ کو وفات پائی۔

۸...... فتاویٰ ثنائیہ

شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ برصغیر پاک و ہند جامع الصفات علمی شخصیت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے پناہ خوبیوں اور محاسن سے نواز رکھا تھا۔ وہ دین کے داعی بھی تھے اور مفسر قرآن بھی، متکلم بھی تھے اور مصنف بھی، مناظر بھی تھے اور صحافی بھی، ان کی اسلامی اور مسلکی خدمات کا دائرہ اس خطہ ارض میں دور دور تک پھیلا دکھائی دیتا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں انھوں نے اسلام کے دفاع اور محافظت کے لیے مختلف مذاہب کے خلاف اپنی تمام قوتیں صرف کردیں۔ وہ نہایت ذہین اور حاضر جواب عالم دین تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو تفقہ فی الدین کا حظ وافر عطا کیا تھا۔ فقہ اور فقہی مسائل میں ان کو بڑا ادراک حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے اخبار ''اہل حدیث'' میں فقہ و فتاویٰ کے لیے مستقل صفحات مختص کر رکھے تھے۔ پورے برصغیر سے جہاں جہاں اردو زبان پڑھی اور بولی جاتی تھی لوگ دینی مسائل کے حل کے لیے انھیں خطوط لکھتے اور مولانا ثناء اللہ صاحب باقاعدہ فتویٰ جاری کرتے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کے اخبار اہل حدیث میں شائع ہونے والے چوالیس سالہ فتاویٰ کا انتخاب ہندوستان کے معروف عالم دین مولانا محمد داؤد راز دہلوی رحمہ اللہ نے (وفات دسمبر ۱۹۸۱ء) نے محنت شاقہ سے مرتب کرکے ''فتاویٰ ثنائیہ'' کے نام سے دو جلدوں

میں۱۹۵۴ء میں پہلی بار شائع کیا تھا۔ پہلی جلد کے صفحات ۸۰۸ اور دوسری جلد کے صفحات ۷۹۶ ہیں۔ فتاویٰ ثنائیہ میں انسانی زندگی میں پیش آمدہ مسائل کو قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کا جواب مختصر اور جامع ہوتا تھا۔ وہ اختصار کے ساتھ مسئلے کی جزئیات تک بیان کر جاتے تھے۔ ان کے فتاویٰ پر مولانا شرف الدین دہلوی رحمہ اللہ (وفات ۱۹۶۱) نے بڑے مفید حواشی سپرد قلم کیے ہیں۔ جس سے ان فتاویٰ کی اہمیت و افادیت اور بھی دو چند ہوگئی ہے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری جون ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو سرگودھا میں وفات پائی۔

۹ ...... فتاویٰ اہل حدیث

حضرت العلام حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ اپنے دور کے اونچے مقام و مرتبہ کے حامل عالم دین تھے۔ دینی علوم وفنون میں انھیں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے اطراف سے آگاہی رکھتے تھے۔ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے شیداو والا تھے۔ مسلک اہل حدیث کے بہت بڑے مبلغ اور داعی تھے، اسی مشن میں انھوں نے عمر بسر کردی۔ فتویٰ نویسی میں بھی انھیں کامل دسترس تھی۔ فتویٰ بڑا مدلل لکھتے تھے اور اس میں قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ مسلک سلف کی پوری پوری ترجمانی کرتے۔ حافظ عبداللہ روپڑی کے فتاویٰ دو جلدوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث روپڑ اور لاہور میں شائع ہونے والے فتاویٰ اور دیگر غیر مطبوعہ فتاویٰ شامل ہیں۔ اس فتاویٰ کے آخر میں محدث روپڑی کے کچھ عربی فتاویٰ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

فتاویٰ اہل حدیث میں بہت سے مسائل کا جامعیت سے احاطہ کیا گیا ہے اور اپنے موقف کی تائید میں روپڑی صاحب نے خوب دلائل پیش کیے ہیں۔ عصر حاضر کے اکثر علم اور مفتیان کرام فتاویٰ اہل حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ فتاویٰ اہل حدیث کو مولانا عبداللہ روپڑی صاحب کے شاگرد رشید مولانا محمد صدیق آف سرگودھا نے مرتب کرکے اپنے

ادارہ احیاء السنۃ النبویہ سرگودھا کی طرف سے شائع کیا تھا۔ مولانا حافظ عبد اللہ روپڑی نے ۸۰ سال کی عمر میں ۲۰ اگست ۱۹۶۴ء کو لاہور میں وفات پائی۔

⑩ ...... فتاویٰ ستاریہ

حضرت مولانا حافظ عبد الستار محدث دہلوی رحمہ اللہ (امام جماعت غرباء اہل حدیث) جماعت اہل حدیث کے نامور عالم دین تھے۔ ان کی نس نس میں سنت رسول ﷺ کی محبت اور دین اسلام کی اشاعت کا جذبہ صادقہ پایا جاتا تھا۔ انھوں نے دین اسلام کی اشاعت اور مسلک اہل حدیث کے فروغ میں درس و تدریس، وعظ و خطابت، تصنیف و تراجم اور مناظروں کے ذریعے خدمات انجام دی۔ آپ دینی علوم کے ماہر، قرآن و حدیث کے داعی اور مبلغ تھے۔ ان کا دائرہ علم و عمل توحید و سنت کی بھرپور اشاعت تھا۔ فتویٰ بڑا مدلل لکھتے اور پوری طرح مسائل کا احاطہ کرتے۔ ''فتاویٰ ستاریہ'' ان کی تحقیق کا بے مثال مجموعہ ہے جو بہت سے روزمرہ کے مسائل پر مشتمل ہے۔ اس کی ضخامت آٹھ سو آٹھ (۸۰۸) صفحات، سات سو (۷۰۰) فتاویٰ اور چار جلدوں پر محیط ہے۔ اس فتاویٰ کو امام عبد الستار محدث دہلوی کے صاحبزادے جماعت غرباء اہل حدیث کے سابق امام و مفتی حضرت مولانا امام عبد الغفار سلفی (وفات ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۷ء) نے مرتب کیا تھا۔ اس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق متفرق فتاویٰ موجود ہیں۔ فتاویٰ کی تقسیم مضامین کے اعتبار سے نہیں کی گئی، بلکہ ہر جلد میں بلاترتیب فتاویٰ شامل ہیں۔ اکثر فتاویٰ کا تعلق عمومی نوعیت کے شخصی مسائل سے ہے۔ اعتقادات اور فروعی اختلاف سے متعلق مسائل مفصل اور مدلل ہیں۔ فتاویٰ ستاریہ میں امام عبد الستار دہلوی کے علاوہ ان کے صاحبزادے مولانا عبد الغفار سلفی اور بعض دیگر مفتیان کرام کے فتاویٰ بھی شامل ہیں۔ ایک عرصے سے یہ فتاویٰ نایاب ہیں۔ اب اسے نئی ترتیب و تہذیب اور ابواب بندی سے کمپیوٹر کمپوزنگ کے ساتھ مکتبہ ایوبیہ (محمدی مسجد برنس روڈ کراچی نمبرا) کی طرف سے شائع کیا جارہا ہے اور اس کا اہتمام مولانا عبد الجبار سلفی مدیر صحیفہ اہل

حدیث کراچی اور ان کے صاحبزادے جناب عبید اللہ سلفی (منتظم مکتبہ ایوبیہ) کر رہے ہیں۔

امام عبدالستار دہلوی رحمہ اللہ ۱۹۰۵ء میں امام عبدالوہاب محدث دہلوی رحمہ اللہ کے گھر دہلی میں پیدا ہوئے اور انھوں نے ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء کو کراچی میں وفات پائی۔

⑪ ...... فتاویٰ سلفیہ

حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ اپنے عہد کے جلیل القدر اہل حدیث عالم دین تھے۔ ان کی تعلیمی و تدریسی اور تبلیغی مساعی کے اثرات آج بھی گوجرانوالہ اور اس کے اطراف میں پائے جاتے ہیں۔ مسائل کی تحقیق میں حضرت سلفی صاحب کا اپنا ہی انداز تھا۔ انھوں نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و تائید میں بیسیوں مضامین و مقالات تحریر فرمائے۔ اہل حدیث جماعت کے وہ بہت بڑے وکیل اور داعی تھے۔ جس موضوع پر بھی خامہ فرسائی کرتے تو تحقیق کا حق ادا کردیتے۔ فتاویٰ سلفیہ ان کے ان فتاویٰ جات پر مشتمل ہے جو ہفت روزہ الاعتصام لاہور کے متعدد شماروں میں شائع ہوئے تھے اور بعد میں ان کو مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کردیا گیا۔ فتاویٰ سلفیہ میں بعض اختلافی اور حساس مسائل کے بارے میں حضرت سلفی صاحب نے اہل حدیث کی نہایت جاندار اور ٹھوس ترجمانی کی ہے۔ فتاویٰ بڑے مدلل، محقق اور مفصل ہیں۔ یہ مجموعہ فتاویٰ پہلی بار ۱۹۷۸ء میں اسلامک پبلشنگ ہاؤس لاہور کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ ۱۸۹۷ء کو پیدا ہوئے اور ۲۰ فروری ۱۹۶۸ء کو وفات پائی۔

⑫ ...... اسلامی فتاویٰ

مولانا عبدالسلام بستوی رحمہ اللہ کئی علمی و تحقیقی کتابوں کے مصنف اور مترجم تھے۔ اسلامی تعلیم اور اسلامی خطبات ان میں زیادہ معروف ہیں۔ ''اسلامی فتاویٰ'' سوال و جواب کی صورت میں ان کا بلند پایہ علمی و تحقیقی ذخیرہ ہے۔ اس فتاویٰ میں جواب بڑے مفصل لکھے گئے

ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ذہنی تسلی وتشفی کے ساتھ ساتھ بے پناہ علمی وتحقیقی فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ فتاویٰ کے شروع میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی شہرہ آفاق کتاب ''اعلام الموقعین'' سے آداب فتویٰ کی بحث کو اردو ترجمہ کر کے شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ اسلامی فتاویٰ کو کتب خانہ سعودیہ اردو بازار دہلی کی طرف سے شائع کیا گیا۔ مولانا عبدالسلام بستوی رحمہ اللہ نے ۱۹۷۴ء میں بھارت کے شہر دہلی میں وفات پائی۔

۱۳...... فتاویٰ احکام ومسائل

حضرت مولانا حافظ عبدالمنان نور پوری رحمہ اللہ جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ کے شیخ الحدیث تھے۔ تقویٰ وصالحیت اور علم وعمل میں نیک نام تھے۔ لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے اکثر ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور ملک کے طول وعرض سے ان کی خدمت خطوط لکھ کر فتویٰ طلب کرتے تھے۔ حافظ صاحب ہر سائل کو کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیتے تھے۔ اس طرح انھوں نے اب تک لوگوں کے سینکڑوں سوالات کے جواب دیے جو ''احکام ومسائل'' کے نام سے دو جلدوں پر مشتمل ہیں۔ ان فتاویٰ میں عقائد وایمانیات سے لے کر ہر قسم کے مسائل خوب صورت پیرائے میں درج ہیں۔ احکام ومسائل کی پہلی جلد ۶۳۲ صفحات اور دوسری جلد ۸۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان جلدوں میں ۱۹۸۵ء سے ۲۰۰۴ء تک کے خطوط کے جواب دیے گئے ہیں۔ حافظ عبدالمنان صاحب کے فتاویٰ کی جمع وترتیب کا کام جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ کے فاضل استاذ مولانا محمد مالک صاحب نے انجام دیا ہے اور ان فتاویٰ کو ''المکتبہ الکریمیہ'' ۶ عظیم منشن نذر لکشمی چوک رائل پارک لاہور کی طرف سے نہایت خوبصورت انداز میں شائع کیا گیا ہے۔

۱۴...... فتاویٰ علمائے اہل حدیث

ابوالحسنات مولانا علی محمد سعیدی رحمہ اللہ ایک درویش منش عالم دین تھے۔ وہ اپنے اخلاق و

کردار، علم و عمل، انکسار و تواضع اور سادگی کے باعث مرجع خلائق اور اسلاف کی یادگار تھے۔ ان کے علمی و عملی کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ ''فتاویٰ علمائے اہل حدیث'' کی ترتیب و تدوین ہے۔ انھوں نے علمائے اہل حدیث کے فتاویٰ کو رسائل و جرائد، مطبوعہ و غیر مطبوعہ مسودات سے جمع کرنا شروع کیا اور ان فتاویٰ کے چودہ حصے مرتب کر کے انھیں اپنی زندگی میں ہی ۹ جلدوں میں شائع کر دیا تھا۔ ان کی زندگی وفا کرتی تو فتاویٰ علمائے اہل حدیث شاہکار تصور ہوتا۔ فتاویٰ علمائے اہل حدیث میں کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجنائز، کتاب الحج، کتاب الصوم، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الایمان، کتاب الاعتصام بالسنہ والاجتناب عن البدعہ، کتاب العلم، کتاب الضحایا والعقیقہ اور کتاب البیوع پر علمائے اہل حدیث کے مفصل فتاویٰ درج ہیں۔ جو مولانا علی محمد سعیدی صاحب کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس فتاویٰ کی پہلی جلد ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی اور نویں جلد ۱۹۸۷ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ مولانا علی محمد سعیدی نے ۶ جولائی ۱۹۸۷ء کو خانیوال میں وفات پائی۔

⑮...... فتاویٰ رفیقہ

مولانا محمد رفیق پسروری رحمہ اللہ جماعت اہل حدیث کے غیور عالم دین تھے۔ ان کی فکر و عمل کا دائرہ عمل بالحدیث کا فروغ اور مسلک اہل حدیث کی اشاعت تھا۔ انھوں نے مسلک اہل حدیث کی تائید میں کئی علمی و تحقیقی کتب تصنیف کیں اور مخالفین کے اعتراضات کے قرآن وحدیث کی روشنی میں مسکت جواب دے کر نیک نام ہوئے۔ مولانا محمد رفیق خاں پسروری کے فتاویٰ چار الگ الگ حصوں پر مشتمل ہیں۔ جو انھوں نے اپنے قائم کردہ مکتبہ اہل حدیث پسرور کی طرف سے شائع کیے تھے۔ ان فتاویٰ میں توحید و سنت کا اثبات، شرک و بدعت کی تردید اور غیر شرعی رسوم و عوائد کی کھل کر نکیر کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر بھی بہت سے مسائل پر فتاویٰ موجود ہیں۔ مولانا چونکہ مناظرانہ ذہن کے حامل تھے اس لیے ان کے فتاویٰ میں بھی مناظرانہ رنگ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس فتاویٰ میں اہل حدیث کے امتیازی مسائل

پر بھی بڑے تحقیقی و تفصیلی فتاویٰ موجود ہیں جو اہل علم کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔ بہر حال فتاویٰ رفیقیہ اپنے مشمولات کے اعتبار سے اپنے دامن میں ندرت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔

مولانا محمد رفیق خاں پسروری نے ۲۲ فروری ۱۹۷۸ء کو پسرور میں وفات پائی۔

⑯ ...... فتاویٰ برکاتیہ

شیخ الحدیث حضرت مولانا ابوالبرکات احمد مدراسی رحمہ اللہ رسوخ علم کے اعتبار سے گوجرانوالہ میں ہی نہیں بلکہ انھیں پورے پاکستان میں قدر و منزلت کا مقام حاصل تھا۔ انھوں نے جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ کی مسند پر بیٹھ کر لوگوں کو قرآن و حدیث کا درس دیا اور دارالافتاء کے منصب پر متمکن ہوکر ہزاروں لوگوں کے مسائل کی عقدہ کشائی کی۔ مولانا ابوالبرکات مرحوم کا خاصہ تھا کہ وہ سائل کو کسی بھی حال میں بغیر فتویٰ کے واپس جانے نہیں دیتے تھے۔ فتاویٰ برکاتیہ ان کے انھی فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو ۳۵۸ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ بعض فتاویٰ پر ان کے شیخ حضرت العلوم حافظ محمد محدث گوندلوی رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر محقق کی تصدیق اور دستخط ثبت ہیں۔ اس سے ان فتاویٰ کی علمی وقعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مولانا ابوالبرکات احمد نے ۱۶ جولائی ۱۹۹۱ء کو گوجرانوالہ میں وفات پائی۔

⑰ ...... فتاویٰ اصحاب الحدیث

حضرت مولانا حافظ عبدالستار الحماد حفظہ اللہ جماعت اہل حدیث کے جلیل القدر اور نامور عالم دین ہیں۔ انھوں نے درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تراجم اور فتویٰ نویسی میں وہ کارنامے انجام دیے ہیں کہ ان کی انھی خدمات کے باعث انھیں جماعت اہل حدیث کی طرف سے ''مفتی پاکستان'' کا خطاب دیا گیا ہے۔ ان کے علمی کارناموں میں صحیح بخاری شریف کی جامع شرح اور اردو ترجمہ نمایاں ہے جو کئی جلدوں پر محیط ہے۔ مولانا حافظ عبدالستار الحماد کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے تفقہ فی الدین اور علم حدیث سے خوب نوازا ہے۔

حافظ صاحب فتویٰ بڑا جچا تلا، متوازن اور قرآن و حدیث کے دلائل کی روشنی میں لکھتے ہیں۔ ان کے قلم کی زبان بڑی صاف اور سمجھانے کا انداز بہت عمدہ ہے۔ وہ جس اسلوب سے فتویٰ لکھتے ہیں اسے پڑھ کر ہر بات قاری پر واضح ہوجاتی ہے۔ حافظ عبدالستار صاحب مارچ ۲۰۰۱ء سے ہفت روزہ اہل حدیث لاہور میں مستقل فتویٰ نویسی کر رہے ہیں۔ ان کے ''فتاویٰ اصحاب الحدیث'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ پہلی جلد ۵۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں توحید وعقیدہ، رسالت و ولایت، طہارت و وضو، اذان ونماز، جنائز زیارت قبور، زکوٰۃ وصدقات، حج وعمرہ، روزہ واعتکاف، خرید وفروخت، وصیت و وراثت، نکاح و طلاق، جمعہ وعیدین، آداب واخلاق اور کچھ متفرقات فتاویٰ موجود ہیں۔ اس فتاویٰ کی دوسری جلد ۵۰۳ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس میں بھی مذکورہ عنوانات پر فتاویٰ رقم ہیں۔

فتاویٰ اصحاب الحدیث کی ترتیب اور ابواب بندی بھی بہت عمدہ ہے۔ طباعت کے سلسلے میں دور حاضر کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ خوب صورت کمپیوٹرائزاڈ کمپوزنگ، عمدہ سفید کاغذ، مضبوط جلد بندی اور جاذب نظر ٹائٹل نے اس فتاویٰ کی ظاہری ومعنوی خوبیوں کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس فتاویٰ کو ہمارے عزیز دوست مولانا محمد سرور عاصم صاحب نے اپنے اشاعتی ادارے مکتبہ اسلامیہ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع کیا ہے۔ بلاشبہ شائقین علم وعمل کے لیے یہ فتاویٰ خاصے کی چیز ہے۔

۱۸...... فتاویٰ محمدیہ

حضرت مولانا مفتی عبیداللہ خاں عفیف ایک عالم و فاضل شخصیت ہیں۔ ان کا شمار عصر رواں کے بلند پایہ مفتیان کرام میں ہوتا ہے۔ علم وتحقیق کے اعتبار سے وہ اعلیٰ پائے کے محقق اور مصنف ہیں۔ مسائل کی تحقیق میں انھیں کمال حاصل ہے۔ مفتی عبیداللہ صاحب کے فتاویٰ اہل حدیث رسائل میں عرصہ سے شائع ہو رہے ہیں۔ وہ ہر سوال کا تفصیل سے جواب لکھتے ہیں۔ ان کی فتویٰ نویسی کی خوبیوں کی تعریف حافظ محمد گوندلوی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی،

مولانا ابوحفص عثمانی اور مولانا ابوالبرکات احمد مرحوم بھی کیا کرتے تھے۔مولانا مفتی عبیداللہ عفیف کے چالیس سالہ فتاویٰ کا مجموعہ ”فتاویٰ محمدیہ“ کے نام سے ۲۰۱۱ء میں مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔ اس کے صفحات کی تعداد ۸۷۸ ہے۔ شروع میں مفسر قرآن حافظ صلاح الدین یوسف کا حرفے چند، مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کے قلم سے مفتی صاحب کا تعارف، مولانا مبشر احمد ربانی کی طرف سے فتویٰ نویسی کی تاریخ اور خود مفتی صاحب کی طرف سے لکھا گیا مقدمہ اور اپنے بزرگوں کے حالات ہیں۔ اس کے بعد کتاب العقائد سے فتاویٰ کا آغاز ہوتا ہے اور پھر اس میں مختلف نوعیت کے مسائل پر سیکڑوں فتاویٰ جات قاری کی رہنمائی میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ فتاویٰ محمدیہ دورِ حاضر میں ایک علمی و تحقیقی دستاویز ہے۔

⑲ ...... فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ

شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ کے فتاویٰ ایک طویل عرصے سے ہفت روزہ الاعتصام لاہور اور ماہنامہ محدث لاہور میں اشاعت پذیر ہو رہے ہیں۔ حافظ صاحب فتویٰ نویسی میں بڑے ماہر و مشتاق ہیں۔ ان کے فتاویٰ علمی و تحقیقی ہوتے ہیں اور وہ بڑی محنت سے فتویٰ مرتب کرتے ہیں۔ ان کے فتاویٰ کی پہلی جلد کتاب العقائد کے عنوان سے ۸۸۶ صفحات پر محیط ہے جو شائع ہو چکی ہے اور باقی فتاویٰ کی ترتیب و تہذیب اور تخریج کا کام جاری ہے۔ حافظ ثناء اللہ صاحب کے فتاویٰ جدید و قدیم مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان فتاویٰ کی جمع و ترتیب اور تبویب کا کام حافظ عبدالشکور مدنی بن حافظ علم الدین نے انجام دیا ہے۔ فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ کی جلد اوّل دارالارشاد B/214 سبزہ زار سکیم لاہور کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔

⑳ ...... فتاویٰ علمیہ المعروف توضیح الکلام

حضرت مولانا حافظ زبیر علی زئی حفظہ اللہ عصر رواں کے معروف عالم دین، محقق اور مصنف ہیں۔ انھیں سنتِ رسول ﷺ سے والہانہ لگاؤ اور حدیث رسول ﷺ سے حد

درجے شغف ہے۔ ان کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کا محور صحیح اسلامی تعلیم کا پرچار، احادیث رسول ﷺ کی تحقیق و دفاع اور مسلک اہل حدیث پر اغیار کے اعتراضات کے جواب دینا ہے۔ اپنے اس مشن میں مولانا خاصے سرگرم اور متحرک دکھائی دیتے ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے مسلک اہل حدیث کے دفاع اور حدیث رسول ﷺ کی نصرت و تائید میں قابل تحسین کام کیا ہے۔ مولانا زبیر علی زئی صاحب کا مطالعہ وسعت پذیر ہے۔ رجال حدیث کے بارے میں ان کی معلومات قابل رشک اور وہ اس فن کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہیں۔ بلاشبہ وہ دور حاضر کے عظیم محقق اور محدث ہیں۔ ان کے علمی و تحقیقی کارناموں میں ان کا تحریر فرمودہ ''فتاویٰ علمیہ المعروف توضیح الکلام'' خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ وہ فتاویٰ ہیں جو محترم زبیر صاحب نے مختلف ادوار میں ماہنامہ شہادت اسلام آباد، ماہنامہ الحدیث حضرو اور دیگر جماعتی رسائل میں لکھے تھے۔ اس فتاویٰ کی پہلی جلد ۶۹۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں کتاب العقائد (توحید و سنت کے مسائل) طہارت کے مسائل، مساجد کا بیان، نماز کے مسائل، جمعہ کا بیان، عیدین کا بیان، دعا و اذکار اور فضائل کا بیان، کتاب الجنائز، اصول، تخریج اور تحقیق روایات اور متفرق مسائل پر فتاویٰ درج ہیں۔ دوسری جلد ۵۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس جلد میں توحید و سنت کے مسائل، نماز، روزہ، اعتکاف، عشر و زکوٰۃ، حج و عمرہ، قربانی و عقیقہ، نکاح، طلاق، رضاعت، فضائل و مناقب، قرآن کے مسائل، اصول، ضوابط و تذکرہ الراوی اور دیگر متفرق مسائل پر داد تحقیق دی گئی ہے اور صحیح معنوں میں فتویٰ نویسی کا حق ادا کیا ہے۔ ہر فتوے میں قرآن و سنت کی نصوص کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور اسی اساس پر فتویٰ صادر کیا گیا ہے۔ ''فتاویٰ علمیہ'' عام عوام کے ساتھ ساتھ طبقہ علماء کے لیے بھی مفید اور خاصے کی چیز ہے۔ مکتبہ اسلامیہ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور کی طرف سے اسے شائع کیا گیا ہے۔ مکتبہ اسلامیہ کے مدیر مولانا محمد سرور عاصم حفظہ اللہ نے دور حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق اس فتاویٰ کی طباعت کروائی ہے اور اسے خوب صورت انداز میں قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ اب تک اس فتاویٰ کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس فتاویٰ کی اشاعت مارچ

۲۰۱۰ء میں کی گئی تھی۔

۲۱ ...... فتاویٰ صراط مستقیم

علامہ محمود احمد میر پوری رحمہ اللہ سرزمین پاکستان سے تعلق رکھنے والے نامور عالم دین تھے۔ انھوں نے جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ سے درس نظامی کی تعلیم مکمل کی اور پھر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سعودی عرب سے سند فراغت حاصل کی۔ ان کی قابلیت اور دینی استعداد کے باعث حکومت سعودیہ نے ان کو برطانیہ میں مبعوث کر دیا۔ آپ نے یورپ کے صنم کدہ ظلمت میں توحید وسنت کا خوب پرچار کیا۔ ان کے کارناموں میں وہاں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی تشکیل اور ماہنامہ صراط مستقیم کا اجراء تھا۔ علامہ میر پوری نے یورپ کی فضاؤں میں پروان چڑھنے والی مسلمانوں کی نئی نسل کی تعلیم وتربیت اور غیر مسلموں کو راہِ ہدایت پر لانے کے لیے ایک انگریزی ماہنامہ "دی اسٹریٹ پاتھ" جاری کیا اور آپ ان دونوں رسالوں کے مدیر مسئول تھے۔ مولانا میر پوری وسیع النظر عالم تھے اور حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ یورپ کے حالات، وہاں کی تہذیب وثقافت اور ضروریات سے خوب آگاہ تھے۔ انھوں نے اپنے مجلّے ماہنامہ "صراط مستقیم" میں سوال وجواب کے انداز میں روزانہ پیش آنے والے فقہی مسائل کے لیے بھی صفحات مخصوص کر رکھے تھے۔ لوگ ان سے حالات کے مطابق جو سوالات پوچھتے تھے، ان کا وہ قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیل سے جواب دیتے تھے۔ مولانا میر پوری مرحوم کے یہ فتاویٰ ان کی وفات کے بعد "فتاویٰ صراط مستقیم" کے نام سے شائع ہوئے اور انھیں ان کے دوست اور یورپ میں خاص دست راست مولانا ثناء اللہ سیالکوٹی حفظہ اللہ نے مرتب کیا۔ "فتاویٰ صراط مستقیم" کے صفحات کی تعداد ۵۷۰ ہے اور یہ متعدد بار مکتبہ قدوسیہ رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ اس فتاویٰ میں شامل مسائل کے چند بڑے بڑے عنوان یہ ہیں۔ عمل، ایمان اور عقائد، قبولیت عمل کی شرائط، دعا میں واسطے یا وسیلے کی شرعی حیثیت، رسالت، مسائل وضو، جرابوں پر مسح، تیمم کا بیان،

احکام مسجد، نماز کے مسائل، جمعہ کے مسائل، صلوٰۃ جنازہ، ایصال ثواب کی بدعات، احکام رمضان، مسائل عیدین، قرآن حکیم سے متعلق مسائل، مسائل زکوٰۃ، مسائل حج، جہاد، احکام طلاق، مسنون کام، بدعت کے مختلف روپ، عورتوں کے متفرق مسائل، حرام اشیاء، گانا بجانا، سود کی حرمت، مختلف فرقے، جدید مسائل، متفرق مسائل، فتاویٰ صراط مستقیم، جہاں یورپ کے لوگوں کو راہنمائی دیتا ہے وہیں دوسرے لوگوں کے لیے بھی بڑا مفید ہے۔ اسلوب بھی بہت عمدہ ہے اور قلم کی زبان بھی صاف ہے۔ مولانا محمود میر پوری نے بیالیس سال کی عمر میں ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ایک ٹریفک حادثے میں لندن میں وفات پائی۔

۲۲...... فتاویٰ دین الخالص

فضیلۃ الشیخ ابو محمد امین اللہ پشاوری حفظہ اللہ سلفی فکر رکھنے والے جید عالم دین ہیں۔ وہ ایک طویل عرصے سے مدرسہ تعلیم القرآن والسنہ مسجد حمزہ (رضی اللہ عنہ) پشاور میں درس و تدریس کی مسند سجائے ہوئے ہیں۔ ان کا لکھنے پڑھنے کا ذوق بہت عمدہ ہے۔ انھوں نے ۱۰ جلدوں پر مشتمل فتاویٰ ''الدین الخالص'' عربی زبان میں مرتب کیا اور یہ شائع شدہ ہے۔ اس فتاویٰ میں شیخ امین اللہ صاحب نے احکام کے ساتھ ساتھ عقیدہ، توحید، سنت، حدیث، تفسیر، معرفۃ فرق اور اہم جدید و نادر مسائل پر تفصیلی فتوے لکھے ہیں اور کوشش کی ہے کہ ان تمام مسائل کو وضاحت سے بیان کر دیا جائے جن مسائل کی ایک مسلمان کو ضرورت پڑتی ہے۔ اس ضخیم فتاویٰ کی جلد اوّل کا اردو ترجمہ مولانا عبدالقیوم کے رواں قلم سے ہو چکا اور اسے مکتبہ محمدیہ منگل مارکیٹ پشاور نے شائع بھی کر دیا ہے۔ جلد اوّل کا اردو ترجمہ کتاب العقائد اور کتاب الطہارہ کے مسائل پر مشتمل ہے اور ۴۵۲ صفحات پر محیط ہے۔

۲۳...... فتاویٰ مولانا عبدالقادر عارفی حصاروی

حضرت مولانا عبدالقادر عارف حصاروی رحمہ اللہ اپنے علم اور تحقیق کے اعتبار سے اونچے

مقام ومرتبے کے حامل عالم دین تھے۔انھوں نے مختلف دینی موضوعات پر بہت کچھ لکھا۔ان کے مقالات وفتاویٰ بڑے مفصل اور تحقیقی ہوتے تھے اور کئی کئی اقسام پر مشتمل۔اہل حدیث رسائل و جرائد حضرت حصاری کے فتاویٰ اور مقالات سے بھرے پڑے ہیں۔اللہ تعالیٰ اجر عظیم دے ہماری جماعت کے بزرگ عالم دین بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد یوسف راجووالوی حفظہ اللہ کو کہ انھوں نے کامل توجہ سے خطیر رقم خرچ کر کے مولانا محمد ابراہیم خلیل حفظہ اللہ (حجرہ شاہ مقیم ضلع اوکاڑہ) سے مولانا حصاری کا فتاویٰ مرتب کروایا۔مقالات وفتاویٰ کا یہ مجموعہ دس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔پروفیسر عبیدالرحمان محسن حفظہ اللہ (دارالحدیث جامعہ کمالیہ راجووال ضلع اوکاڑہ) کی طرف سے فراہم کردہ معلومات کے مطابق مولانا محمد یوسف صاحب نے مولانا حصاروی کے نواسے ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر صاحب کی خواہش پر اس فتاویٰ کی تمام جلدیں ڈاکٹر صاحب کو برائے اشاعت لوجہ اللہ دے دی ہیں۔اب یہ ڈاکٹر صاحب پر منحصر ہے کہ وہ کب ان فتاویٰ کی اشاعت کا اہتمام کرتے ہیں۔مولانا حصاروی رحمہ اللہ کے فتاویٰ شائع ہوجائیں تو ایک شاہکار ہوگا۔مولانا عبدالقادر عارف حصاروی نے ۱۹ ستمبر ۱۹۸۱ء کو وفات پائی۔

۲۴......آپ کے مسائل اور ان کا حل

ابوالحسن مولانا مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ جماعت اہل حدیث کے معروف محقق، مصنف اور مناظر ہیں۔صبح وشام پڑھنا اور لکھنا اور مسائل کی تحقیق ہی ان کا من پسند مشغلہ ہے۔فتویٰ نویسی میں ربانی صاحب بڑے مشتاق ہیں۔اس میدان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو بڑی صلاحیتوں سے نواز رکھا ہے۔۱۹۹۲ء میں انھوں نے مجلّہ الدعوہ لاہور میں قارئین کے سوالات کے جواب لکھنے شروع کیے۔ جسے جماعتی حلقوں میں از حد پسند کیا گیا اور ربانی صاحب کا یہ کالم قارئین کی نظر میں شہرت دوام حاصل کرگیا۔اب تک ربانی صاحب قارئین کے سیکڑوں مسائل پر فتوے جاری کرچکے ہیں اور ان کے فتاویٰ کا مجموعہ ''آپ کے مسائل اور اُن کا حل''

کے نام سے تین ضخیم جلدوں میں شائع شدہ ہے۔اس فتاویٰ کی فقہی ترتیب بہت عمدہ ہے۔ عبادات، معاملات، اخلاقیات، عقائد، توحید و رسالت، سنت و بدعت اور دین و دنیوی سلسلے کے مسائل پر بڑے شاندار اور جاندار فتوے لکھے گئے ہیں اور بڑے خوب صورت پیرائے میں سائل کی رہنمائی کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اہل حدیث فتاویٰ جات میں مبشر ربانی صاحب کے اس فتاویٰ کو بڑی قدر و منزلت کا مقام حاصل ہے۔اس فتاویٰ کی اشاعت کا اہتمام معروف اشاعتی ادارے ''مکتبہ قدوسیہ، رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور کی طرف سے کیا گیا ہے۔ ہر سوال کے جواب میں فقط کتاب و سنت کا التزام اور صرف صحیح احادیث سے ہی مسائل کا استنباط کیا گیا ہے۔

۲۵ ...... فتاویٰ عبداللہ ویرووالوی

شیخ الحدیث مولانا عبد اللہ محدث ویرووالوی رحمہ اللہ غزنوی علماء کے تربیت یافتہ اور جماعت اہل حدیث کے بلند پایہ عالم دین تھے۔ مسلک اہل حدیث کے فروغ میں انھوں نے درس وتدریس کے ذریعے بڑا کام کیا ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے نامی علماء کے نام ملتے ہیں۔ مولانا عبد اللہ محدث ویرووالوی فتویٰ بڑا تحقیقی اور دلائل سے بھرپور لکھتے تھے۔ ان کے بہت سے فتاویٰ میں چند ایک ان کی سوانح ''مولانا عبد اللہ محدث ویرووالوی'' مرتبہ پروفیسر سعید احمد چنیوٹی کے صفحہ ۴۶۵ سے صفحہ ۶۰۷ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ کل ۹۵ فتاویٰ ہیں۔ ان میں تفصیل سے مولانا عبد اللہ صاحب کے پوچھے گئے سوالات کے جوابات لکھے ہیں۔ مولانا عبد اللہ صاحب کی سوانح مع فتاویٰ طارق اکیڈمی فیصل آباد کی طرف سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ مولانا عبد اللہ ویرووالوی نے ۲ فروری ۱۹۹۱ء کو فیصل آباد میں وفات پائی۔

۲۶ ...... ضمیمہ جدیدہ فتاویٰ ستاریہ

مولانا مفتی حافظ محمد ادریس سلفی حفظہ اللہ جماعت غرباء اہل حدیث کے مفتی اور مفسر

قرآن حضرت مولانا مفتی عبدالقہار سلفی دہلوی رحمہ اللہ (وفات ۳۱ مئی ۲۰۰۶ء) کے صاحبزادہ گرامی قدر ہیں۔ علم وعمل اور فتویٰ نویسی انھیں ورثے میں ملے ہیں۔ آپ دینی علوم سے آشنا اور قرآن وحدیث کے ماہر ہیں۔ تعلیم وتدریس کے ساتھ ساتھ آپ نے تحریر وتصنیف میں بھی خاصہ کام کیا ہے۔ مسائل کی تحقیق میں کوشاں رہتے ہیں، صاحب نظر عالم دین ہیں۔ جماعت غرباء اہل حدیث کے مرکزی دارالافتاء کے مفتی ہیں۔ نماز ظہر کے بعد دارالافتاء (محمدی مسجد برنس روڈ کراچی) میں خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ فتویٰ نویسی میں موصوف کو مہارت حاصل ہے۔ فتویٰ پوری تحقیق سے لکھتے ہیں۔ ان کے فتاویٰ کئی سال سے صحیفہ اہل حدیث کراچی میں باقاعدہ شائع ہورہے ہیں۔ مفتی محمد ادریس صاحب کے فتاویٰ کا مجموعہ ''ضمیمہ جدیدہ فتاویٰ ستاریہ'' کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہوچکا ہے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ مجموعہ بہت سے مسائل کو محیط ہے۔ ان میں عقائد، عبادات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق اور دیگر بہت سے فقہی جدید وقدیم مسائل شامل ہیں۔ پہلی جلد میں بعض مسائل سے ہم آہنگ دوسرے اہل قلم کے علمی وتحقیقی مضامین بھی شامل ہیں۔ یہ فتاویٰ مکتبہ اشاعت الکتاب والسنہ محمدی مسجد، محمد بن قاسم روڈ کراچی کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔

۲۷ ...... آپ کے مسائل کا حل

انجینئر حافظ ابتسام الٰہی ظہیر حفظہ اللہ شہید ملت علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کے لائق و فائق فرزند ہیں اور ان کا شمار وطن عزیز کے دینی ودنیوی علوم کے ماہر علماء میں ہوتا ہے۔ ان کے فتاویٰ کا مجموعہ ''آپ کے مسائل کا حل'' کے عنوان سے شائع ہوچکا ہے۔ یہ اصل میں ان سوالات کے جوابات ہیں جو حافظ ابتسام صاحب نے انٹرنیٹ پر دیے تھے۔ اس مجموعہ کے صفحات کی تعداد ۲۰۰ ہے اور اس فتاویٰ کی ابواب بندی کچھ اس طرح کی گئی ہے۔ عقائد، طہارت، نماز، جنازے، زکوٰۃ، روزوں، جہاد، نکاح، طلاق، خرید وفروخت، طب، دم اور تعویذ، قربانی، ذکر واذکار، اخلاقیات، شرعی حدود، قسموں، نذروں اور نیاز اور متفرق مسائل۔

ان فتاویٰ میں سوال و جواب کی صورت میں مختصر جواب مرقوم ہیں۔ اسے دارالقرآن والسنہ ۵۳۔ لارنس روڈ لاہور کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔

۲۸ ...... فتاویٰ مولانا عبدالمجید خادم

مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی رحمہ اللہ اپنے کام اور نام سے جماعت اہل حدیث میں معروف و مشہور ہیں۔ انھوں نے جہاں طب اور دینی علوم وفنون پر بہت سی کتابیں لکھیں وہیں کئی رسائل بھی جاری کیے۔ مولانا خادم مرحوم اپنے ان رسائل ''مسلمان'' اور ''اہل حدیث'' سوہدرہ میں قارئین کی طرف سے پوچھے گئے سوالات کے جوابات بھی لکھتے تھے اور انھوں نے اس کے لیے رسائل کے صفحات مختص کر رکھے تھے۔ اللہ بھلا کرے ہمارے بزرگ دوست ملک عبدالرشید عراقی صاحب کا کہ انھوں نے مولانا خادم مرحوم کے ان فتاویٰ کو رسائل سے نکال کر مرتب کیا اور اس پر ایک جامع مقدمہ لکھ کر مولانا مرحوم کے ورثاء مولانا نعمان فاروقی کے حوالے کر دیا۔ مولانا خادم مرحوم کا فتاویٰ جو کہ بہت سے مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہے کئی سو صفحات پر محیط ہے۔ اس کی کمپوزنگ ہو چکی ہے اور عنقریب مسلم پبلی کیشنز لاہور کی طرف سے اشاعت پذیر ہوگا۔

۲۹ ...... فتاویٰ علامہ سیّد بدیع الدین شاہ راشدی رحمہ اللہ

سرزمین سندھ کے عظیم عالم دین اور راشدی خاندان کے گل سرسبد حضرت مولانا سیّد بدیع الدین شاہ راشدی رحمہ اللہ اپنے دور کے فقید المثال عالم دین تھے۔ ان کا علم پختہ، عمل کتاب وسنت کے مطابق اور فکر محدثین کرام سے ہم آہنگ تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی کے لیل ونہار کتاب وسنت کے پرچار اور مسلک اہل حدیث کی ترویج میں بسر کیے۔ وہ اپنے علم و عمل کے اعتبار سے مرجع خلائق تھے۔ لوگ دور دور سے حضرت شاہ صاحب کی خدمت عالیہ میں حاضر ہو کر اپنے مسائل کا حل طلب کرتے اور حضرت شاہ صاحب قرآن وسنت کی روشنی

میں ان سائلین کو فتویٰ لکھ کر دیتے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنی زندگی میں سینکڑوں فتاویٰ لکھے جو بکھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے عزیز دوست مولانا افتخار احمد الازہری حفظہ اللہ کی کوششوں سے ان فتاویٰ کو جمع کیا جا رہا ہے۔ یہ فتاویٰ جو زندگی کے مختلف مسائل پر رہنمائی کرتے ہیں جماعت کا عظیم علمی اثاثہ ہیں۔ ان کی اشاعت نہایت خوش آئند ہے۔ یہ فتاویٰ عنقریب جامعہ بحر العلوم السّلفیہ میرپور خاص سندھ کی طرف سے اشاعت پذیر ہوگا۔ علامہ سید بدیع الدین شاہ راشدی رحمہ اللہ نے ۸ جنوری ۱۹۹۶ء کو وفات پائی۔

۳۰ ...... فتاویٰ اسلامیہ مترجم

مولانا عبد المالک مجاہد حفظہ اللہ کی زیر نگرانی اسلامی لٹریچر شائع کرنے والے عالمی ادارہ دارالسلام لاہور نے جہاں دیگر قرآن وحدیث کے تراجم اور شاندار اسلامی کتب شائع کی ہیں وہیں لوگوں کو درپیش مسائل کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دارالسلام کی طرف سے بعض عربی فتاویٰ کے اردو تراجم بھی شائع کیے گئے ہیں۔ ان فتاویٰ میں ''فتاویٰ اسلامیہ'' سعودی عرب کے جید مفتیان کرام کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو چار جلدوں میں ہے۔ ان میں مسلمانوں کو درپیش مسائل کے اسلامی تعلیم کے مطابق جواب دیے گئے ہیں۔ ان فتاویٰ کا اردو ترجمہ معروف محقق، مصنف، مترجم اور مؤلف جناب مولانا محمد خالد سیف آف اسلام آباد کے شگفتہ اور رواں قلم کا رہین منت ہے۔

۳۱ ...... فتاویٰ سماحۃ الشیخ ابن باز رحمہ اللہ

ماضی قریب میں سعودی عرب میں ایک جید عالم دین فضیلۃ الشیخ علامہ عبد العزیز بن باز رحمہ اللہ گزرے ہیں۔ وہ آنکھوں سے نابینا اور دل کے بینا تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو قرآن وحدیث کے علم سے خوب نوازا تھا اور تفقہ فی الدین کی صلاحیتیں انھیں کثرت سے ودیعت فرمائی تھیں۔ وہ اپنے دور میں سعودی عرب کے مفتی اعظم تھے۔ لوگ اپنے مسائل کے

حل طلب کے لیے سعودی عرب اور دیگر دوسرے ممالک سے ان کی طرف رجوع کرتے اور شیخ اپنی علمی لیاقت اور سمجھداری سے جواب مرحمت فرماتے۔ ان کے فتاویٰ کا شمار ممکن نہیں۔ شیخ کے فتاویٰ سے دو جلدوں پر محیط ''فتاویٰ ابن باز'' کا اردو ترجمہ ادارہ دارالسلام لاہور کی طرف سے شائع ہوا جو بہت سے مسائل کو محتوی ہے۔

۳۲...... فتاویٰ برائے خواتین

یہ فتاویٰ سعودی علماء کے فتاویٰ پر مشتمل ہے۔ اس میں صرف خواتین سے متعلق مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ اپنے مندرجات کے اعتبار سے یہ بہت عمدہ ہے۔ اس میں خواتین کو درپیش مسائل کی عمدہ طریقہ سے وضاحت کی گئی ہے۔ فتاویٰ خواتین صرف ایک جلد میں ہے اور ہر گھر کی ضرورت ہے۔ اسے ادارہ دارالسلام لاہور کی طرف سے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

ان فتاویٰ کے مجموعوں کے علاوہ بہت سے مفتیان کرام کو اللہ تعالیٰ نے فتویٰ نویسی کے فن سے نوازا ہے۔ ان میں بہت سے علمائے کرام کے فتاویٰ جات مرتب نہیں ہو سکے اور بعض کے فتاویٰ کو مرتب کیا جا رہا ہے۔ جماعت اہل حدیث کے جو مفتیان کرام صاحب فتویٰ گزرے ہیں یا موجود ہیں ان میں چند ایک کے نام یہ ہیں، مولانا عبید اللہ رحمانی مبارک پوری، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا حافظ محمد گوندلوی، مولانا عبد اللہ شیخ الحدیث گوجرانوالہ، مولانا محمد بن عبد اللہ شجاع آبادی، مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی، مولانا محمد اعظم گوجرانوالہ، مولانا فاروق احمد راشدی گوجرانوالہ، مولانا محمد علی جانباز سیالکوٹ، حافظ ثناء اللہ ضیاء، مولانا مفتی عبد القہار سلفی دہلوی کراچی، مولانا ثناء اللہ ہوشیار پوری، مولانا حافظ محمد انس مدنی جامعہ ستاریہ کراچی، مولانا عبد الوکیل ناصر کراچی، حافظ عبد الغفار روپڑی لاہور، حافظ عبد الوہاب روپڑی لاہور، مولانا ارشاد الحق اثری فیصل آباد، شیخ الحدیث مولانا حافظ عبد العزیز علوی فیصل آباد، مولانا مفتی عبد الحنان زاہد فیصل آباد، مولانا یونس بٹ جامعہ سلفیہ فیصل آباد

اور مولانا عبد الرزاق عنایت پوری اہل حدیث رسائل جن میں باقاعدگی سے قارئین کے سوالوں کے جواب دیے جاتے ہیں ان میں معروف رسائل یہ ہیں۔ صحیفہ اہل حدیث کراچی، ہفت روزہ اہل حدیث لاہور، ہفت روزہ الاعتصام لاہور، ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث لاہور، ماہنامہ محدث لاہور، ماہنامہ تفہیم الاسلام احمد پور شرقیہ، ماہنامہ شہادت اسلام آباد۔

ہمارے تمام مدارس اہل حدیث میں یہ اہتمام ہے کہ وہاں سے فتویٰ صادر کیا جاتا ہے اور ان مدارس کے اصحاب علم بڑی ذمہ داری سے فتویٰ تحریر کرتے ہیں۔ ان مدارس میں جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ، جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ، جامعہ سلفیہ اسلام آباد، جامعہ رحمانیہ ماڈل ٹاؤن لاہور، جامعہ اہل حدیث مسجد قدس چوک دالگراں لاہور، دار العلوم تقویۃ الاسلام لاہور، کلیہ دار القرآن والحدیث فیصل آباد، دار العلوم سلفیہ ستیانہ ضلع فیصل آباد، جامعہ رحمانیہ ملتان، جامعہ ستاریہ کراچی، جامعہ ابی بکر الاسلامیہ کراچی وغیرہ۔ علاوہ ازیں جماعت اہل حدیث کے مرکزی دار العلوم ''جامعہ سلفیہ حاجی آباد فیصل آباد میں باقاعدہ ایک کمیٹی قائم ہے جس کے تحت فتاویٰ جات جاری کیے جاتے ہیں۔ اس کمیٹی کے مفتیان کرام میں شیخ الحدیث مولانا عبد العزیز علوی، مولانا محمد یونس بٹ اور مولانا مفتی عبد الحنان زاہد کے نام نمایاں ہیں۔ اب فتاویٰ راشدیہ کا تعارف ملاحظہ فرمائیں۔

...... فتاویٰ راشدیہ

یہ فتاویٰ راشدیہ سید محب اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ سندھ کا راشدی خاندان کئی پشتوں سے علم و تحقیق اور مسلک اہل حدیث سے والہانہ لگاؤ کے باعث مرجع خلائق ہے۔ محدث العصر پیر سید محب اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ اس خاندان کے نامور عالم دین گزرے ہیں۔ وہ اپنے دور کے یگانہ عالم تھے۔ دینی و دنیوی علوم سے بہرہ ور اور توحید و سنت کی تعلیم سے آشنا تھے۔ اپنی خاندانی روایات کے امین اور علم و تحقیق کے اعتبار سے اپنے والد گرامی حضرت مولانا پیر سید احسان اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ کے صحیح معنوں میں جانشین تھے۔ علم و تحقیق اور کتاب ان کا زندگی

بھر مشغلہ رہا اور اس میدان میں انھوں نے نیکی نامی کے ساتھ ساتھ بے پناہ عزت و عظمت پائی۔ شاہ صاحب نے ماضی قریب میں درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ تاریخ اہل حدیث کا ناقابل فراموش حصہ ہیں۔ حضرت شاہ صاحب بہت بڑے محدث، مفسر قرآن، مفکر، محقق اور ماہر تعلیم تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی اور صحیح بخاری شریف کے حواشی بھی سپرد قلم کیے۔ اس کے علاوہ یہ کئی کتابیں حوالۂ قرطاس کیں۔ ان کے علمی و تحقیقی شہ پارے جب منصۂ شہود پر آئے تو اہل علم نے ان کی حد درجے تحسین کی۔

شاہ صاحب بہت بڑے محقق اور مفتی بھی تھے۔ ان کے سیکڑوں فتوے غیر مرتب شکل میں بکھرے پڑے تھے۔ اللہ تعالیٰ اجر عظیم دے ہمارے محترم اور عزیز دوست جناب مولانا افتخار احمد الازہری حفظہ اللہ کو کہ انھوں نے کمر ہمت باندھ رکھی ہے کہ راشدی خاندان کے بزرگوں کے علمی و تحقیقی شہ پاروں کو مرتب کر کے زیور طباعت سے آراستہ کریں۔ اس سلسلے میں وہ مقالات راشدیہ کی دو جلدیں مرتب کر کے نعمانی کتب خانہ لاہور کی طرف سے شائع کروا چکے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی محنت شاقہ سے مجلہ بحر العلوم السلفیہ میر پور خاص مولانا سید بدیع الدین شاہ راشدی رحمہ اللہ پر اشاعت خاص "شیخ العرب والعجم نمبر" اور پیر محب اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ پر "محدث العصر نمبر" شائع کر چکا ہے اور اب "فتاویٰ راشدیہ" قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس پر بجا طور پر مولانا افتخار احمد صاحب اور ان کے رفقاء مبارک باد کے مستحق ہیں اور انھوں نے اپنی اس مساعی جمیلہ کے باوصف صحیح معنوں میں راشدی خاندان کے حقیقی وارث ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ "فتاویٰ راشدیہ" کی یہ جلد محدث العصر سیّد محب اللہ شاہ راشدی مرحوم کے علمی و تحقیقی اور معلوماتی فتاویٰ کا جاندار اور شاندار مجموعہ ہے۔ فتویٰ نویسی بڑا نازک اور اہم منصب ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے اس منصب کی نزاکتوں اور ذمہ داریوں کو خوب نبھایا ہے اور بغیر کسی لگی لپٹی کے فقط قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنی تحقیق سے فتاویٰ صادر کیے ہیں۔ اس

فتاویٰ میں جن مسائل پر دردِ تحقیق دی گئی اور مسائل کی عقدہ کشائی کی گئی ہے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ قرآن پاک اور اس کے متعلقات، حدیث شریف اور اس کے متعلقات، توحید وعقائد کے مسائل، طہارت کے مسائل، نماز کے مسائل، جنازے کے مسائل، زکوٰۃ کے مسائل، نکاح کے مسائل، طلاق کے مسائل، معاملات کے مسائل، اخلاق وادب کے مسائل اور تحقیق وتنقید۔

شاہ صاحب نے ان ابواب کے تحت فتاویٰ کی صورت میں اپنے علم وتحقیق کی خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔ یہ فتاویٰ پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے ہیں۔ اس اعتبار سے ''فتاویٰ راشدیہ'' اہل حدیث فتاویٰ میں ایک گراں قدر علمی اضافہ ہے۔

میں اُمید رکھتا ہوں کہ قارئین اس علمی سوغات کا خوش دلی سے استقبال کریں گے اور مجھے یقین کامل ہے کہ میرے عزیز دوست مولانا افتخار احمد الازہری حفظہ اللہ خاندان راشدیہ کے دیگر عالی قدر بزرگوں کے فتاویٰ کو بھی جلد مرتب کرکے کتابی صورت میں شائع کریں گے۔ بلاشبہ یہ بہت بڑی دینی خدمت ہے جو مولانا افتخار صاحب اور ان کے ادارے جامعہ بحر العلوم السّلفیہ میر پور خاص سندھ کی طرف سے انجام دی جارہی ہے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں قبول فرماتے ہوئے اسے قبولیت عامہ عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین

مخلص

محمد رمضان یوسف سلفی

نمائندہ جماعت غرباء اہل حدیث پاکستان

۳۰ جنوری ۲۰۱۲ء

فتاویٰ راشدیہ

محدث العصر السید محب اللہ شاہ الراشدی رحمہ اللہ

خاندان راشدی کے چشم و چراغ، محدث العصر، مفکر اسلام، مفتی اعظم، ماہر فن اسماء الرجال فضیلۃ الشیخ السید ابوالقاسم محب اللہ شاہ الراشدی رحمہ اللہ کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم و فضل تقویٰ و عمل میں جو بلند مقام سے نوازا تھا عصر حاضر میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر آن قال اللہ اور قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آبیاری میں صرف ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلم میں وہ طاقت رکھی تھی جس سے غیر بھی اپنے ہوگئے۔ تعصب سے پاک جس فن میں بھی لکھا اس کا حق ادا کردیا۔ قرآن پاک کی تفسیر پر قلم اٹھایا تو "المنهج الأقوم في تفسير سورة مريم" کئی سو صفحات پر تحریر کردی۔ حدیث پر لکھنا شروع کیا تو بخاری شریف پر حاشیہ ۹ جلدوں پر لگادیا جو "التعليق النجيح على جامع الصحيح" کے نام سے غیر مطبوع ہے، رجال پر قلم کو جنبش دی تو "تراجم الرواة لكتاب القراءة خلف الامام لإمام البيهقي" کے تمام رواۃ پر تحریر فرمادی۔ اس کے علاوہ صلوٰۃ کے جمیع مسائل و دیگر اہم اہم موضوعات پر تحقیقی انداز میں لکھا، ان کتب کے علاوہ شاہ صاحب رحمہ اللہ جماعتی رسائل میں مضامین اور بعض پر تعلیق و تنقید فرماتے تھے، اس کے علاوہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی زندگی کا سب سے بڑا اہم کام عوام الناس کے سوالات کے جوابات تحریر کرنا اور پھر اس کو محفوظ رکھنا یہ آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی عادت مبارکہ تھی جو بھی جواب تحریر کرتے وہ تحقیق اور باحوالہ تحریر فرماتے تھے اور اگر کسی مسئلہ

میں سامنے والی کی رائے حق بجانب ہوتی تو بڑی فراخدلی اور خندہ پیشانی سے قبول فرماتے جیسے تعویذ کا مسئلہ ابتدا میں آپ آیت قرآنی کے تعویذ کے قائل اور فاعل تھے لیکن بعد میں آپ نے رجوع فرمالیا اور بقول فضیلۃ الشیخ ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ حتیٰ کہ پانی پر دم کرنا بھی آخری عمر میں انھوں نے چھوڑ دیا کہ اس میں نفخ فی الماء پایا جاتا ہے۔''مجلہ بحر العلوم محدث العصر نمبر طبع اولیٰ ص ۱۵۲'' اس رجوع سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ ہمیشہ حق بجانب رہے۔ اسی چیز نے بندہ ناچیز کو ان فتاویٰ کو جمع کرنے کا شوق پیدا کیا جس کا عملی نمونہ آپ کے سامنے موجود ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ کے فتاویٰ کی اقسام:

شاہ صاحب رحمہ اللہ کے فتاویٰ ہم کو مختلف جگہوں سے ملے ہیں۔ اکثر شاہ صاحب کی لائبریری یا اولاد یا احفاد سے، دوسرے آپ کے دوست و احباب سے، تیسرے آپ کے خطوط و مکتوبات سے یا مختلف کتب سے یعنی ہم شاہ صاحب رحمہ اللہ کے فتاویٰ کو ۳ حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

1. وہ فتاویٰ جو ''مکتبہ پیر آف جھنڈو'' سے باقاعدہ جاری کیے گئے، لوگ آپ کے پاس آتے اور لے کر جاتے جن میں اکثر کی نقل موجود تھی۔
2. وہ فتاویٰ جو آپ نے اپنے تلامیذہ یا دوست احباب کو بذریعہ پوسٹ ارسال کیے اُن میں خصوصاً ضلع تھرپارکر کے عظیم انسان اور ادیب پروفیسر مولانا بخش محمدی صاحب حفظہ اللہ جنھوں نے آپ کے ہر فتاویٰ کو سنبھال کر محفوظ رکھا اور اس کو اردو قالب میں ڈھال کر مختلف رسائل میں ارسال فرمایا، ہم نے پروفیسر صاحب سے تمام وہ فتاویٰ کی فوٹو نقل کرکے اس علمی مجموعہ میں جمع کر دیے ہیں اور اسی طرح شاہ صاحب رحمہ اللہ کے فتاویٰ کا کچھ حصہ مولانا اللہ بخش تونیہ صاحب رحمہ اللہ کے فرزند مولانا عبدالغنی صاحب سے ملا ہے۔
3. جماعتی مؤقر رسائل میں بھی آپ کے کئی فتاویٰ طبع ہوچکے تھے ان کو جمع کیا اور تکرار کو

نکال کر اس علمی ارمغان میں جمع کیا۔

ہم نے تینوں اقسام سے فتاویٰ کو جمع کیا ہے آپ کے اکثر فتاوی سندھی زبان میں تحریر شدہ تھے جن کو جامعہ کے اساتذہ کرام نے اردو زبان میں بڑی سہل انداز میں ڈھالا ہے، اس مجموعہ میں ایک کمی جو رہ گئی ہے وہ ہے نقل سوال کی، یعنی ہم کو شاہ صاحب رحمہ اللہ کا جواب تو مل گیا لیکن سوال کی تمیز نہ کرسکے کہ یہ سوال کس نے اور کب کیا ہے، ہوسکتا ہے اس وقت فوٹوسٹیٹ کی اتنی سہولت نہ ہو جتنی آج ہے۔ اسی لیے کئی جوابات کے سوال ہم نے خود تجویز کیے ہیں۔

طریقہ کار:

پہلے مرحلے میں شاہ صاحب رحمہ اللہ کے تمام دستیاب فتاویٰ کو یکجا کیا گیا ہے۔ دوسرے مرحلے پر تمام سندھی زبان اور عربی زبان کے فتاویٰ کو اردو زبان میں منتقل کیا گیا ہے۔ تیسرے مرحلے میں تمام فتاویٰ کو ترتیب فقہی پر مرتب کیا اور ان کو بارہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ چوتھے مرحلے میں تمام احادیث کی تخریج اور ضرورت کے وقت حاشیہ اور ہر دلیل کا حوالہ نقل کیا گیا ہے اور مجموعہ فتاویٰ کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے۔

① قران پاک اور اس کے متعلقات
② حدیث شریف ومتعلقات۔
③ توحید وعقائد کے مسائل
④ طہارت وپاکیزگی کے مسائل۔
⑤ نماز وصلاۃ کے مسائل
⑥ میت اور جنازے کے مسائل۔
⑦ زکوۃ وصدقات کے مسائل
⑧ شادی ونکاح کے مسائل۔
⑨ معاملات ومعاشیات کے مسائل
⑩ طلاق وعدت کے مسائل۔
⑪ اخلاق وادب کے مسائل
⑫ تحقیق وتنقید۔

خصوصیات:

❶ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے فتاویٰ کی سب سے بڑی یہ خصوصیت ہے کہ یہ فتاویٰ اعتدال پر مبنی ہے اس میں تعصب نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

③ اس طرح شاہ صاحب کے فتاویٰ "یَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوْا" کی عکاسی کرتا ہے کیونکہ قرآن پاک میں ﴿یُرِیْدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرہ: ۱۸۵) آیا ہے اور اسی طرح حدیث شریف میں ہے: ((یَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا.))- ((انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین.)) یعنی شاہ صاحب رحمہ اللہ نے آسانی کے پہلو کو مقدم رکھا ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انھوں نے قرآنی نص یا احادیث صحیحہ کے خلاف فرمایا بلکہ "أحوط" کے مقابلہ "ایسر" کو مقدم رکھا ہے۔

④ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے "سندھ یونیورسٹی" سے M.A کیا تھا اس لیے سائنس کو آپ نے بہت پڑھا اور اس فتاویٰ میں کئی سوالات جو سائنس کے متعلق پوچھے گئے ان کے بہت ہی تفصیل سے جواب دیے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی شاہ صاحب رحمہ اللہ کے فتاویٰ کی بہت سی خصوصیات ہیں جو کہ پڑھنے سے واضح ہو جائیں گی۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شاہ صاحب رحمہ اللہ کو اعلیٰ علیین اور جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائیں۔ آمین

آخر میں شیخ صاحب مولانا محمد رمضان یوسف سلفی صاحب، پروفیسر مولانا مولا بخش محمدی، سید قاسم شاہ راشدی صاحب اور اپنے تمام رفقاء کا جنھوں نے میرے ساتھ تعاون فرمایا اور اسی طرح اللہ تعالیٰ اس فتاویٰ کو شرف قبولیت سے نواز کر ہمارے لیے اسے ذخیرہ آخرت بنائیں۔ آمین

والسلام

افتخار احمد تاج الدین الازہری

شیخ الحدیث جامعۃ العلوم السلفیہ

میرپور خاص

0332-2819002

فتاویٰ راشدیہ ایک نظر میں!

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی اشرف الانبیاء والمرسلین اما بعد!

اللہ رب العزت نے دنیا میں اسلام کو بنی آدم کی کامیابی کے لیے نازل فرمایا اور نبی مکرم ﷺ کو اس دین کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے مبعوث فرمایا۔ آپ ﷺ نے دین حق کو بخوبی اور احسن انداز سے بنی آدم تک پہنچایا اور کھرے کھوٹے کی پہچان کروائی۔

جبرائیل علیہ السلام جیسے جیسے احکامات لے کر آتے فوراً آپ ﷺ بالکل ویسے ہی اپنے پیروکاروں کو سکھاتے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی خوش دلی اور اطمینان قلب کے ساتھ اپنے سینوں میں وحی الٰہی کو محفوظ کرتے۔

بسا اوقات کسی جاں نثار کو کوئی دینی مسئلہ پیش آتا اور جبکہ ابھی تک اس بابت وحی نازل نہ ہوئی ہوتی تو خدمت اقدس میں عرض کرنے حاضر ہو جاتے (یعنی فتویٰ طلب کرتے) اور پھر آپ ﷺ اپنے علم الٰہی جو کہ ربّ تعالیٰ کی طرف سے آتا اس کی روشنی میں ان کی راہنمائی فرماتے، پھر رسول اللہ ﷺ کے بعد خلیفۃ الرسول نے اس کا بیڑہ اٹھایا اور اپنی زندگیوں میں فرمان رسول اور فرمان الٰہی کے مطابق فتوے دیتے، اور پھر تابعین نے بھی اسی طرز عمل کو اپنایا، اور پھر یہ سلسلہ چلتا چلتا چودھویں صدی تک آ پہنچا، چودھویں صدی میں بھی ہمارے سلف و صالحین نے بے پناہ قرآن و سنت سے محبت کرتے ہوئے اپنے علم کو آگے پھیلایا اور انھی کی روشنی میں عوام الناس کے مسائل کو حل کیا، اور ہمارے سلف میں سے ایک شخصیت جو کہ کسی تعارف کی محتاج نہیں جن کا علم، عمل اور تقویٰ زہد ورع پیشہ تھا، کا نام باب الاسلام کی عظیم ہستیوں میں گنا جاتا ہے۔ ہمارے ممدوح السیّد پیر محب اللہ شاہ راشدی ہیں کہ

جنھوں نے اپنی حیات میں دین کی خدمت کا حق ادا کر دیا اور سندھ کیا پنجاب بلکہ پورے پاکستان اور ملک کے باہر اپنے علم کو پھیلایا، جس وقت جس موضوع کی ضرورت پڑی آپ نے اپنے قلم کو حق لکھنے سے نہ روکا، اور جب کبھی اسلام پر کسی نے قلم اٹھایا تو ہمیشہ آپ نے اسلام کا دفاع کیا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ جب بھی سائل نے دین کے متعلق سوال کیا تو آپ نے قرآن وسنت اور عقلی دلائل کے ذریعے اسے مطمئن کیا اور راہ حق کی راہنمائی کی۔ جن کی مثال آپ اس کتاب کے مطالعہ میں پائیں گے۔ آپ نے مختلف موضوعات پر فتوے دیے، چند کو آپ کے شاگردوں نے سنبھالا اور بعض کو مصروفیت کے تحت ضائع کر بیٹھے۔ لیکن جو جمع کیا، وہ بہت خوب ذخیرہ اکٹھا کیا، اللہ ان لوگوں کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

ان میں سرفہرست مولانا مولا بخش محمدی صاحب کا نام آتا ہے، کہ جنھوں نے عرق ریزی سے اس کام کو سرانجام دیا۔ اور ساتھ ہی میرے استاد محترم افتخار احمد الازہری صاحب کہ جن کی کاوش کے تحت یہ ذخیرہ علمی آپ احباب تک پہنچایا۔ اس کتاب کی کمپوزنگ اور ڈیزائننگ محمد حسن خان صاحب اور سرورق جناب ضیاء الرحمٰن صاحب نے کی۔ اللہ تعالیٰ دیگر احباب کہ جنھوں نے اس کار خیر میں شرکت فرمائی کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے اور اجر عظیم سے نوازے۔

اس کتاب کو میں نے حرف بہ حرف پڑھا، الحمد للہ ہر لحاظ سے کامل ومکمل پایا، آپ نے قرآن وسنت اور عقل سے اپنی موقف کو ثابت کیا، اگر کتاب میں کسی قسم کی بشری تقاضوں کی کمی کوتاہی رہ گئی ہو تو آگاہ کریں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اسے دور کیا جاسکے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہماری اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول ومنظور فرمائے اور ہمارے والدین کے لیے ذریعہ نجات بنائے۔ (آمین)

دعاؤں کا طالب

ابوخبیب حافظ ثناء اللہ تبسم (بیرانی)

فاضل جامعہ بحر العلوم السلفیہ

قرآن ومتعلقات

معانی قرآن

سوال: ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ قرآن کی دو معانی ہوتے ہیں ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ ظاہری معنی تو ہر صاحب علم سمجھ سکتا ہے لیکن باطنی معنی کو کسی امام وپیشوا کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا اس لیے کسی ''امام'' کی تقلید لازمی ہے؟

الجواب بعون الوهاب: قرآن حکیم کے معنی کی ظاہری اور باطنی تقسیم کا مطلب اگر یہ ہے کہ ایک معنی وہ ہے جو قرآن کے الفاظ مبارکہ سے لغت کے اعتبار سے سمجھ میں آتی ہے اور دوسری وہ ہے جو اشارۃً یا اقتضاءً یا دلالۃً معلوم ہوتی ہے یعنی اس میں استنباط واستخراج کو دخل ہے یا اس میں ان الفاظ کے حقائق شرعیہ (حقائق لغویہ) کا علم ہونا ضروری ہے تو یہ تقسیم درست ہے لیکن ان معانی کو جاننے کے لیے اہل علم کے لیے آخر تقلید کیونکر ضروری ہے؟ اہل دنیا کی یہ ذہنیت بن چکی ہے کہ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار نہیں، استنباط واستخراج کے لیے اصول وقواعد مستنبط کیے گئے ہیں اصول روایت واصول درایت وضع ہو چکے ہیں ایک صاحب علم کے لیے ان قواعد واصول کو مدنظر رکھ کر مسائل ومعانی کے استخراج میں کوئی بھی مشکل درپیش نہیں آ سکتی، دیکھیں فقہ کی کتب میں کتنے ہی مسائل کے اجزاء مرقوم ہیں اور مسائل کی تفریع درتفریع موجود ہے اور تمام مقلدین ان پر آمنا وصدقنا کہہ کر بیٹھے ہیں اور ان کی قوت استنباط واستخراج کے قائل ہیں۔

مثلاً صاحب ہدایہ وغیرہ۔ اب خدارا انصاف کے ساتھ بتائیے کہ کیا یہ بھی مقلد ہیں۔ اپنے آپ کو کہتے تو مقلد ہیں مگر اس قسم کی تفریع اور تخریج کا مقلد سے کیا تعلق؟ مقلد کو تو علم ہی نہیں بلکہ اس کا تو فرض ہے کہ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے یہ فرمایا ہے باقی اس پر اشارہ یا اقتضاء وغیرہا طرق سے تفریع یا استخراج قطعاً اس کے دائرہ عمل سے خارج ہے۔ اس طرح حقائق شرعیہ کا اور کتاب وسنت کا پورے انہماک کے ساتھ تتبع اور کتب حدیث کا دل کی چاہت کے ساتھ مطالعہ ہو سکتا ہے اس کے لیے کسی امام یا پیشواء کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں

ہے باقی اگر تقسیم کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ قرآنیہ کا کوئی ایسا مطلب ومعنی ہے جو قواعد وغیرہ کے ماتحت بالکل نہیں، یعنی اس کے حصول کے لیے کسب کی ضرورت نہیں تو ایسا مطلب ومعنی بالفاظ دیگر الہام ہوئے اور الہام وہی معتبر ہے جو شریعت کے موافق ہو باقی وہ الہام جو کتاب وسنت کے معارض ہے وہ قطعاً قابل اعتبار نہیں، اس کے علاوہ ایسا الہام کوئی ان ائمہ کے ساتھ مخصوص نہیں جن کو عوام کالانعام نے زبردستی اور جبراً اپنا قائدورہبر بنا رکھا ہے اور ان کی غیر مشروط اطاعت اپنے اوپر لازم قرار دے دی ہے۔ مطلب کہ اگر ایسی کوئی وہبی یا الہامی معنی ومطلب کسی خدا پرست انسان نے پیش بھی کیا ہے تو اسے بھی ظاہری شریعت پر پیش کیا جائے گا پھر اس کے موافق ہونے کی صورت میں وہ معنی ومطلب اس آیت یا حدیث کے اسرار میں سے کوئی سرہی ہے جو کہ محض ایک اللہ کی طرف سے مزید انعام واکرام ہے وہ بات کوئی واجبات شرعیہ یا ایسی باتوں میں سے نہیں جن کا علم حاصل کرنا ہمارے لیے ایمانا ضروری ہے جب ان کا علم ازروئے ایمان ہمارے اوپر لازم نہیں ہے تو پھر اس کے لیے تقلید کی کیا ضرورت؟ اس پر خوب غور وتعمق کے ساتھ توجہ دیں۔

اور اگر اس تقسیم کا مقصد یہ ہے جیسا کہ کچھ ملحد اور زندیق لوگ کہتے ہیں کہ قرآن شریف کی ظاہری اور باطنی معنی ومطلب ہے یعنی جو حکم کسی آیت سے ظاہر طور پر معلوم ہورہا ہوتو دوسری معنی ومطلب اس کے بالکل برعکس ہے جو کچھ چیدہ چیدہ بزرگوں اور ائمہ عظام کو معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً قرآنی حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ:

﴿وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا﴾ (المائدة: ٣٨)

''چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے۔''

اب کوئی بے دین اور ملحد قسم کا آدمی یہ دعویٰ کرے کہ اس کا ظاہری مطلب تو یہی ہے لیکن اس کا باطنی مطلب دوسرا ہے، پھر وہ کوئی ایسا مطلب بیان کرے جو اس حکم ربانی کی صورت کو مسخ کردے تو کیا وہ طلب قابل اعتبار ہوگا؟ کیا کوئی صاحب عقل ودانش ہوش وحواس کے صحیح سالم ہونے کی صورت میں ایسے اقدام پر جرأت کرسکتا ہے؟ ہاں اگر اس معانی

ومطالب کے لیے تقلید ضروری ہے تو یہ تقلید آپ ہی کو مبارک ہو اور پھر ایسی معانی ومطالب اسرار ورموز بیان کرنے والے جو ائمہ ہوتے ہیں وہ ائمة الهدیٰ نہیں بلکہ قرآن کی اس آیت کے بمصداق:

﴿وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ﴾ (القصص : ٤١)

''وہ خود بھی گمراہ اور دوسروں کو بھی گمراہی کے عمیق گڑھے میں پھینکنے والے ہوں گے۔''

بہر حال اللہ تبارک وتعالیٰ ایسی تقلید اور ایسے مقلدین (بکسر اللام) اور مقلدین (بفتح اللام) سے ہر مسلمان کو محفوظ ومأمون رکھے۔ اللّٰھم آمین!

بالفرض:...... اگر باطنی سے مراد استنباطی معنی اور استخراجی مسائل اور حکم واسرار ہیں تو ان تک پہنچنے کے لیے علماء حقہ نے اصول وضوابط منضبط کر دیئے ہیں جن کو عمل میں لاکر کتاب وسنت سے استنباط واستخراج کی لیاقت پیدا کی جاسکتی ہے لہٰذا ان کے لیے تقلید کو ضروری سمجھنا نادانی ہے۔ باقی اگر اس سے مراد ملحدین والا مطلب ہے تو اس کا حکم آپ خود معلوم کر سکتے ہیں۔ اس لیے اس سے تقلید شخصی کے لیے دلیل نہیں پیش کی جاسکتی۔ هذا ما عندي والله اعلم بالصواب .

کسی آیت کو وظیفہ میں خاص کر لینا

سوال: مختلف قرآنی آیات یا اسماء الٰہی کو مفید جان کر نماز یا کسی دوسرے وقت کا تعین کر کے پڑھنا جب کہ سنت سے اس طرح کرنا ثابت نہیں کیا یہ بدعت کے زمرہ میں آتا ہے؟ مثلاً ایک مشہور عمل یہ ہے کہ سورۃ الفاتحہ مابین سنت فجر ۴۱ مرتبہ بیماری دور کرنے کے لیے پڑھنا اسی طرح یہ عمل دیگر ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بھی کیا جاتا ہے کچھ لوگ اس میں اضافہ بھی کرتے ہیں کہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے میم کو الحمد کے لام کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے، اسی آیت ﴿ وافوض امری الی اللہ......﴾ کو ہر نماز کے بعد مقررہ تعداد میں

پڑھنا کہا جاتا ہے کہ ایسا کرنے سے مطلوبہ حاجت پوری ہو جاتی ہے۔ یا پھر سورۃ التوبہ کی آخری دو آیات یا ایک آیت کو بعد نماز عشاء ۱۰۱ مرتبہ پڑھنا کہا جاتا ہے کہ یہ عمل قید اور دشمنی سے بچنے کے لیے مفید ہے۔ کیا اس طرح کے یہ اعمال شرعاً ناجائز ہیں؟ میری سمجھ کے مطابق اس طرح کے وظائف کو اختیار کرنے میں شرعاً ممانعت نہیں اور نہ ہی یہ بدعت کے زمرہ میں آتے ہیں بشرطیکہ انہیں سنت یا ماثور نہ سمجھا جائے۔ الغرض آپ دلائل کے ساتھ وضاحت کریں تاکہ اطمینان حاصل ہو؟ بینوا توجروا!

الجواب بعون الوهاب: اس کا جواب یہی ہے کہ آیات قرآنیہ یا اسماء الٰہی کو کسی خاص تعداد اور کسی مخصوص اوقات میں بطور وظیفہ یا دینی خواہ دنیوی خیر و بھلائی کے حصول کے لیے پڑھا جا سکتا ہے۔ (جیسا کہ خود محترم نے سوال کے آخر میں فرمایا ہے) بشرطیکہ اسے سنت ماثورہ نہ سمجھا جائے اور مقررہ تعداد کو لازم و واجب تصور نہ کیا جائے۔

اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سفر میں تھے کسی قبیلہ کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا پھر ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے اس پر سورۃ الفاتحہ کا سات مرتبہ دم کیا اور وہ تندرست ہو گیا بالآخر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور یہ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا کہ "ما ادراك انها رقية." یعنی آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ فاتحہ رقیہ (دم) ہے؟ اس نے عرض کیا: "یا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم شئی القی فی روعی" یعنی ایک چیز تھی جو میرے دل میں ڈالی گئی۔"

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابی رضی اللہ عنہ نے اس سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ علم حاصل نہ کیا تھا کہ سورۃ فاتحہ دم ہے اور ڈسے ہوئے شخص پر سات مرتبہ پڑھنا بھی اس صحابی کے دل میں القاء کی ہوئی بات کے ماتحت اسی تعداد میں یہ سورۃ مبارکہ پڑھی۔

پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ان دونوں باتوں کو بحال رکھا۔ لہٰذا یہ تقریری دلیل ہے کہ کوئی شخص قرآن کریم کی کوئی سورت یا ایک یا دو آیات کسی خاص مقدار میں کسی مرض کی

شفا یا کسی مشکل کے حل وغیرہ کے لیے پڑھے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اگر یہ بات درست نہ ہوتی تو صحابی رضی اللہ عنہ کے جواب "شئی القی فی روعی." پر ضرور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے زجر وتوبیخ فرماتے کہ یہ کیا ہے کہ جو بات دل میں آئے اس پر عمل کرتے پھرو گے؟ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے بحال رکھنا اور اس فعل کو ثابت رکھنا اس پر واضح دلیل ہے کہ یہ بات شریعت کے ہرگز خلاف نہ تھی اور مسئلہ ہذا کی عمومی دلیل:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ (الاسراء: ۸۲)

"اور ہم قرآن وہ کچھ نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا کچھ نہیں۔"

بھی ہو سکتی ہے اور شفا سے روحانی وجسمانی، مادی، معنوی شفاء مراد لی جا سکتی ہے۔ تخصیص کی کوئی بھی وجہ نہیں، وجہ یہی ہے کہ جب صحابی رضی اللہ عنہ نے فاتحہ کو دَم سمجھ کر پڑھا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی اعتراض نہ فرمایا:

باقی رہا اسماء الالٰہیہ کا معاملہ تو خود قرآن کریم میں ہے کہ:

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ (الاعراف: ۱۸۰)

لہٰذا اسماء الٰہیہ میں جس اسم میں بھی قاری کو مشکل حل ہونے کی توقع ہو تو اسے کچھ تعداد مقرر کر کے (محض اپنی سہولت کی خاطر نہ کہ اسے لازم سمجھتے ہوئے) پڑھے اور نماز کے بعد بھی پڑھ سکتا ہے کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نماز کے بعد دعا قبول ہوتی ہے یا کسی اور وقت میں پڑھے تو بھی اس میں کچھ حرج نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

آیت کا مفہوم

سوال: "لا اکراہ فی الدین" کے متعلق بحث کریں؟ بینوا توجروا!

الجواب بعون الوهاب: اسلام تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی تبلیغ وحکمت اور موعظ حسنہ

کے ساتھ پھیلا تھا، کسی نے بھی زبردستی نہیں کی تھی قرآن کریم نے جن بھی انبیاء کرام کے احوال بیان کئے ہیں ان میں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ ان بزرگ ہستیوں نے تو خود دین کی تبلیغ کی خاطر دشمنوں کی تکالیف برداشت کیں مگر ان پر زبردستی نہیں کی اور پوری کوشش کے باوجود جب وہ کفر پر ڈٹے رہے تو یہ بزرگ ہستیاں صرف یہ کہہ کر ان سے الگ ہو گئیں کہ:

﴿وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾

اس طرح قرآن کریم میں اصولی طور پر فرمایا گیا ہے کہ:

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ (البقرة: ٢٥٦)

''دین میں زبردستی نہیں ہے ہدایت گمراہی سے الگ کی گئی ہے، پھر جو کوئی طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے ایک مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

بہرحال اصل دین اسلام میں نہ زبردستی جائز ہے اور نہ ہی کرنی چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب

اولی الامر کا مطلب

سوال: قرآن کریم میں سورۃ النساء میں آیت کریمہ ہے ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ﴾ (النساء: ٥٩) اس آیت کریمہ میں '' أُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ '' سے کیا مراد ہے کیا اس آیت سے تقلید شخصی کے لیے استدلال کیا جا سکتا ہے؟

الجواب بعون الوهاب: اس آیت کریمہ میں ﴿أُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ﴾ سے مسلمانوں کے حکام مراد ہیں کیونکہ وہی صاحب امر ''أُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ'' ہیں پھر چاہے وہ

علماء میں سے ہوں یا غیر علماء میں سے مگر وہ علماء جو صاحب امر نہیں وہ ﴿اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ﴾ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ دیگر الفاظ میں مذکورہ آیت امت مسلمہ کو اپنے امراء کی اطاعت کا حکم فرما رہی ہے اسی طرح کئی احادیث مبارکہ میں بھی امراء کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے، کیونکہ اسلام کا ایک اپنا نظام دستور اور قانون یا آئین ہے اور وہ حکومت میں اقتدار کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتا اسی لیے کتاب وسنت مسلم میں امراء وحکام کی اطاعت پر زور دیا گیا ہے تاکہ وہ امت مسلمہ میں ربانی قانون نافذ کر سکیں۔ مگر ان حکام کی طاعت غیر مشروط ہرگز نہیں بلکہ ان کی اطاعت تب تک کی جائے گی جب تک وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول ﷺ کے احکامات اور ان کی سنت وطریقہ کی مخالفت نہ کریں ورنہ اگر ان کا کوئی بھی امر یا حکم کتاب وسنت کے خلاف ہوگا تو اس صورت میں ان کی اطاعت ہرگز جائز نہیں یہی سبب ہے کہ جو آیت کریمہ سوال میں تحریر کی گئی ہے اس میں ﴿اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ﴾ کے بعد یہ الفاظ مبارک ہیں:

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (النساء: ۵۹)

''اگر کسی چیز میں اختلاف کرو تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ اگر تمہیں اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان ہے۔''

یعنی تنازعہ اور اختلاف کی صورت میں پورا کا پورا معاملہ اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ کی طرف یا کتاب وسنت کی طرف لٹایا جائے گا پھر جس کی بات کتاب وسنت کے موافق ہوگی تو صحیح ورنہ غلط۔

اور یہ تنازع یا اختلاف تب ہی وجود میں آتا ہے جب کوئی شخص (حاکم یا عالم) کوئی حکم یا مسئلہ بتاتا ہے مگر اس کے برخلاف اور اس کی فتویٰ کے مخالف کوئی کتاب اللہ کی آیت ہوتی ہے یا کوئی حدیث شریف ورنہ اگر حاکم کا حکم یا عالم کی فتویٰ کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو تو پھر جھگڑا اور اختلاف پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس صورت میں یہ اطاعت بالآخر اللہ تعالیٰ

اور اس کے رسول ﷺ کی ہی ہے نہ کہ اس حاکم کی کیونکہ وہ حاکم قانون ساز قطعاً نہیں ہے بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے قانون کو نافذ کرنے والا ہے قانون سازی کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے، جیسے فرمایا:

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (الانعام: ٥٧)

''اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں (چلتا)۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ﴾

(الشوریٰ: ٢١)

''کیا ان کے لیے شرکاء ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین میں وہ چیزیں مشروع کردی ہیں جن کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔''

اسی طرح حدیث میں ہے کہ:

((لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق)) [1]

''یعنی جس بات یا کام کرنے سے خالق کی نافرمانی لازم آئے اس میں کسی بھی مخلوق کی ''خواہ'' وہ ماں باپ ہو خواہ عالم خواہ کوئی امیر یا حاکم'' اطاعت نہیں کرنی۔''

اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ کی نافرمانی ان کے ارشادات عالیہ کی خلاف ورزی میں لازم آتی ہے۔ لہٰذا اس صورت میں کسی کی اطاعت نہیں کرنی۔ یہی مطلب سیاق وسباق کے موافق ہے اور قرآن وحدیث کے بالکل مطابق ہے۔ اس میں تقلید شخصی کا نام ونشان بھی نہیں اس کا اثبات تو دور کی بات ہے لیکن اگر '' علی سبيل التنزل'' یہ تسلیم بھی کیا جائے تو اولی الامر سے مراد علماء ہیں، یعنی مطلق علماء خواہ وہ صاحب امر ہوں یا نہ ہوں، تو بھی اس سے تقلید شخصی کا اثبات ہرگز نہیں ہوتا کیونکہ آیت کریمہ کا یہ حصہ جو اوپر ذکر کیا گیا ہے یعنی ''فان تنازعتم فی شیء الخ ''اس سے مانع ہے، اس طرح کہ اختلاف

[1] مسند أحمد جلد٥، صفحه ٦٦، رقم الحديث: ٢٠٦٨٠.

کی صورت میں ربانی ارشاد ہے کہ وہ مکمل معاملہ کتاب وسنت کی طرف لوٹایا جائے آپ دیکھیں کتنے ہی مسائل ہیں جن میں علماء کا اختلاف ہے۔

مثلاً ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کسی مسئلہ کے متعلق کچھ فرماتے ہیں تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کے برعکس ارشاد فرماتے ہیں اور مالک رحمۃ اللہ علیہ ان دونوں سے مختلف تیسری بات کہتے ہیں اور احمد رحمۃ اللہ علیہ کا راستہ ان تینوں سے الگ ہے اب اس صورت میں ہمارے ایمان کی تقاضا ﴿ان كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر﴾ کے مطابق کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ ان چاروں ائمہ کرام کے اختلاف کو نظر انداز کر کے ہمیں پورا معاملہ مسئلہ مختلف فیہا کو کتاب وسنت کی طرف لوٹا دینا ہے پھر اس عدالت عالیہ ''سپریم کورٹ'' کی طرف سے جس کی بات یا فتویٰ کے متعلق صحت کا فیصلہ صادر ہوگا اس کی بات درست اور دوسری غلط ہوگی اور اگر ہمیں یہ معلوم ہوگیا کہ کتاب وسنت نے اس مسئلہ کے متعلق یہ فیصلہ دیا ہے تقلید تو ختم ہوگئی کیونکہ تقلید کی تعریف میں'' جو علماء اصول فقہ نے لکھی ہے'' عدم علم داخل ہے یعنی اصول فقہ کے مطابق تقلید کی یہ تعریف ہے:

((اخذ قول الغير من غير معرفة دليله .)) [1]

یعنی کسی کی بات اس کی دلیل معلوم کیے بغیر لے لینا۔ پھر اگر اسے اس مسئلہ کی دلیل کا علم ہوگیا تو تقلید از خود ختم ہوگئی۔ مطلب کہ اختلاف کی صورت میں کسی ایک شخص کی اتباع یا تقلید اس کی دلیل معلوم کیے بغیر کرنا بالکل ناجائز ہے، لیکن اگر وہ مسئلہ مختلف فیہ نہیں بلکہ امت کا اس پر اجماع واتفاق ہے تو اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ کتاب وسنت کے خلاف قطعاً نہیں کیونکہ

((لا تجتمع امتى على ضلالة اوكما قال .)) [2]

حدیث شریف وارد ہوئی ہے لہٰذا امت کا اجماع ایسی ہی بات پر ہوتا ہے جو کتاب

---

[1] شرح جمع الجوامع، جلد۲، صفحه ۲۵۱ .

[2] كشف الخفا للعجلونی، جلد۲، صفحه ۳۱۸ بحواله معجم الكبير .

وسنت کے موافق ہوتی ہے نہ کہ مخالف تو اس صورت میں بھی تقلید شخصی کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ کسی بھی عالم ربانی اور حق پرست سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا کیا ارشاد ہے۔

خلاصہ کلام:...... اگر وہ خود عالم ہے اور کتاب وسنت سے استنباط کی لیاقت رکھتا ہے تو اسے تمام مسائل میں از خود کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اگر وہ خود عالم نہیں تو بمصداق:

﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ٤٣)

کسی بھی حق پرست اور کتاب وسنت کا صحیح علم رکھنے والے سے دریافت کر سکتا ہے لیکن اس طرح نہیں کہ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے بلکہ اس طرح کہ اس مسئلہ کے متعلق کتاب وسنت کا کیا فیصلہ ہے تاکہ وہ اہل الذکر فتویٰ کے لیے دلیل پیش کرے تو اس صورت میں تقلید ختم ہوگئی۔ تقلید تو اس وقت باقی رہتی جب اس عالم دین سے اپنی رائے دریافت کی جاتی اور وہ اس مسئلہ کے متعلق کتاب وسنت سے کوئی دلیل پیش نہ کرتا اور پھر محض اس کی مجرد رائے پر عمل کیا جاتا شریعت اسلامی میں اس طرز عمل کی اجازت نہیں یہی وجہ ہے کہ خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ:

"جس شخص کو بھی ہماری کسی بھی فتویٰ کی دلیل معلوم نہ ہو تو اس پر ہماری فتویٰ کے مطابق فتویٰ دینا حرام ہے۔"

مطلب کہ تقلید کو تو خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ حرام قرار دیتے ہیں کیونکہ جب اس مسئلہ کی دلیل معلوم کرنا لازم ٹھہری تو تقلید ختم ہوگئی۔ بہرحال کیا کتاب وسنت اور ائمہ کرام وسلف عظام رحمہم اللہ کے اقوال صرف اتنی بات کے محتمل ہیں کہ اگر کوئی شخص جاہل ہے یعنی اسے از خود کتاب وسنت سے مسائل استنباط کرنے کی صلاحیت نہیں تو اسے اجازت ہے کہ کسی بھی عالم لا علی التعین سے پوچھے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ ساتھ میں کتاب وسنت کی دلیل بھی پیش کرے تو آپ لوگ اگر اس کا نام تقلید رکھتے ہیں تو یہ آپ کے بس کی بات ہے اگرچہ

اصطلاحاً ''یعنی علی اصطلاح اصول الفقہ'' اسے تقلید کہنا قطعاً غلط ہے۔لیکن مذکورہ آیت کریمہ بلکہ کسی اور آیت میں تقلید شخصی یعنی معین شخص کی اتباع وتقلید کو اپنے اوپر لازم وضروری قرار دینے کا ثبوت ہرگز ہرگز نہیں ملتا کیونکہ اگر اولی الامر سے مراد علماء وائمہ لیے جائیں تب بھی اس آیت میں اتباع کا حکم لاعلی التعین ہے یعنی خاص کسی عالم یا شخص کی اتباع کا حکم نہیں۔ لہٰذا اس سے یہ استدلال کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے کہ تم امام ابوحنیفہ یا امام شافعی رحمہ اللہ کی تقلید ہر مسئلہ میں اپنے اوپر لازم کرلو یعنی:

﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ٤٣)

''پس تم اہل علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔''

میں ''اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ'' کی شرط علماء کے لیے تو تقلید کو ناجائز قرار دیتی ہے پھر یہ جو علماء احناف مسند تدریس پر بیٹھ کر حدیث وتفسیر فقہ واصول صرف ونحو، معانی وبیان وغیرہ وغیرہ پڑھاتے رہتے ہیں اور کتاب وسنت کے نکات بیان کرتے رہتے ہیں، فقہ کے مسائل کی موشگافیوں میں مشغول رہتے ہیں آخر انہیں تقلید کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اس کے باوجود بھی تقلید کرتے ہیں۔تو وہ اتنے علم کے باوجود اپنے آپ کو غیر عالم یا جاہل قرار دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ مہربانی ونعمت ''علم'' کا بھی انکار کرتے ہیں اور احسان فراموش بنتے ہیں بہر حال عالم کے لیے تقلید جائز نہیں باقی رہا جاہل تو اسے ان آیات کے مطابق صرف کسی عالم سے بمع دلیل مسئلہ دریافت کرنے کی اجازت ہے لیکن ''لا علی التعین والتشخص'' اور اس صورت میں بھی تقلید باقی نہیں رہتی بلکہ عالم جاہل کو مسئلہ کی دلیل پیش کرے گا اور وہ دلیل کی اتباع کرے گا نہ کہ اس کی مجرد رائے کی بہر حال تقلید کی یہاں بھی جڑ اکھڑ گئی گویا ان آیات سے تو مطلق تقلید بھی ثابت نہیں ہوتی پھر اگر کوئی اتباع بالدلیل کو تقلید کا نام دے پھر کھینچ کر اسے جا کر تقلید شخصی تک پہنچا دے تو وہ اپنے علم، عقل، صداقت، وامانت، سمجھ، انصاف وعدالت کا بے دردی سے خون کر رہا ہے۔

الغرض کہ آیات کریمہ میں تقلید کی طرف اشارہ تک موجود نہیں چہ جائیکہ ان کو تقلید شخصی

کے ثبوت کے لیے پیش کرنے کی جسارت کی جائے علاوہ ازیں تقلید شخصی اس وجہ سے بھی ناجائز ہے کہ مقلد اپنے متبوع کو رسالت کے منصب تک پہنچاتا ہے۔

کیونکہ کسی کو یہ سرٹیفکیٹ دینا کہ اس کی تمام باتیں سو فیصد درست ہیں اس کی کوئی بات غلط نہیں ہوسکتی یہ عمل اسے نبوت کے درجہ پر پہنچانے کے مترادف ہے اگرچہ زبان سے ہزار بار کہہ دے کہ میں اسے رسول تصور نہیں کرتا لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی شان ہے کہ اس کا ہر ارشاد صحیح ہوتا ہے کیونکہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىo اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ (النجم: ٣، ٤)

''وہ اپنی خواہش سے بات نہیں کرتا مگر وہ جو وحی کی جاتی ہے۔''

آپ ﷺ کے علاوہ کسی اور کو یہ منصب نہیں ملا پھر بھی اگر کسی اور کو ایسا سمجھ کر اس کی اتباع و تقلید کو اپنے اوپر لازم قرار دینے کا یہی مطلب ہے کہ اسے منصب رسالت پر کھڑا کرنا ہے کیونکہ عمل انسان کے عقائد و تصورات کا عنوان ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ تقلید شخصی بدعت سیئہ ہے خیر القرون میں اس بدعت سیئہ کا کوئی نام و نشان نہ تھا چار سو سالوں کے گذر جاتے ہیں لیکن تقلید شخصی ناپید ہے اور نہ ہی کتاب و سنت میں کوئی ایسا ارشاد موجود ہے کہ تم کسی ایک کو یعنی ''معین شخص کو'' ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو ہر مسئلہ و معاملہ میں اپنا متبوع اور مقتدا بنانا پھر بدعت سیئہ کس طور پر دین کا مرجع بن سکتی ہے؟ شاید کوئی یہ کہے کہ تقلید شخصی پر امت کا اجماع ہوگیا ہے لہٰذا ((لا تجتمع امتي على ضلالة)) کے مطابق درست قرار پائے گی اور تقلید شخصی جائز بلکہ لازم ہوگی۔ اس کے لیے یہ گذارش ہے کہ اجماع کی دعویٰ صرف وہی کرسکتا ہے جو یا تو جاہل ہے یا تجاہل عارفانہ سے کام لے رہا ہے آخر جس بات کا صحابہ، تابعین، تبع تابعین کے عہد مبارک میں کوئی سراغ نہیں معلوم ہوتا ہے اس کے متعلق بعد کے ادوار میں اجماع کیسے ہوسکتا ہے۔

علاوہ ازیں اجماع کرنے والے خود مقلدین ہیں اور مقلد جاہل ہیں پھر کیا کچھ جاہلوں کے کسی بات پر متفق و متحد ہونے والی بات اہل علم کے نزدیک بھی قابل عمل بن سکتی ہے آج

کل جہال کئی رسومات کو بجالاتے ہیں ان پر سختی سے عمل پیرا ہوتے ہیں گویا ان کی طرف سے ان پر اجماع ہے۔ مثلاً عرس، گیارہویں، تیجہ، رجب کے کونڈے وغیرہا وغیرہا کیا یہ سب بدعتی اعمال جہال کے اجماع کی وجہ سے اب دین حق کے ضروری اجزاء وحصے بن جائیں گے؟ ہرگز نہیں اسی طرح تقلید شخصی پر بھی ان مقلدین کا اجماع تو ہو لیکن مجتہدین تو سب ہی اسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول پہلے درج کرآئے ہیں، تقریباً باقی تمام ائمہ سے بھی اس طرح کی عبارات منقول ہیں جو کہ طوالت کے خوف سے یہاں درج نہیں کی جاتیں اب خود سوچیں کہ ایسے مقلدین کے اجماع کی کیا وقعت وحیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔ افسوس کہ آج کل حق کو پہچاننے والی آنکھ بہت مشکل سے کہیں جاکر نظر آتی ہے بہرحال تقلید شخصی بدعت سیئہ اور ناجائز اور کتاب وسنت کی رو سے باطل ہے اور اس کا ثبوت کتاب وسنت میں قطعاً موجود نہیں اور مذکورہ بالا آیت سے اس کا ثبوت پیش کرنے کی سعی کرنا مذموم جسارت اور بدترین جہالت ہے۔ اعاذنا اللّٰہ منھا"

ابھی اس کے متعلق کچھ مزید کی گنجائش ہے لیکن اسی پر اکتفاء کیا جاتا ہے کیونکہ جواب کافی طویل ہوگیا ہے۔ واللّٰہ اعلم بالصواب!

وقف کا حکم

سوال: **قرآن مجید کی ہر آیت کے آخر میں ایک گول نشان (ο) درج ہوتا ہے کیا وہاں پر وقف کرنا لازم ہے یا پھر مروجہ طریقہ یعنی "لا۔ط۔م۔ک۔ وغیرہ جنہیں رموز القرآن کے نام سے موسوم کرتے ہیں پر وقف کیا جائے۔ نیز وقف کی تفصیل واضح فرمائیں؟**

الجواب بعون الوھاب: احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات کے اختتام پر گول نشانوں پر وقف کیا جائے جیسا کہ صحیح مسلم (کتاب الصلاۃ باب وجوب القرأۃ الفاتحہ فی کل رکعۃ، رقم الحدیث ۸۷۸) میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مروی حدیث میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((قسمت الصلاة بيني وبين عبدي نصفين ولعبدي ما سأل، فاذا قال العبد الحمد لله رب العالمين، قال الله تعالىٰ حمدني عبدي واذا قال الرحمن الرحيم قال الله تعالىٰ اثنى على عبدي واذا قال مالك يوم الدين مجدني عبدي ......الخ))

ہر آیت کے آخر میں رب تعالیٰ جواب دیتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ کہہ کر کچھ وقف کیا جائے تا کہ اس کا جواب بھی ہوتا جائے۔ علىٰ هٰذا القياس. ﴿اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ﴾ پھر ﴿مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ﴾ اور اس کے بعد ﴿اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ...... الخ﴾ اسی طرح احادیث میں یہ بیان بھی ہے کہ آپ ﷺ آیت پڑھنے کے بعد کچھ توقف فرماتے تھے اور پھر دوسری آیت پڑھتے تھے۔ باقی یہ رموز القرآن یا اوقاف وغیرہا کا ثبوت حدیث شریف میں نہیں ملتا۔ لہٰذا ان پر عمل کرنے کو لازم یا مندوب ومستحب قرار نہیں دیا جا سکتا البتہ کچھ مقامات ایسے ہیں جہاں پر کچھ الفاظ کو اگلے الفاظ کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے کچھ غلط معنیٰ کا ابہام پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً سورۃ النساء (آیت ۱۱۷، ۱۱۸) میں ہے:

﴿اِنۡ يَّدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَاِنۡ يَّدۡعُوۡنَ اِلَّا شَيۡطٰنًا مَّرِيۡدًا ۙ o لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنۡ عِبَادِكَ نَصِيۡبًا مَّفۡرُوۡضًا﴾

(النسآء: ۱۱۷ تا ۱۱۸)

''اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں تو بتوں کو اور سرکش شیطان کو جس پر اللہ نے لعنت کی ہے جس نے کہا تھا کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک حصہ مقرر کرلوں گا۔''

اس آیت میں ظاہر ہے کہ لعنه الله میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے شیطان پر لعنت بھیجی گئی ہے لیکن آگے ''وقال الخ'' شیطان کا مقولہ ہے اگر کوئی شخص لعنہ اللہ پر کچھ توقف نہ کرے بلکہ ملا کر پڑھتا جائے تو غلطی سے یہ ابہام ہوسکتا ہے کہ ''وقال کا قائل بھی نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ لفظ اللہ ہے'' جو کہ لعنه الله میں ہے اور یہ قطعاً غلط ہے اور اسی طرح کچھ دیگر بھی

مقامات ہیں جن پر کچھ توقف کیا جائے تو بہتر ہے یعنی اس جگہ (مثلاً) "لعنه الله" پر کچھ توقف کرے پھر آگے پڑھا جائے مگر یہ محض قرآن کو واضح پڑھنے کے باب میں سے ہے جو ﴿ورتل القرآن ترتیلا﴾ میں داخل سمجھا جائے گا باقی چونکہ اس کے متعلق قرآن وحدیث میں وضاحت کے ساتھ ان مقامات ومواضع پر وقف کا طریقہ موجود نہیں اس لیے اسے لازم قرار نہیں دیا جائے گا یہ محض اپنی طرف سے ایک کوشش ہے جو انسان قرآن حکیم کے احترام اور آداب کے باب میں سے سمجھے۔ان اوقاف پر عمل ہر شخص اپنے وسعت علم کے موجب کرتا ہے مگر اس پر عمل کرنے کو واجب یا ضروری قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کچھ بھی وارد نہیں ہوا۔

اس آیت میں "لعنه الله" کے اوپر لکھا ہوتا ہے "وقف لازم" لیکن یہاں لزوم سے مراد لزوم شرعی نہیں ہے۔محض اپنی طرف سے آداب واحترام کا لحاظ ہے اسی طرح دیگر رموز الاوقاف کو بھی تصور کیا جائے یعنی وہ سب محض انسانی کوششیں ہیں۔ چونکہ ان کے متعلق حدیث میں کچھ بھی وارد نہیں ہوا لہٰذا ان کو ضروری سمجھ کر ان پر عمل درآمد کو لازم سمجھنا درست نہیں۔ باقی اگر کوئی ان کو غیر ضروری سمجھتا ہے لیکن پھر بھی ان رموز کے مطابق وقف کرتا ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں مگر آیات کے اختتام پر گول نشان کے پاس تھوڑا سا توقف کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حافظہ کی دعا

سوال: کیا احادیث صحیحہ سے کوئی حافظہ کے لیے دعا ثابت ہے اگر ہے تو آگاہ فرمائیں۔

الجواب بعون الوهاب:

محترم برادرم میاں انعام الرحمٰن صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ: اما بعد!

آپ کا خط ملا جواب درج ذیل ہے۔

❶ :......ترمذی شریف میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے حسن سند کے ساتھ روایت مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں مجھ سے قرآن بھلا دیا جاتا ہے میرے سینے میں محفوظ نہیں رہتا پھر میں اپنے اندر اتنی طاقت نہیں سمجھتا کہ اس کو محفوظ رکھ سکوں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا کہ اے ابوالحسن کیا میں آپ کو وہ چند کلمات نہ سکھاؤں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آپ کو نفع پہنچائے اور جن کو آپ سکھائیں ان کو بھی وہ کلمات نفع پہنچائیں اور جو تو سیکھے وہ بھی تیرے سینے کے اندر محفوظ رہے۔سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کیوں نہیں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم وہ ضرور مجھے سیکھائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب جمعہ کی رات ہو اور آپ رات کے آخری حصہ میں اٹھنے کی طاقت رکھتے ہوں تو اس وقت اٹھیں کیوں کہ یہ وقت فرشتوں کے حاضر ہونے کا ہے اور اس وقت کی دعا مستجاب ہے، میرے بھائی یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے بیٹوں کو کہا تھا ﴿سوف استغفر لکم ربی﴾ یعنی عنقریب میں تمہارے لیے تمہارے رب سے دعا کروں گا۔ پھر (اے علی رضی اللہ عنہ) رات کے اس ٹائم اگر اٹھنے کی طاقت نہیں تو پھر درمیانی حصہ میں اٹھ اگر اس ٹائم میں بھی اٹھنے کی طاقت نہیں تو پھر اول حصہ میں اٹھ اور پھر چار رکعتیں پڑھ اس طرح کہ پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورت یٰس پڑھ اور دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ اور حم دخان، تیسری رکعت میں سورۃ فاتحہ اور الم تنزیل السجدہ اور چوتھی رکعت میں سورۃ فاتحہ اور تبارک الذی بیدہ الملک" پھر چوتھی رکعت میں التحیات کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کر اور مجھ پر درود بھیج پھر تمام انبیاء کرام پر بھی صلوٰۃ وسلام بھیج پھر تمام مومن مرد اور مومنہ عورتوں کے لیے مغفرت کی دعا مانگ اور تجھ سے قبل جو تمہارے مسلمان بھائی فوت ہو چکے ہیں ان کے لیے بھی مغفرت کی دعا مانگ (یعنی یوں کہو)

"ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا باالایمان ."

پھر آخر میں یہ دعا مانگو:

((اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِي بِتَرْكِ الْمَعَاصِي أَبَدًا مَا أَبْقَيْتَنِي وَارْحَمْنِي أَنْ أَتَكَلَّفَ مَا لاَ يَعْنِينِي وَارْزُقْنِي حُسْنَ النَّظْرِ فِيمَا يُرْضِيكَ عَنِّي

اَللّٰهُمَّ بَدِيعَ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ ذَا الْجَلاَلِ وَالإِكْرَامِ وَالْعِزَّةِ الَّتِي لاَ تُرَامُ أَسْأَلُكَ يَا اللّٰهُ يَا رَحْمٰنُ بِجَلاَلِكَ وَنُورِ وَجْهِكَ أَنْ تُلْزِمَ قَلْبِي حِفْظَ كِتَابِكَ كَمَا عَلَّمْتَنِي وَارْزُقْنِي أَنْ أَتْلُوَهُ عَلَى النَّحْوِ الَّذِي يُرْضِيكَ عَنِّي اَللّٰهُمَّ بَدِيعَ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ ذَاالْجَلاَلِ وَالإِكْرَامِ وَالْعِزَّةِ الَّتِي لاَ تُرَامُ أَسْأَلُكَ يَا اَللّٰهُ يَا رَحْمٰنُ بِجَلاَلِكَ وَنُورِ وَجْهِكَ أَنْ تُنَوِّرَ بِكِتَابِكَ بَصَرِي وَأَنْ تُطْلِقَ بِهِ لِسَانِي وَأَنْ تُفَرِّجَ بِهِ عَنْ قَلْبِي وَأَنْ تَشْرَحَ بِهِ صَدْرِي وَأَنْ تَغْسِلَ بِهِ بَدَنِي لأَنَّهُ لاَ يُعِينُنِي عَلَى الْحَقِّ غَيْرُكَ وَلاَ يُؤْتِيهِ إِلاَّ أَنْتَ وَلاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إِلاَّ بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ))

اے ابوالحسن یہ کام آپ تین یا پانچ یا سات جمعہ کریں گے تو اللہ تعالی کے حکم سے تمھاری ہر دعا قبول ہوگی اور اس ذات کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ یہ دعا کسی مومن سے خطانہیں ہوگی۔ (یعنی قبول ہوگی)

حدیث کے راوی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قسم سیدنا علی رضی اللہ عنہ پانچ سات جمعہ بعد پھر دوبارہ اس طرح کی مجلس میں آئے اور کہا اے اللہ تعالیٰ کے رسول بیشک اس سے قبل میں قرآن کریم کی چار یا اس سے مثل آیات ہی یاد کرسکتا تھا لیکن پھر بھی بھلا دی جاتی تھیں لیکن آج (یعنی دعا پر عمل کرنے کے بعد) یہ حال ہے کہ چالیس یا اس کے مثل آیات یاد کرتا ہوں اور پھر جب منہ زبانی پڑھتا ہوں تو گویا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میری آنکھوں کے سامنے ہے اور (یہی حال حدیث میں ہے) اس سے قبل میں حدیث سنتا تھا لیکن بعد میں وہ بھول جاتی تھی لیکن آج کتنی ہی حدیثیں اور باتیں سنتا ہوں پھر جب ان کی دہرائی کرتا ہوں تو ان سے ایک حرف بھی کم نہیں ہوتا اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوالقاسم کعبہ کے رب کی قسم آپ مومن ہیں۔ [1]

---

[1] سنن ترمذی شریف:کتاب الدعوات ، باب فی دعاء الحفظ ، رقم الحدیث: ۳۵۷۰.

بہر حال یہ پوری کی پوری حدیث قرآن کریم کے حفظ کو آسان بنانے کے لیے لکھی ہے۔

چاند ایک ہے یا زیادہ

سوال: ایک مولوی صاحب نے کہا ہے کہ موجودہ چاند اس آسمان دنیا پر ہے مگر اس قسم کے دوسرے چاند دیگر آسمانوں پر بھی ہیں اور ہر کسی آسمان پر الگ الگ چاند ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ یہ حقیقت میں قرآن وحدیث سے ثابت کردوں گا یہ دعویٰ اپنے اندر کتنی صداقت رکھتی ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب بعون الوھاب: یہ دعویٰ بھی بالکل باطل ہے مدعی کو قرآن وصحیح حدیث (جو متصل مسند کے ساتھ مروی ہو) سے اس دعویٰ کو ثابت کرنا چاہیے وگرنہ اپنے اس دعوے سے رجوع کرے۔ واللہ اعلم بالصواب

آسمانی دروازے

سوال: قرآن کریم میں ہے کہ آسمان کے دروازے ہیں۔ سورۃ الاعراف میں ہے کہ کافروں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور سورۃ النباء میں ہے کہ قیامت والے دن آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے معلوم ہوا کہ آسمان کے دروازے ہیں اسی طرح معراج والی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب پہلے آسمان پر پہنچے تو جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا گیا آپ کے ساتھ دوسرے کون ہیں جبریل علیہ السلام نے جواب دیا کہ محمد ﷺ ہیں پھر آسمان کے محافظ نے سوال کیا کہ کیا ان کو بلایا گیا ہے جبریل علیہ السلام نے جواب دیا جی تو آسمان دنیا کا دروازہ کھولا گیا پھر آپ ﷺ اوپر کی طرف چڑھے اور اسی طرح تمام آسمانوں پر اس طرح کے سوالات وجوابات ہوئے اور جوابات ملنے کے بعد ہی دروازہ کھلتا گیا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ اور جبریل علیہ السلام کے لیے بھی اجازت کے بعد ہی آسمان کے دروازے کھلے ہیں اور بغیر اجازت کے نہیں کھل سکتے تھے تو

پھر امریکن خلابازوں کے لیے آسمانوں کے دروازے کس طرح کھل گئے کہ وہ بغیر کسی روک ٹوک کے آسمانوں سے ہوتے ہوئے سیدھا جا کر چاند پر اترے اور اس وقت اخبارں اور میڈیا کی چاند کے متعلق باتوں کو سن کر جب حدیث کو دیکھتے ہیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ یا الٰہی یہ کیا ہے واقعی چاند کو فتح کیا گیا ہے؟ اور اُدھر قرآن میں یہ فرمایا گیا ہے کہ سورج اور چاند چلتے ہیں اب یہ بتائیں کہ اگر چاند چلتا ہے تو پھر کس طرح امریکن خلاباز وہاں پر پہنچے کیونکہ جتنا راکٹ چلے گا اس سے کہیں زیادہ تیز چاند چلتا رہے گا پھر کس طرح چاند کو فتح کیا گیا ہے یہاں پر اسلام اور سائنس کا زبردست ٹکراؤ ہے اس کے متعلق وضاحت کے ساتھ جواب دیا جائے تاکہ حیرانگی دور ہو جائے؟

الجواب بعون الوهاب: سوال نمبر۲ کے جواب میں عرض رکھا کہ دروازوں سے مراد شرعی آسمان کے دروازے ہیں نہ کہ یہ آسمان یا عالم بالا کے وہ خطہ جو مشاہدہ میں آتے ہیں کیونکہ معراج والی روایت میں جو بیان ہے وہ اس عالم محسوسات سے ماوراء اور غیب کے علم سے تعلق رکھنے والا ہے جس کا مشاہدات اور محسوسات سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ ہمارا مکمل ایمان ہے کہ وہ دروازے بھی تھے اور کھولے بھی گئے تھے اس کے محافظ بھی تھے لیکن اس حقیقت کا ہمیں پوری طرح ادراک نہیں ہے۔ اس کی پوری حقیقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو ہی معلوم ہوگی ہمارا کام اس حقیقت پر بغیر چوں چراں ایمان لانا ہے۔

بخاری شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا کہ یہ جبریل علیہ السلام کھڑا ہے جو آپ کو سلام کہہ رہا ہے سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں فرمایا: "وعلیہ السلام ورحمة الله وبركاته" آپ (یعنی نبی کریم ﷺ) وہ دیکھتے ہو جو میں نہیں دیکھ سکتی۔ تو دیکھو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پاس کھڑی ہیں لیکن حضرت جبرئیل علیہ السلام کو نہیں دیکھ سکتیں لیکن آپ ﷺ ان کو دیکھ رہے تھے اور اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایمان تھا۔

اسی طرح نبی ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو صرف دو مرتبہ اصلی حالت میں دیکھا جس طرح حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ان کو دیکھا کہ آسمان کے

پورے افق کو گھیرا ہوا تھا (کرسی پر) تو اتنی بڑی جسامت رکھنے کے باوجود وہ ہستیاں ہمیں کیوں نظر نہیں آتیں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان کے وجود کے ہی منکر ہو جائیں؟ کیا یہ کوئی عقلمندی ہوگی یا اس کو حد درجہ کی جہالت اور بیوقوفی کہا جائے؟ دراصل بات یہ ہے کہ اللہ کی مخلوقات میں بیشمار ایسی چیزیں ہیں جن کو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ ایسا بھی کوئی وقت تھا جب بیکٹیریا (Gersomes) کے بارے میں لوگوں کو کچھ پتہ نہیں تھا لیکن طاقتور خورد بین کے ذریعے اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

حالانکہ ایک صدی قبل ان کے متعلق کوئی بات بھی کرتا تو کوئی ماننے کے لیے تیار بھی نہ ہوتا لیکن کیا ان کا نہ ماننا علمی دنیا میں کوئی وقعت رکھتا ہے؟ ہرگز نہیں! لیکن چونکہ آج اس کے مشاہدہ کے ذرائع فراہم ہو چکے ہیں اس لیے اگر کوئی انکار کرے گا تو اس پر نہ صرف جگ ہنسائی ہوگی بلکہ ہر کوئی اسکی جہالت اور بے علمی پر افسوس کا اظہار کرے گا۔

بعینہٖ اسی طرح فرشتے اور بہت ساری دوسری چیزیں جن کا تعلق غیب سے ہے موجود ہیں لیکن فی الحال ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ کیونکہ اس وقت ہم سے ایمان بالغیب مطلوب ہے اور دوسرا کوئی ایسا ذریعہ بھی موجود نہیں ہے کہ جس کے سبب اس کا مشاہدہ کیا جا سکے۔ لیکن قیامت کے دن یہ تمام پردے چاک ہو جائیں گے اور حائل تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ پھر بہت ساری غیب کی چیزیں مشاہدہ میں آ جائیں گی۔

حتیٰ کہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ اپنا دیدار نصیب کریں گے۔ اس لیے کوئی بھی عقلمند کسی چیز کا صرف اس لیے انکار نہیں کرسکتا کہ وہ چیز اس کو نظر نہیں آتی۔ یہ تو ہمارے روزمرہ کا دستور ہے کہ اگر کوئی قابل اعتماد آدمی خبر دیتا ہے تو ہم اس پر اعتبار کر لیتے ہیں صرف اس لیے کہ خبر دینے والا قابل اعتماد ہے۔

اسی طرح اگر ان حقائق کے بارے میں ہمیں اصدق القائلین جناب محمد ﷺ کوئی خبر دیں تو ہمیں بغیر کسی چوں چرا اس پر کامل یقین ایمان رکھنا ہے۔ کیا آپ ﷺ کی باتوں پر ہمارا اتنا پختہ یقین نہیں ہے جتنا ایک عام آدمی کی بات پر ہوتا ہے؟ اگر اس طرح

ہے تو پھر ہمارے اندر ایمان ہی نہ رہا۔ اسی طرح بہشت (جنت) وغیرہ جس کا مومن بندوں کے ساتھ وعدہ ہے جوکہ آسمانوں پر ہے جس کا ہم مشاہدہ بھی نہیں کر سکتے:

﴿وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ﴾ (الذاریات: ۲۲)

''تمھاری روزی اور جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے سب آسمان میں ہے۔''

تو کیا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہمارا اتنا اوپر جانے کے باوجود بھی (یعنی راکٹوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے) وہ ہمیں نظر نہیں آتے لہٰذا وہ ہیں ہی نہیں؟ کیا ایک مومن یہ عقیدہ رکھ سکتا ہے؟ دراصل بات یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں موجود ہیں لیکن ہمارے امتحان کی وجہ سے ان کو پردہ میں رکھا ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں یا نہیں؟ پھر قیامت کے دن اس پردے کو ہٹایا جائے گا جیسے قرآن میں ہے:

﴿وَإِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ﴾ (التکویر: ۱۱)

''اور جب آسمان کی کھال اتار لی جائے گی۔''

یہاں مراد اس پردہ کے ہٹانے کا ہے جو تمام چیزوں کے سامنے حائل ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ ہٹے گا تو پوری حقیقت بالکلیہ آنکھوں کے سامنے آجائے گی اور سورۃ نباء کا جو ترجمہ کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے یہ ترجمہ غلط ہے اصل آیت کریمہ اس طرح ہے:

﴿وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا﴾ (النبا: ۱۹)

''کہ آسمان کھولا جائے گا پس وہ ہو جائے گا دروازے دروازے۔''

یہ بعینہٖ وہی بات ہے جس کو ہم نے پیچھے ذکر کیا یعنی عالم بالا جو ہماری نظروں سے مستور ہے وہ کھولا جائے گا اور غیبی پردے ہٹا دیئے جائیں گے پھر اس کے دروازے ظاہر ہو جائیں گے۔

معلوم ہوا کہ آسمان میں ابھی بھی دروازے ہیں جو ہماری آنکھوں سے مستور ہیں۔

سورۃ النباء کی یہ آیت ان دروازوں کے متعلق بالکلیہ فیصلہ کن بات بتاتی ہے اگر اس پر

غور کیا جاتا یا اس کے مطلب کی تہہ تک پہنچنے کی سعی کی جاتی تو اس طرح کے اعتراضات یا شبہات پیش ہی نہ آتے۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے بعد آتے ہیں چاند پر پہنچنے والی بات کی طرف۔ اگر اندھی تقلید مانع نہ آئے اور ہر تحقیق کو قبول نہ کرنے کا سبب صرف اسی کا نیا ہونا نہ ہوتو معاملہ بالکل آسان ہے۔ جتنا بھی غور سے قرآن کریم کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ قرآن حکیم اس کائنات اور مشاہدہ میں آنے والی موجودات کی ہر چیز پر پہنچنے کا قائل ہے۔ چند آیات ملاحظہ کریں۔

﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً﴾ (لقمان: ٢٠)

''کیا تم نے نہیں دیکھا اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی ہر چیز کو تمھارے کام میں لگا رکھا ہے اور تمھیں اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں بھرپور دے رکھی ہیں۔''

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾

(الجاثیہ: ١٢، ١٣)

''اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے دریا کو مطیع بنادیا تاکہ تم اس میں چل پھر کر اس کا فضل (رزق) تلاش کرو اور ممکن ہے کہ تم شکر بجالاؤ اور آسمان وزمین کی ہر ہر چیز بھی اس نے اپنی طرف سے تمھارے تابع کردی جو اس میں غور کریں وہ یقیناً بہت سے دلائل پالیں گے۔''

ان دونوں آیات کریمہ میں بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اوپر نیچے ہر چیز کو انسان کے تابع بنایا ہے۔ (ما فی السمٰوات) میں چاند اور دوسرے سیارے بھی آجاتے ہیں۔ لہٰذا آج اگر انسان چاند پر پہنچا ہے تو پہنچ سکتا ہے اس میں کون سی تعجب والی بات ہے یہ تو آپ ﷺ کی صداقت اور برحق نبی ہونے کی ایک ٹھوس دلیل ہے کیونکہ آپ ﷺ نے بذریعہ وحی وہ

خبر دی جس کے متعلق اس وقت کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن چودھویں صدی کے اختتام پر وہ سچ ثابت ہوئی ہے یہ آپ کی صداقت کی کتنی بڑی دلیل ہے اس میں اسلام اور سائنس کی کون سی ٹکر ہے اس کے برعکس خود سائنس نے عملی طرح اس وحی کی بتائی ہوئی بات کی چودہ سو سال کے بعد تصدیق کی ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر ہے ؎

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر چڑھ جانے سے مجھے یہ سبق ملا ہے کہ اوپر کے عالم یا فضائے بسیط یا کائنات کی دوسری مشاہدہ میں آنے والی چیزیں انسانی پہنچ پر ہیں۔ انسان ان تک پہنچ سکتا ہے۔

بہرحال کائنات میں جو بھی چیز مشاہدہ میں آنے والی ہے چاہے اوپر ہو یا نیچے، وہاں انسانی رسائی ممکن ہے قرآن اس حقیقت کو مانتا ہے۔ یہاں یہ الگ بات ہے۔ کہ ان چیزوں میں سے عملاً کن کن چیزوں پر انسان واقعی پہنچے گا کیونکہ یہ تو مستقبل کی بات ہے جس کا علم رب البرکات کے علاوہ کسی کو بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر کہیں بھی پہنچا تو یہ قرآن وحدیث کی بتائی ہوئی حقیقت کے متصادم نہیں ہوگا۔

بلکہ خود اس کا مؤید اور صداقت کا قائل ہوگا۔ شرعی آسمان کا الگ ہونا اور چاند وسورج کی گردش کے مداروں کا الگ ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بلکہ مجھ سے قبل ۹ نویں صدی کے زبردست عالم حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مایہ ناز کتاب ''فتح الباری شرح الصحیح البخاری'' میں فرماتے ہیں:

''والحق ان الشمس فی الفلك الرابع والسمٰوات للسبع عن اهل الشرع غير الافلاك انتهى .'' (فتح الباری: ج٦، ص٢٥٩)

''یعنی حق بات یہ ہے کہ سورج چوتھے فلک میں ہے اور سات آسمان شریعت والوں کے ہاں افلاک کے علاوہ دوسرے ہیں۔''

یعنی فلک دوسری چیز ہے اور آسمان شرعی دوسری چیز۔ اور فلک کہا جاتا ہے اس کھلی فضا میں کسی سیارے یا ستارے کی گردش کی حد یا دائرہ یا مدار کو باقی آسمان شرعی دوسری چیز ہے۔ جس کے متعلق سیر حاصل بحث دوسرے سوال کے جواب اور اس سوال کے جواب میں عرض رکھی کہ انسان کی پہنچ آسمان شرعی پر ناممکن ہے نہ کہ ان افلاک پر کیونکہ یہ افلاک تو انسان کی زد میں ہیں ان تک انسانی رسائی ممکن ہے۔

قرآن کریم نے بھی ان کی گردش یا پھرنے کو فلک میں فرمایا ہے نہ کہ آسمان میں جس طرح سورۃ یٰس اور سورۃ الانبیاء کے اندر یہ الفاظ ہیں:

﴿كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ﴾

یعنی وہ سارے کے سارے اپنے اپنے فلک یا دائرے میں گھوم رہے ہیں۔ اور انسان کی پہنچ آسمان شرعی پر محال ہے کیوں کہ یہ غیب کے علم سے ہے اور پیچھے جو فتح الباری کی عبارت نقل کی اس میں بھی یہ صراحت ہے کہ آسمان شرعی اور فلک دو الگ چیزیں ہیں دونوں کو خلط ملط کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

باقی یہ سوال رہے گا کہ قرآن کریم میں ہے کہ عالم بالا میں ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ شیطان ملأ الاعلیٰ کی گفتگو نہیں سنتے۔ اور اگر کوئی شیطان اس گفتگو کو سننے کی کوشش بھی کرتا ہے تو اس پر دھکتا ہوا انگارہ پھینکا جاتا ہے تو پھر جب اوپر شیطان بھی نہیں پہنچ سکتا تو انسان کس طرح پہنچ سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی درحقیقت شرعی آسمان کو محسوس اور مشاہدہ میں آنے والے آسمان یا عالم بالا کو خلط ملط کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، یعنی وہ شیاطین ملاء الاعلیٰ کی باتوں کو کان لگا کر سننے کی کوشش کرتے ہیں اور ملاء الاعلیٰ شرعی آسمان میں ہیں نہ کہ اس کلی فضا میں چونکہ ابلیس فرشتوں کے ساتھ کافی عرصہ رہا تھا پھر اللہ کے حکم کی نافرمانی کی وجہ سے اس کو وہاں سے نکالا گیا اس لیے اس کی اولاد بھی ان فرشتوں تک پہنچنے اور بات سننے کی ناکام کوشش کرتی ہے اور چونکہ شیطان جنوں میں ہیں انسان کے مقابلے ان کو زیادہ اختیار حاصل ہے اور اللہ کی طرف سے اختیار چلانے کی قدرت حاصل ہے۔

مثلاً وہ شکلیں بدل سکتے ہیں۔ دور سے وسوسہ ڈال سکتے ہیں اور حدیث میں آتا ہے شیطان انسان کے خون کے اندر چلتا ہے اسی طرح کئی دوسری باتیں ہیں لہٰذا شیطان جو کہ اصل میں وہاں کا رہائش پذیر تھا اس لیے وہاں تک پہنچنا اور وہاں کی گفتگو سننا اس کے اور اس کی اولاد کے لیے کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا انتظام کیا ہے کہ جب بھی کوئی وہاں پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو وہاں سے اس پر دھکتا ہوا انگارہ پھینکا جاتا ہے اور اتنی قدرت ان کو اس وجہ سے ملی ہوئی ہے کہ وہ انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے دن رات کوشاں ہوتے ہیں اور انسان کے امتحان کے لیے یہ (اجازت) ان کو قیامت کے دن تک ملی ہوئی ہے اس لیے وہ ملأ الاعلیٰ تک پہنچ کر ایک آدھی بات سن کر پھر اس میں کئی جھوٹ ملا کر اپنے دھوکے باز نجومیوں کے کان میں ڈالتے ہیں، جو خلق خدا کو ہر وقت گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ بس اس حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو سوال حل ہو جائے گا۔

باقی رہی یہ بات کہ چاند چلتا رہتا ہے پھر راکٹ وہاں پر کیسے پہنچا؟ تو یہ سوال شاید کچھ غور فکر کئے بغیر رکھا گیا ہے۔ چاند برابر چل رہا ہے لیکن اس کی چال چلن اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے اس رفتار پر چلتا ہے اس طرح نہیں ہے کوئی چیز اگر اس کے پیچھے سے آتی ہے تو وہ دوڑ لگا کر تیز بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ پیچھے والا اس تک نہ پہنچ سکے۔ چاند کا معاملہ اس طرح نہیں ہے بلکہ اس کی رفتار رب کریم عزوجل کی طرف سے مقرر کی ہوئی ہے لہٰذا وہ اپنی رفتار میں ہی چلتا ہے چاہے اس کے پیچھے کوئی آئے یا نہ آئے۔ اس بات کو سمجھنے کے بعد اب دیکھیں کہ ایک جیپ حیدرآباد سے تقریباً صبح ۸ بجے نکلتی ہے جو آدھے گھنٹے میں خیبر پہنچتی ہے اور خیبر حیدرآباد سے ۴ میل دور ہے اس کے بعد ساڑھے ۸ بجے حیدرآباد سے ایک تیز رفتار کار نکلتی ہے جس کی رفتار اس جیپ سے دگنی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا جس جگہ ۹ بجے وہ جیپ پہنچے گی وہاں پر بعینہٖ اسی وقت ساڑھے ۸ بجے نکلی ہوئی کار بھی آکر پہنچے گی۔

حالانکہ جیپ بھی چلتی رہی اور کار بھی اس کے پیچھے چلتی رہی لیکن چونکہ کار کی رفتار جیپ کی رفتار سے دگنی تھی۔ یہ تو ہمارا روز مرہ کا مشاہدہ ہے اور واضح بات ہے معمولی سمجھ والا

بھی اس کو سمجھ سکتا ہے بس اسی طرح چاند کی رفتار بھی معلوم ہے پھر اگر انسان کوئی ایسی سواری ایجاد کر دے جس کی رفتار چاند سے زیادہ تیز ہو تو وہ چاند کو پہنچ سکتی ہے۔

تیز سے تیز سواریاں آج ہر روز مشاہدہ میں آ رہی ہیں۔ راکٹ کو تو چھوڑو اس کی رفتار بہت تیز ہے لیکن آج کل کے ہوائی جہاز جو ایک گھنٹہ کے اندر ہی ہزار میل سے بھی زیادہ کا فاصلہ طے کرتے ہیں تو اس سے اندازہ لگائیں کہ اللہ نے انسان کو کتنی قدرت عطا فرمائی ہے اور یہ سب کچھ اس ارشاد کا ظہور ہے جو ابونا آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت رب تعالیٰ نے فرشتوں کو فرمایا تھا:

﴿اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرة: ٣٠)

''بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔''

تو پھر جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو اتنی قدرت عطا فرمائی ہے تو اس میں تعجب اور حیرانگی کی کیا بات ہے کہ انسان ایسی تیز رفتار سواری ایجاد کر دے جو چاند تک پہنچ جائے۔

گذشتہ اوراق میں یہ آیت بھی گذر چکی ہے جس میں یہ حقیقت بیان ہے کہ عالم بالا اور عالم ارضی کی ہر چیز جو مشاہدہ میں آئے وہ انسان کے تابع بنائی گئی ہے یعنی چاند وغیرہ پر انسانی رسائی ممکن ہے (قرآن کریم کے مطابق) پھر خواہ مخواہ انکار کر کے جگ ہنسائی کا کیوں موقع دیا جائے۔ بلکہ یہ تو خود قرآن اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر بڑی دلیل ہے۔

باقی یہ بات کہ قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے اوپر سے آسمان کا ٹکڑا عذاب کی خاطر گرا دے تو اس کو سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں ہے، کیونکہ ہمارے اوپر بے شمار سیارے اور تارے وغیرہ ہیں جن میں کچھ ستارے زمین سے بھی بڑے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسی چیزیں زمین کے اوپر چھت کا کام دیتی ہیں پھر ان سے کوئی ٹکڑا آ کر زمین پر گرے تو وہ بھی آسمان سے ہی آیا یعنی عالم بالا یا اوپر کی دنیا سے اور ایسے گرے ہوئے ٹکڑے دنیا کے مختلف ممالک میں مشاہدہ میں آئے ہیں۔

اور دنیا کو مختلف جگہوں پر ایسے ٹکڑے گرے تھے اور زور سے گرنے کی وجہ سے زمین میں

کافی نیچے چلے گئے اور وزن کے اعتبار سے کئی ٹن تھے اس لیے اس بات میں کوئی استبعاد نہیں ہے اوپر یہ بھی ذکر کیا کہ لغت میں بادلوں کو بھی سماء کہا جاتا ہے تو اس میں کون سی قباحت کی بات ہے؟ کہ ان بڑے بڑے سیاروں کو بھی سماء کہا جائے بلکہ یہ عین لغت کے مطابق ہے۔ کما لا یخفی ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب!

کیا سورج غروب ہوتا ہے؟

سوال: سورج غروب ہوتا ہے یا چاروں اطراف گھومتا رہتا ہے اور پھر واپس اپنی جگہ سے آکر طلوع ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ ذوالقرنین نے سورج کو غروب ہوتے دیکھا کہ وہ کیچڑ والے پانی میں اتر رہا تھا اس کا کیا مطلب ہے؟ اور صحیح بخاری میں ہے کہ سورج روزانہ اللہ تعالیٰ کے عرش عظیم کے نیچے آکر سجدہ کرتا ہے اور واپس جانے کے لیے اجازت مانگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب اسے مغرب سے طلوع کرنا چاہے گا اس رات سورج کو اجازت نہیں ملے گی اور اسے کہا جائے گا کہ جہاں سے غروب ہوا ہے وہیں سے جا کر طلوع ہو جا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورج طلوع وغروب ہوتا ہے۔ مگر جب اوقات کو دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سورج غروب ہوتا ہی نہیں۔ مغربی تہذیب والے کہتے ہیں کہ سائنس سے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ درست ہے باقی مولوی حضرات خوامخواہ اپنا سر کھپا رہے ہیں۔ اب تفصیل کے ساتھ سمجھایئے کہ قرآن کریم اور صحیح بخاری کی حدیث کا کیا مطلب ہے تاکہ حق بات معلوم ہو جائے؟

الجواب بعون الوھاب: اولاً یہ حقیقت ذہن نشین رہے کہ کتاب وسنت میں جو الفاظ وارد ہوئے ہیں وہ انسانوں کے زمانوں میں چلنے والے محاورات کے لحاظ سے لائے گئے ہیں اس لیے ان الفاظ کو دیکھ کر ان کی معنی بھی بالکل اسی طرح سمجھنا جس طرح بظاہر سمجھ میں آرہا ہے درست نہیں مثلاً سورج کے نظروں سے غائب ہونے کو ہم اپنی زبان میں غروب ہونا کہتے ہیں اور عرب بھی غروب کے مادہ کو استعمال کرتے ہیں اس لیے قرآن کریم میں یہ لفظ استعمال

کیا گیا ہے لہٰذا اس سے یہ مطلب سمجھنا کہ سورج واقعتاً نیچے کسی کھڈے میں غروب ہو گیا ہے قطعاً غلط ہوگا، ظاہر ہے کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لیے وہ کسی بات یا حقیقت کو بیان کرنے کے لیے ضرور وہی الفاظ استعمال کرتا جو عربی زبان میں مروج تھے ایسا کوئی دوسرا لفظ استعمال نہیں کرتا جو اس زبان میں مروج نہ تھا ورنہ وہ اہل زبان اس پر سخت انکار کرتے اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ گذارش ہے کہ قرآن وحدیث میں یہ بیان موجود نہیں کہ سورج زمین کے چاروں اطراف گھوم رہا ہے۔ البتہ قرآن میں اتنا ضرور ہے کہ سورج اوپر خلا میں حرکت کر رہا ہے اور ایک خاص وقت تک حرکت کرتا رہے گا۔ آج کل کی سائنس بھی اسے تسلیم کرتی ہے کہ واقعتاً سورج چلتا رہتا ہے باقی زمین کے گرد چلتا اور گھومتا ہے یا نہیں اس بارے میں قرآن شریف نے کچھ بھی بیان نہیں کیا۔

موجودہ سائنس تو کہتی ہے کہ زمین ہی اس کے گرد گھوم رہی ہے سو اگرچہ انہوں نے اپنی اس دعویٰ پر کوئی مضبوط دلیل پیش نہیں کی تاہم اگر واقعتاً زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے تو بھی اس کا قرآن وحدیث میں انکار نہیں ہے باقی قرآن شریف میں جو غروب کا لفظ آیا ہے اس کے متعلق پہلے ہی گذارش کر دی گئی ہے کہ غروب سے مراد نظروں سے اوجھل ہونا مراد ہے نہ کہ نیچے اتر جانا باقی یہ لفظ کیوں استعمال ہوا اس کے متعلق بھی گذارش کر دی گئی کہ اس وقت عرب میں یہی لفظ مستعمل تھا لہٰذا اسے استعمال کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ سورج اوپر خلاء میں گھوم رہا ہے اور ایک مقررہ وقت تک حرکت کرتا رہے گا۔ موجودہ سائنس بھی یہ تسلیم کرتی ہے کہ واقعتاً سورج حرکت کر رہا ہے اور گھوم رہا ہے اگرچہ ان کے کہنے کے مطابق وہ اپنے مدار (حساب کتاب) سے گھوم رہا ہے نہ کہ زمین کے گرد اور اس بات کو قرآن پاک نے نہیں چھیڑا۔

باقی سورج کے غروب ہونے کا مطلب اسی خطہ سے (جہاں غروب ہوا ہے) نظروں سے غائب ہو جانا ہے اس کا مطلب نیچے کسی گڑھے (یا کھائی) وغیرہ میں اترنا نہیں ہے۔

باقی رہی ذوالقرنین والی بات تو سوال میں کہا گیا ہے کہ ذوالقرنین نے سورج کو کیچڑ

والے پانی میں اترتے دیکھا یہ قرآن کریم کے لفظ کا صحیح ترجمہ نہیں کیونکہ قرآن پاک کے الفاظ ہیں کہ:

﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾

(الکهف : ٨٦)

''یعنی یہاں تک کہ ذوالقرنین جب سورج کے اترنے کی جگہ پر جا پہنچا (یعنی مغرب کی طرف انتہا تک جا پہنچا یعنی جہاں خشک زمین ختم ہو جاتی ہے اور سمندر شروع ہو جاتا ہے اور (اسے بحر روم یا جسے بھونوچ سمندر کہا جاتا ہے جو یورپ اور ایشا اور افریقہ کے درمیان میں) وہاں جا پہنچا تب اسے اس طرح سمجھ میں آیا کہ سورج کیچڑ والے پانی میں اتر رہا ہے۔''

یہ الفاظ اس لیے کہے گئے کہ ذوالقرنین ایسی جگہ پر جا پہنچا تھا جہاں سے آگے خشکی کا راستہ بالکل نہ تھا بلکہ پانی ہی پانی تھا اور (اس کے کنارے پر کھڑے ہونے کے بعد ہر کسی کو یہی محسوس ہوگا کہ سورج پانی میں اتر گیا جیسا کہ حجاج کرام کو جب وہ حج پر جاتے ہیں تو کراچی سے کچھ آگے سمندر میں پہنچنے کے بعد ہر روز سورج سمندر سے طلوع وغروب ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے یہاں تک کہ خشکی کے قریب نہ پہنچ جائیں۔

بہرحال ذوالقرنین مغرب کی جانب خشکی کی آخری حد پر جا پہنچا تھا (یعنی اقصائے مغرب) جس کے بعد پانی ہی پانی تھا۔ لہٰذا اسے سورج اسی میں غروب ہوتا محسوس ہوا ہوگا نہ کہ واقعتاً اس نے سورج کو اس میں غروب ہوتے دیکھا جیسا کہ سوال میں ہے اور وجدہا کا ترجمہ اس طرح اس لیے کیا گیا ہے کہ اس مقام پر ''زار'' ہوتا تو اس کے معنی یہ بنتے ہیں کہ اس نے دیکھا مگر یہاں پر لفظ وجد ہے اور یہ افعال قلوب میں سے ہے یعنی جو بات انسان آنکھوں سے نہیں مگر دل سے محسوس کرے، ظاہر ہے کہ سورج کا اس پانی میں غروب ہونا ذوالقرنین کو محسوس ہوا نہ کہ واقعتاً غروب ہوا۔

لیکن اگر اس کا معنی آنکھوں سے دیکھنا کیا جائے تو بھی مطلب بالکل واضح ہے اس

میں کوئی خرابی نہیں ہے کیونکہ یہ تو ذوالقرنین کا مشاہدہ بیان کیا گیا ہے۔

یعنی ذوالقرنین کو ایسا دیکھنے میں آیا اور یہ تو آج بھی کوئی سمندر کے کنارہ پر سورج کے غروب ہونے کے وقت کھڑا ہو تو اسے ظاہری طور پر دیکھنے میں آئے گا کہ سورج سمندر میں اتر گیا، اگر کسی شک ہو تو تجربہ کر لے ہم نے اوپر حجاج کی مثال ذکر کی ہے اس کا مطلب بھی یہ نہیں کہ واقعتاً سورج اس پانی میں غروب ہو گیا یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لفظ ''وجد'' ذکر کیا ہے جو کہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اسے اس طرح دیکھنے میں آیا یا اسے اس طرح محسوس ہوا نہ کہ واقعتاً سورج اس پانی میں غروب ہوا اس پر خوب غور کریں۔

مزید مطلب بالکل واضح ہے۔ باقی کیچڑ والا پانی یا گدلا (مٹی آلود) پانی اس لیے کہا گیا ہے کہ جس جگہ پر ذوالقرنین بحر روم کے کنارہ پر پہنچا تھا وہاں کشتیوں کے آمدورفت بہت ہے لہٰذا مٹی کی وجہ سے سفید پانی بھی مٹیالے رنگ کا نظر آتا ہے۔ بہر کیف مطلب بالکل واضح ہے کہ ذوالقرنین مغرب کی طرف انتہا تک جا پہنچا جہاں سے آگے جانے کے لیے خشکی کا راستہ اسے نہ ملا اور سورج کو اس پانی میں غروب ہوتے ہوئے سمجھے کہ وہ گویا سورج کے اترنے کی جگہ پر جا کر پہنچے اب اس پر کوئی بھی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

انسان کو جس جگہ پر آگے جانے کا راستہ نہیں ملتا تو اسے انتہا یا حد ہی اس ملک یا زمین کی سمجھتا ہے ممکن ہے کہ حقیقت میں اس سے آگے بھی کوئی ملک یا زمین ہو اسی طرح ذوالقرنین جس جگہ پر پہنچا (یعنی مغرب کی طرف کی انتہاء کو) اس سے آگے اسے راستہ نہ ملا اگرچہ کافی سفر کرنے بعد دوبارہ خشکی آتی ہے یعنی یورپ مگر تاہم اسے چونکہ آگے راستہ نہ ملا لہٰذا وہاں سے ہی واپس پلٹے۔ واللہ اعلم بالصواب!

باقی رہی صحیح بخاری والی حدیث سو حدیث شریف کے تمام الفاظ لکھ کر ترجمہ وتشریح کرتا جاؤں گا جس سے معلوم ہو گا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث پاک میں کوئی بھی خرابی نہیں بلکہ ہمارے کج فہمی اور تحقیق نہ کرنے کا یہ نتیجہ ہے۔ کاش! اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو صحیح راستہ پر توفیق عنایت فرمائے۔ آمین!

حدیث کے الفاظ درج ذیل ہیں:

''(فانها تذهب) یعنی سورج جاتا ہے یا مادے کے لحاظ سے ترجمہ ہوگا کہ سورج غروب ہوتا ہے اترتا ہے۔ سورج کے چلنے کا ذکر قرآن پاک میں بھی مذکور ہے قرآن فرماتا ہے کہ ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا﴾ (یٰسٓ : ٣٨) ''یعنی سورج اپنے مستقر کی طرف چلتا ہے۔ مستقر کا مطلب جاء قرار'' یعنی وہ نقطہ جہاں سے ہی اسے الٹی حرکت کرنی پڑے گی۔'' یعنی نقطہ رجوع، یعنی سورج ایک مقررہ وقت تک ایک نقطہ تک چل رہا ہے جہاں سے ہو کر دوبارہ واپس پلٹے گا یا الٹی حرکت کرے گا۔''

اسی طرح جدید سائنس نے بھی سورج کی حرکت یا چلنے کو تسلیم کیا ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے لہٰذا حدیث کے اس لفظ میں کوئی بھی خرابی نہیں اب اس لفظ کی بامحاورہ معنی یہ ہوا کہ سورج اتر جاتا ہے اس سے آگے ہے کہ ''حتى تسجد تحت العرش'' ان الفاظ کے معنی نہ سمجھنے میں زیادہ دقت لفظ ''حتیٰ'' کے معنی نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے عام طور پر اس کا معنی یہاں تک کیا جاتا ہے اور اس معنی سے مشکل پیش آجاتی ہے۔

حالانکہ یہاں ''حتّٰی'' صرف حرف عطف ہے جس طرح واؤ اور فاء حروف عاطفہ ہیں علامہ عبداللہ اپنی کتاب مشکلات الاحادیث النبویہ وبیانہا میں لکھا ہے کہ کتنے ہی مواقع پر حتی کا لفظ عطوف کے لیے استعمال ہوتا ہے جس طرح واؤ اور فاء آتے ہیں۔ نحو کے علماء میں سے ایک جماعت کا یہ مشہور قول ہے ''بينات ترجمة مشكلات، ص ٣١٤.''

اب مطلب یہ ہوگا کہ سورج غروب ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے یعنی حتی بمعنی ''اور'' کے ہے۔ باقی رہا سورج کا سجدہ کرنا سو اول تو خود قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ

مِّنَ النَّاسِ﴾ (الحج: ١٨)

''کیا آپ نہیں دیکھ رہے جو آسمانوں اور جو زمینوں میں ہیں وہ سب رب کے سامنے سجدہ میں ہیں، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ اور درخت، جانور اور بہت سے انسان بھی۔''

دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ سورج بھی سجدہ کرتا ہے بلکہ پہاڑ اور درخت بھی سجدہ کرتے ہیں۔ پھر جو حدیث کو نہیں مانتے صرف قرآن کو مانتے ہیں وہ جواب دیں کہ یہ کس قدر درست ہے۔

درحقیقت انہوں نے سجدہ کا مطلب نہیں سمجھا صرف لفظ سجدہ کو دیکھ کر یہ کہنا کہ سورج یا دیگر اشیاء بھی ہم انسانوں کی طرح سجدہ کرتی ہیں سو یہ قطعاً غلط ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہر چیز نماز بھی پڑھتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح بھی کرتی ہے مگر ہر چیز کی نماز اور تسبیح کا اپنا اپنا طریقہ ہے قرآن کریم نے خود تصریح کی ہے کہ:

﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ﴾ (النور: ٤١)

''ہر ایک کی نماز اور تسبیح اسے معلوم ہے۔''

اس آیت سے اوپر بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح زمین وآسمان میں جو کچھ سب بیان کرتے ہیں اور پرندے بھی اس کے بعد فرمایا کہ ان میں سے ہر کسی کو اپنی تسبیح اور نماز کا علم ہے یعنی پرندوں کے لفظ یہ مت سمجھو کہ وہ بھی ہماری طرح تسبیح کرتے ہیں بلکہ ان کی تسبیح اور نماز کا الگ ڈھنگ اور طور طریقہ ہے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے سمجھایا ہے اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِنْ لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾

(بنی اسرائیل: ٤٤)

''اور ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بمع حمد کرتی ہے تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے (یعنی اس لیے کہ ان کی تسبیح کا الگ الگ طریقہ ہے)''

مطلب یہ ہوا کہ سورج بھی واقعتاً اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتا ہے مگر اس کا سجدہ بعینہٖ ہمارے سجدہ کی طرح نہیں ہے اس کا سجدہ بھی اپنے طریقہ کا ہوگا جو اللہ تعالیٰ اس کے لیے مقرر کیا ہوگا باقی عرش کے نیچے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حکومت کے ماتحت ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ میرا سر بادشاہ سلامت کے تخت کے سامنے جھکا ہوا ہے باقی اس جگہ تخت یا عرش کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ تخت بادشاہ کی عظمت اور جلال و بزرگی کا مظہر ہوتا ہے۔

بہرحال حدیث کا مطلب یہ بنا کہ سورج اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے یعنی خود اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے مطیع و فرمانبردار ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے حکم سے باہر نہیں حقیقت میں اس حدیث نے تو ایک بڑی حقیقت انسان کے سامنے بیان کی ہے کہ ہر چیز حتی کہ سورج، چاند وغیرہ سب اللہ تعالیٰ کی حکومت کے ماتحت اپنا فرض نبھا رہے ہیں اور اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہے ہیں۔

واقعتاً کوئی ایک ذرہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکم کے سوا حرکت نہیں کرسکتا، اگر سجدہ کا مطلب اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سرنگوں اور اس کی مرضی کے مطابق حرکت کرنا کی جائے تو اصل اشکال نیست ونابود ہوجاتی ہے حقیقت میں ایسی اشیاء کا سجدہ یہ ہی ہے کہ وہ ہر حالت میں اللہ کے حکم کے سامنے سرنگوں ہیں اور وہی کام کرتے ہیں جو کام مالک العلام نے ان کے ذمہ لگایا ہے۔

اب حدیث کے مذکورہ بالا اجزاء کا بامحاورہ مطلب یہ بنا کہ سورج غروب ہوجاتا ہے اور عرش عظیم والی ذات پاک کے تکوینی حکم کے سامنے سرنگوں اور اس کے ارادہ اور مرضی کے مطابق اور اس کے مقرر کردہ قوانین، حرکات کے ماتحت چلتا رہتا ہے۔ اس کے بعد حدیث کے یہ الفاظ ہیں۔

((فتستأذن فيؤذن لها.))

یعنی پھر اجازت طلب کرتا ہے اور اسے اجازت مل جاتی ہے۔ ان الفاظ میں کوئی خرابی نہیں کیونکہ یہ مسلم اور طے شدہ اصول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی ذرہ بھی اپنی جگہ سے آگے حرکت نہیں کرتا۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ سب اسی کے قوانین فطرت اور اسی ہی کے

اذن (مشیت) سے ہوتا ہے اسی طرح اس جگہ پر یہ اصول کارفرما ہے ہر لحہ ہر گھڑی جس جگہ پر بھی سورج غروب ہوتا ہے اور کسی جگہ پر طلوع ہوتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہے مطلب یہ ہے کہ سورج کا غروب ہونا یا طلوع ہونا سب اپنے مالک کی مرضی اور اس کے ارادہ کے مطابق ہے اور وہ ہر وقت حکم الٰہی کا منتظر رہتا ہے اور چونکہ اسے رک جانے یا واپس پلٹنے کا حکم نہیں ملتا۔ لہٰذا آگے بڑھتے رہنے کا اذن ہو جاتا ہے اور وہ آگے بڑھتا رہتا ہے اور اپنی گردش جاری رکھتے ہوئے آتا ہے۔ یعنی جس جگہ پر غروب ہوا وہاں اللہ کے حکم سے غائب ہو کر اور دوبارہ اسی کے حکم سے آگے بڑھتا ہوا دوسرے ملک پر جا کر طلوع ہو جاتا ہے بتایا جائے کہ اس میں کیا خرابی ہے یا اس میں کون سی مشکل ہے جو سمجھ میں نہیں آرہی؟ آگے حدیث شریف کے الفاظ ہیں:

((ویوشك ان تسجد ولا یقبل منها ولتستأذن ولا یؤذن لها))

’’یعنی قریب ہے کہ وہ (سورج) سجدہ کرے اور سجدہ قبول نہ کیا جائے اور اجازت طلب کرے مگر اسے اجازت نہ مل سکے۔‘‘

مطلب یہ ہے کہ عنقریب (قیامت سے پہلے) اس طرح ہوگا کہ سورج سجدہ کرے گا (یعنی اپنی فرمانبرداری ادا کرنا چاہے گا اور اپنی مقررہ حرکت (یعنی جس طرح اب حرکت کرتا ہے) جاری رکھنا چاہے گا لیکن سجدہ (فرمانبرداری) قبول نہیں کی جائے گی (یعنی اب یہ حرکت تجھے جاری نہیں رکھنی)

یا بالفاظ دیگر وہ قانون الٰہی کے مطابق چلتا رہنا چاہے گا لیکن اس کی یہ درخواست قبول نہیں ہوگی اور اسے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ آگے یہ الفاظ ہیں:

((فیقال لها ارجعی من حیث جئت فتطلع من مغربها))

’’یعنی پھر اسے کہا جائے گا کہ جس طرف سے آئے ہو اسی طرف واپس پلٹ جا پھر وہ مغرب کی طرف سے طلوع ہوگا۔‘‘

مطلب کہ قیامت کے قریب سورج کو مغرب سے طلوع ہونے کا حکم ہوگا لہٰذا وہ حکم کی

تعمیل میں مغرب کی طرف سے طلوع ہوگا اور اس میں کوئی اشکال نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر کام آسان ہے۔" واللہ علی کل شئی قدیر" اور یہ بات جدید سائنس کے بقول بھی درست ہے وہ اس طرح کہ وہ کہتے ہیں کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور وہ اس وقت مغرب کی طرف سے مشرق کی طرف گھومتی ہے یعنی مشرق والے ممالک پہلے سورج کے سامنے آتے ہیں۔ اس لیے قیامت کے قریب جب اللہ تعالیٰ اس کائنات کے موجودہ نظام کو درہم برہم کرنا چاہے گا تو زمین کو حکم فرمائے گا کہ تو اپنے موجودہ حرکت سے الٹی حرکت کر یعنی مغرب سے مشرق کی طرف گھومنے کی بجائے مشرق سے مغرب کی طرف گھوم، بس نتیجہ ظاہر ہے کہ موجودہ وقت کے برعکس مغرب والے ممالک پہلے سورج کے سامنے آئیں گے یعنی دوسرے الفاظ میں سورج بجائے مشرق کے مغرب سے طلوع ہوتا ہوا دکھائی دے گا۔

اب غور کریں کہ اس میں کیا اشکال ہے یا اس میں کیا مشکل ہے؟ کچھ بھی نہیں مگر یہ بھی ہم نے ان سائنس والوں کے کہنے کو صحیح فرض کر کے لکھا ہے ورنہ زمین کی حرکت کے متعلق انہوں نے کوئی ٹھوس اور معقول دلیل پیش نہیں کی بہرحال حدیث میں کوئی بھی خرابی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کا فرمان بالکلیہ صحیح ہے صرف ہماری سمجھ کا چکر ہے اور حدیث کے مطلب کو غلط سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ العلام وھو اعلم بالصواب!

سورج کی جگہ

سوال: ایک مولوی کہتا ہے کہ میں قرآن سے یہ ثابت کرسکتا ہوں کہ اس دنیا میں جو سورج ہے وہ اس دنیا والے آسمان پر نہیں بلکہ تیسرے آسمان پر ہے اور اس کا تیز طرف اوپر ہے اور کم طرف دنیا والے آسمان کی سائیڈ میں ہے کیا یہ سچ ہے اور واقعتاً قرآن پاک میں یہ بات موجود ہے؟

الجواب بعون الوھاب: قرآن حکیم جو ہمارے پاس موجود ہے یا مسلمان جس کتاب کو قرآن حکیم کہتے ہیں اس میں یہ پوری بات قطعاً موجود نہیں۔ باقی شیعوں والے

دس پارے (جوان کی دعویٰ کے مطابق گم ہیں) ان میں یہ بات اگر موجود ہو تو معلوم نہیں بہرحال اس مولانا صاحب کو کہیے کہ آپ نے جو دعویٰ کیا ہے وہ ہمیں ثابت کر کے دے کہ قرآن کریم کی کس سورت اور کس پارہ اور کس آیت میں یہ بیان موجود ہے وگرنہ اپنے اس دعوے سے باز آ جائے اور اس جھوٹی نسبت کی وجہ سے جس سخت جرم کا مرتکب ہوا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرے اور آئندہ ایسی غلط دعویٰ یا نسبت ہرگز نہ کرے۔ واللہ اعلم بالصواب

جنت وجہنم کی تعداد

سوال: کیا جہنم سات (۷) اور جنتیں آٹھ (۸) ہیں نیز ان کی وسعت کتنی ہے اور ان میں سے دونوں کے طبقات کتنے ہیں قرآن وسنت کی روشنی میں اپنی معلومات سے مستفید فرمائیں؟

الجواب بعون الوهاب: جہنم سات (۷) اور جنتیں آٹھ کے متعلق قرآن کریم میں تو کچھ بھی وارد نہیں ہوا بلکہ کسی صحیح حدیث میں بھی میرے نظر سے نہیں گذرا کہ جہنم سات اور جنتیں آٹھ ہیں واللہ اعلم!

البتہ جہنم کے سات دروازے ہیں جس طرح ارشاد ربانی ہے:

﴿لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِّكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ﴾ (الحجر: ٤٤)

''یعنی جہنم کے سات دروازے ہیں ان میں سے ہر دروازہ جہنمیوں کے لیے تقسیم کیا ہوا ہے۔''

البتہ جہنم کے مختلف طبقات ہیں۔ جس طرح ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (النساء: ١٤٥)

''یعنی منافق جہنم کے سب سے نچلے درجے (طبقے) میں داخل ہوں گے۔''

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کے مختلف طبقات ہیں اور منافقین اس کے سب

سے نچلے طبقہ میں داخل ہوں گے اس کی وسعت وگہرائی قرآن کریم کی اس آیت سے معلوم ہوتی ہے، ارشاد فرمایا:

﴿لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ (حٰم السجدة : ١٣)

''یعنی میں ضرور بہ ضرور جہنم کو جنوں اور انسان سے بھروں گا۔''

ابتدا سے لے کر قیامت تک آنے والے تمام جنات اور انسانوں میں سے جو مشرک یا کافر ہوں گے ان کے ساتھ جہنم کو بھی بھرا جائے گا اس لیے ہر اہل علم ودانش اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ عذاب کی جگہ (جہنم) کتنا کشادہ ووسیع ہے اس کے متعلق ایک صحیح حدیث بھی وارد ہوئی ہے جیسا کہ:

''سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ناگہاں آپ نے کسی چیز کے گرنے کی آواز سنی پھر ارشاد فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ یہ کیا چیز ہے۔ (کس چیز کی آواز ہے) صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہم نے کہا اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں آپ نے فرمایا یہ پتھر ہے جو ستر سال پہلے جہنم کے اندر پھینکا گیا تھا وہ جہنم میں گرتا جا رہا تھا کہ وہ اب (ستر سال گذر جانے کے بعد) جا کر اس کی تہہ تک پہنچا ہے۔'' [1]

ہر ایک شخص جانتا ہے کہ اوپر سے گرنے والی چیز کتنی تیزی سے گرتی ہے پھر بھی جہنم میں پھینکا گیا پتھر اوپر سے تہہ تک پہنچنے میں ستر سال کا عرصہ گذار دیتا ہے اس سے جہنم کی گہرائی اور وسعت معلوم ہوسکتی ہے۔

اسی طرح جنت کے متعلق بھی صحیح احادیث میں وارد ہوا ہے کہ اس کے آٹھ دروازے ہیں ذیل میں دو احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱)...... ''سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازے کا نام

---

[1] صحیح مسلم: كتاب الجنة ونعيمها ، باب جهنم أعاذنا الله منها : رقم الحديث: ٧١٦٧.

"الریّان" ہے جس سے صرف روزے دار داخل ہوں گے (یعنی وہ لوگ جو فرضی روزوں کے علاوہ نفلی روزے بھی بکثرت رکھتے ہوں گے۔)"❶

(۲)......"سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو کوئی کامل طور پر وضو کرے، پھر یہ الفاظ کہے ((اشهد ان لا اله الا الله وان محمدا عبده ورسوله.)) تو اس شخص کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جائیں گے جن میں سے چاہے داخل ہو۔"❷

باقی جنت کی وسعت کے متعلق قرآن کریم میں سورۃ آل عمران اور سورۃ حدید میں آیات موجود ہیں ذیل میں ایک آیت نقل کی جاتی ہے۔

﴿وَسَارِعُوٓا اِلٰى مَغۡفِرَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَجَنَّةٍ عَرۡضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِيۡنَ﴾ (آل عمران: ۱۳۳)

"یعنی جلدی کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے جو کہ متقین کے لیے تیار کی گئی ہے۔"

جس طرح جہنم میں طبقات ہیں اسی طرح جنت میں درجات ہیں۔جس طرح صحیح بخاری میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور ترمذی میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جنت میں ایک سو (۱۰۰) درجات ہیں اور ہر دو درجات کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔" واللہ اعلم بالصواب

کیا زمین گھومتی ہے؟

سوال: سائنس کہتی ہے زمین چلتی ہے سورج اور چاند ایک جگہ کھڑے ہیں چلتے

❶ صحیح البخاری: کتاب بدء الخلق ، باب صفة ابواب جهنم : رقم الحدیث: ۳۲۵۷ .

❷ صحیح مسلم: کتاب الطهارة، باب الذکر المستحب عقب الوضوء، رقم الحدیث: ۵۵۳ .

نہیں ہیں جس طرح ریل گاڑی (ٹرین) میں سفر کرتے ہوئے نظر آتا ہے کہ درخت اور دوسری نظر آنے والی چیزیں چل رہی ہوتی ہیں حالانکہ وہ ایک جگہ کھڑے ہوتے ہیں چلتی ٹرین ہے بعینہ اسی طرح چلتی زمین ہے اور دیکھنے میں یوں آتا ہے کہ سورج اور چاند چل رہے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں ہے چانداور سورج اپنے مستقر کی طرف چلتے ہیں اور پہاڑوں کواللہ نے زمین کی میخیں بنایا ہے۔ اب یہاں پر قرآن اور سائنس کا ٹکراؤ ہے لہٰذا اس کی وضاحت کی جائے؟ اوراس بات کی بھی وضاحت کی جائے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت جو ہوا میں چلتا تھا وہ بھی سائنس کا کرشمہ تھا نہ کہ معجزہ اور اسی طرح نبی کریم ﷺ کا معراج بھی ایک سائنس کا کرشمہ تھا اس کے متعلق واضح بیان کریں کہ واقعی یہ واقعات معجزات میں سے تھے یا سائنس کا کوئی کرشمہ تھا۔ اطمینان بخش جواب مطلوب ہے؟

الجواب بعون الوهاب: وباللہ التوفیق وبیدہ ازمۃ التحقیق کہ زمین کے متعلق سائنسدانوں کا یہ کہنا کہ زمین چلتی ہے اس کے متعلق انہوں نے کوئی واضح اور ٹھوس ثبوت ابھی تک پیش نہیں کیا ہے اور اگر دلیل مل بھی جائے اور مانا جائے کہ زمین چلتی ہے تو یہ بات قرآن وحدیث کے برخلاف نہیں ہوگی کیونکہ کتاب وسنت میں اس طرح کہیں بھی نہیں ہے کہ زمین ساکن ہے۔ دونوں ماخذ اس کے متعلق خاموش ہیں تو پھر اگر سائنس نے کوئی چیز ثابت کی تو اس سے اسلام یا قرآن وحدیث کو کون سا نقصان پہنچے گا؟ باقی رہی یہ بات کہ سائنسدان کہتے ہیں کہ سورج چاند نہیں چلتے تو یہ خبر تم نے کسی جاہل سے سنی ہوگی قدیم خواہ جدید سائنسدان چاند کے چلنے کے انکاری نہیں ہیں بلکہ ایک معمولی جاگرافی دان بھی جانتا ہے کہ چاند زمین کے چاروں طرف (ان کے کہنے کے مطابق) چلتا ہے۔ لہٰذا یہ بات قابل سماعت نہیں ہے البتہ سورج کے متعلق پہلے سائنسٹ چلنے کے انکاری تھے لیکن اس ۲۰ ویں صدی کے سائنسدان تو سورج کے متعلق بھی جانتے ہیں کہ وہ چلتا ہے لیکن اپنے اردگرد اور اپنے ہی مدار میں۔ اور پھر زمین چاند کے اردگرد چلتی ہے آپ کسی اچھے سائنسدان سے معلوم کریں تو وہ بھی اسی بات کا اقرار کرے گا جو قرآن حکیم نے فرمائی ہے۔ یعنی اپنے مستقر کی

طرف چلتا رہتا ہے یعنی اس آخری نقطے کی طرف جب وہاں پہنچے گا تو اس کی حرکت ختم ہو جائے گی اور وہ فنا ہو جائے گا آخراس میں سائنس اور قرآن کا کون سا ٹکراؤ ہے؟

اگر بالفرض سائنس والے سورج کی حرکت کے منکر ہی ہیں تو کیا حرج ہوگا، جو لوگ گرگٹ کی طرح بار بار رنگ بدلتے رہتے ہیں ان کی بات کو کیا اصدق القائلین، علیم، خبیر اور عالم الغیب والشہادۃ کی بتائی ہوئی حقیقت کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے؟ یہ طرز عمل عقل کا دیوالہ نہیں ہے؟ کتاب اللہ کی بتائی ہوئی حقیقت سو فیصد سچ ہے۔ باقی دنیا والوں کی باتیں تو ہر دوسری تیسری سال بدلتی رہتی ہیں۔

ایسے متبدل اور متغیر نظریہ کو کتاب اللہ جیسی مضبوط اور حق کتاب کے مقابلہ میں وہی پیش کر سکتا ہے جو یا تو بے عقل ہو یا حلاوت ایمان سے عاری ہو۔ بہر حال قرآن کریم کی صداقت ایک ثابت شدہ اور طے شدہ حقیقت ہے جس کی حقیقت کو دنیا کی کوئی ہستی رد نہیں کر سکتی اس کے ہوتے ہوئے بھی سائنس اس معاملہ میں مخالف ہی نہیں تو سوال کس چیز کا؟ باقی رہی بات پہاڑوں کو میخیں بنانے والی تو وہ اس طرح ہے جس طرح کشتی کو کیلوں سے مضبوط کیا گیا ہے اور وہ عمیق پانی کے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی رہتی ہے، پھر اگر کوئی کہے کہ بڑی بڑی کیلوں کو کشتی کے لیے میخیں بنایا گیا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ کشتی پانی میں کھڑی ہے؟ ہرگز نہیں! بعینہٖ اسی طرح زمین بھی غیر متناہی فضا میں اللہ کی قدرت سے لٹکی ہوئی ہے جس طرح اس آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا﴾ (فاطر: ٤١)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو تھاما ہوا ہے کہ وہ اِدھر اور اُدھر نہ ہو جائیں۔''

باقی اس پر پہاڑ زمین کے مختلف اوراق اور طبقات کے لیے کیل کی طرح ہیں یا یوں کہیں کہ جس طرح کشتی خالی ہوتی ہے تو اوپر نیچے ہوتی رہتی ہے پھر جب اس کے اوپر وزن رکھا جائے گا تو وہ کافی متوازن ہو جائے گی اور طوفانی حالت کے علاوہ میں اتنا اوپر نیچے نہیں

ہوگی اسی طرح یہ پہاڑ بھی رب کریم نے زمین پر وزن کے طور پر رکھیں ہیں تاکہ اس کی حرکت متوازن رہے۔ (سائنسدانوں کے کہنے کے موجب) سائنس کے مطابق زمین کشش ثقل کی وجہ سے سورج کے چاروں طرف گھومتی ہے یہ بھی قدرت کی طرف سے ایک انتظام ہے تاکہ پہاڑوں کے بوجھ تلے متوازن رہے اور کشش ثل کی وجہ سے سورج کی طرف کھینچ کر پاش پاش نہ ہوجائے۔

اس کی مثال سومنات کے مندر والے بت کی ہے کہ جب سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں پر ایک جگہ بت دیکھا جو بغیر رسی اور کنڈی کے اپنی جگہ کھڑا تھا۔ پھر کسی جاننے والے نے ان کو بتایا کہ اس بت کے چاروں طرف اوپر نیچے مقناطیسی سسٹم ہے جس کی کشش چاروں طرف برابر ہے۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ بغیر کسی سپورٹ کے بیچ میں لٹکا ہوا ہے اس کا ثبوت یہ کہ جب اس کی ایک سائیڈ والی دیوار کو گرایا گیا تو وہ بت جا کر دوسری طرف گرا کیونکہ کشش اب غیر متوازن ہوگئی بس اسی طرح ذہن نشین کریں کہ زمین کو سورج کشش کر رہا ہے لیکن وہ پہاڑوں کے بوجھ تلے اپنے ہی مدار پر چلتی رہتی ہے اور اس طرح نہیں ہوتا کہ اس مدار سے نکل کر اور جا کر سورج سے ٹکرائے بلکہ ایک مقرر فاصلہ پر سورج کے اردگرد چلتی رہتی ہے اور اس مقررہ مدار سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھتی اس حقیقت کو میخوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جو اپنی کم فہمی کی وجہ سے اس پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ استعارہ اور مجاز ہر زبان میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں اپنی بات پر پہاڑ بن کر کھڑا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ جس طرح پہاڑ مضبوط کھڑا ہے اسی طرح فلاں آدمی بھی اپنی بات یا مؤقف پر مضبوطی سے ڈٹا ہوا ہے اور اس محاورہ پر کوئی معترض نہیں ہے پھر قرآن کریم پر اعتراض کرتے ہوئے ان کو شرم نہیں آتی آخر قرآن کریم بھی اگرچہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے لیکن ہے تو اسی زبان میں جس میں انسان بات کرتے ہیں۔

لہٰذا اس کو بھی وہ محاورات اور وہی زبان استعمال کرنی تھی جو زبان مروجہ تھی اس لیے

میخوں والے محاورے میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔اعتراض محض غفلت اور عجلت کے سبب ہے جس طرح سندھی میں کہاوت ہے۔

''تکڑ کم شیطان جو'' یعنی عجلت (جلد بازی) شیطان کی طرف سے ہے۔

اور کچھ پڑھے لکھے آدمیوں کا یہ اعتراض کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت سائنس کا کرشمہ تھا یہ واضح قرآن کی تکذیب ہے۔ یقیناً سائنس نے بڑے کرشمہ کر دکھائے ہیں لیکن سلیمان علیہ السلام کے دور میں سائنس کا کوئی وجود نہیں تھا، یہ محض معجزہ ہی تھا اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی ہدایت کے لیے ان کو عطا کیا تھا۔معجزہ نام ہی اسی چیز کا ہے جو بنا اسباب عادیہ وجود میں آئے۔مثلاً آج کل لوگ ہوائی جہاز کی وجہ سے فضا میں سفر کر رہے ہیں لیکن سلیمان علیہ السلام کا معجزہ اس طرح نہیں تھا بلکہ وہ خاص معجزہ تھا۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو عطا کیا گیا۔ کیونکہ اس وقت نہ ہوائی جہاز تھا اور نہ ہی سائنس کا ہنر اور سائنس کی ایجادات ۔لہٰذا بغیر اسباب کے اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت سے وجود میں آنے والا کام معجزہ ہوتا ہے۔

دوسری مثال مثلاً انسان کے نطفے سے اولاد پیدا ہوتی رہتی ہے لیکن اس کو کوئی معجزہ نہیں کہتا یعنی اولاد پیدا ہوتے وقت کوئی یہ نہیں کہتا کہ میں نے یہ بیٹا اپنے کرشمہ سے پیدا کیا ہے کیونکہ اس طرح اولاد کا پیدا ہونا اسباب کے ماتحت ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیدا کر دیئے ہیں۔

تاہم اگر اللہ کی مرضی نہ ہوگی تو اولاد بھی پیدا نہیں ہوگی لیکن اُدھر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر والد کے پیدا کیا ان کا یہ تولد مبارک بنا اسباب کے معجزہ تھا اور یہ محض اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت سے ہوا نہ کہ کسی سبب یا ہنر یا سائنس کے زور پر بس اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرت کاملہ سے ہوا کو ان کے تابع کر دیا جس کی وجہ سے ان کا تخت اس میں چلتا تھا اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج بھی رب کریم کی قدرت کی ایک نشانی تھی بذات خود کسی کے بس کی بات نہیں کہ وہ اتنی بلندی پر پہنچ سکے لیکن یہ کام مالک الملک کا تھا جو قادر مطلق ہے۔''ان اللہ علی کل شئی قدیر''

لہٰذا یہ بھی معجزہ تھا۔ان باتوں کو سائنس کا کرشمہ قرار دینے والے گمراہی کے عمیق کھائی

میں گر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو ہدایت نصیب فرمائیں۔ آمین!

چاند اور سورج کی جگہ

سوال: سورج اور چاند آسمان دنیا پر ہیں یا اس سے اوپر ہیں تفصیل سے وضاحت کریں؟

الجواب بعون الوھاب: وباللہ التوفیق قرآن کریم کی بہت سی آیات سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا والے آسمان میں ہیں۔ مثلاً

﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ﴾ (الملك : ٥)

''ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے زینت والا بنایا۔''

﴿إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ ِنِ الْكَوَاكِبِ﴾ (الصافات : ٦)

''ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے بارونق بنادیا ہے۔''

ان آیات میں صراحتاً بیان ہے کہ آسمانِ دنیا کو چراغوں سے مزین کیا گیا ہے اور ایک جگہ اللہ نے فرمایا:

﴿وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا﴾ (نوح: ١٦)

''اور سورج کو اللہ تعالیٰ نے چراغ بنایا۔''

مطلب کہ سورج بھی ان چراغوں میں سے ہے۔ جب اللہ نے یہ فرمایا کہ آسمان دنیا کو چراغوں سے مزین کیا گیا ہے تو پھر سورج اور چاند ان چراغوں میں شامل ہوئے۔

اور وہ بھی آسمان دنیا کی زینت ہوئے۔ باقی ایسی کوئی واضح آیت نہیں ہے جو راقم الحروف کی نظروں سے گذری ہو۔ واللہ اعلم بالصواب!

باقی آسمان کے متعلق قرآن یا حدیث میں ایسی کوئی آیت یا حدیث نہیں ہے جس میں بتایا گیا ہو کہ یہ کس سے بنے ہوئے ہیں یا ان کا مادہ کیا ہے؟ لہٰذا اس کے متعلق جو بھی کہا جائے گا وہ صرف قیاس آرائی ہوگی۔ دراصل لغت کی کتابوں میں یہ صراحت ہے کہ ہر وہ چیز

جو زمین سے اوپر ہوں اس کو سماء کہا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بادلوں کو گھر کی چھت کو سماء کہا جاتا ہے جس طرح حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ بخاری کی شرح فتح الباری ج ۲، ص ۴۱۹ میں لکھتے ہیں:

((”قوله سماء“ اى مطر واطلق عليه سماء لكونه ينزل من جهته السماء وكل جهته علو شمسى سماء .))

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے اوپر کے تمام عالم کو سماء کہا جاتا ہے اسی طرح لغت کی دوسری کتابوں میں بھی یہی بیان ہے اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے بعد آپ کو سمجھ میں آ جائے گا کہ کتاب وسنت میں جو سات آسمانوں کا ذکر آتا ہے اس سے مراد عالم بالا کے سات حصے ہیں جن کو درجہ بدرجہ سات طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو ایک دوسرے کے اوپر قریب قریب اس طرح ہیں۔
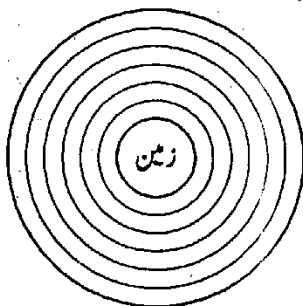
باقی ہر ایک آسمان کی حد کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہے۔ اس حقیقت کا ادراک صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کو ہے اور قرآن میں جو فرمایا گیا ہے: ﴿سبع سمٰوات طباقا﴾ اس سے یہ مطلب سمجھنا غلط ہے کہ آسمان کوئی لوہے، لکڑی، یا کسی دوسری چیز کا بنا ہوا ہے جن کو ایک دوسرے پر ترتیب وار رکھا گیا ہے کیونکہ ”طبقہ“ کا محسوس چیز کے علاوہ معنوی اور غیر مرئی وغیرہ وغیرہ غیر محسوس چیز پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔

مثلاً کہا جاتا ہے، مزدور طبقہ، امیر طبقہ، یا معاشرتی طبقہ یا سوسائٹی کے طبقات ان تمام الفاظ میں طبقہ ایک غیر محسوس غیر مرئی چیز پر بولا گیا ہے جس طرح ظاہر ہے۔ اسی طرح سات آسمانوں کو بھی یوں سمجھو کہ وہ زمین سے اوپر عالم بالا کے سات حصے ہیں۔ جو کہ ایک دوسرے

کے اوپر ہیں اور ایک دوسرے سے کچھ غیر مرئی اور مشاہدہ میں نہ آنے والی حدود کے ساتھ علیحدہ ہیں۔

مثلاً جس طرح سمندر کا پانی کڑوا ہے لیکن اس میں بھی چند جزء میٹھے پانی کے ہوتے ہیں وہ پانی میں اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ ان کے درمیان نظر آنے والی کوئی آڑ یا حد نہیں ہے تاہم وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں اسی طرح زمین سے اوپر جو لامتناہی اور غیر محدود فضا نظر آرہی ہے اس کے بھی سات حصے ہیں جو ایک دوسرے کے اوپر ہیں ان کو سات آسمان کہا جاتا ہے جس کی شروع ہونے والی اور ختم ہونے والی حدود کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور ایک دوسری بات بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ ملاء الاعلیٰ اور جنت وغیرہ ہم سے اوپر عالم بالا میں ہیں۔

گویا ہیں تو وہ آسمانوں میں مگر ہماری نظروں سے مخفی ہیں جس طرح زمین پر اگرچہ فرشتہ ہیں مثلاً ہر ایک انسان کے ساتھ دو دو فرشتے ہیں جو اس کی حفاظت اور نامہ اعمال کو لکھنے کے لیے صبح اور شام کی نمازوں کے وقت تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ پھر اوپر جا کر اللہ تعالیٰ کو خبریں دینے والے، جمعہ کے دن مسجد کے دروازوں پر بیٹھ کر آنے والوں کے نام لکھنے والے، مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی خاطر آنے والے مطلب کہ بے شمار فرشتہ زمین پر ہیں مگر ہم ان کو دیکھتے نہیں ہیں۔ اسی طرح جنات کا بھی یہاں پر عالم ہے مگر وہ عالم بھی ہماری محسوسات سے ماوراء ہے۔ ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ ہیں مگر ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔

اسی طرح عالم بالا کے معاملے کو سمجھا جائے کہ اس کو بھی ہمارے مشاہدے سے دور رکھا گیا ہے تاکہ ہم اس پر ایمان بالغیب لاسکیں۔ اور اس سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ قرآن وحدیث میں جو آسمان کے دروازوں کا ذکر آتا ہے اس سے مراد عالم بالا کے وہ دروازے ہیں جو ہم کتنا بھی اوپر چڑھ جائیں مگر ان کو دیکھ نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ ہیں تو اگرچہ بہت دور مگر وہ بھی غیب کے عالم سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ قیامت کے دن یہ غیب غیب نہیں

رہے گا اور فرشتہ وغیرہ ظاہر ظہور آنکھوں کے سامنے نظر آئیں گے اور آسمان کے دروازے بھی نظر آئیں گے۔

لیکن اس وقت انسانی آنکھوں پر پردہ رکھا گیا ہے تاکہ وہ غیب پر ایمان لاسکیں اور محض اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات عالیہ پر یقین کامل رکھ سکیں۔ لہٰذا چونکہ معراج کی رات آپ ﷺ کو ملاء الاعلیٰ کی سیر کروائی گئی۔ جنت وجہنم دکھائی گئی انبیاء کرام علیہم السلام سے ملاقات کروائی گئی۔ بیت المعمور اور سدرۃ المنتہیٰ اور دوسرے بہت سارے عجائب قدرت کا مشاہدہ کروایا گیا۔ اس لیے اس بیان میں دروازوں کے کھولنے کا تذکرہ آتا ہے یعنی وہ دروازے کھولے گئے۔ جو عالم بالا میں ہماری آنکھوں سے مستور عالم کے دروازے ہیں۔

مطلب یہ کہ آسمان تو برابر سات ہیں مگر وہ سات آسمان دیکھنے میں ایک ہی آسمان نظر آتے ہیں، یعنی وسیع اور غیر تناہی فضا (Space) اور دوسرے سات آسمان شرعی وہ ہیں جو اس فضا میں ہیں مگر انسانی نظروں سے ان کو مخفی رکھا گیا ہے اوپر جو سورج چاند وغیرہ نظر آرہے ہیں وہ اس کے دروازے نہیں ہیں کیونکہ وہ محسوس اور مرئی چیزیں ہیں ان پر انسانی دسترس ہوسکتی ہے جس طرح تیسرے سوال کے جواب میں عرض رکھوں گا بہرحال وہ عام سرا سر غیب ہی غیب ہے جس کا اس دنیا میں ماسواء انبیاء کے کسی کو مشاہدہ نہیں کرایا جاتا اور ہمیں غلطی صرف اس لیے لگی ہے کہ ہم شرعی آسمان اور ہم سے اوپر کے عالم بالا کی محسوس چیزوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ ورنہ اگر دونوں کو الگ الگ قرار دیا جائے تو نہ کوئی شبہ پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ یہ بات ہر کوئی سمجھ سکتا ہے یہ تمام چیزیں جو اوپر اور نیچے نظر آتی ہیں ان کا تعلق دنیا سے ہے یہی وجہ ہے کہ سورج، چاند اور ستاروں کو زمین کی روشنی اور انسانوں کی رہنمائی کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔

جس طرح قرآن کریم میں ہے:

﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ﴾ (النحل: ١٦)

''اور ستاروں سے بھی لوگ راہ حاصل کرتے ہیں۔''

پھر جو چیزیں انسان کے نظر اور مشاہدے میں آتی ہیں وہ غیب کی چیزیں نہیں ہیں کیونکہ غیب کی چیزوں تک انسانی دسترس حاصل نہیں۔

خلاصہ کلام! ان محسوسات اور کائنات کے مشاہدہ میں آنے والی چیزیں اور غیب کی چیزوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ (پھر چاہے وہ زمین پر ہوں یا عالم بالا میں ہو) محسوسات کوغیب کی چیزوں سے متحد و متفق قرار دیا جائے گا تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ خود لفظ محسوس اور غیب آپس میں مخالف ہیں۔ محسوس کو حواس خمسہ ((Fivefuisas)) سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن غیب کی چیزوں کو محسوس کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے یہاں کسی کو اگر اللہ تعالیٰ اس پر مطلع کردے تو الگ بات ہے ورنہ ہمارے پاس اس کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ بس یہی فرق اگر سمجھ میں آجائے تو تمام اعتراض ختم ہو جائیں گے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھیں کہ عالم بالا میں جو ہمیں سورج، چاند اور بہت ساری عجیب چیزیں نظر آتی ہیں وہ ملاء الاعلیٰ نہیں ہیں اور نہ ہی وہ آنکھوں سے مستور عالم بالا کے حصے ہیں جن کے دروازے معراج کی رات کھولے گئے تھے بس یہی وہ چیز ہے جس کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے جس پر غور وفکر کرنے سے کافی مشکلات ان شاء اللہ کم ہو جائیں گی۔

اس کے متعلق مزید وضاحت تیسرے سوال کے جواب میں عرض رکھوں گا تاہم ان باتوں کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہئے تاکہ آنے والے سوالات کے جوابات کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ واللہ اعلم بالصواب وھو یھدی من یشاء الی صراط مستقیم!
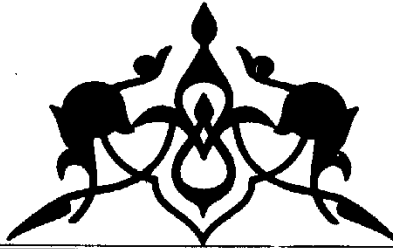
حدیث اور اسکے متعلقات
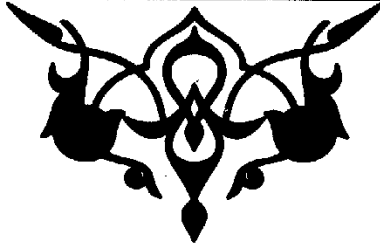
میرے صحابہ رضی اللہ عنہم چاند کے مانند ہیں

سوال: حدیث "اصحابی "کالنجوم" کی تحقیق مطلوب ہے؟

الجواب بعون الوهاب: علامہ البانی رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق یہ روایت "اصحابی کالنجوم ......الخ" موضوع ہے اور ان کی تحقیق صحیح بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ علامہ موصوف نے اس روایت کے جمیع طرق کو جمع کیا ہے۔ کچھ طرق میں متروک ومجهول راوی ہیں اور کچھ میں کذاب ووضاع بھی اور جس روایت کی سند میں راوی کذاب اور وضاع ہو اسے موضوع ہی کہا جائے گا۔ مزید معلومات، علامہ البانی رحمہ اللہ صاحب کی اصل کتاب کے مطالعہ کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم

آگ سے پناہ

سوال: ((اللهم اجرني من النار)) روایت کی تحقیق مطلوب ہے؟

الجواب بعون الوهاب: ((اللهم اجرني من النار .)) یہ دعا جس سند سے مروی ہے آپ نے وہ تو لکھی ہے اور وہ واقعتاً سنن ابی داؤد میں ہے لیکن اس سے پہلے اس دعا کے متعلق جو حدیث سنن ابی داؤد میں ہے وہ آپ نے نہیں لکھی۔ اس کی سند اس طرح ہے۔

((حدثنا اسحاق بن ابراهيم ابو النضر الدمشقي نامحمد بن شعيب اخبرني ابو سعيد الفلسطيني عبدالرحمن بن حسان عن الحارث بن مسلم انه اخبره عن ابيه مسلم بن الحارث التميمي عن رسول الله ﷺ الحديث))

یعنی صحابی کا صحیح نام مسلم بن الحارث ہے اور ان کے فرزند کا نام حارث ہے کتب الرجال سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری، امام ابو حاتم الرازی، امام ابو زرعہ الرازی، امام ترمذی، ابن قانع رحمہم اللہ وغیرہم من ائمۃ الحدیث نے اسی کو ترجیح دی ہے نہ کہ مسلم بن الحارث

بن مسلم عن ابیہ کو اور میزان وغیرہ میں امام دارقطنی نے جسے مجہول کہا ہے وہ مسلم بن الحارث بن مسلم ہے نہ کہ حارث بن مسلم ابن الحارث التمیمی اور امام ابن ابی حاتم الجرح والتعدیل میں اس حارث بن مسلم بن الحارث کے متعلق اپنے والد ابو حاتم الرازی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ حارث بن مسلم تابعی ہے لیکن اس پر کوئی جرح نہیں فرمائی اور نہ ہی مجہول کہا ہے اور کسی اور امام نے بھی اسے مجہول نہیں کہا۔

لہٰذا امام ابو حاتم الرازی جیسے متشدد کی طرف سے اسے تابعی کہنا بتاتا ہے کہ کم از کم معروف راوی ہے اور اسی حارث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب التاریخ الکبیر میں بھی ذکر کیا ہے اس میں بھی ترجیح اسی کو دی ہے کہ الحارث بن مسلم بن الحارث ہی راجح ہے لیکن امام صاحب نے بھی ان پر کوئی جرح نہیں فرمائی۔

لہٰذا احقر العباد راقم الحروف کے خیال میں یہ سند کم از کم حسن ہونی چاہئے یہی وجہ ہے کہ امام نسائی کی کتاب عمل الیوم واللیلۃ کے محقق محشی نے بھی لکھا ہے کہ یہ حدیث ان شاء اللہ حسن ہے۔ مزید تحقیق فی الحال ہمارے علم میں نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

کیا ضعیف حدیث قابل حجت ہے

سوال: کیا ضعیف حدیث قابل عمل ہے اور کیا صحاح ستہ کی تمام احادیث قابل عمل ہیں اور کیا کچھ حدیثیں موضوع (من گھڑت) بھی ہیں؟

الجواب بعون الوهاب: وہ ضعیف حدیث قابل عمل ہے جس کا ضعف تمام خفیف ہو مثلاً کسی راوی کا حافظہ معمولی کم ہو یا کچھ اور باتیں جو اصول حدیث کی کتب میں مفصلاً بیان ہوئی ہیں دوسری شرط یہ ہے کہ وہ حدیث فضائل اعمال میں ہو یعنی جس عمل کی فضیلت کے متعلق کوئی اور صحیح حدیث وارد ہوئی ہو تو پھر اسی عمل کی فضیلت کے متعلق کوئی خفیف ضعف کی حامل حدیث کو قبول کیا جائے گا۔

مثلاً نماز کی فضیلت اور اہمیت کتنی ہی صحیح احادیث سے ثابت ہے پھر جب اسی باب

میں کوئی ایسی حدیث ہو جس میں ضعف خفیف ہو اس میں نماز کی فضیلت وارد ہو تو اسے قبول کیا جائے گا مگر اس میں یہ خیال ملحوظ خاطر رہے کہ اس کی نسبت جزماً اور یقینی طور پر رسول اکرم ﷺ کی طرف نہ کی جائے۔

باقی حدیث کی ایک قسم حسن لغیرہ سے کم درجہ رکھتی ہے۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

باقی اعمال اور احکام وعقائد کے متعلق محدثین ومحققین وائمہ فن بہت کڑی شروط عائد کرتے ہیں، یعنی ضعیف احادیث سے احکام کا اثبات نہیں کرتے، باقی صحاح ستہ میں سواء صحیحین بخاری ومسلم کے علاوہ دیگر کتب میں کچھ احادیث صحیح تو کچھ ضعیف اور کچھ تو سخت ضعیف ہیں مگر ان کا علم حدیث کے ماہرین کے علاوہ کسی کو نہیں ہو گا باقی کچھ لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ صحاح ستہ کی سب احادیث بالکل صحیح ہیں تو انہیں ان کے متعلق اپنے قصور علم کا اعتراف کرنا چاہیے۔ حالانکہ ان کتب میں کچھ احادیث ایسی بھی پیش کی جا سکتی ہیں جن کے متعلق یہی بزرگ اقرار کرتے ہیں کہ وہ ضعیف ہیں لیکن پھر یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ان کتب کی سب کی سب احادیث صحیح ہیں۔ ((فالی اللہ المشتکیٰ.))

آج کل حدیث کا علم بہت کم رہ گیا ہے خصوصاً رجال کے فن اور اصول حدیث کا علم بہت ہی مشکل سے کہیں ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت دے آمین!

اصل بات یہ ہے کہ ان مشہور اور متداول کتب کو صحاح اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی اکثر احادیث صحیح اور قابل عمل ہیں اور قاعدہ ہے کہ حکم اکثریت پر لاگو ہوتا ہے یعنی جس کی اکثریت ہوتی ہے۔ اس کا اعتبار کیا جاتا ہے قلت کو معدوم سمجھا جاتا ہے اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ القلیل کالمعدوم بعینہٖ اسی طرح چونکہ ان چھ کتب میں اکثر احادیث قوی ہیں اور امت مسلمہ ان پر عمل کرتی چلی آ رہی ہے۔

لہٰذا اکثریت کے اعتبار سے ان کتب کو صحاح کا لقب دیا گیا ہے انہیں صحاح ستہ کہا گیا ہے اور باقی جو بہت کم احادیث ضعیف اور نا قابل حجت ہیں انہیں نظر انداز کر کے ترک کر دیا گیا ہے، کیونکہ وہ قلیل ہیں اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان میں ضعیف احادیث سرے سے

ہیں ہی نہیں اگر یہ بات کہی جائے تو پھر ان کتب کے مصنفین مثلاً ابواؤد، ترمذی، نسائی، وغیرہم نے خود ان کتب میں موجود کچھ احادیث پر ضعف کا حکم لگایا ہے تو پھر اس کا مطلب کیا ہے یہ تو اس مثال کی طرح ہوا کہ مدعی سست گواہ چست یعنی خود مصنفین تو ان کتب کی احادیث کی تضعیف کریں اور یہ ان کی وکالت کرنے والے یہ دعویٰ کریں کہ ان کتب میں کوئی بھی حدیث ضعیف نہیں ہے۔وکیل سچا یا اصیل؟ باقی ان کتب کے مصنّفین کا اپنی کتب میں ضعیف احادیث لانے سے ان پر کوئی قصور نہیں آتا کیونکہ انہوں نے احادیث کی اسانید ذکر کردی ہیں۔

لہٰذا وہ اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ باقی کوئی یہ دریافت کرسکتا ہے کہ آخران ضعیف احادیث کے ذکر کرنے کا مقصد کیا ہے تو اس کے متعلق گذارش ہے کہ اس طرز عمل کے کئی مقاصد ہیں۔

① :.....مثلاً کسی مسئلہ کے متعلق صحیح احادیث بھی وارد ہوئی ہیں تو اسی مسئلہ کی مخالفت میں کچھ ضعیف حدیثیں بھی ہیں تو اس صورت میں محدثین کرام دونوں ذکر کر کے ضعیف کے متعلق وضاحت کر دیتے ہیں کہ ضعیف حدیث ہے تا کہ ان ضعیف احادیث کے سننے کے بعد کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ جیسا کہ اس مسئلہ کے متعلق فلاں حدیث (صحیح) وارد ہے اسی طرح اس کے مقابلہ میں یہ حدیث (ضعیف) بھی وارد ہوئی ہے۔

لہٰذا اس مسئلہ کے متعلق ہم جو راستہ بھی اختیار کریں درست ہے دونوں طریقے درست ہیں اور آپ کے اسم مبارک پر جلد حدیثیں مشہور ہو جاتی تھیں۔ خصوصاً اسلام کے اول دور میں اس لیے کتنے ہی واضعین حدیثیں گھڑ گھڑ کر بیان کرتے رہتے تھے۔ لیکن اب ان بزرگوں نے ان حدیثوں (ضعیف) کو مقابلہ میں ذکر کر کے ان کے حال سے واقف کر دیا ہے لہٰذا اب کسی کو یہ موقعہ نہیں مل سکتا کہ اس طرح کر سکے کیونکہ کہ ہمارے پاس بھی دلیل موجود ہے۔ لہٰذا دونوں طریقے درست ہیں کیونکہ اب کہا جا سکتا ہے کہ بھائی آپ کی دلیل چونکہ کمزور ہے لہٰذا ہماری دلیل کے مدمقابل نہیں بن سکتی۔ اس کی ایک مثال یہ سمجھیں کہ فاتحہ

خلف الامام پڑھنے کے متعلق بالکل صحیح بلکہ اصح احادیث وارد ہوئی ہیں مگر ساتھ ہی کچھ قرأت خلف الامام (مطلق قرأۃ نہ کہ قرأۃ الفاتحہ) سے مانع روایات بھی موجود ہیں۔

لہٰذا محدثین دونوں احادیث کو ذکر کر کے ان ضعیف احادیث کا حال بیان کرتے آئے ہیں تا کہ مقابل ان سے استدلال نہ کر سکے۔

۲:...... کسی مسئلہ کے متعلق صحیح حدیث بھی ہے مگر اس کے موافق کچھ ضعیف حدیثیں بھی ہیں جن کا ضعف خفیف ہے تو محدثین ان ضعیف احادیث کو بھی ذکر کر دیتے ہیں تا کہ صحیح کچھ طرق (خواہ ضعیف ہی سہی) کی وجہ سے زیادہ قوی بن جائے یعنی اصل دلیل کی بنیاد صحیح حدیث ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ اس کے موافق ضعیف حدیثیں بھی آ گئیں تو ثابت شدہ دلیل کو مزید تقویت حاصل ہوگئی۔

۳:...... کسی مسئلہ کے متعلق یا کسی بات کے متعلق کوئی بھی صحیح حدیث وارد نہیں ہوئی مگر اس مسئلہ کے متعلق کسی صحابی کا قول یا فعل وارد ہوا ہے تو محدثین کرام رحمہم اللہ کسی ضعف خفیف کی حامل حدیث کو ذکر کرتے ہیں تا کہ اس قول یا فعل صحابی کو کچھ تقویت حاصل ہو یا اس طرح کہا جائے کہ اس طرف یا پہلو کو ترجیح دی جا سکے۔

۴:...... کوئی بھی صحیح حدیث وارد نہیں ہوئی مگر ایک ضعیف حدیث وارد ہوئی ہے لیکن وہ شدید ضعف کی حامل ہے۔ لہٰذا محدثین کرام ایسی حدیث کو بھی بسا اوقات ذکر کرتے ہیں لیکن اس لیے نہیں کہ اس کو دلیل بنایا جائے بلکہ اس لیے کہ اس کا حال معلوم کر کے عوام کو اس سے احتراز کی تلقین کریں کیونکہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن سے ہر مسلم کو بے حد عقیدت مندی ہوتی ہے پھر جب وہ یہ سنتا ہے کہ فلاں مسئلہ کے متعلق یا فلاں معاملہ کے متعلق آپ کا ارشاد وارد ہے تو وہ اس کی اتباع کی کوشش کرتا ہے، اس لیے محدثین رحمہم اللہ کو وہ حدیث لا کر تصریح کرنی پڑتی ہے تا کہ عوام بھی ان ضعیف یا موضوع حدیثوں کو بیان کرنے نہ لگ جائیں۔ کیونکہ ایسی روایتوں کی نسبت بھی آپ کی طرف کرنا گناہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

((من حدث عني حديثا وهو يرىٰ انه كذب فهو احد الكاذبين .)) ❶

''یعنی جو کوئی ایسی حدیث بیان کرتا ہے جس کے متعلق وہ جانتا ہے تو وہ دو جھوٹوں یعنی بنانے والا اور بیان کرنے والا میں سے ایک جھوٹا ہے۔''

آپ ﷺ کی ذات گرامی پر جھوٹ باندھنا کبیرہ گناہ ہے۔ اگر ایسا شخص توبہ تائب نہیں ہوتا تو اس پر جہنم واجب ہے۔

ایسی ہی ضعیف اور موضوع حدیثوں میں کتنی ہی بدعات شنیعہ اور کئی شرکیہ اعمال مسلمانوں میں رائج ہو چکے ہیں، اس لیے محدثین جیسے خدا پرست انسانوں اور حق پرست علماء پر یہ تھا کہ وہ ایسی روایات سے امت مسلمہ کو آگاہ کریں تاکہ لاعلمی کی وجہ سے ہلاکت کے گڑھے میں نہ گریں۔

اس طرح کے کئی اور اسباب بھی ہو سکتے ہیں اگر کوئی اہل دانش شخص غور کرے گا تو اسے تھوڑا سا غور کرنے سے ہی ان پر اطلاع حاصل ہوسکتی ہے۔ مگر ہمارے اس کلام سے شاید کوئی شخص یہ خیال کرے کہ ایسی ضعیف احادیث کے متعلق محدثین کرام رحمہم اللہ ہر جگہ پر لامحالہ اور بالضرور تصریح کرتے ہوں گے اور ان کی اسانید کے رواۃ کے متعلق آگاہ فرماتے ہوں گے لیکن ہر جگہ پر یہ سمجھنا درست نہیں۔

کیونکہ کچھ جگہوں پر وہ دانستہ رواۃ کے متعلق تصریح نہیں کرتے اس لیے کہ وہ مجروح راوی اتنا معروف ومشہور ہوتا ہے اور اس کی بیان کردہ حدیثوں کا حال اتنا واضح ہوتا ہے کہ بہت کم حدیث کے ساتھ ممارست رکھنے والے کو بھی معلوم ہوتا ہے وہ راوی کتنے پانی میں ہے۔ اور وہ کون سی آفت ہے۔

مثلاً جابر جعفی وغیرہ تو اس صورت یہ بزرگ اس کی شہرت اور حدیث میں اس کے حال

---

❶ سنن ترمذي، كتاب العلم، باب ما جاء في من روى حديثا وهو يرى انه كذب، رقم الحديث:٢٦٦٢ .

کے عام ہونے کی وجہ سے صرف سند ذکر کر دیتے ہیں تاکہ اس سند کو دیکھنے والا فوراً معلوم کر کے ترک کر دے۔ لہٰذا اس صورت میں محدثین کی تصریح کی کوئی ضرورت نہیں۔ افسوس! کہ آج کل اتنے بڑے مجروح راویوں کا علم رکھنے والے بھی کم ہوتے جا رہے ہیں۔

محدثین دوسرے انسانوں کو بھی اس فن وعلم کی طرف متوجہ کرنے کے لیے بھی بسا اوقات کچھ احادیث کا ضعف بیان نہیں کرتے تاکہ طالب حدیث میں اس فن کا شوق وجذبہ پیدا ہو اور وہ خود اس فن میں مہارت حاصل کر لے تاکہ اس میں اتنی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ خود بھی کسی روایت کی کما حقہ تحقیق کر سکے ورنہ دوسری صورت میں حدیث کے طالب محض مقلد بن جائیں گے۔

باقی اس میں اتنی استعداد نہیں ہو گی کہ خود کسی حدیث کی تحقیق کر سکے۔ لہٰذا محدثین اس غرض سے بھی کہ طالب حدیث خود اتنی استعداد پیدا کرے کہ کسی حدیث کی تحقیق کر سکے رواۃ کے حالات بیان نہیں کرتے۔

امام محدثین امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح میں جو ابواب اور احادیث کے تراجم میں جو قابلیت دکھلائی ہے وہ کسی دوسرے محدث میں بمشکل نظر آتی ہے۔ باب باندھ کر اس کا ترجمہ لکھتے ہیں پھر اس کے تحت حدیث ذکر کرتے ہیں اور پھر کتنی ہی باران احادیث کو تراجم الابواب پر منطبق کرنے کے لیے شارح حیران رہ جاتے ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ طرز عمل اس لیے اپناتے ہیں کہ طالب علم بھی اپنے ذہن کو تیز کرے اور وہ احادیث سے مسائل کے استنباط پر قدرت حاصل کرے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف مجتہد ہے بلکہ مجتہد گر بھی ہے یعنی غیر مجتہد کو مجتہد بنانے والا ہے۔ رحمة رحمة واسعة.

بہرحال محدثین کرام رحمہم اللہ کا ضعیف احادیث کو اپنی کتب میں ذکر کرنے کے کئی مقاصد ہیں لہٰذا انہیں ان احادیث کو لانے کی وجہ سے مطعون نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب

سنن ابن ماجہ کا معیار

سوال: سنا بھی ہے اور لکھا ہوا پڑھا ہے کہ سنن ابن ماجہ میں صرف ایک ہی حدیث موضوع ہے وہ کون سی حدیث موضوع ہے؟

الجواب بعون الوهاب: سنن ابن ماجہ میں ایک سے زائد احادیث موضوع ہیں اگرچہ مشہور یہی ہے کہ سنن ابن ماجہ میں ایک ہی روایت موضوع ہے جو کہ ابن ماجہ شہر قزوین کی فضیلت کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔

علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ الفوائد المجموعہ کے صفحہ نمبر ۱۵۰ میں لکھتے ہیں کہ:

((حديث ستفتح عليكم الآفاق ويفتح عليكم مدينه يقال لها قزوين من رابط فيها اربعين كان له في الجنة عمود من ذهب إلى قوله قد اورده ابن الجوزي في الموضوعات فاصاب ولعل هذا هو الحديث الذي يقال ان في سنن ابن ماجه حديث موضوعاً انتهىٰ.))

اسی حدیث کا متن مع سند سائل کے لیے نقل کیا جاتا ہے۔

((حدثنا اسماعيل بن سمرة حدثنا محمد بن يعلى السلمي ثنا عمر بن صبيح عن عبدالرحمان بن عمرو عن مكحول عن ابي بن كعب رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ لرباط يوم في سبيل الله من وراء عورة المسلمين محتسبا من غير شهر رمضان اعظم اجرا من عبادة مائة سنة صيامها وقيامها ورباط يوم في سبيل الله من وراء عورة المسلمين محتسباً من شهر رمضان افضل عندالله.))[1]

[1] اخرجه ابن ماجه في كتاب الجهاد باب: فضل الرباط في سبيل الله، رقم الحديث: (۲۷٦۸). ط: دارالسلام.

فن رجال کا علم کہاں

سوال: ایک شخص ایسا ہے جس کا تعلق دین اسلام سے ہے جب کہ وہ قرآن مجید اور اس کا ترجمہ وتشریح اور کتب احادیث مثلاً صحاح ستہ وغیرہ اور دینی لٹریچر کا اچھی طرح مطالعہ کرتا ہے لیکن وہ شخص عربی گرامر یعنی صرف ونحو اور اسماء الرجال کے فن سے پوری طرح واقف نہیں ہے اور وہ دعوت وتبلیغ کا شوق رکھتا ہے کیا ایسا شخص قرآن کی تفسیر (ابن کثیر) اور صحاح ستہ کی روشنی میں دعوت وتبلیغ کرسکتا ہے جب کہ بعض احباب کا کہنا ہے کہ ایسا شخص جو اسماء الرجال کے فن سے واقف نہیں وہ اس حدیث کا مصداق بن سکتا ہے

((من كذب على متعمداً فليتبوا مقعده من النار .))

(صحیح بخاری و مسلم)

کیا یہ درست ہے؟

الجواب بعون الوهاب: صورت مسئولہ میں ایسا شخص دعوت تبلیغ کرسکتا ہے کیونکہ دعوت وتبلیغ کے لیے اسماء الرجال کے فن سے واقف ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ دعوت تبلیغ کے لیے قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ میں اس طرح کی کوئی حد بندی وارد نہیں ہوئی بلکہ تھوڑا بہت علم رکھنے والا بھی اسلام کی تبلیغ کرسکتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (آل عمران : ۱۱۰)

”تم بہترین ہو تو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہو تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر تمام اہل کتاب بھی ایمان لے آتے ان کے حق میں تو بہتر تھا۔ ان میں سے تھوڑے ہیں جو ایمان لائے ورنہ اکثر نافرمان ہیں۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ سے خطاب فرمایا ہے کہ تمہیں بہترین امت بنا کر پیدا کیا ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے روکتے ہو اس آیت میں امت مرحومہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے صرف اس وجہ سے کہ اس امت میں دعوت وتبلیغ کا کام موجود ہے۔ (اچھے کاموں کی تلقین کرنا اور برے کاموں سے روکنا) یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اس امت کے سب لوگ عالم نہیں ہیں اور نہ ہی ہو سکتے ہیں جب کہ اس امت کے کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو لاعلم اور جاہل ہیں بلکہ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو علم سے ناآشنا اور ناواقف ہیں تبلیغ کا اصل معنی یہ ہے کہ ہر اچھے کام کا حکم دینا اور ہر برائی سے روکنا یہ ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ ہر شخص بغیر علم کے تبلیغ کر سکتا ہے جیسا کہ حدیث میں بھی ایسا حکم ارشاد ہوا ہے:

((عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان النبی ﷺ قال بلغوا عنی ولو آیۃ...... الخ)) [1]

''سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ سے جو سنو اسے آگے پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو، یعنی رسول اللہ ﷺ سے جس شخص نے بھی جو رسول اللہ ﷺ سے سنا وہ دوسروں تک پہنچائے۔''

ایک اور حدیث میں اس طرح کا حکم ارشاد ہوا ہے:

((الا لیبلغ الشاھد الغائب او کما قال علیہ السلام .)) [2]

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ہر عام وخاص سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اے لوگو! میری اس نصیحت کو جو لوگ حاضر ہیں غیر حاضر لوگوں تک پہنچائیں اسلام کے پھیل جانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرصہ قلیل میں تمام دنیا تک پہنچ کر بے مثال ترقی کی جس کا اصل سبب بھی یہی ہے کہ جو بھی صحابی رسول اللہ ﷺ سے

[1] صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، رقم الحدیث: ۳۴۶۱.

[2] صحیح البخاری ... رقم الحدیث: ۱۰۴.

سنتا تھا اس کو بعینہٖ دوسروں تک بغیر کسی تاخیر کے پہنچا دیتا تھا۔

پھر آج کل کے مسلمانوں کی تنزلی (پستی) کا سبب بھی یہی ہے کہ جوانہوں نے اپنا فریضہ تبلیغ ترک کردیا ہے برعکس اس کے جو تھوڑی بہت تبلیغ کرتا ہے تو اس شخص سے مذاق کی جاتی ہے رب کریم ہمیشہ ہم مسلمانوں کی ہدایت فرمائے اور ہماری خطاؤں اور لغزشوں کو معاف فرمائے۔ آمین!

آخر میں ایک اور آیت بھی پیش کی جاتی ہے جس میں تبلیغ کا حکم وارد ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (آل عمران: ۱۰۴)

”تم میں بھی ایسے جماعت ہونی چاہئے جو لوگوں کو اسلام کی طرف بلاتی رہے اور نیکی کا حکم دیتی رہے برائیوں سے روکتی رہے اور یہی کامیاب لوگ ہیں۔“

کیا شیطان کے سینگ ہیں؟

سوال: حدیث شریف میں ہے کہ سورج طلوع ہوتے وقت نماز نہ پڑھو کیونکہ سورج شیطان کے دوسینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے۔ اُدھر سائنس نے بھی ثابت کیا ہے کہ مثلاً ڈھاکہ اور حیدرآباد کے درمیان ایک ایک گھنٹے کا تفاوت ہے اسی طرح جو ملک دوسرے ملکوں سے مشرق کی طرف ہیں وہاں مغرب کے ملکوں سے قبل سورج طلوع ہوتا ہے اسی طرح سورج غروب ہوتے وقت بھی نماز پڑھنے کی منع وارد ہے کیونکہ اس وقت سورج شیطان کے دوسینگوں کے درمیان غروب ہوتا ہے۔ حالانکہ سورج غروب ہونے کا وقت مختلف ملکوں میں الگ الگ ہے۔ مشرقی ممالک میں سورج پہلے غروب ہوتا ہے اور مغربی ممالک میں سورج دیر سے غروب ہوتا ہے۔ مثلاً پاکستان میں سورج عرب ممالک کے مقابلے میں دوڈھائی گھنٹے قبل طلوع وغروب ہوتا ہے یہ مشاہدہ کی بات ہے جس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا اب سائنس والے کہتے ہیں کہ ایک ہی شیطان کئی جگہوں پر سورج کو سر دیتا رہتا ہے کیا؟ کہا

جائے گا کہ یہ حدیثیں جھوٹی ہیں ورنہ یہ احادیث مشاہدات اور واقعات کے برخلاف نہ ہوتیں۔ اب قرآن وحدیث سے اس سوال کی وضاحت اور تفصیل سے جواب دیا جائے تا کہ شکوک وشبہات دور ہو جائیں؟

الجواب بعون الوهاب: حدیث پاک پر اس بے جا اعتراض کے جواب سے پہلے ایک گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی ایک بنیادی بات یہ ہے کہ ایک سچا مومن اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے سچے مقدس رسول ﷺ کی ہر اس بات پر پورا بھروسہ اور یقین کامل رکھے جو صحیح طور باسند ثابت ہو اگر کسی آدمی کا کتاب وسنت کے ثابت شدہ حقائق پر ایمان کامل نہیں ہے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے جب ایک انسان کتاب وسنت پر پکا اور سچا ایمان رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ خود اس کی رہنمائی کرتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت: ٦٩)

''جو ہماری راہ میں کوشش کرتا ہے ہم ضرور انھیں راستہ دکھاتے ہیں۔''

اور ایسے کامل ایمان والے کے لیے خود ہی ایسے اسباب علم اور ہدایت کے ایسے راستے مہیا کرتا ہے کہ اس کے سارے شک وشبہات کافور بن جاتے ہیں اور اس کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے لیکن جو شخص بے ایمان ہے اور اس کا دل ودماغ پر اسلام کے خلاف تعصب کے پردے لٹکے ہوئے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے دین کے دشمنوں کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے تو ایسے آدمی کو کتاب وسنت میں غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا کیونکہ اس کی آنکھوں پر دشمنان اسلام کی دشمنی کا چشمہ چڑھا ہوا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی آنکھوں کو کتاب وسنت کی باتیں اس طرح نظر نہیں آتیں جس طرح اس کو اس کے آقا پٹیاں پڑھاتے ہیں۔

پھر ایسے ملحد اور بے دین حدیث پاک کے دشمن اور متکبرین اسلام کو ان ہدایت کی باتوں میں کئی شکوک وشبہات نظر آتے ہیں چونکہ ان منکرین حدیث کا عالم ہی دوسرا ہے انہوں نے یہ عزم کیا ہوا ہے کہ خواہ مخواہ تحریف وتبدیل کر کے معنی اور مطلب کو گھما کر کوئی نہ کوئی حدیث پاک میں نقص وعیب نکالنا ہی ہے اس لیے ان کے اعتراض حق کو سمجھنے کے لیے

نہیں ہوتے بلکہ محض اللہ کے بندوں کو گمراہ کرنے اور حق سے پھسلانے کے لیے ہوتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ (لانعام: ١١٢)

مطلب کہ قرآن کریم کے مطابق انسانوں میں شیاطین یعنی (سرکش اور اللہ کے بندوں کو گمراہ کرنے والے) ہیں جو انبیاء کرام علیہم السلام کے برخلاف لوگوں کو بے ہودہ باتیں بتا کر ان کے دلوں میں شکوک وشبہات ڈال کر صراط مستقیم سے دور کر دیتے ہیں، اس لیے یہ منکرین حدیث بھی شیطان ہیں محض اسلام سے دشمنی کی خاطر ایسے غلط اور واہی اعتراضات اور بے ہودہ شکوک وشبہات سادہ مسلمانوں کے سامنے پیش کر کے ان کو گمراہی کے عمیق گھڑے میں گرا رہے ہیں ورنہ دراصل ایمان کے لیے اس حدیث پاک میں قابل اعتراض کوئی بات ہی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی مشاہدات اور واقعات کے خلاف کوئی حقیقت بتائی گئی ہے۔

صرف سمجھنے کا فرق ہے یا حسد وتعصب کا چشمہ چڑھانے کا اثر ہے۔ ﴿واللہ یھدی من یشاء الٰی صراط مستقیم﴾ اب جواب عرض رکھا جاتا ہے۔

دراصل حدیث مبارک میں یہ مشکلات اس لیے پیش آئی کہ ایک تو حدیث پاک میں لفظ ''شیطان'' ہے جس سے ابلیس مراد لیا جاتا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے دوسرا یہ کہ حدیث شریف میں یہ الفاظ ہیں:

((فانها تطلع بين قرني الشيطان .))

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

''کیونکہ یہ سورج شیطان کے دوسینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے۔''

یہ ترجمہ بھی غلط ہے اس لیے یہ پوری خرابی وجود میں آ گئی۔ اس احوال کی تفصیل یہ ہے کہ ''شیطان'' کا لفظ کوئی خاص ابلیس کے لیے نہیں ہے بلکہ شیطان کے معنی ہے سرکش جو اپنی سرکشی میں اور ہو گیا ہو اور اللہ کے بندوں کو گمراہ کرتا رہے اسی لیے تو قرآن کریم میں کافروں

کو بھی شیطان کہا گیا ہے۔ جس طرح سورت بقرۃ میں منافقوں کے ذکر کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ﴾ (البقرۃ: ۱۴)

"یعنی جب وہ اپنے شیاطین یعنی کافروں کے ساتھ تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔"

اسی طرح سورۃ انعام میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ (الانعام: ۱۱۲)

"یعنی اسی طرح ہم نے شیطان جنوں اور انسانوں کو ہر نبی کے لیے دشمن بنایا ہے۔"

اس سے ثابت ہوا کہ شیطان کوئی خاص "ابلیس" کا نام نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایک گمراہ کن سرکش ہے، پھر وہ جن ہو یا انسان وہ شیطان ہے۔ یہ بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ جنوں میں بھی صرف ایک ابلیس ہی شیطان نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک بڑا قافلہ ہے اگرچہ ابتدا میں ابلیس ایک ہی گمراہ تھا جس طرح انسانوں کا باپ بھی ایک ہی تھا جس سے دوسرے انسان پیدا ہوئے اور بڑھے اسی طرح ابلیس نے بھی بعد میں (مہلت ملنے کے بعد) اپنے کئی پیروکار بنا دیے ہیں جو ہر جگہ انسانوں اور جنوں کی صورت میں موجود ہیں۔ اس حقیقت کی طرف قرآن نے کئی جگہوں پر اشارہ کیا ہے۔ مثلاً:

﴿وَ یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ﴾ (الانعام: ۱۲۸)

"اور وہ دن جس دن اللہ تعالیٰ سب کو جمع کرے گا (اور فرمائے گا) اے جنوں کی جماعت تم نے انسانوں سے بڑی جماعت ساتھ لے لی۔"

﴿اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ (الاعراف: ۲۷)

"وہ اور اس کا گروہ تمھیں ایسی جگہ سے دیکھتا ہے جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔"

﴿فَكُبْكِبُوا فِيهَا هُمْ وَالْغَاوُونَ ۝ وَجُنُودُ إِبْلِيسَ أَجْمَعُونَ﴾

(الشعراء : ٩٤، ٩٥)

''پھر وہ سب اور کل گمراہ لوگ جہنم میں اوپر تلے ڈال دیے جائیں گے۔''

یہی سبب ہے کہ ابتدا میں تو ابلیس نے ہی بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کی تھی حتی کہ ایک بڑا لشکر تیار کر لیا بعدازاں خود ایک جگہ بیٹھ گیا اور اس کے چیلے چھاٹے خلق اللہ کو گمراہ کرتے ہیں اور خود ابلیس کہیں بھی نہیں جاتا الا یہ کہ کوئی بڑا معرکہ سر کرنا ہو یا کسی ایسے آدمی کو گمراہ کرنا ہو جو اس کے چھوٹے کارندوں سے گمراہ نہ ہوتا ہو یا کسی ایسی جگہ برائی پھلانی ہو جہاں اس کے چھوٹے نہ پھیلا سکتے ہوں۔ ایسی صورتوں میں ابلیس وہاں جا کر خود کام کرتا ہے ورنہ ہر جگہ وہ نہیں جاتا بلکہ اس کے متبع ہی یہ کام سرانجام دیتے ہیں اس حقیقت کا بیان اس حدیث صحیحہ کے اندر ہے کہ:

''شیطان ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھا کر بیٹھا ہوا ہے پھر اس کے پاس اس کے چیلے چھاٹے آ کر اپنی اپنی کارگذاریاں پیش کرتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ میں نے فلاں سے زنا کروایا، کوئی کہتا ہے کہ میں نے فلاں سے ناحق خون کروایا ہے وغیرہ وغیرہ، مگر ابلیس ہر ایک کو کہتا ہے کہ تم نے کچھ نہیں کیا پھر ایک اور آگے بڑھ کر کہتا ہے میں نے فلاں میاں بیوی کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک ان کے درمیان جدائی نہ کروائی۔ پھر ابلیس اس سے بغلگیر ہو کر کہتا ہے کہ تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔''

اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ ابلیس خاص ہر جگہ نہیں جاتا بلکہ یہ کام اس کے چیلوں کے ذمے ہوتا ہے جو گمراہی پھیلاتے رہتے ہیں جب یہ حقیقت ذہن نشین ہو گئی تو حدیث کا مطلب بھی صاف ہو گیا کہ ابلیس کی طرف سے ہر ایک ملک میں شیطان مقرر ہے جو کہ سورج کے طلوع اور غروب کے وقت اس کے آگے کھڑا ہوا ہوتا ہے اس حالت میں کہ سورج اس کے کندھوں کے درمیان طلوع اور غروب ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ (یعنی دور سے)

غالبًا ان دونوں کندھوں کو اس کے دو سینگ کہا جاتا ہے مطلب کہ مغربی پاکستان میں سورج طلوع ہوتے وقت ایک شیطان جو کہ ابلیس کی طرف سے مقرر ہوتا ہے سورج کو پیٹھ دے کر اور غیر کے پجاریوں کی طرف منہ کر کے کھڑا ہوتا ہے۔ اور اس کے پیچھے سورج طلوع ہوتا ہے گویا وہ اس کے دونوں کندھوں کے درمیان آہستہ آہستہ طلوع ہوتا ہے۔

اگر سورج زمین سے بھی بڑی ہے لیکن دور سے ایک گول تھال کی طرح نمایاں دکھائی دیتی ہے اور کندھوں کے درمیان دور سے اس کی گولائی پوری طرح سے نظر آئے گی اس پر خوب غور اور تجربہ کر کے دیکھیں۔ بہرحال چونکہ اس وقت سورج کے پجاری سورج کی پوجا پاٹ کرتے ہیں اور شیطان جا کر ان کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تا کہ اس کو سجدہ ہو جائے بس یہی بات تھی اور یہی ان پجاریوں کے ساتھ مشابہت تھی جس کی حدیث میں منع وارد ہے۔

اسی طرح مشرقی پاکستان کے لیے الگ شیطان مقرر ہے اور عرب کے لیے الگ ہندوستان کے لیے الگ مطلب کہ ہر ملک اور خطہ کے لیے الگ الگ شیطان ابلیس کی طرف سے مقرر ہے اور غالبًا واللہ اعلم حدیث میں جو لفظ " الشیطان" کا استعمال ہوا ہے اس میں الف لام عہدی ہے یعنی وہ خاص شیطان جو ابلیس کی طرف سے مقرر ہے۔ بہرحال حدیث کا مطلب صاف واضح ہے جس میں کوئی شک وشبہ اور الجھن نہیں ہے، باقی اگر منکرین حدیث اور متعصبین کو کوئی خامی یا خرابی نظر آتی ہے تو یہ ان کے نظروں کا قصور ہے ایسے لوگ حدیث کی روشنی سے اس طرح نفرت کرتے ہیں جس طرح چمگادڑ سورج کی روشنی سے نفرت کرتا ہے۔

گر نبیند بروز شپرہ چشم
چشمہ آفتاب راچہ گناہ

کیا یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ ایک لفظ کو اپنے خیال اور اندھی رائے کے مطابق غلط معنی دے کر پھر اس پر اعتراض کیا جائے؟ ایسے دشمنان دین لوگ جہاں بھی شیطان لفظ پاتے ہیں وہاں ابلیس مراد لیتے ہیں۔ حالانکہ پیچھے ہم دلائل سے یہ بات ثابت کر چکے ہیں کہ شیطان

کوئی خاص ابلیس کا نام نہیں ہے پھر جن لوگوں کے علم کا مبلغ بھی یہ ہے کہ جن کو کتاب وسنت کا اتنا علم بھی نہیں ہے تو ان کو کیا حق کہ وہ احادیث مبارک کے اندر زبان درازی کریں۔ اول تو ایسے حضرات پورا علم حاصل کریں پھر اپنی زبان سے کچھ بولنے کی جرأت کریں۔ سندھی میں کہاوت ہے۔

"اك لپي کون کبڙ خان چنڊ ڏٺو"

یعنی آنکھ ہے ہی نہیں اور کھبڑ خان گیا ہے چاند دیکھنے۔

کیا یہ بھی علمی دیانت ہے کہ اپنے خیال سے شیطان کی معنی ابلیس لے کر اس طرح کی بے ہودہ الزام تراشی کی جائے کہ اب ایک شیطان کتنی جگہوں پر سورج کو سر دیتا رہے گا؟

اللہ اکبر! اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اج کل ایسے بے عمل اور کور چشم بھی پاک پیغمبر ﷺ کے مبارک کلام پر اعتراض کرتے ہیں اور احادیث پاک کو نشانہ طعن و تشنیع بناتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ زبردست علمی خیانت ہے۔ دشمنان رسول ﷺ اس کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:

﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾

(الحج: ٤٦)

"اصل میں ان کے دل ہی اندھے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کو کوئی چیز نظر نہیں آتی:

((اللهم اعذنا من عمى القلوب.))

حاصل کلام یہ ہے کہ حدیث شریف کا مطلب بالکل واضح ہے جس میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں ہے اور نہ ہی مشاہدہ کے خلاف کوئی بات ہے۔ معترض کا اعتراض سراسر بیہودہ اور واہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

کتاب العقائد

اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عالم کہتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو بلا کیف مستوی علی العرش مانے وہ کافر ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ ہر ایک آدمی کے سینے میں موجود ہے جس طرح حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ، زمین اور آسمان کی پیائش مت کریں صرف مسلمان مرد کے دل کی پیائش کریں۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر نہیں ہے بلکہ ہر ایک آدمی کے سینے میں ہے آیا یہ بات درست ہے یا نہیں؟ بینوا بالدلیل توجرو بأجر الجلیل.

الجواب بعون الوهاب: قرآن کریم میں کتنی ہی جگہوں پر اللہ تعالیٰ کا عرش عظیم پر مستوی ہونا ثابت ہے مثلاً سورۃ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ....﴾ (الاعراف: ٥٤)

''بے شک تمھارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔''

﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ....﴾ (یونس: ٣)

''بے شک تمھارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔''

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ....﴾ (الرعد: ٢)

''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ستونوں کے، جنھیں تم دیکھتے ہو، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔''

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (طٰهٰ : ٥)

''وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا۔''

﴿الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ....﴾ (الفرقان : ٥٩)

''وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر عرش پر بلند ہوا۔''

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ....﴾ (السجدہ : ٤)

''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی ہر چیز کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔''

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ....﴾ (الحديد : ٤)

''وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔''

ان تمام آیات میں اللہ تعالیٰ کا عرش عظیم پر مستوی ہونا واضح طور پر ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ کا عرش پر استویٰ اس کی صفت ہے اور اللہ کی صفات کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور سلف صالحین کا یہی مسلک ہے (یہی مسلک اصح اور اسلم ہے) کہ اللہ تعالیٰ کی وہ تمام صفات جو قرآن کریم سے اور صحیح احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں ان کو ویسے ہی ماننا ہے جس طرح کتاب وسنت میں وارد ہوئی ہیں۔ ان کی لغوی معنی تو ہمیں معلوم ہے لیکن ان کی کیفیت کے بارے میں نہ ہمیں کچھ معلوم ہے اور نہ ہی کوئی ایسا ذریعہ یا وسیلہ ہے جس کی بنا پر ان کی کیفیت معلوم کر سکیں۔ یہ مسلم قانون ہے کہ صفات ذات تابع ہوتی ہیں جب کہ اللہ جل وعلیٰ شانہ کی ذات پاک بے مثل ہے تو اس کی صفات بھی بے مثل ہوں گی،

خالق اور مخلوق کی صفات میں صرف لفظی اشتراک ہے باقی معنی اور مفہوم کے لحاظ سے مخلوق کی صفات اس بے مثل ذات پاک کی صفات سے کوئی اشتراک نہیں رکھتی مثلاً انسان کو بھی سمیع اور بصیر کہا گیا ہے جس طرح سورۃ الدہر کے اندر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا﴾ (الدھر: ۲)

''یعنی انسان کو بھی سننے والا اور دیکھنے والا بنایا گیا ہے۔''

اور ہاں ''سمیع اور بصیر'' اللہ تعالیٰ کی بھی صفات ہیں مگر ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سورۂ شوریٰ کے اندر فرماتے ہیں:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوری: ۱۱)

''کہ اللہ تعالیٰ سننے والا اور دیکھنے والا ہے لیکن اس کا سننا اور دیکھنا بے مثل ہے۔''

یعنی سننے اور دیکھنے میں ہماری طرح آنکھوں اور کانوں کا محتاج نہیں ہے۔ یہی حکم اللہ تعالیٰ کی باقی تمام صفات کا ہے۔ مثلاً اللہ کا کلام کرنا، اللہ کا غضب اور رضا مندی، بندوں سے محبت کرنا ان پر غصہ کرنا۔

ید (ہاتھ) عین (آنکھ) وجہ (چہرا) وغیرہ تمام کو ویسے ہی ماننا ہے جس طرح کتاب وسنت میں وارد ہوا ہے۔ نہ ان کے اندر تاویل کی جائے گی اور نہ ہی ان کا معنی مفہوم ایسا لیا جائے گا جو مخلوق سے مشابہت کی طرف منتج ہو، درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفات بھی متشابہات کے باب سے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان متشابہات کے نزول اور بیان کا آخر مقصد کیا ہے کہ ہم انسانوں کو ان کے پورے مفہوم اور کیفیت کا علم ہی نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت صرف اس کی صفات کے علم سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھ ہی نہیں سکتے، مثلاً کسی ملک کا بادشاہ ہو یا دوسری کوئی بڑی ہستی ہو وہاں تک لوگوں کی رسائی نہ ہو اور اس کے متعلق واقفیت صرف اس کی صفات سے ہو سکتی ہو، یعنی ہمیں علم کے صحیح ذرائع سے معلوم ہو کہ وہ بادشاہ عدل وانصاف والا ہے، اپنی رعیت پر رحم کرنے

والا ہے، ان کی تکالیف پر خبر گیری اور مدد کرنے والا ہے، وغیرہ وغیرہ تو اس کی ان خوبیوں کی اعلیٰ صفات کی معرفت سے ہمیں اس کے بارے میں کافی حد تک صحیح علم ہو جاتا ہے، اس لیے وہ عوام جس کو اپنے اس بادشاہ تک رسائی حاصل نہیں ان کے دل میں بھی یہ یقین کامل ہو جاتا ہے کہ بادشاہ جب رحم دل اور عدل و انصاف کا علمبردار ہے ظلم وزیادتی سے کنارہ کشی کرنے والا ہے تو ہماری مشکلات کی اگر اس کو اطلاع ہو گئی تو ضرور ہماری مدد کرے گا اور مشکل وقت میں ضرور ہمارے کام آئے گا، اس کی ان خوبیوں اور کمالات کو مدنظر رکھ کر لوگ اس سے بے پناہ محبت کرنے لگتے ہیں، اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ جو کہ پوری مخلوق کا خالق و مالک اور حقیقی بادشاہ ہے جس نے اپنے بندوں کو آزمانے کے لیے اس دنیا میں مبعوث کیا اور اسی امتحان کی خاطر انہیں حکم کیا کہ وہ ان دیکھے ان پر ایمان لائیں غیب پر ایمان لائیں یہی وجہ ہے کہ اس دنیا فانی کی مخلوق اس فانی دنیا میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتی اور انسان جس چیز کو نہیں دیکھ سکتا آخر اس کے ساتھ تعلق کس طرح قائم کر سکتا ہے؟ کس چیز کے ساتھ کسی کا تعلق یا تو اس کے حسن و جمال خوبیوں اور کمال کے مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے یا اس کی صفات حمیدہ اور اس کی بے شمار خوبیوں کے علم حاصل ہونے سے پیدا ہوتا ہے، جبکہ ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو اس دنیا میں نہیں دیکھ سکتے اس لیے ان سے تعلق قائم کرنے کی صرف واحد صورت یہی بچتی ہے کہ ہمیں ان کی صفات اور اسمائے حسنیٰ کا علم ہو جائے پھر جب بندے کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ ہمارا رب اللہ خالق بھی ہے مالک بھی ہے تمام مخلوق کی پرورش بھی کر رہا ہے ان کو رزق بھی دے رہا ہے، عدل وانصاف والا ہے، کسی پر ذرے برابر بھی ظلم نہیں کرتا، بندوں پر رحم کرتا ہے ان سے محبت کرتا ہے اور ان کی فریاد رسی بھی کرتا ہے جب بھی اس کو پکارا جائے تو پکار کو سنتا بھی ہے اور قبول بھی کرتا ہے۔ گناہوں کو معاف کرنے والا ہے رات کے آخری حصہ میں دنیا آسمان پر نازل ہو کر بندوں کو پکار پکار کر اپنے گناہوں اور خطاؤں کی معافی طلب کرنے کا کہتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت ساری صفات حمیدہ کے علم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ بندہ اپنا تعلق اللہ تعالیٰ سے استوار کر لیتا ہے اور دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے

یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی اتنی محبت ہوتی ہے کہ دنیا کی کسی چیز سے اتنی محبت نہیں ہوتی، قرآن کریم سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ....﴾ (البقرة: ١٦٥)

''اور جو ایماندار لوگ ہیں وہ تو سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔''

اہل ایمان کی اللہ تعالیٰ سے بے انتہا محبت ہے اور یہ اتنی بڑی محبت یہ تعلق ورشتہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفات کے علم کا نتیجہ ہے۔

سورۂ ذاریات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذاريات: ٥٦)

''کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔''

اور ظاہر ہے کہ کسی کی عبادت اس کی معرفت کے بغیر تصور میں نہیں آ سکتی، تو اگر بندوں کو رب کی صفات کا علم نہ ہوتا تو اس کی عبادت کس طرح کر سکتے تھے۔ جہمیہ وغیرہ نے اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کیا ہے درپردہ گویا اللہ سبحانہ وتعالیٰ معاذ اللہ کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ یا کوئی مستقل ہستی نہیں ہے کیونکہ انسان جو مشاہدات اس دنیا میں کرتا ہے جن کا تعلق چاہے جمادات یا نباتات کی اقسام سے ہو یا حیوانات کے باب سے حیوانات سے مراد جاندار چیزیں ہیں۔ ان تمام کی کچھ نہ کچھ صفات ہیں موجودات میں سے کوئی بھی چیز صفات سے عاری نہیں ہے پھر اگر اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت ہی نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ ایک موہوم چیز ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اور اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا کفر یہ عقیدہ نہیں ہوسکتا۔ دوسرے الفاظوں میں یوں سمجھیں کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکاری ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکاری ہے۔ خلاصہ کلام کہ بندوں کو اللہ کی بندگی کے لیے ضروری ہے کہ ان کے ذہنوں میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم ہو اور اس علم کے ذریعے ان کے دل ودماغ میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم ہو اور اس علم کے ذریعے ان کے دل اور دماغ میں اللہ تعالیٰ کے متعلق صحیح یقین اور تصور قائم ہو سکے کہ میری یہ عبادت اس ذات پاک

جل وعلیٰ کے لیے ہے جس کی یہ یہ صفات ہیں اور اس سے یہ یقین قائم ہوگا کہ میں کسی موہوم چیز کی بندگی نہیں کر رہا بلکہ ایک ایسی ہستی کی بندگی کر رہا ہوں جو خود بھی موجود ہے اور دوسری مخلوق کو بھی قائم رکھا ہوا ہے جو کہ ان ان صفات کمال سے متصف ہے، اور صفات دو قسم کی ہیں۔

1 صفات ثبوتیہ 2 صفات سلبیہ

ان دونوں صفات کا علم ہونا ضروری ہے تاکہ انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں صحیح تصور قائم ہو سکے، صفات ثبوتیہ سے مراد وہ صفات ہیں جو کسی ہستی میں موجود ہوں، مثلاً اللہ تعالیٰ کا غفور، رحیم، شکور، ودود، عادل ہونا اس قسم کی تمام صفات ثبوتیہ ہیں۔ اور وہ صفات جن کا تعلق عیوب، نقائص، عجز و کمزوری ظلم و ناانصافی وغیرہم سے ہو اس طرح کی صفات جس میں پائی جائیں وہ اس کے عیوب میں شمار ہوں گی، لہٰذا جس طرح صفات جلال و کمال کی اثبات اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری ہے اس طرح ذات جل وعلیٰ سے ان تمام صفات کی نفی بھی ضروری ہے جو نقص وعیوب پر دلالت کرنے والی ہوں۔ اس کی صفات جلال و جمال کے خلاف ہوں، ایسی صفات کو صفات سلبیہ کہا جاتا ہے مثلاً سورۃ اخلاص میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾ (اخلاص : ٤)

''یعنی اس کا کوئی ثانی یا برابری والا نہیں ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ان تمام نقائص اور عیوب سے پاک ہے جو مخلوق کے اندر موجود ہیں جس طرح سورۂ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ : ١١)

''اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔''

لیکن اس کا سننا اور دیکھنا مخلوق کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کا سمیع اور بصیر ہونا بے مثل ہے۔ اسی طرح کتاب وسنت میں ہر اس صفت کی نفی کی گئی ہے جس میں ذرہ برابر نقص یا عیب کی بو آتی ہو۔ اب خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اللہ نے اپنے بندوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا

کیا ہے۔ اور عبادت صحیح نمونے پر اس وقت ہو سکے گی جب معبود کا دل میں صحیح تصور قائم ہو یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب کبریا نے اللہ تعالیٰ کی ان تمام صفات کا ذکر کیا ہے جن کی معرفت سے اللہ کے بارے میں جتنا علم ہو سکے وہ ہو جائے۔ اب آپ کو معلوم ہو چکا ہو گا کہ متشابہات جن میں اللہ تعالیٰ کی صفات بھی شامل ہیں ان کو اللہ نے کیوں بیان فرمایا ہے مثلاً بندوں کو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ سمیع اور بصیر ہے، اس لیے کہ بندے یہ جان لیں ان کا رب ہر حال میں دیکھ رہا ہے اور ہماری تمام دعائیں سن رہا ہے اور وہ مشکل کشا جل وعلیٰ اپنے فضل وکرم سے ان کی دعا کو قبول کرے اور اس مشکل سے اس کو نجات دلائے۔ اسی لیے انہیں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ غفار، غفور وغیرہ ہے اس لیے اگر بندوں سے خطائیں اور غلطیاں ہوں تو وہ مایوس بالکل نہ ہوں بلکہ ان کے دلوں میں وہ یقین اور امید باقی رہے کہ ہمارا مالک وحدہ لاشریک لہ ہے بہرحال بخشنے والا اور بے حد مہربان ہے۔ اس لیے ہم اگر اس کی طرف رجوع کریں گے اور توبہ تائب ہوں گے تو وہ ضرور ہمیں اپنی مغفرت اور رحمت واسعہ سے نوازے گا۔

اسی طرح دوسری صفات ثبوتیہ کو سمجھنا چاہیے۔ کتاب وسنت میں ہمیں چند کلمات سکھائے گئے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق ہمیں کافی اور شافی علم عطا کرتے ہیں جن کے پڑھنے کی بھی فضیلت وارد ہوئی ہے وہ کلمات یہ ہیں۔ ''سبحان اللہ'' اس کلمہ میں اللہ تعالیٰ سے ہر عیب ونقص اور خامی کی نفی کی گئی ہے۔ یعنی یہ لفظ صفات سلبیہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے مگر کسی عیب کی صرف نفی اس کی معرفت کے لیے کامل نہیں ہوئی۔ مثلاً جس طرح کہا جائے کہ فلاں شخص یا بادشاہ اندھا نہیں ہے یا لنگڑا نہیں ہے۔ کانا یا بدصورت نہیں ہے وغیرہ وغیرہ لیکن عیوب کی نفی کے باوجود سننے والے کے دل میں ابھی تک تشنگی باقی رہتی ہے لیکن جب اس کو صفات ثبوتیہ کا علم ہو جائے تو پھر وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھے اس ہستی کے بارے میں کماحقہ معرفت حاصل ہوگئی ہے اس لیے سبحان اللہ کے بعد الحمد للہ کا کلمہ سکھایا کہ وہ تمام عیوب سے پاک ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی صفات حمیدہ اور کمالات کا

صاحب ہے کہ جس کی وجہ سے وہ واقعتاً اور حقیقتاً ہر چیز کی حمد وثنا وتعریف کا اہل ہے اس کے بعد تیسرا کلمہ ''اللہ اکبر'' کا سکھایا گیا کہ انسان کو صفات سلبیہ اور ثبوتیہ کے علم حاصل ہونے کے باوجود اس کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ وہ خیالات، تصورات اور وہم گمان سے بھی بڑا ہے۔ اس لیے کہا گیا کہ اللہ ہر چیز سے بڑا ہے۔ تاکہ انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کا ایمان وایقان مزید پختہ ہو جائے کیونکہ کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' کے اندر یہ درس ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات محامدات وکمالات میں دوسری کوئی ہستی شامل شریک نہیں ہے بلکہ وہ اکیلا ہی معبود برحق ہے اس کے علاوہ کوئی بھی معبود برحق نہیں ہے باقی سارے اس کی مخلوقات میں سے ہیں جن کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ جب معلوم ہوا اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کے لیے اس کی صفات کا علم ضروری ہے اب ہم اصل بات کی طرف آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عرش عظیم پر مستویٰ ہونا بھی اس کی صفات میں سے ایک صفت ہے جس سے بندوں کو آگاہ کرنا اس لیے ضروری تھا تاکہ ان کو اس بات کا علم ہو سکے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد ان سے لاتعلق نہیں ہوا ہے بلکہ جس طرح کوئی بادشاہ تخت بادشاہی پر بیٹھ کر اپنی حکومت چلاتا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے عرش عظیم پر مستوی ہو کر اس کائنات کے کارخانے کو چلا رہا ہے اور دنیا کی ہر چیز پر اس کی نظر ہے۔ آسمان وزمین کو اسی نے تھاما ہوا ہے۔ جس طرح سورت فاطر میں فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُمۡسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ اَنۡ تَزُوۡلَا ....﴾ (فاطر: ٤١)

''اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو روکا ہوا ہے تاکہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکیں۔''

اسی طرح سورۂ ملک میں فرماتے ہیں:

﴿اَوَلَمۡ يَرَوۡا اِلَى الطَّيۡرِ فَوۡقَهُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقۡبِضۡنَ مَا يُمۡسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحۡمٰنُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَىۡءٍۢ بَصِيۡرٌ﴾ (ملك: ١٩)

''یعنی کیا یہ انسان نہیں دیکھتے کہ آسمان وزمین کے بیچ میں جو پرندے صفیں بنا کر اڑتے ہیں اور پھر اپنے پروں بند بھی کرتے ہیں ان پرندوں کو فضا کے اندر

صرف اللہ رحمٰن نے ہی روکا ہوا ہے بے شک وہ ہی ہر چیز کو دیکھنے والا ہے۔‘‘

یہ صرف پرندوں کی مثال نہیں ہے بلکہ اس کی ہر چھوٹی بڑی اور جاندار اور بے جان چیز پر نظر ہے کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں کہ وہ اپنی مخلوق سے غافل رہتا ہو، نہ اس کو نیند آتی ہے اور نہ ہی اونگھ اور اپنے عرش سے ہی پورے کائنات کا نظام چلا رہا ہے اور ان کے تمام امور میں تدبیر کر رہا ہے۔ جس طرح سورۂ الم سجدہ میں فرماتے ہیں:

﴿يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ ....﴾ (الم سجدة : ٥)

یعنی ان کافروں سے تمام باتوں کے ساتھ یہ بھی پوچھو گے کہ اس کائنات کو کون چلا رہا ہے۔‘‘

تو جو جواب دیں وہ جواب بھی مذکور ہے۔

﴿فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ﴾ (يونس : ٣١)

’’یعنی وہ جواب دیں گے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے۔‘‘

سلف صالحین کا یہ عقیدہ ہے جو کہ صحیح اور اسلم بھی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے عرش عظیم پر مستوی ہو کر پوری کائنات کو چلا رہا ہے اگر وہ ساتوں آسمانوں سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے لیکن اس کا علم اور قدرت ہر جگہ موجود ہے اور مخلوق کے ذرے ذرے کو بھی جانتا ہے۔

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ﴾ (ق : ١٦)

’’یعنی ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں جو خیالات اٹھتے ہیں ان سے بھی ہم واقف ہیں۔‘‘

﴿إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ (الملك : ١٣)

’’بیشک وہ سینے کے رازوں کو بھی جانتا ہے۔‘‘

سورۂ آل عمران میں فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ﴾

(آل عمران : ٥)

''بیشک اللہ تعالیٰ سے کوئی بھی چیز چاہے وہ آسمان ہو یا زمین میں مخفی نہیں ہے۔''

یعنی کہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کے باوجود اس کا علم وقدرت ہر جگہ موجود ہے، کوئی بھی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں ہوسکتی۔ البتہ یہ ذہن میں رکھنا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفتیں بے مثل ہیں۔ یعنی عرش پر مستوی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ جس طرح دنیا کے بادشاہ کسی بنائے ہوئے تخت پر بیٹھ کر بادشاہی چلاتے ہیں عین اسی طرح اللہ کے لیے بھی کوئی تخت ہے جس پر وہ بیٹھ کر وہ بادشاہی چلاتا ہے۔ اس طرح ہرگز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عرش کے متعلق یا اس کی کیفیت کے متعلق ہمیں کوئی بھی علم نہیں ہے صرف اتنا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے عرش عظیم کو پیدا کیا جس کے لیے ضروری تھا وہ اس کی شایان شان وعظمت وکبریائی کے مطابق ہو باقی اس پر اس کی استوئ کیفیت یہ بے مثل ہے کیونکہ یہ اللہ کی صفت ہے اور ذات اور صفات کے اعتبار سے کوئی بھی اللہ کے مثل یا نظیر نہیں بن سکتا۔

خلاصہ کلام کہ اللہ تعالیٰ کا ساتویں آسمانوں کے اوپر عرش عظیم پر مستوی ہونا بے مثل ہے جس کی کوئی بھی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی ہاں اس کی قدرت وعلم ہر جگہ موجود ہے اس کے برخلاف جہمیہ، معتزلہ، خوارج اور اشاعرہ یا متکلمین میں سے جو ان کے خیالات سے متاثر ہوتے ہیں انہوں نے استوئ میں تاویل کی ہے اور اسے مجاز قرار دیا ہے ان کا کہنا ہے کہ استوئ علی العرش کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر غالب ہوا یا عرش اس کے قبضے وقدرت میں ہے۔ جس کی دلیل پر وہ ایک شعر بھی پیش کرتے ہیں کہ

''استواء بشر علی العراقی من غیر سیف اودم مهراق .''

یہاں پر استواء بمعنی استولاع ہے۔ یعنی غالب ہوا، شعر کی معنی ہے بشر غالب ہوا عراق پر بغیر تلوار چلائے ہوئے اور بغیر خون بہائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ استوئ کا لفظ کبھی تو بغیر صلہ کے استعمال ہوتا ہے جس طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰٓی ....﴾ (قصص : ١٤)

''اور جب وہ پہنچا طاقت کو اور طاقت تام کو۔''

کبھی یہ "اِلٰی" اور "عَلٰی" کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ "اِلٰی" کی مثال قرآن کریم میں:

1: ﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ ....﴾ (البقرة: ٢٩)

2: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ ....﴾

(حٰمٓ السجدة: ١١)

سلف کا اجماع ہے کہ یہاں پر اس کی معنی علوّ وارتفاع ہے اور "علیٰ" کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

مثال نمبر۱: ﴿لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ....﴾ (الزخرف: ١٣)

"تاکہ تم ان جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھ کر (سواری کرو)۔"

مثال نمبر ۲: ﴿وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِىِّ﴾ (هود: ٤٤)

"یعنی نوح کی کشتی جودی پہاڑ پر آ کر کھڑی ہوئی۔"

اس طرح کی کئی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں ان تمام سے علو، ارتفاع اعتدال یعنی بلند ہونا، برابر ہو کر بیٹھنا مراد ہے جس پر اہل لغت کا اجماع ہے جب استویٰ کا صلہ "علیٰ" آئے تو ہر جگہ پر معنی بلند نہ ہونا مراد ہوگی جس طرح استویٰ علی العرش میں ہے۔ تو استویٰ کو اپنے معنی سے کیوں محروم کیا جا رہا ہے؟ مجاز والی بات قطعاً درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ مجاز وہاں پر مراد لیا جاتا ہے جہاں پر حقیقت متعذرہ ہو، یہاں حقیقی معنیٰ ہرگز متعذرہ نہیں ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ حقیقی معنی میں مخلوقات کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے تو یہ درست نہیں ہے اس لیے کہ "استویٰ علی العرش" اللہ کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات ویسے ہی بے مثل ہیں جیسے اس کی ذات بے مثل ہے اور مجازی معنی مراد لینے کی دوسری صورت اس وقت پیش آئے گی جب مجازی معنی والے الفاظ دوسری جگہوں پر زیادہ آئے ہوں ایک یا دو جگہوں پر ایک لفظ آیا ہو جس کے حقیقی معنی ان زیادہ الفاظ کے مخالف ہو پھر ان متعدد مواضع کو مدنظر رکھ

کر اس ایک جگہ پر وارد لفظ کو بھی ان پر محمول کیا ہے لیکن یہاں پر ایسی کوئی بات نہیں۔ استویٰ کی معنی استعلاء یا غلبہ اس کی حقیقی معنی نہیں ہے بلکہ مجازی معنی ہے لہٰذا ''استوی علی العرش'' کو اس مجاز معنی پر محصول کرنے کی ضرورت اس وقت پیش آتی جب قرآن کریم میں متعدد بار استولاع علی العرش'' کے الفاظ آتے اور پھر ایک دو جگہوں پر'' استویٰ علی العرش'' کے الفاظ آتے تو پھر ہم اس کی معنی'' استولاع علی العرش'' کرنے کے مجاز ہوتے لیکن قرآن کریم میں ''استولاع علی العرش'' کے الفاظ ایک بار بھی استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس ''استوی علی العرش'' کے الفاظ ایک دو کیا بلکہ سات آیات میں وارد ہوئے ہیں جن کی تفصیل ہم گذشتہ اوراق میں کر چکے ہیں۔ لہٰذا'' استویٰ علی العرش'' کی معنی'' استولاع'' کرنا اصولاً بھی غلط ہے اور دوسرا استعلاع اور غلبہ کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز پہلے قبضہ میں نہیں تھی اس پر غلبہ حاصل کر کے اپنے قبضہ میں کیا جس طرح مذکورہ شعر کا مطلب وہ حضرات اس طرح کرتے ہیں کہ بشر کے قبضہ سے عراق پہلے باہر تھا پھر اس پر غلبہ حاصل کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح کے معنی اللہ تعالیٰ کے قبضے اور قدرت سے ایک لحہ بھی باہر نہ تھی نہ ہے اور نہ ہی کبھی ہو سکے گی اس لیے استعلاء اور غلبہ کا مطلب یہاں پر سراسر بے معنی ہے اور دوسری بات کہ عرش تو زمین وآسمان کی پیدائش سے بھی پہلے سے موجود تھا جس طرح اللہ تعالیٰ میں فرماتے ہیں:

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ﴾ (ھود: ۷)

''اور اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے چھ دنوں میں زمین وآسمان کو پیدا کیا اس حال میں کہ اس کا عرش پانی پر تھا۔''

عربی گرامر کا قائدہ ہے کہ کسی جملہ میں جو حکم ہے وہ اگر جملہ حالیۂ کے واؤ کے ساتھ مقید ہے تو وہ جملہ حالیہ اس حکم یا خبر سے پہلے ہی ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جائے ''جاء زیدٌ وھو راکبٌ'' یعنی زید آیا اس حال میں کہ وہ سوار تھا۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ زید کے آنے سے پہلے ہی اس کے ہونے کی اس جملہ میں دلالت ہے، اس طرح اس آیت کریمہ کا بھی یہی

مطلب ہے کہ زمین وآسمان کی پیدائش سے پہلے ہی عرش پیدا ہو چکا تھا۔ اس وقت عرش پانی پر تھا پھر اگر عرش پہلے سے موجود تھا تو اللہ تعالیٰ نے یوں کیسے فرمادیا کہ:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ.......﴾ (الحديد: ٤)

''وہ ذات جس نے آسمان وزمین کو پیدا کیا چھ دنوں میں پھر عرش پر مستوی ہوا۔''

وغيرها من الآية کیونکہ ''ثم تراخي'' اور ترتیب کے لیے آتا ہے۔ اگر یہاں پر استویٰ سے مراد استعلاع لیا جائے گا تو معنی یہ ہوگا کہ زمین وآسمان کی پیدائش کے بعد عرش پر غلبہ حاصل ہوا۔ حالانکہ قرآنی نص اور بخاری وغیرہ کی صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش، زمین وآسمان سے پہلے پیدا ہو چکا تھا، جس پر پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو غلبہ اور قبضہ حاصل تھا تو اگر استعلاع کے معنی کرو گے تو مطلب یہ ہوگا کہ زمین وآسمان کے بعد اس پر غلبہ حاصل ہوا ہے یہ صریح تناقض ہے جس سے اللہ کا کلام پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾

(النساء: ٨٢)

''یعنی اگر قرآن مجید اللہ کی کلام نہ ہوتی تو اس میں بہت زیادہ اختلاف وتناقض دیکھنے میں آتا۔''

لیکن اگر اس کے معنی یہ کیا جائے کہ زمین وآسمان کے پیدا کرنے کا بعد اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہوا تو اس معنی سے کوئی خرابی نہیں آتی، یعنی عرش عظیم کی تخلیق تو پہلے ہی ہو چکی تھی مگر اس پر استواء زمین وآسمان کی تخلیق کے بعد ہوا۔ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اور تناقض وتعارض کا شائبہ ہی ہے۔ ''فليتأمل متأملون'' باقی جو شعر پیش کیا گیا ہے اولاً تو اس کے قائل کا کوئی پتہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ عربوں کے کسی دیوان میں ملتا ہے اس کے باوجود اس شعر میں ایک آدمی کا عراق پر غلبہ کا ذکر ہے اور یہ اس لیے بات صحیح ہوسکتی ہے کہ کوئی ملک کسی کے قبضہ میں نہ ہو پھر اس پر غلبہ حاصل کر کے قبضہ میں لے آتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے

بارے میں یہ معنی قطعاً درست نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس کی قدرت سے کوئی بھی چیز پہلے یا بعد میں باہر نہیں ہو سکتی، اس لیے اللہ کا عرش پر مستویٰ ہونا اس معنی کا ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا کہ عرش اس کے قبضہ میں نہیں تھا پھر اس پر غلبہ حاصل ہوا۔ لہٰذا ''اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا'' کی صحیح معنی وہی ہے جو لغت عرب کی روء سے متبادر ہے جس کی مثال پہلے ذکر چکے ہیں وہی معنی ہے جس کو صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور سلف صالحین نے ان الفاظ سے سمجھی ہے۔

علاوہ ازیں ہم کہتے ہیں کہ پیش کردہ شعر میں استویٰ بمعنی استعلاء کے نہیں ہے بلکہ اس کی وہی اصلی معنی ہوگی وہ اس طرح کہ بشر جو کہ عبدالملک بن مروان کے بھائی تھے اور وہ عراق کے امیر تھے۔ سابقہ امراء بادشاہوں اور حاکموں کا یہ دستور تھا کہ جب وہ کسی ملک کی بادشاہی کے لیے آتے تو وہ اپنے تخت شاہی کے اوپر آ کر بیٹھتے تھے۔ اسی طرح یہ بشر بھی عراق کا امیر بننے کے بعد اپنے تخت پر مستوی ہو کر بیٹھ گیا اور اس میں کوئی خرابی نہیں ہے اس لفظ کو اپنی اصلی اور حقیقی معنی سے خارج کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ بہرحال یہ شعر ہرگز حجت نہیں ہے کہ ''ثم استویٰ علی العرش'' کے معنی استعلاع یا غلبہ ہے جب کہ اس جگہ حقیقی معنی متعذر نہیں ہے تو پھر مجازی معنی کی طرف جانا اصولاً غلط ہے قرآن کریم میں کتنے ہی مقامات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمام مخلوق سے بلند ہے اور انسانی فطرت بھی یہی بتلاتی ہے مثلاً جب بندہ دعا مانگتا ہے تو اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتا ہے نبی کریم ﷺ دعائے استسقاء کے اندر ہاتھوں کو اتنا بلند اٹھاتے تھے کہ بغلوں کی سفیدی نظر آتی تھی اگر اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہوتے تو پھر ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی بلکہ وہ کام ہی فضول بن جاتا، اس طرح صحیح حدیث کے اندر آتا ہے کہ ایک شخص اپنی لونڈی کو نبی ﷺ کے پاس لے کر آیا جو کہ رقبہ مومنہ کو آزاد کرنا چاہتا تھا آپ نے اس لونڈی سے سوال کیا ''أین اللّٰہ'' اللہ کہاں ہے؟ تو انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ میں کون ہوں؟ تو انہوں نے آپ کی طرف اشارہ کیا کہ آپ اللہ کے رسول ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو آزاد کر دو یہ مومنہ ہے، اگر اللہ تعالیٰ آسمان

کے اوپر نہ ہوتے تو آپ ﷺ باندی کے اشارہ کو کس طرح بحال رکھتے اور کس طرح اس کو مومنہ قرار دیتے؟ اللہ کے رسول سے بڑھ کر کس کو اللہ کے بارے میں معرفت ہوسکتی ہے۔ حجۃ الوداع والی حدیث تو بالکل مشہور ہے جس میں آپ ﷺ نے لوگوں کو چند باتیں پوچھنے اور سمجھانے کے بعد ان سے سوال کیا کہ کیا میں نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا؟ تو سب نے جواب دیا کہ ہاں! آپ نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا۔ اس پر آپ نے اپنی انگلی مبارک آسمان کی طرف اُٹھا کر فرمایا۔ "اللهم اشهد" اے اللہ اس بات پر گواہ رہنا کہ میں نے تیرا پیغام تیرے بندوں تک پہنچا دیا ہے۔ اگر اللہ کے لیے علو نہ ہوتا بلکہ وہی ہر جگہ بذات خود موجود ہوتا تو آپ اپنی انگلی آسمان کی طرف نہ اٹھاتے۔ اسی طرح احادیث صحیحہ میں رات کے آخری حصہ میں دنیا کے آسمان پر اللہ تعالیٰ کے نزول کا ذکر موجود ہے اگر اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں سے اوپر عرش عظیم پر نہ ہوتے تو نزول کوئی معنی نہیں رکھتا۔ باقی ان صفات کی کیفیت کے بارے میں کوئی علم ہے اور نہ ہی ہوسکتا ہے اس لیے اس میں تاویلات وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کریم اعلان کرتا ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾ (بنی اسرائیل: ٣٦)

''ایسی بات کے پیچھے مت پڑو جس کا آپ کو علم نہیں ہے۔''

کتاب وسنت میں جو اللہ تعالیٰ کی صفات وارد ہیں ان پر اسی طرح ایمان لانا ہے جس طرح وارد ہوئی ہیں۔ باقی کیفیات کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے۔ باقی قرآن میں یہ جو کہا گیا ہے:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ (حدید: ٤)

اور اسی طرح سورۃ مجادلہ میں ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنَىٰ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا ......الآية﴾

(المجادلہ: ٧)۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کا ہمارے ساتھ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ علم اور قدرت کے لحاظ سے ہمارے ساتھ ہے، یعنی وہ ہم سے علوشان کے لحاظ سے بہت بلند اور عرش عظیم پر ہونے کے باوجود ہماری ہر نقل وحرکت کا علم رکھتا ہے۔ خود اسی سورۂ مجادلہ کے بارے میں اُمّ المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اپنے گھر میں بیٹھی ہوئی تھی، بی بی صاحبہ کا گھر مسجد سے متصل تھا کہتی ہیں کہ میں سنتی ہوں کہ کوئی عورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی ہلکی آواز میں گفتگو کر رہی تھی کہ میں نہ سمجھ سکی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے لیکن پاک ہے وہ ذات مبارکہ جو ہر وقت دنیا کے آوازوں کو سنتی ہے اس نے ساتوں آسمانوں سے اوپر اپنے عرش عظیم پر اس عورت کا محاورہ سن لیا۔ اور فوراً وحی نازل کر کے اس عورت کے مسئلہ کو حل کیا اور اس کی شکایت کو دور کیا۔ جیسا کہ سورت کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ﴾ (المجادلة: ١)

''بیشک اللہ تعالیٰ نے سن لیا اس عورت کا قول جو اپنے خاوند کے بارے میں شکایت کر رہی تھی اللہ تعالیٰ نے آپ دونوں کی گفتگو کو سن رہا ہے بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

بہر حال اللہ تعالیٰ کی معیت کا مطلب جو ہم نے لیا ہے وہی متفقہ طور پر سلف صالحین سے منقول ہے باقی اللہ تعالیٰ ہر جگہ باعتبار ذات موجود ہونے کا عقیدہ یا حلولیین، زندقین کا ہے یا متاخرین، متکلمین اور آج کل کے دیوبندی حضرات کا ہے جو کہ سلف صالحین کے عقیدے کے برخلاف ہے۔ قرآن کریم میں تحویل قبلہ کے بارے میں ہے:

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا .....الآية﴾ (البقرة: ١٤٤)

''بیشک ہم آپ کے بار بار چہرہ آسمان کی طرف کرنے کو دیکھ رہے ہیں پھر ہم ضرور اس قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم کریں گے جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔''

نبی ﷺ بار بار آسمان کی طرف کیوں دیکھتے تھے؟ اس کا صاف جواب یہ ہے کہ چونکہ وحی آسمان سے نازل ہوتی تھی آپ اس شوق میں بار بار اوپر دیکھتے کہ کب وحی نازل ہوتی ہے کعبۃ اللہ کی طرف منہ کرنے کے حکم کی، اور وحی کا اوپر سے نازل ہونا اس حقیقت پر واضح دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں سے اوپر ہے اور وہیں سے وحی کو نازل کرتا ہے تو خود قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں سے اوپر سے اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ....الآية﴾ (النساء: ١٥٠)

''کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کو اپنی طرف اٹھالیا۔''

احادیث صحیحہ جو کہ تواتر کی حد تک پہنچ چکی ہیں ان میں اس کی تفسیر اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان کی طرف اٹھالیا اگر اللہ تعالیٰ آسمانوں سے اوپر نہ ہوتے تو یوں کس طرح فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا، آخر میں اتنا عرض کریں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ہر جگہ حاضر ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں یا اس کے قائل ہیں تو ان کے اس قول سے یہ بات لازم آئے گی کہ نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ، بیت الخلاء، گندی جگہیں، بداخلاقی کے محلات اور شراب وزنا کے اڈوں میں موجود ہیں۔ اور پھر اس کے نتیجہ میں جو خرابی لازم آئے گی اس کی سنگینی سے کوئی بھی عقلمند انسان بے خبر نہیں رہ سکتا۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت مروی ہے جو کہ مسند احمد، ابن ماجہ، نسائی، ابن ابی حاتم اور ابن جریر کی تفاسیر اور عثمان بن سعید داری اپنی کتاب ''الرد علی بتر المریس'' میں لائے ہیں جس کو امام بخاری اپنی صحیح کے اندر کتاب التوحید کے عنوان کے ساتھ تعلیقاً جزم کے صیغہ سے ذکر فرمایا ہے۔ یہاں پر ہم امام احمد کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

((عن عائشة رضي الله عنها قالت الحمد لله الذی وسع سمعة الاصوات لقد جاءت المجادلة الی النبی ﷺ تكلمة وانا فی ناحية البيت ماأسمع ماتقول فانزل الله عزوجل ﴿قد سمع الله

قول التی تجادلك فی زوجها﴾ .))[1]

''تعریف اس پاک ذات کی جس کا سمع تمام آوازوں سے کشادہ ہے البتہ تحقیق ایک عورت آئی جو کہ نبی ﷺ کے مجادلہ کرنے والی تھی اور آپ ﷺ کے ساتھ محو گفتگو تھی اس حال میں کہ میں گھر کے اندر موجود ہونے کے باوجود نہ سمجھ سکی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے پھر اللہ تعالیٰ نے ﴿قد سمع اللہ﴾ والی آیات نازل فرمائیں۔''

اور ابن ابی حاتم کی تفسیر میں اس طرح کے الفاظ ہیں:

((تبارك الذی اوعٰی سمعه کل شئی انی لأسمع کلام خولة بنت ثعلبة ویخفی علی بعضه وهی تشتکی زوجها الی رسول الله ﷺ الی اٰخرہٖ .))

''یعنی برکت والی ہے وہ ذات جس کا کان ہر چیز کو سمجھتا ہے بیشک میں خولہ بن ثعلبہ کا کلام سن رہی تھی اور کچھ میرے اوپر مخفی رہا اور وہ نبی ﷺ کے پاس اپنے خاوند کی شکایت کر رہی تھی۔''

امام دارمی اپنی کتاب ''الرد علٰی بشر المریس'' میں صحیح سند کے ساتھ عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت لائے ہیں کہ:

((قبض رسول الله ﷺ قال ابوبکر رضی اللہ عنہ ایها الناس ان کان محمد الهکم الذی تعبدون فانه قدمات وان کان الهکم الله الذی فی السمآء فان الهکم لم یمت .))

''جب نبی ﷺ نے اس دنیا سے رخصت فرمائی تو اس وقت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے انسانو! اگر تمہارے معبود محمد ﷺ تھے تو بیشک وہ فوت ہو چکے ہیں اگر تمہارا معبود اللہ ہے جو کہ آسمان میں ہے تو وہ فوت نہیں ہوا ہے۔''

[1] مسند احمد، رقم الحدیث ٢٤١٩٥، ابن ماجه فی المعجمه المقدمة، رقم ١٨٨ .

امام دارمی اسی کتاب کے اندر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے روایت نقل کرتے ہیں کہ:

''عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ان کی وفات کے وقت آئے تو انہوں نے اس وقت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں چند باتیں کیں ان میں سے یہ بات بھی تھی کہ:

((وانزل الله براءتك من فوق سبع السمٰوات وجاء به الروح الامين .))

''یعنی اللہ تعالیٰ نے تیری براءت ساتوں آسمانوں کے اوپر سے نازل فرمائی جس کو روح الامین جبرئیل علیہ السلام لے کر آئے۔''

اسی کتاب میں امام دارمی صحیح سند کے ساتھ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

((مابين السماء الدنيا والتى تليها مسيرة خمس مائة وبين كل سماء مسيرة خمس مأة عام وبين السماء السابعة وبين الكرسى خمسة مائة عام والعرش على الماء والله ترفوق العرش وهو يعلم ما انتم عليه .))

(بحوالہ الدر المنثور جلد ۱، ص ۹۲)

''آسمان دنیا اور جو اس کے ساتھ متصل ہے ان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے اور ہر دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ساتویں آسمان اور کرسی کے بیچ میں پانچ سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر ہے۔

اسی طرح ایک اور واقعہ ہے جس میں ایک شخص نے کہا اے ابوعبداللہ، اللہ رحمٰن عرش پر مستوی ہے اس کے استویٰ کے کیفیت کیا ہے پھر امام نے سر جھکایا اور ان کو پسینہ آنا شروع ہو گیا پھر سر اوپر اٹھایا اور کہنے لگے (یقیناً) اللہ رحمٰن اپنے عرش پر مستوی ہے جس طرح اپنی

ذات پاک وصف بیان فرمائی ہے اس طرح کہنا ہی نہیں ہے اور کیفیت نامعلوم ہے تو برا آدمی اور صاحب البدعۃ دکھائی دیتا ہے اس کو یہاں سے نکال دو امام عثمان بن سعید دارمی اپنی کتاب "الرد علی الجھمیہ" میں سورۂ مجادلہ کی آیت کریمہ: ﴿مَا يَكُونُ مِن نَّجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ........الآیة﴾ (المجادلة: ۷) کے متعلق وضاحت کرتے ہیں:

((انما يعني انه حاضر كل نجوى ومع كل احد من فوق العرش بعلمه لان علمهٗ بهم محيط وبصره فيه فافض لا يحجه شئى عن عليه وبصره ولا يتوارون منه بشئى وهو بكمالهٖ فوق العرش .))

"یعنی اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے اوپر اپنے علم سے ہر سرگوشی اور ہر ایک کے ساتھ ہے، کیونکہ اس کے علم نے تمام چیزوں کو گھیرا ہوا ہے کوئی بھی چیز اس کے علم اور ان کو دیکھنے سے روک نہیں سکتی اور نہ ہی انسان اس سے چھپ سکتے ہیں وہ اپنے کمال قدرت سے عرش کے اوپر ہے۔"

امام دارمی کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ حاضر ناظر ہے لیکن اپنے علم اور قدرت کے لحاظ سے نہ کہ اسی طرح جس طرح بدعتی لوگ کہتے ہیں کہ وہ بذات خود ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ اس کی تردید ہم پہلے کر چکے ہیں۔ امام حاکم نیساپوری اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث صفحہ نمبر ۸۴ پر اپنے سند سے امام ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ صاحب الصحیح سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

((من لم يُقرّبان الله تعالىٰ على عرشه قد استوى فوق سبع السمٰوٰت فهو كافر بربه يستتاب فان تاب وان لا ضربت عنقه والقى على بعض مذابل حيث لا يتاذىٰ المسلمون والمعاهدون بنتن ريح جيفته وكان ماله فيئاً لا يرثهٗ احد من المسلمين اذا المسلم لا يرث الكافر كما قال ﷺ .))

"یعنی جس آدمی نے یہ اقرار نہ کیا کہ بیشک اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے تو وہ اپنے رب کے ساتھ کفر کرنے والا ہے اس سے توبہ کروائی جائے گی پھر اگر توبہ کی تو فبہا وگرنہ اس کی گردن ماردی جائے گی اور اس کو اٹھا کر گندگی کے ایسے ڈھیر پر پھینکا جائے گا جس سے مسلمانوں یا ذمی کو اس کی بدبو، تکلیف نہ پہنچائے اور اس کا مال فے بن جائے گا کوئی مسلمان اس کے مال کا وارث نہیں بنے گا کیونکہ مسلمان کافر کا وارث نہیں بنتا جس طرح نبی ﷺ کا فرمان مبارک ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

اللہ تعالیٰ کی ذات مبارکہ

سوال: اللہ تعالیٰ کی ذات مبارک کو عقلاً سمجھائیں اور ثابت کریں؟

الجواب بعون الوهاب: اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے وجود کے منکر ہر زمانہ میں بہت تھوڑے رہے ہیں، اکثریت ان لوگوں کی رہی ہے جو اللہ کے وجود کے تو انکاری نہیں ہیں، لیکن اللہ کے ساتھ شرک کرتے چلے آرہے ہیں۔ قرآن کریم سورۂ یوسف میں ہے:

﴿وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ٥﴾

(یوسف: ١٠٦)

"اکثر لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے بھی اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار حد درجہ کی جہالت ہے، سوائے اس آدمی کے جو اپنے عقل کا دیوالیہ کر بیٹھا ہو، دوسرا کوئی آدمی خالق کائنات وجود کا منکر ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جن گمراہ قوموں کا تذکرہ کیا ہے، وہ سب کی سب مشرک تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی دہریا اللہ کی ذات کے وجود کا انکاری نہ تھا اور جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام ان قوموں کی طرف مبعوث ہوئے، انہوں نے توحید کی تبلیغ کی اور شرک کی تردید کی۔ اللہ کے وجود کے منکر سے شاید ہی سابقہ پڑا ہو۔ سورۂ ابراہیم میں ہے:

﴿قَالَتۡ رُسُلُهُمۡ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ﴾

(ابراھیم : ١٠)

''ان قوموں کے رسولوں نے فرمایا کہ کیا اللہ کے بارے میں شک ہوسکتا ہے جو زمینوں اور آسمانوں کا مالک ہے؟''

یہ سوال ایک عقل سلیم رکھنے والے سے ہے، یعنی ہر عقل سلیم رکھنے والا انسان کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز دیکھ کر سمجھ جاتا ہے کہ یہ کسی کاریگر کی بنائی ہوئی ہے۔ کیونکہ کسی عقل مند انسان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ ہی نہیں سکتی اور نہ ہی وہ اس کے ممکن ہونے کا تصور بھی کرسکتا ہے کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی بغیر صانع کے وجود میں آسکتی ہے، تو پھر یہ اتنا بڑا کارخانہ ہے زمین، آسمان سورج، چاند اور ستارے، پہاڑ، دریا، نہریں، سمندر، درخت، باغ اور باغیچے مطلب کہ یہ پوری کائنات بغیر خالق اور صانع کے کس طرح خود بخود وجود میں آ گئی؟ اس طرح کی بے ہودہ بکواس کوئی عقل کا اندھا ہی کرسکتا ہے لیکن کوئی عقلمند ایسی واہیات بکواس کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

تاریخ کی کتابوں میں عباسی خلافت کے وقت کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ اس وقت ایک دہریہ آیا جو کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکاری تھا اور لوگوں سے خالق کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے عقلی دلائل مانگنے لگا۔ خلیفہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف آدمی بھیجا۔ امام صاحب کچھ دیر سے پہنچے تو ان سے دیر سے پہنچنے کا سبب دریافت کیا گیا، امام صاحب فرمانے لگے کہ میں دریائے دجلہ کے کنارے پر پہنچا تو دیکھا کہ کئی تختے جدا جدا پڑے ہیں جب میری نظر ان تختوں پر پڑی تو یہاں سے یہ تختہ بھاگا اور وہاں سے وہ تختہ بھاگا اور آ کر آپس میں مل گئے اور ایک کشتی تیار ہوگئی، جس پر سوار ہو کر یہاں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں میری تاخیر کا یہی سبب ہے۔ اس پر دہریہ (خالق کا انکاری) کہنے لگا کہ واہ! آپ نے میرے مقابلہ کے لیے عالم بلایا ہے جو ایسی بے عقل بات کر رہا ہے کہ الگ الگ تختے خود بخود بغیر کسی بنانے والے کے آپس میں مل کر ایک کشتی تیار ہوگئی، یہ تو سراسر بے عقلی کی بات ہے۔ اس پر امام

صاحب کہنے لگے اے احمق، جاہل! تو صرف ایک کشتی کے خود بخود بننے کے انکاری ہوا اور بغیر بنانے والے کے اس کا بن جانا، بے عقلی کی بات تصور کرتا ہے ہو تو پھر اتنے بڑے کارخانے کا خود بخود بغیر کسی صانع کے بن جانا اس پر تجھے کس طرح جرأت ہوئی کہ تو یہ نظریہ رکھے تو احمق اور جاہل ہے۔ ایسا عقلی جواب سن کر دہریا لا جواب ہو گیا اور خلیفہ نے ان کی گردن مارنے کا حکم دے دیا۔

مقصد یہ تھا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے وجود اور ہستی پر اس کائنات کا ذرہ ذرہ گواہ ہے۔ اس ذات پاک ہستی کا انکار سوائے عقل کے اندھے کوئی انسان نہیں کرسکتا۔ دنیا کے مشہور بتیس (۳۲) یا اس سے بھی زیادہ سائنسدانوں نے اپنے سائنسی انکشافات اور تجربات علوم کی بنا پر یہ واشگاف اقرار کیا ہے کہ بیشک اللہ ہے۔ انہوں نے اپنے اس مستحکم عقیدہ پر سائنسی تجربات اور کئی دلائل پیش کیے ہیں وہ سارے ایک کتاب میں مذکور ہیں۔ وہ کتاب اصلاً انگلش میں ہے جو (Godis) کے نام سے ہے۔ اس کا ترجمہ اردو زبان میں شائع ہوا ہے جس کا نام ہے ''خدا ہے'' وہ کتاب ہماری لائبریری میں موجود ہے۔

بہرحال اس حقیقت کا اتنا واضح ہونا اور اس پر تقریباً کائنات کے تمام عقلمندوں کے اتفاق کے باوجود بھی آج کل عقل کے اندھے کمیونسٹ اور سوشلسٹ ''بے حیا باش وھرچہ خواہی کن'' کے مصداق اپنے عقل کے دشمن بن کر اللہ کے بندوں کو گمراہ کرنے اور ان کو سیدھے راستے سے ہٹانے کے لیے کھلم کھلا بے ہودہ سرآلاپ رہے ہیں کہ اللہ کی ذات ہے ہی نہیں اور اس کو عقل سے ثابت کرو وغیرہ وغیرہ اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے سورۂ نمل میں فرعون اور ان کے ساتھیوں کے متعلق فرمایا کہ:

﴿وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا﴾ (النمل: ١٤)

ان کے دلوں نے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حقانیت وصداقت کا یقین کرلیا لیکن باہر سے محض ظلم اور تکبر کی وجہ سے انہوں نے انکار کیا۔ اسی طرح یہ ظالم بھی اگرچہ اللہ کے وجود کو دل سے مانتے ہیں اور ان کو ان کا ضمیر جھنجوڑتا رہتا ہے لیکن محض ظلم، حدود توڑنے اور نفسیاتی

خواہشات کی بے لگام پیروی کر کے زبان سے بے اختیار اللہ جل واعلیٰ کی ہستی کا انکار کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم یہاں پر کوئی بھی تین دلیل سائنٹیفک نمونے پر اپنے منصف ومزاج اور حق کے طالبوں پر عقل کی آواز پر کان لگانے والوں کے لیے تحریر کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اسی میں حق کے طالبوں کے لیے کافی اور شافی تسلی اور تشفی بخش رہنمائی کا سامان مہیا کرے گا۔ (اللہم آمین)

(۱)...... یہاں پر یہ دلیل ہم گو سائنٹیفک طور پر پیش کر رہے ہیں، لیکن دراصل یہ قرآن کریم کی سورت مؤمنون کی اس آیت سے ماخوذ ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ﴾ (المومنون : ۱۸)

''ہم نے نازل کیا آسمان سے ٹھیک اندازے کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اور اس کو زمین میں ٹھہرایا اور ہم اس کو جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں۔''

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ آغاز پیدائش میں اللہ تعالیٰ نے ایک ہی وقت زمین پر اتنا پانی نازل فرمایا کہ قیامت تک کرۂ ارض کی ضروریات کے لیے ان کے علم کے مطابق کافی تھا، وہ پانی زمین کے ہی نشیبی حصوں میں قرار پکڑ گیا جس سے سمندر اور نہریں وجود میں آئیں اور اسی ہی پانی سے زیر زمین یا (Sub-Soil-Water) پیدا ہوا۔

اب یہ اسی پانی کا ہی ہیر پھیر ہے کہ جو سردی گرمی اور ہواؤں کے ذریعے ہوتی رہتی ہے۔ اسی کو ہی برف پوش پہاڑ، دریا، چشمے اور کنویں زمین کے مختلف حصوں میں پھیلاتے رہتے ہیں اور یہی بے شمار چیزوں کی پیدائش اور ترکیب میں شامل ہوتا ہے اور پھر ہوا میں تحلیل ہو کر اصل ذخیرے کی طرف واپس جاتا رہتا ہے، شروع دن سے لے کر آج تک اس پانی کے ذخیرے میں نہ ایک قطرہ کمی ہوئی ہے اور نہ ہی ایک قطرہ زیادہ کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے، یہ تو آیت کریمہ کا مطلب تھا، اب دلیل کی وضاحت کی جاتی ہے۔

آج مدرسہ یا اسکول کے ہر ایک طالب کو معلوم ہے کہ وہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے دو

گیسوں کے امتزاج یا ملنے کی وجہ سے بنا ہے اور یہ حقیقت بھی سائنسدانوں کے ہاں ہے کہ یہ سمندر وغیرہ بہت عرصہ پہلے اس طرح وجود میں آئے کہ ماضی میں ہائیڈروجن اور آکسیجن دونوں گیسیں ایک وقت میں زیادہ مقدار میں آپس میں ملیں جس کے نتیجے میں اوپر فضا سے بے حساب پانی گرا جو زمین کے نشیبی حصوں میں قرار پکڑ گیا جس کی وجہ سے سمندر وغیرہ وجود میں آ گئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دہریہ یا کیمونسٹ کے کہنے کے مطابق اس کائنات کو چلانے والا یا پیدا کرنے والا جس کو اللہ کہا جاتا ہے وہ ہے ہی نہیں تو پھر وہ بتائیں کہ سائنسی انکشافات اور تحقیقات موجب جبکہ اب بھی فضا میں وہ گیسیں، ہائیڈروجن اور آکسیجن موجود ہیں تو پھر وہ آپس میں اس انداز میں کیوں نہیں ملتی جس انداز میں ماضی بعید میں آپس میں ملیں تھیں کہ جن کے امتزاج کی وجہ سے اتنی بڑی مقدار میں اوپر سے پانی گرا تھا کہ جس کی وجہ سے سمندر، نہریں یا زیر زمین پانی قرار پکڑ گیا۔ ظاہر ہے کہ آج بھی اگر وہ دونوں گیسیں آپس میں اس انداز سے ملیں تو اوپر سے بے انتہا پانی گرنا شروع ہو جائے کہ جس سے انسان بلکہ پوری جاندار چیزوں کا کیا حشر ہوتا، یہ ہر عقلمند جان سکتا ہے مگر آج وہ دونوں گیسیں اتنی بڑی مقدار میں آپس میں نہیں ملتیں، آخر کونسی ہستی ہے جس نے مخلوقات کی ضروریات کے مطابق دونوں گیسوں کو اتنے بڑے انداز میں ملا کر اتنا بڑا پانی کا ذخیرہ مہیا کیا، لیکن آج وہ ہستی ان دونوں گیسوں کو آپس میں اتنی بڑی مقدار میں ملنے نہیں دیتی۔ آخر وہ کون سی ہستی ہے؟ حالانکہ وہ دونوں گیسیں آج بھی فضا میں موجود ہیں مگر کون ہے جو ان کو اتنی بڑی مقدار میں ملنے سے روک رہا ہے؟

اسی طرح یہ بھی سوال ہے کہ آخر کون ہے جو پانی کے بخارات سے آکسیجن اور ہائیڈروجن کو الگ الگ کرتا ہے فضائی آکسیجن کو ہائیڈروجن کے ساتھ ملنے سے روک رہا ہے۔ مگر یقین رکھیے ان ملحد دہریوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ کیونکہ وہ دونوں گیسیں تو ایک اندھا، بہرا اور لاشعور مادہ ہے ان میں یہ سمجھ کہاں سے آئی کہ آج اگر ہم اتنی

بڑی مقدار میں ملے تو جاندار چیزیں تباہ اور ہلاک ہو جائیں گی جبکہ ان مادوں میں کوئی شعور نہیں ہے تو لامحال ماننا پڑے گا کہ ایک قادر مطلق ہستی جو اپنی بے پناہ قدرت کے ساتھ ایک وقت میں مخلوقات کی ضروریات کے لیے ان کی تخلیق سے پہلے ان گیسوں کو اتنی انداز میں آپس میں ملایا جس سے بڑی مقدار میں اوپر سے پانی گرا، لیکن آج وہ قادر قدیر ہستی ان کو اتنی بڑی مقدار میں اس قدر ملنے سے روک رہی ہے، وہ یہی ہستی ہے جس کو ہم اللہ سبحانہ و

تعالیٰ کہتے ہیں۔

بہرحال اس حقیقت باہرہ سے انکار کرنے کی جرأت سوائے ضدی ملحد اور عقل کے دشمن دہریہ کے اور کوئی نہیں کرسکتا۔

مطلب کہ اس سوال کا ان کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ یہاں البتہ وہ جان چھڑانے کی خاطر یہ کہیں گے بلکہ کہتے بھی ہیں کہ ان باتوں میں ہم کیوں پڑیں یہ کسی طرح بھی ہے، لیکن ہمیں پتا نہیں ہے تو پھر ہم ان کے پیچھے کیوں پڑیں! اس سے خاموش رہنا بہتر ہے۔ حالانکہ ہر عقل سلیم رکھنے والا انسان ان کے اس جواب سے ان کی نمایاں شکست اور مغلوبیت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

﴿إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّٰلِمُونَ﴾ (الانعام: ۲۱)

اس آیت کا خلاصہ مولانا مودودی رحمہ اللہ کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' کی سورۂ مومنوں کی مذکورہ آیت کریمہ کی تشریح سے ماخوذ ہے۔

دلیل نمبر ۲: محترم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب اپنی کتاب ''انسان کائنات اور قانون فطرت'' کے صفحہ نمبر ۱۰، ۱۱ پر ''انسانی جسم'' کے عنوان سے جدید علوم (تشریح انسانی متعلق) حاصل شدہ علوم و معارف، سائنسی تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر اس طرح رقمطراز ہیں۔ ''مرد کے پیدائشی مادے سے یعنی نطفے کے ایک مکعب سینٹی میٹر میں اڑھائی کروڑ منی کے جرثومے ہوتے ہیں اور عام حالات میں ایک دفعہ میں کتنے ہی مکعب سینٹی میٹر جتنا مادہ ہوتا ہے۔ جس میں ماہرین کے اندازے کے مطابق (۵۰) کروڑ جرثومے (منی کے زندہ جراثیم)

ہوتے ہیں۔ ان نصف ارب جراثیم میں سے ہر ایک میں ایک مکمل انسان بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے، لیکن دوسری طرف صرف ایک جرثومہ عورت کے بیضے میں داخل ہوتا ہے، جو تخلیق انسانی کا باعث بنتا ہے، اسی طرح ہر بالغ عورت کے مخصوص حصے میں (۴) چار لاکھ کچے بیضے موجود ہوتے ہیں، لیکن ان میں صرف ایک بیضہ پکہ ہوکر اپنے مقرر وقت پر ظاہر ہوتا ہے، تاکہ مرد کا کوئی ایک جرثومہ اس میں داخل ہوکر ایک مکمل حیاتی کا یونٹ بن کر حمل کی صورت اختیار کرے، یہاں پر ڈاکٹر صاحب کی عبارت پوری ہوئی۔

اس عبارت سے اللہ خالق کائنات کے وجود پر دلیل ملتی ہے جبکہ سائنس اور جدید علوم انسانی جسم کی تشریح کے متعلق تھی۔ حقیقت ثابت معلوم ہوئی کہ مرد کے ایک دفعہ کے نطفہ میں نصف ارب جرثومے ہوتے ہیں جن میں ہر ایک جرثومے میں ایک مکمل انسان بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح عورت کے مخصوص حصہ میں چار لاکھ کچے بیضے موجود ہوتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مرد کے نصف ارب جرثومے میں سے صرف ایک ہی جرثومہ عورت کے بیضے میں کیوں داخل ہوتا ہے؟ باقی جرثومے کیوں داخل نہیں ہوتے؟ وہ کونسی طاقت ہے جو باقی جراثیم کو عورت کے بیضے میں داخل ہونے سے روکتی ہے؟ بذات خود ان جراثیم میں تو کوئی شعور نہیں ہوتا اور نہ ہی مرد کے نطفے (یا پیدائشی مادہ) میں کوئی سمجھ یا شعور ہوتا ہے۔ پھر کون ہے جو ان کو کنٹرول کرتا ہے اور ایک سے زائد جراثیم کو عورت کے بیضے میں داخل ہونے سے روکتا ہے؟ اسی طرح عورت کے مخصوص حصے میں چار لاکھ کچے بیضے ہوتے ہیں، ان میں صرف ایک ہی پکا ہوکر کیوں ظاہر ہوتا ہے؟ زیادہ کیوں نہیں پکے ہوکر ظاہر ہوتے ہیں؟

ظاہر ہے کہ اگر مرد کے ایک سے زیادہ جرثومے عورت کے بیضے میں داخل ہو جائیں یا عورت کے بھی ایک سے زیادہ کچے بیضے پکے ہوکر مرد کے جرثومے کو قبول کرنے کے لیے ظاہر ہو جائیں تو عورت بیچاری کا کیا حشر ہوتا یہ ہر عقلمند جانتا ہے، اسی حشر یا نقصان کا شعور بے شعور مادے میں کہاں ہے، بہرحال اس سوال کا جواب ان عقل کے دشمنوں کے پاس

کہاں سے آیا، ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

اگر اللہ خالق کائنات قادر مطلق کی ہستی کے قائل ہو جائیں تو اس سوال کا فوراً حل مل جائے گا، یعنی وہ اللہ کی ذات ہے جو مرد کے جراثیم میں سے صرف ایک جرثومے کو عورت کے بیضے میں داخل ہونے کے لیے تیار کرتا ہے اور باقی اجزا کو نہیں چھوڑتا۔

اسی عورت کے تمام بیضوں میں سے صرف ایک کو پکا کر کے مرد کے جرثومے کو اخذ کرنے کے قابل بناتا ہے، باقی بیضے اس کے امر کے مطابق کچے ہی رہتے ہیں اور مرد کے جرثومے کو قبول کرنے کے قابل ہی نہیں ہوتے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار، اس سے ایک بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آج کل کی سائنس خود اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلائل فراہم کر رہی ہے اور اسلام کے دین حق ہونے کا ثبوت فراہم کر رہی ہے۔

دلیل نمبر۳: اس کائنات کے خلا میں کیمیا اجرام فلکی حرکت کر رہے ہیں۔ سورج، چاند، زہرہ، مشتری، زحل، مریخ سفید کہکشاں وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم تو کہتا ہے:

﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ (الانبیاء: ۳۳)

یہ سارے اجرام فلکی اس خلا میں تیر رہے ہیں۔ سائنسدان اور جغرافیہ کے ماہرین کی بھی یہ تحقیق ہے کہ سورج اپنی مدار پر گھوم رہا ہے، چاند زمین کے اردگرد گھومتا ہے۔ باقی دوسرے بے شمار سیارے اور ستارے اپنے اپنے دائرے میں حرکت کر رہے ہیں اور ان کی تحقیق کے مطابق کئی ہزار سال پہلے یہ وجود میں آئے اور اس وقت سے لے کر آج تک حرکت کر رہے ہیں۔ زمین بھی ان کی تحقیق کے مطابق سورج کے اردگرد گھوم رہی ہے اور خود اپنے اردگرد بھی یومیہ حرکت کر رہی ہے، اب یہ اللہ خالق اکبر کے انکاری بتائیں کہ یہ اتنے بڑے اجسام والے کئی ہزار سالوں سے اپنے دائرے میں حرکت کر رہے ہیں اور ان میں کوئی بھی دوسرے کے دائرے میں ذرا برابر داخل نہیں ہوتا، کوئی بھی اپنی حرکت طلوع یا غروب میں کسی بھی موسم میں ایک سیکنڈ بھی آگے پیچھے نہیں کرتا۔ اتنا بڑا نظام آخر کس طرح چل رہا ہے، وہ کون ہے جو اتنی بڑی جسامت والی مخلوق کو خلا میں ایک مقرر دائرے (Sphere) میں

کنٹرول کیے ہوئے ہے کہ ایک انچ بھی اپنے مدار سے نہیں ہٹتے۔ کیا اللہ قادر مطلق کے علاوہ کوئی ہے؟ یا اس بے پناہ قدرت رکھنے والے کے سوائے ممکن ہوسکتا ہے؟ اگر تھوڑی بھی عقل والا سوچے گا تو فوراً بول اٹھے گا ہرگز نہیں، ان عظیم اجرام میں سے کوئی بھی اتنے بڑے لمبے عرصے اور لامحدود وقت تک اپنے مدار پر اتنا کھڑا نہیں ہوسکتا کہ ایک بال بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔

علاوہ ازیں! اتنے بڑے ہائل شماوی اجرام حرکت تو بعد کی بات ہے، مگر اولاً تو ان کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ وجود میں کیسے آئے؟ کیونکہ کائنات کی کوئی بھی چیز خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی وہ بغیر صانع کے وجود میں نہیں آسکتی اور نہ ہی کبھی آئی ہے، تو پھر پہلے وہ جواب دیں کہ وہ وجود میں کس طرح آئے؟ ان کے پاس معقول جواب کوئی نہیں ہے۔ صرف حقیقتِ ثابتہ کو ماننے سے انکار کے شوق میں ایسی الٹی سیدھی باتیں کریں گے جس سے ہر سمجھدار انسان فوراً اندازہ لگالے گا کہ یہ صواحب محض فالتوں باتیں کرنے کی تیاریاں کررہے ہیں اور محض دفع الوقتی اور سمجھ دار لوگوں کو بے وقوف بنانا اور عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہی ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ ان عظیم اجرام کے چھوٹی چھوٹی مثالیں آج سائنس سے فراہم کر دیں عصری سائنسدانوں نے مصنوعی سیارے بنا کر زمین کے چاروں طرف روانہ کر دیئے ہیں، جو اس کے اردگرد گھومتے ہیں کیا یہ مصنوعی سیارے خود بخود وجود میں آ گئے؟ ہرگز نہیں۔ بغیر صانع کے خود بخود بن کر اور خلا میں حرکت کرنے لگے؟ یا ان کے بنانے کے بعد خود بخود خلا میں اڑنے لگے، ہرگز نہیں بلکہ ان کے موجد نے ان کو حرکت میں لایا۔ کیا یہ مثالیں ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی نہیں ہیں؟

یعنی جس طرح یہ مصنوعی سیارے یا راکٹ خلا میں بنانے والوں نے بنا کر چلائے اسی طرح یہ عظیم اجرام فلکی کو بھی ایک خالق اکبر نے اپنی قدرت باہرہ سے پیدا کر کے ان کو اپنی مدار میں متحرک کر بنا دیا ہے اور اس خالق اکبر قادر مطلق کا نام ''اللہ'' ہے۔ سائنسدانوں نے میزائل وغیرہ جو کہ ریموٹ کنٹرول (Remote Cnotral) طریقہ پر ہیں، یعنی ایک خاص

جگہ یا کنٹرول کرنے کا مقام ہوتا ہے وہاں سے یہ فائر کیے جاتے ہیں، جو جہاز وغیرہ کو نشانہ بنا کر اس کی تباہی کا سبب بنتے ہیں اور وہ کنٹرولنگ اسٹیشن سے طاقتور دوربینی (Powerful tele scope) کے ذریعے مشاہدہ بھی کرتے ہیں کہ وہ واقعی نشانے پر لگے ہیں یا نہیں۔ اس ایجاد سے بھی ظاہر ہوا کہ اول یہ میزائل کن کاریگروں نے بنائے، پھر ان کے رکھنے والوں نے ایک خاص نشانے پر فائر کیا۔ نہ یہ سارے خود بخود وجود میں آئے اور نہ ہی وجود میں آنے کے بعد خود حرکت میں آئے اور نہ ہی مطلوبہ جگہ پر خود بخود جا کر لگے، یہ بالکل واضح ہے، پھر آخر اس کائنات کے ان اتنے بڑے اجرام فلکیہ کے بارے میں یہ احمقانہ خیال ان حضرات کو کس طرح آیا کہ وہ خود بخود وجود میں آئے اور خود ہی اپنے دائرے میں متحرک ہو گئے اور ہزاروں سال گزرنے کے باوجود نہ ان کی حرکت میں فرق آیا اور نہ ہی اپنے مدار سے ایک انچ بھی ہٹے ہیں۔ کیا یہ عقلمندوں کی گفتار ہے یا مجنون کی؟ یہی حقیقت ہے جس کی طرف یہ آیت کریمہ رہنمائی کرتی ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهِ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا﴾ (الفاطر : ٤١)

یعنی تمام فلکی اجرام اور زمین کو اللہ تعالیٰ ہی اپنے مدار میں اپنی جگہ پر روکے ہوئے ہے۔ ورنہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹتے تو کوئی بھی ان کو روک نہیں سکتا۔

اور اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹتے تو جاندار اشیاء کا کیا حال ہوتا، اس کے تصور کرنے سے ہی کپکپی شروع ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا کہ ''بیشک اللہ تعالیٰ بردبار اور گناہ بخشنے والا ہے۔'' یعنی اسی وجہ سے بندوں کے گناہوں کے باوجود ان اجرام کو روکے ہوئے ہے اور ان کو چھوڑتا نہیں ہے، اس لیے کہ مخلوق نہ تباہ ہو جائے۔ انسان کی کوئی بھی چیز کتنی ہی بڑی محنت اور کاریگری کے ساتھ کیوں نہ بنائی گئی ہو، خواہ مشینری ہو، انجن ہو، ہوائی جہاز ہو یا کوئی اور چیز ہو، لیکن وہ دائمی طور پر نہیں چل سکتی۔ ایک مکینک کسی مشین کو چلاتا تو دیتا ہے، لیکن وہ چل چل کر خراب یا نقص والی بن جاتی ہے، لیکن وہ مشین نہ خود بنی اور نہ ہی

خود بخود چالو ہوئی، اس کو چلایا بھی کسی واقف نے، مگر پھر بھی ایک وقت پر وہ خود بخود خراب ہو جاتی ہے۔ آٹو میٹک (Auto matic) گھڑیاں ہیں لیکن ان پر بھی ہمارا تجربہ ہے کہ وہ بھی ایک وقت پر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ہوائی جہاز دیکھو کیسے خلا کو چیر کر چلتا ہے، لیکن اگر ان میں کوئی نقص پیدا ہوا یا چلتے چلتے اگر کھڑا ہوا تو وہ دھڑام سے زمین پر گر کر خود بھی تباہ ہوگا اور اس میں سوار مسافر بھی اجل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیا ان تمام واقعات کا ہم مشاہدہ نہیں کرتے؟ بہر حال ان تمام عجیب وغریب اشیاء کو کس نے بنایا اور پھر چلایا اور ان پر کنٹرول بھی کیے ہوئے ہیں لیکن پھر کبھی کبھار حوادثات کا شکار ہو جاتے ہیں تو کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ اتنے بڑے اجسام سورج اور اس کا نظام شمسی، چاند اور ستارے وغیرہ اور زمین ہزاروں سالوں سے چل رہے ہیں، لیکن پھر کیوں نہیں وہ رکتے اور نہ ہی ان میں کوئی نقص پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی ان میں سے کوئی اپنے مدار سے ایک بال جتنا بھی اِدھر اُدھر ہوتا ہے۔ ان کے طلوع وغرب کا تا ہم مقرر ہے، جس میں کبھی ایک سیکنڈ تفاوت نہیں ہوا ہے اور ان کی مقررہ رفتار کو دیکھ کر سورج کے طلوع اور غروب اوقات (ہر موسم میں) نقشے کی صورت میں بنائے جاتے ہیں جو کہ تقریباً صحیح ہوتے ہیں اور اسی حرکت اور ہیر پھیر کی بنیاد پر لوگوں کو خبر ہے کہ فلاں مہینے میں گرمی اور فلاں مہینے میں سردی آئے گی۔

کیا یہ سارا نظام جو کہ اتنا مستحکم اور مضبوط ہے اتنے لمبا عرصہ گزرنے کے باوجود اس میں کوئی تفاوت نہیں کیا؟ یہ سب کچھ بغیر صانع کے وجود میں آیا، یہ بغیر قادر مطلق کے باقاعدہ منظم طریقے سے چل رہا ہے؟ کیا یہ بات انسانی عقل میں آنے جیسی نہیں ہے ایک حقیقت پسند انسان فوراً پکار اٹھے گا، ہرگز نہیں، ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ بہر حال اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کے وجود کے دلائل کائنات کے ذرے ذرے میں آنکھیں رکھنے والوں کے لیے موجود ہیں۔

باقی شیخ سعدی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق ۔

گر نہ بیند بروز شبپر چشم
چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

اگر دن میں چمگادڑ دیکھ نہیں سکتا تو اس میں سورج کا کوئی قصور نہیں ہے۔

اگر ان صاحبوں کو یہ دلائل نظر نہیں آتے تو اس میں اس حقیقت ثابتہ کا کیا قصور ہے، ایسے صاحب اپنی بیمار آنکھوں کا علاج کروائیں، اگر غور کیا جائے تو دوسرے دلائل بھی پیش کیے جاسکتے ہیں، لیکن اس جگہ پر دلائل کا احصار (شمار) مطلوب نہیں ہے (اگر درخانہ کس است یک حرف بس است) عقلمند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ایک شاعر نے کہا ہے۔

طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ؟
دو اشک بھی بہت ہیں اگر اثر کریں

(واللہ اعلم)

اللہ کا حاضر و ناظر ہونا

سوال: آج کل مختلف رسائل میں حتی کہ اہلحدیث جماعت کے رسائل وکتب میں بھی یہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حاضر ناظر ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ سلف صالحین وصحیح مسلک کے مطابق اپنے عرش عظیم پر مستوی ہے اور ہر جگہ اس کی قدرت قاہرہ کام کر رہی ہے اور اپنے علم کی صفت میں ہر جگہ ہے، نا کہ بذات خود اور یہی قرآن حکیم میں مذکور ہے بہت سی آیات اس پر دال ہیں۔مثلاً "ثم استویٰ علی العرش، الرحمن علی العرش استویٰ وغیرھما" اس صورت میں کیا مذکورہ بالا الفاظ (حاضر ناظر) (جس سے اللہ تعالیٰ کا بذات خود ہر جگہ ہونا مترشح ہوتا ہے) کہنا جائز ہے۔یا نہیں۔بینوا توجروا

الجواب بعون الوھاب: اس جواب کے لیے ذیل کا قاعدہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ کسی زبان کے لفظ یا جملہ کا دوسری زبان میں عام فہم ترجمہ کرنا یا اس کے مضمون کے ادا کرنے کے لیے اس زبان میں جو مروجہ الفاظ ہوں ان سے مطلب ادا کرنا کوئی معیوب بات نہیں ہے کیونکہ عوام اپنی زبان کے الفاظ کو زیادہ جلد سمجھ جاتے ہیں صرف یہ حاضر و ناظر ہی نہیں اور بھی بہت سے الفاظ ہماری زبانوں میں عام طور پر رائج ہیں حالانکہ ان کے متعلق کسی نے اعتراض

نہیں کیا مثلاً خدا دھنی پاک وغیرہ اب قرآن وحدیث میں خدا دھنی پاک وغیرہ میں سے کوئی لفظ بھی مستعمل نہیں ہے۔ حالانکہ یہ الفاظ زبان زد عام وخاص ہیں نہ کسی نے اس پر اعتراض کیا ہے نہ اس کو اللہ تعالیٰ کے بارہ میں استعمال کرنے کو برا سمجھا ہے کیوں؟ اس لیے کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی ان صفات کے معانی میں جو خود اس ذات جل وعلا نے اپنی ذات قدوس پر اطلاق کیے ہیں مثلاً خدا لفظ القیوم کی معنی رکھتا ہے، دھنی مالک یا مولی کا ہم معنی ہے اور پاک قدوس کے معنی کا حامل ہے۔ اب خدا بخش کے معنی ہوئے قیوم کا بخشا ہوا، دھنی بخش مولا بخش کا مترادف ہے اللہ پاک اللہ قدوس کا ہم معنی ہے لہٰذا چونکہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی ان ہی صفات کے معانی ہیں جو خود اس ذات قدوس نے اپنے اوپر اطلاق کیے ہیں (یعنی قیوم، مالک یا مولی، قدوس یہ سب صفات قرآن حکیم میں ملتی ہیں) تو ان الفاظ کا استعمال کرنا جو ہماری زبانوں میں ان صفات کے مرادف ہیں کوئی معیوب بات نہیں ہے اسی طرح گو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات جل وعلا تو عرش کریم پر مستوی ہے لیکن وہ اپنے وسیع علم وقدرت کے اعتبار کے ساتھ ہمارے ساتھ ہے قرآن حکیم فرماتا ہے:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾

(الحدید: ٤)

''یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو اور وہ ذات پاک تمہارے سب اعمال کو دیکھ رہا ہے۔''

اب اللہ تعالیٰ کا ہمارے اعمال کو دیکھنے کا مفہوم لفظ ناظر سے ادا کیا گیا ہے۔ اور ''وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ'' کا مطلب اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ بذاتہ تعالیٰ وتقدس اس جگہ پر موجود ہیں بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ ہمارے ساتھ (یعنی وھو معکم) اب جو ساتھ ہونے کا مطلب لیا جائے گا وہی حاضر کا بھی ہوگا اگر ساتھ ہونے (معکم) سے ہر جگہ پر بذاتہ تعالیٰ وتقدس موجود ہونا لازم نہیں آتا تو حاضر کے لفظ سے یہ کہاں لازم آتا ہے؟ مقصد یہ کہ لفظ حاضر اللہ تعالیٰ کی معیت کو ظاہر کرتا ہے اور یہ لفظ ''معیت'' کتاب و

سنت میں بکثرت وارد ہے۔

اور جس طرح کتاب وسنت میں معیت سے مراد معیت علمی ہے اسی طرح حاضر ہے (جو ہماری زبانوں میں اسی کا ہم معنی ہے) اس سے بھی یہی معیت علمی مراد ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کا بذاتہ تعالیٰ وتقدس موجود ہونا کسی زبان کا ہم معنی لفظ اللہ تعالیٰ پر اطلاق کرنا ناجائز ہے۔ (یعنی جو اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کے مرادف ہو) تو اس سے دو خرابیاں لازم آئیں گی۔

(۱)...... وہ تمام الفاظ جو متفقہ طور پر امت کے خواص وعوام استعمال کر رہے ہیں۔ مثلاً خدا بخش، وھنی بخش اللہ پاک، پروردگار وغیرہ وغیرہ سب الفاظ ناجائز ہو جائی گے اور زبان کا قافیہ ایسا تنگ ہوگا کہ ہر بڑی مشکل پیش آجائے گی۔

(۲)...... یہ کہ اس صورت میں ہم اللہ تعالیٰ کی کسی بھی صفت کی معنی نہیں کر سکیں گے، فرض کیجئے ہم کہتے ہیں اللہ کریم ہے۔ اللہ غفور ہے اللہ سمیع وبصیر ہے۔ اب کوئی ہم سے پوچھے (مثلاً کوئی ان الفاظ کی معانی جاننے والا نہ ہو) کہ بھائی کریم کے کیا معنی ہیں غفور کا کیا مطلب ہے اور سمیع وبصیر سے کیا مراد ہے تو ہم اس کو کچھ بھی بتا نہیں سکتے ہیں صرف کہتے جائیں گے کہ بس جناب غفور ہے، کریم ہے وغیرہ وغیرہ باقی اس کی معنی نہیں کر سکتے اور اس طرز عمل سے جو خرابی لازم آئے گی، اس کے متعلق راقم الحروف کو لکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہر ایک اندازہ لگا سکتا ہے۔

خلاصہ کلام:...... اللہ تعالیٰ کے لیے حاضر وناظر کہنا ناجائز نہیں ہے کیونکہ یہ ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ کا مفہوم ادا کرتا ہے اور جس طرح اس آیت کریمہ سے معیت علمی مراد ہے اسی طرح حاضر سے بھی مراد اللہ تعالیٰ کا علم کی صفت کے اعتبار سے ہمارے ساتھ ہونا ہی مراد ہے نہ کہ کچھ اور ایک عام اور مروجہ لفظ حاضر سے ادا کیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ حاضر ہیں۔

هذا ما ظهر لهذا العبد الحقير والعلم عند ربنا العلي الكبير

وهو اعلم بالصواب

کلمہ طیبہ

سوال: کیا کلمہ پڑھنے والا جنتی ہے، اگر جنتی ہے تو کیا یہ بات حدیث مبارکہ اور قرآن پاک سے مطابقت رکھتی ہے؟ اگر ہاں تو پھر سورت اور آیت کا حوالہ بتائیں؟

الجواب بعون الوھاب: اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہ حدیث بالکل صحیح ہے یہ حدیث صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ جو شخص ''لا الٰہ الا اللہ'' دل کے اخلاص کے ساتھ پڑھے گا تو وہ جنت میں داخل ہوگا خواہ ابتداءً یا پھر کبیرہ گناہوں کی سزا پانے کے بعد ''لا الٰہ الا اللہ'' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان الفاظ مبارکہ کہنے والا پکا موحد ہو اور شرک سے بالکلیہ اجتناب کرنے والا ہو اس کی تائید قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾

(النساء: ٤٨)

''یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ شرک معاف نہیں فرمائے گا ہاں شرک کے علاوہ دیگر گناہ (کبیرہ) جسے چاہے معاف فرما دے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص بھی مشرک نہیں وہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت سے بالکل مایوس نہیں گناہ کبیرہ کی قید اس لیے لگائی گئی ہے کہ قرآن کریم میں ہے کہ:

﴿إِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾

(النساء: ٣١)

''یعنی اگر آپ لوگ ان کبیرہ گناہوں سے جن کے ارتکاب سے تمہیں روکا گیا ہے بچتے رہو گے تو ہم تمہاری چھوٹی چھوٹی برائیوں کو مٹا دیں گے۔''

اور ابتداءً یا کچھ سزا پانے کی بات اس لیے کہی گئی اگر ''وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ'' کا مطلب یہ لیا جائے کہ شرک کے علاوہ دیگر گناہوں میں کچھ گناہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ

اصلاً کبھی بھی معاف نہیں فرمائے گا تو پھر شرک اور دیگر گناہوں میں کچھ فرق نہ رہا۔ یعنی اگر کچھ گنہگاروں کو جہنم میں خلود اور ابدی سزا ملے گی اور کبھی بھی انہیں اس سے نکلنا نصیب نہ ہوگا تو پھر شرک اور وہ کبیرہ گناہ سزا کے اعتبار سے برابر ہوئے نہ مشرک کی مغفرت اور نہ ہی (مشرک کے علاوہ) دیگر مرتکبین کبیرہ کی مغفرت ان کے لیے بھی ابدی سزا اور اُن کے لیے بھی ابدی سزا۔ لہٰذا "وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ" کا صاف اور واضح مطلب ہے کہ شرک کے علاوہ دیگر کبیرہ گناہوں کے مرتکبین میں سے کچھ کو تو ابتداہی میں معافی مل جائے گی اور کچھ (جن کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حکمت وعدل کی تقاضا ہے کہ انہیں سزا ملنی چاہئے) اپنے گناہوں کی سزا پا کر بالآخر ان کی بخشش ہو جائے گی اور انہیں جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ انہیں جہنم کی ابدی سزا نہیں ملے گی۔ اس بارے میں صحیحین دیگر کتب احادیث میں بے شمار احادیث مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بالآخر وہ سب لوگ جہنم سے نکالے جائیں گے جنہوں نے کوئی بھی نیکی اصلاً نہ کی ہوگی اور ایسی روایات حد تواتر کو پہنچتی ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

علاوہ ازیں قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت کریمہ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰهُ النَّارُ﴾

(المائدة: ٧٢)

"یعنی جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے گا اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام قرار دے دیا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔"

اس آیت کریمہ میں بھی اشارہ ہے کہ غیر مشرک کے لیے جنت ہمیشہ کے لیے حرام نہیں اگر چہ مشیت ایزدی کے مطابق کچھ وقت کے لیے جہنم میں چلا بھی گیا لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جنت میں داخل ہو جائے گا اس کے لیے جنت ہمیشہ کے لیے حرام نہیں۔ بہر حال جنت ہمیشہ کے لیے حرام صرف مشرکین کے لیے ہے۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾

(النحل : ٤٤)

''اور ہم نے تیری طرف کتاب اتاری ہے تاکہ لوگوں کو کھول کھول کر بیان کرے جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔''

یعنی قرآن حکیم کی تبیین اور توضیح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول اکرم ﷺ کے سپرد کی ہے۔ لہٰذا مذکور بالا احادیث مبارکہ سورۂ نساء اور مائدہ کی آیات کی ہی تشریح وتوضیح ہیں لہٰذا انہیں قبول کرنا ضروری ولازمی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ ''لا الہ الا اللہ'' کا مطلب کیا ہے؟ توحید کا مفہوم کیا اور شرک کسے کہتے ہیں یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سمجھنی چاہئے اس کے لیے ذیل میں کچھ تفصیل سے وضاحت کی جارہی ہے۔ بعون اللہ سبحانہ وتعالیٰ وحسن توفیقہ.

'' لا الــہ الا اللّٰـہ'' کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی معبود برحق نہیں اور پوری مخلوق میں کوئی بھی ہستی ایسی نہیں چاہے وہ فرشتہ ہو یا نبی یا کوئی اور مخلوق جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ ذات میں صفات میں، افعال واختیارات میں اور کائنات کے نظام کو چلانے میں شریک وند نہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کا کوئی کفو وہم پلہ ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی مثل کوئی چیز ہے۔

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الشوریٰ : ١١)

''اس کے مثل کوئی چیز نہیں وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ (الاخلاص : ٤)

''اور نہ ہی کوئی اس کا ہم پلہ ہے۔''

صحیح معنی میں ''لا الہ الا اللہ'' پر کامل ایمان رکھنے والا وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان اس طرح رکھے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی ذات وصفات واسماء وافعال کے اعتبار سے وحدہ لا شریک لہ ہے، یعنی خالق مالک رازق اولاد عطا کرنے والا بیماری سے شفایاب کرنے والا،

عالم الغیب ، ہر شے پر قادر جس کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دینے کا اختیار رکھنے والا ، بندوں کی دعاؤں کو قبول کرنے والا ، عبادات کی جمیع انواع واقسام کا مستحق ، مرادیں پوری کرنے والا ، نفع ونقصان اور زندگی وموت کا مالک ، ہر لمحہ اپنی مخلوق کی ہر ضرورت کو پورا کرنے والا ، ان کا محافظ ونگہبان وغیرہ وغیرہ صفات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی خاص ہیں کوئی بھی ہستی اس کائنات میں ان صفات میں اللہ تعالیٰ کی شریک وثانی نہیں ہے۔ اس طرح موحد ہونے اور شرک سے براءت کے لیے یہ بات بھی ضروری ہے کہ وہ موحد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تقدیر (یعنی اللہ کو ماضی ، حال ، مستقبل ، سب کا علم ہے جو کچھ ہو چکا اور جو ہو رہا ہے اور جو آئندہ ہوگا سب کچھ جانتا ہے اور جو کچھ ہوا یا ہوگا سب ہی اس کے بنائے ہوئے منصوبہ کے مطابق عمل میں آ رہا ہے۔) پر ایمان رکھتا ہو اسی طرح تمام انبیاء ورسل اور کتب سماوی پر ایمان رکھے کہ اللہ تعالیٰ ابتدا ہی سے انبیاء ورسل اور کتب کو بھیج رہا ہے اور یہ سلسلہ سیدنا واما منا محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن کریم پر آ کر ختم ہوا ہے اسی طرح آخرت کے دن پر ایمان بھی ضروری ہے یعنی ایک دن سب انسان زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور اپنے اعمال کے مطابق جزو سزا پائیں گے نتیجہ جنت یا جہنم کی صورت میں ان کے سامنے واضح ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک موحد کو ملائکہ علیہم السلام پر ایمان لانا لازمی امر ہے۔ اسی طرح جن اشیاء یا اوامر وعبادات کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے ان کی فرضیت پر ایمان رکھتا ہو، مثلاً نماز ، روزہ وغیرہ اور جن اشیاء کو اس نے حرام وناجائز قرار دیا ہے ان کو حرام اور ناجائز سمجھتا رہے۔ یہ سب امور توحید اور ایک موحد کے لیے لازمی ہیں ان میں سے اگر کسی ایک کا بھی انکار کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی صفات جو اس کے ساتھ خاص ہیں ان میں کسی کو شریک سمجھتا ہے۔ مثلاً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو عالم الغیب یا مشکل کشا سمجھتا ہے تو وہ مشرک ہے موحد ہرگز نہیں ، اس کا " لا الہ الا اللّٰہ " پر عمل نہیں ۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ذات یا صفات میں کسی کو شریک کرنے والے کا مشرک ہونا تو ظاہر وعیاں ہے لیکن انبیاء ورسل ، کتب ، ملائکہ علیہم السلام اور تقدیر اور بعث بعد الموت ، جزا وسزا ، جنت وجہنم

ان پر ایمان نہ رکھنے والے اور انکار کرنے والے اور اسی طرح فرائض کی فرضیت کا انکار کرنے والے یا حرام کو حلال جاننے والے یا حرام نہ سمجھنے والے کو مشرک اس لیے کہا جاتا ہے کہ رسل وپیغمبروں اور کتابوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں انہیں بھیجتا رہا ہوں اور یہ سلسلہ میں نے محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن حکیم پر ختم کردیا۔

فرشتوں کے متعلق فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کی ایسی برگزیدہ مخلوق ہیں کہ ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور نافرمانی نہیں کرتے، اسی طرح تقدیر کے متعلق بے شمار آیات واحادیث وارد ہوئی ہیں لیکن یہاں ایک ہی آیت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾ (القمر: ٤٩)

''بے شک ہم نے ہر چیز کو ایک مقرر اندازے پر پیدا کیا ہے۔''

اور آخرت کے متعلق بھی پورے قرآن مجید میں جا بجا وعظ ونصیحتیں موجود ہیں بعینہ اسی طرح نماز، روزہ وغیرہ کے متعلق قرآن کریم میں موجود ہے کہ یہ فرائض ہیں۔حرام اشیاء کی مکمل توضیح قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں موجود ہے اب اگر کوئی شخص ان کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) جھوٹا سمجھتا ہے اور جھوٹ نقص، عیب وخامی ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر عیب ونقص سے قطعاً پاک ہے اسماء الحسنیٰ میں ایک اسم ''السلام'' ہے اور ایک اسم مبارک ''القدوس'' بھی ہے جن کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب ونقص سے باعتبار ذات وصفات پاک ہے۔عیب اور نقص مخلوقات کا خاصہ ہے لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کو نعوذ باللہ جھوٹا سمجھتا ہے تو اس نے واضح طور پر اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ مشابہ قرار دیا اور یہی تو شرک ہے اس پر خوب غور وتدبر کریں۔ ہاں جو شخص مذکورہ بالا صفات وغیرہ وغیرہ سب پر ایمان رکھتا ہے اور فرائض کی فرضیت بھی تسلیم کرتا ہے اور تمام ممنوعات وناجائز کاموں کو حرام وناجائز جانتا ہے لیکن بتقاضائے بشریت فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی وسستی کا ارتکاب کرتا ہے یا محرمات میں سے کسی حرام کام کا ارتکاب کر بیٹھتا

ہے یہ مشرک نہیں بلکہ موحد ہی ہے، البتہ اسے فاسق وگنہگار کہا جائے گا اور ایسا شخص اگر توبۂ نصوحہ کرتا ہے اور اپنے کیئے پر نادم ہوتا ہے اور آئندہ باز رہتا ہے اور مزید اپنی اصلاح کرتا ہے تو اس کا وہ گناہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد موجب معاف ہو جاتا ہے لیکن اگر کوئی شخص بغیر معافی طلب کیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا تو پھر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ماتحت رہے گا چاہے اسے اپنے فضل عظیم سے معاف کر دے اور جنت میں داخل کر دے یا چاہے اسے گناہوں سے پاک صاف کرنے کے لیے کچھ وقت جہنم میں داخل کرے پھر اپنی نظر کرم سے معاف کر کے جنت میں داخل کر دے۔ یہ ہے صحیح مطلب ''لا الٰہ الا اللہ'' کا اور یہی ہے صحیح وحقیقی موحد اور شرک سے بیزار اور بری باقی عوام بلکہ کچھ خواص بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس حدیث شریف کا مطلب ہے کہ صرف زبان سے یہ الفاظ ''لا الٰہ الا اللہ'' ادا کر دینے سے آدمی پکا موحد بن جاتا اور اس کے لیے جنت میں جانے کے لیے بھی الفاظ ادا کر دینے کافی ہیں ''لا الٰہ الا اللہ'' کا زبان سے ورد کرنے کے بعد چاہے وہ پیروں کی پوجا کرے اور قبوں قبروں کا طواف کرتا پھرے اور ان پر سجدہ کرتا رہے اور مُردوں سے مرادیں مانگتا پھرے نماز وغیرہ کی فرضیت کا انکار کرتا رہے محرمات ،زنا، چوری، شراب نوشی، جوا، سود، رشوت وغیرہ وغیرہ کو حلال سمجھتا رہے اور ایمان کے اجزاء کا انکار کرے پھر بھی وہ موحد ہے اور جنت کا ٹھیکیدار ہے تو یہ احمقوں کی دنیا میں رہتا ہے آج کل کے نام نہاد مسلمان بزرگوں کی قبروں کی پوجا کرنے کے بعد بھی اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مکہ مکرمہ کے کفار بتوں کی پرستش کرتے تھے اور جن بتوں کی پوجا کرتے وہ صلحاء وبزرگان دین کے مجسمے تھے وہ ان کے پوجنے سے یہ سمجھتے تھے کہ ان مجسمین کی ارواح خوش ہو کر اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری سفارش کریں گے۔

﴿وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (یونس : ۱۸)

''اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہماری سفارشی ہیں۔''

یعنی اس وقت کے کفار صالحین کے مجسّموں کی پرستش کرتے تھے اور آج کل کے مسلمان انہی صالحین کی قبروں کو پوجتے ہیں خدارا سوچیں کہ ان دونوں میں آخر کیا فرق ہے؟

لیکن وہ کفار اور یہ مسلمان فیاللعجب ، اس کے برعکس اگر ان الفاظ (یعنی جس نے "لا الٰہ الا اللہ" کہا وہ جنت میں داخل ہوگا) کا مطلب یہی ہے کہ صرف زبان سے یہ الفاظ ادا کر دیئے جائیں باقی جو من میں آئے کرتا پھرے وہ مسلمان ہے اور پکا موحد ہے اور جنت کی ٹکٹ اس کے ہاتھ لگ گئی ہے تو پھر سوچنے کی زحمت کی جائے کہ پھر ایسے آسان وسہل اسلام لانے سے ابولہب، ابوجہل اور دیگر کفار کو کیا چیز مانع تھی جب کہ وہ انہیں تو یہی الفاظ ادا کر دینے تھے باقی من مانیاں کرنے سے کوئی چیز انہیں مانع نہ تھی بلکہ جو کچھ بھی کرتے پھرتے ان کے اسلام پر ذرا بھر بھی کوئی اثر نہ پڑتا بلکہ جنت میں جانا بھی ان کے لیے آسان تھا پھر آخر وہ یہ الفاظ کہہ کر دائرہ اسلام میں کیونکر داخل نہ ہوئے؟ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کی زبان عربی تھی وہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کے معنی ومفہوم کو خوب جانتے تھے اور ان کے تقاضوں کو بھی سمجھتے تھے کہ صرف یہ الفاظ کہنے کافی نہیں بلکہ ان الفاظ کے کہنے کے بعد ان کے معنی ومفہوم پر کامل یقین واعتقاد رکھنا ہوگا اور اپنی زندگی انہی کلمات کے معنی ومفہوم پر عمل کرتے ہوئے اور ان کی تقاضا ومتمنات کو پورا کرتے ہوئے گذارنی پڑے گی اور یہی وہ بات تھی جو ان کے لیے مشکل تھی جو وہ نہ کر سکے اس وجہ سے وہ اسلام وایمان سے محروم رہے آخر ہمارے آج کل کے مسلمانوں نے جنت کو اتنا سستا کس بنا پر سمجھ رکھا ہے۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین!

خلاصہ کلام: ...... کہ ایک موحد کا جو صحیح طور پر توحید پر مستقیم ہے وہ خواہ صالح ہو یا گنہگار لیکن جنت میں بہر حال ضرور داخل ہوگا خواہ ابتداءً بغیر کسی سزا وعذاب کے بھگتنے کے خواہ بالآخر مقررہ مدت کے عذاب بھگتنے کے بعد لیکن یہ بات ہر سچے مومن کو ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جہنم کی آگ کی حرارت وتپش اس دنیاوی آگ سے کئی گنا زیادہ ہے ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا﴾ (التوبہ : ۸۱)

''یعنی آپ کہہ دیں کہ جہنم کی آگ سخت گرم ہے۔''

اس کی تشریح صحیح بخاری میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں مروی ہے کہ نبی

کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری یہ دنیا والی آگ جہنم کی آگ کا سترواں حصہ ہے۔ [1]

یعنی جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے اونہتر درجے زیادہ گرم ہے پھر جب اس دنیا کی آگ میں آدمی ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا تو پھر اس آگ میں جو اونہتر مرتبہ زیادہ گرم ہے کس طرح رہ سکتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کے سبب اس میں داخل ہوگا اگرچہ اس میں رہنے کی مدت کتنی کم کیوں نہ ہو؟ اس لیے نفس کو دھوکے میں رہنے نہ دیا جائے بلکہ اس زندگی میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے گناہوں پر پشیمان ہوکر پکی وسچی توبہ کر کے اعمال صالحہ کے ذریعے اپنی اصلاح کی جائے تاکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اسے نواز دے اور اپنی مغفرت میں اسے داخل کردے اور بغیر کسی عذاب کے اسے جنت میں داخل کردے۔ واللہ اعلم!

عمل میں تقدیر کا عمل

سوال: تقدیر کیا ہے؟ اور انسان جو کچھ کر رہا ہے اچھا یا برا کیا وہ مشیت الٰہی کے تحت کر رہا ہے؟

الجواب بعون الوهاب: اللہ کی قسم اگر یہ سوال ملحدوں یعنی دین اسلام کے دشمنوں کی طرف سے نہ ہوتا تو اپنے قلم کو ہرگز حرکت میں نہ لاتا، کیونکہ اس مسئلہ میں بے جا غور وخوض کرنا مومن کے لیے بے حد نقصان دہ ہے، لیکن دین اسلام کے دشمنوں کی سازش اور عوام کو گمراہ کرنے کی سوچی سمجھی ناپاک کوشش کو مدنظر رکھ کر اس موضوع پر قلم اٹھاتا ہوں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے حق کا کلمہ کہنے کی توفیق عطا فرمائے اور کلمہ حق تحریر کرنے کے لیے راہ آسان بنائے اور اپنے فضل سے میری ہر جگہ پر رہنمائی فرمائے۔ اللھم آمین

کوئی بھی کام کرنا ہوتا ہے یا کوئی جگہ بنانی ہوتی ہے، کوئی گاؤں یا شہر آباد کرنا ہوتا ہے یا کوئی کارخانہ وغیرہ جاری کرنا ہوتا ہے مطلب کہ کوئی بھی اسکیم بروئے کار لانی ہوتی ہے تو اول اس کا نقشہ، اس کے اجزاء اس کے تمام پرزوں اور اس کے لوازمات اور ان میں واقع

---

[1] صحیح بخاری: کتاب بدء الخلق، باب صفة النار وانها مخلوقة، رقم الحديث ۳۲۶۵.

اشیاء کی ترتیب اسی طرح اس کے متعلق کئی اشیاء کا تصور اور خاکہ، نقشہ یا نمونہ، ان کی ترتیب وترکیب، ان کے اجزا ولوازمات کے موضوع کی تقسیم اور ان کی ظاہری ہیئت اور کیفیت پورے کی پوری اولاً تو ذہن میں بٹھانا پڑتی ہے، اس کے بعد اس کا مکمل خاکہ کو سپرد قرطاس کیا جاتا ہے بعد ازاں اس کے مطابق اس اسکیم کو عمل میں لایا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو پوری طرح ذہن میں لانے کے بعد اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں، اللہ کی توفیق سے۔ پہلے چند اہم نکتے ذہن نشین کر لیجیے۔

الف:...... انسان کے سوا باقی پوری کائنات کا جس کا مشاہدہ کرتے ہیں انسان کے لیے ہی پیدائش ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ (البقرۃ: ۲۹)

''اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے جو کچھ زمین میں ہے۔''

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ﴾

(الجاثیة: ۱۳)

''اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جو آسمانوں میں اور جو زمینوں میں ہے اس کو تابع بنایا۔''

بہر حال اس کائنات کے تمام اجرام علویہ وسفلیہ انسان کے تابع بنائے گئے ہیں اور انسان کے کام، منفعت اور فائدے کے لیے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آج انسان چاند وغیرہ پر کمند ڈال رہا ہے، یعنی یہ سب کچھ جو ہم دیکھ رہے ہیں وہ سارا انسان کے کام آتا ہے، اگر یہ نہ ہوتے یا کچھ وقت کے لیے انسان کی دسترس سے دور ہو جاتے تو انسان بڑی مصیبت میں پڑ جاتا، لیکن اگر انسان نہ ہوتا تو ان اشیاء کو کوئی نقصان نہیں ہوتا، کئی انسان آرہے ہیں، اور جا رہے ہیں لیکن انسان کی آمد ورفت کا ان پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، کسی بڑی ہستی کی موت پر کبھی ایسا نہیں دیکھا گیا ہے کہ سورج نے طلوع ہونا چھوڑا ہو یا دریا نے بہنا بند کیا ہو، یا سیارات اور ستارے غیر متحرک ہوئے ہوں بلکہ وہ اپنی مقرر ڈیوٹی ادا کرتے رہتے ہیں، لیکن

اگر سورج طلوع نہ ہو یا لمبا عرصہ غائب رہے یا دریا بہنا بند یا کم پانی آئے تو خود سوچو کہ حضرت انسان کا کیا حال ہوتا۔

خلاصہ کلام یہ پوری کائنات انسان کے لیے ہے اور اس کی ضروریات کو پورا کر رہی ہے، مگر خود حضرت انسان ان میں سے کسی کے بھی خاص کام کے لیے نہیں ہے اگر وہ انسان چلا جائے تو ان پر کوئی نقصان یا اثر نہیں ہوتا وہ اپنا دائمی فرض بجالاتے رہتے ہیں۔

ب:...... جب اتنی بڑی وسیع کائنات انسان کے لیے ہے اور انسان ان کے کسی کام کا نہیں ہے تو پھر خود انسان کس کام کا ہے، جب انسان اس کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے تو ظاہر ہے کہ پوری کائنات سے اشرف ہے، کیونکہ حاکم جن پر حکمرانی کرتا ہے وہ ان سے اعلیٰ ہوتا ہے تو پھر کیا عقل اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ کارآمد ہے اور وہ ہمارے لیے مفید خدمت سرانجام دے رہا ہے اور اس کا حکمران نکما اور بالکل بے مقصد و بے غرض وغایت نفع اور فائدہ سے یکسر خالی اور محروم ہے؟ عقل ہرگز اس بات کو تسلیم نہیں کرے گی، پھر سوچنا ہے کہ اس حکمران انسان کی تخلیق و پیدائش کی غرض وغایت کیا ہے، اس کو کیا فرائض انجام دینے ہیں؟ اس کا جواب بھی قرآن میں موجود ہے۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات: ٥٦)

''میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔''

یعنی جس طرح یہ پوری کائنات انسان کی خدمت کر رہی ہے اور اس کے فائدے کے لیے ہے، انسان جو بھی کام ان سے لینا چاہتا ہے وہ اس کے اس ارادے کی تکمیل سے انکار نہیں کرتے بلکہ وہ جو کام بھی چاہے جائز ہو یا ناجائز لینا چاہے گا وہ ان کے حکم کی بجاآوری سے سرتابی نہیں کرتے۔ اسی طرح انسان اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی بجالانے کے لیے اس خطہ ارضی پر آیا ہے تاکہ وہ اپنے حقیقی خالق بے حد رحم وحلم والے رب کے ہر معاملے پر کام کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں مرضی رکھے اور اس کے حکم ارشاد رہنمائی اور مرضی کے مطابق چلے، انہی نکتوں کا نتیجہ اللہ کی کتاب و رسل علیہم السلام اور اس کے اوامر ونواہی زندگی کی طرز بود وباش کے

متعلق رہنما اصولوں کی صورت میں اس دھرتی پر تشریف لائے کیونکہ جب انسان کو اللہ کی مرضی کے مطابق چلنا تھا تو لامحالہ اس کو یہ علم بھی دینا تھا کہ زندگی کے گوناگوں شعبوں کے متعلق اس کے رب کی کیا مرضی اور حکم وارشاد ہے، اس کے لیے وحی کی ضرورت تھی۔

ج:...... انسان اس دنیا میں ایک بڑی آزمائش اور امتحان گاہ میں ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾

(الكهف : ٧)

''زمین پر جو کچھ ہے اس کو ہم نے ان کے لیے خوبصورت بنایا تا کہ انسان کی آزمائش کی جائے کہ کون ہے جو نیک عمل کرتا ہے۔''

یہ آزمائش اس لیے نہ تھی کہ اس کو پتہ ہی نہ تھا، بلکہ اس لیے کہ یہ اس کا دستور ہے کہ وہ کسی کو بھی بغیر عمل خواہ نیک ہو یا یہ کہ محض اپنے علم کے مطابق جزا اور سزا دے بلکہ کوئی بھی انسان جب بد ارادہ کرتا ہے تو اس وقت تک اس پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا جب تک ارادے کے مطابق عمل نہ کر لے۔ اسی طرح سورۂ ملک میں فرمایا:

﴿الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾

(الملك : ٢)

''وہ اللہ مالک الملک جس نے موت اور حیاتی کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ کون ہے تم میں سے جو نیک عمل کرتا ہے۔''

بہر حال یہ دنیا امتحان کی جگہ یا Examination hall ہے، تا کہ ان لوگوں کا امتحان لیا جائے کہ وہ جس عظیم مقصد کے لیے اس کرہ ارض پر آئے ہیں وہ مقصد کس طرح انجام دیتے ہیں، آیا بطریقہ کمال یا کم یا اس سے زیادہ یا بالکل اصل مقصد کے خلاف۔

د:...... جب یہ دنیا امتحان گاہ اور ابتلاء کا مقام ہے تو ظاہر ہے کہ انسان کے سامنے دونوں راستے آئیں خیر وشر، نیکی اور بدی کی سمجھ آئے اور ان میں فرق کا بھی الہام کیا جائے

اللہ کی پسند اور ناپسند کی معلومات ہو۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن کریم ان دو آیات کریمہ میں ارشاد کیا ہے:

﴿وَهَدَيْنَٰهُ ٱلنَّجْدَيْنِ﴾ (البلد : ١٠)

''انسان کو دونوں راستے خیر وشر کے دکھائے۔''

﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَىٰهَا﴾ (الشمس : ٨)

''اور نفس انسانی کی طرف برائی اور پرہیزگاری کا بھی الہام کیا۔''

جب انسان کے سامنے دونوں راستے ہیں اب چوائس اور انتخاب کا سوال پیدا ہوا، یعنی دونوں میں سے کس راستے کو انتخاب کرے، اس لیے آزمائش خاطر یہ بھی ضروری تھا کہ انسان کو اتنا اختیار ملے کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک کو اپنی مرضی اور ارادے کے مطابق اختیار کرے۔ اسی لیے اس کو اپنے کسی بھی ارادے کو عمل میں لانے کی قوت اور اختیار دیا گیا ہے، آزمائش کے لیے ضروری ہے کہ جس کو آزمایا جائے اس کو دونوں اطراف میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی قوت ہو ورنہ اگر اس کو غلط یا برائی کا راستہ اختیار کرنے کا ایک قسم کا اختیار ہی نہ ہوتا تو پھر انسان جمادات کی طرح ہوا یا مشینی صفت انسان ہوا جس کو نہ اپنا شعور ہے نہ کوئی ارادہ یا اختیار چلانے والے نے اس کو چلا دیا تو چل رہی ہے جب بند کیا تو بند ہوگئی، نہ اپنے ارادے سے حرکت میں آئی اور نہ ہی اپنے ارادے سے حرکت کو بند کیا ایسے انسان کے لیے جزاوسزا کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، مثلاً کوئی انسان مجنون یا دیوانہ ہے تو مرفوع القلم ہے، کسی کام کی وجہ سے شرعاً اسے سزا نہیں، کیونکہ اس میں عقل نہیں ہے، لہٰذا اس کے کام بے اختیار ہیں، عقل وارادہ ماتحت نہیں ہیں۔ بہرحال انسان کو صاحب الارادہ والاختیار بنایا گیا ہے، تاکہ وہ اپنے اختیار سے کسی بھی راستے کا انتخاب کرلے اسی کے مطابق چلے اور پھر اس کا نتیجہ دیکھے۔

یہی ارادہ اور اختیار کسی حد تک آزادی کے ساتھ سارا امتحان اور اس کی جزاوسزا کی بنیاد ہے۔

ھ:...... یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان کو اتنا اختیار دے کر اس امتحان حال میں کیوں لایا گیا ہے؟ یا ان کے آزمائش کی کیا ضرورت تھی؟

اس کے لیے یہ گزارش ہے کہ اول تو یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ذاتی معاملہ ہے، ہم اس کے بارے میں کیا قیاس آرائی کر سکتے ہیں، تاہم ہمارے ہے ناقص علم اور فہم میں جو حقیقت آئی ہے وہ یہاں عرض رکھتے ہیں۔ (واللہ اعلم) انسان کی اس طرح صورت گری کر کے اسے گوناگوں لیاقتوں سے مزین بنا کر مختلف قوتوں سے مسلح بنا کر اور قدرے اختیار دے کر اس عالم رنگ وبو میں آزمائش کے لیے آمد سے اللہ تعالیٰ کی کتنی صفات حمیدہ کا ظہور ہوا اللہ تعالیٰ تو اپنی ذات پاک میں غنی وحمید ہے، لیکن اگر ان صفات اور لیاقتوں والا انسان نہ ہوتا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفت عدل، رحم فضل، کرم، حلم بردباری، غفاریت والی صفت اور ہر چیز کے خالق ہونے کی صفت (پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہ ساری کائنات انسان کے لیے ہی پیدا کی گئی ہے) بندوں سے محبت کرنا، عفو ودرگزر سے کام لینے کی صفات وغیرہ وغیرہ آخر وہ کس طرح ظہور پذیر ہوئیں۔ ملائکہ (فرشتے) تو پہلے پیدا تھے مگر صرف ان کی پیدائش سے یا ان کی موجودگی سے اوپر ذکر کی گئی بے شمار صفتوں کا ظہور نہ ہوا کیونکہ ان فرشتوں کو کوئی اختیار نہیں ہے، لہٰذا وہ کون سی خطائیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کو صفت غفاریہ سے معاف کرتے، ان میں ظلم کا مادہ نہ تھا اور نہ ہی اس کو اختیار کرنے کی ان میں قوت تھی، پھر اللہ تعالیٰ کی صفت عدالت کا کس طرح ظہور ہوتا۔ علی ہذا القیاس دوسری کئی صفات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اگر اتنی ساری مخلوق مع انسان پیدا نہ کرتے تو ان کو کون پہچانتا اگرچہ وہ خود تو ہمیشہ ہی سے اپنی ذات کے اعتبار سے غنی، حمید اور مجید تھا۔ اسی طرح اس با اختیار انسان کو اس عالم میں بھیجنے سے کیا وجود میں آیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے متعلق فرشتوں کو فرمایا:

﴿اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۳۰)

''یعنی انسان میں کیا کیا خوبیاں ہیں وہ کیا کیا کر سکتا ہے، اس کو کتنا بڑا علم دیا گیا ہے، اس میں کتنی سمجھ رکھی ہے۔ اس کا علم آپ کو نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کا ہی نتیجہ ہے کہ

انسان زمین تو زمین مگر اجرام علویہ کے تسخیر کے احوال جاننے کے لیے کمر بستہ ہوگیا ہے جن میں کچھ تک تو قدرے پہنچ بھی گیا ہے اور کیا کیا عجیب وغریب چیزیں ایجاد کردیں، یہی روز بروز کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا ہے کیا یہ سارا کچھ علم کا کرشمہ نہیں ہے؟ بہرحال اللہ تعالیٰ کے اتنے بڑے بے انتہاء کا ظہور بھی انسان کی تخلیق سے ہوا۔ مشہور مقولہ ہے ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے'' یعنی جب کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو اس کے حل کے لیے انسان کوئی نہ کوئی ایجاد یا راستہ تلاش کرتا ہے تاکہ اس کی وہ ضرورت وحاجت پوری ہو جائے، اب سوچنا چاہیے کہ اگر ان ضرورتوں اور صفتوں والا انسان نہ ہوتا تو اس دنیا کی کسی بھی چیز سے کوئی ایجاد نہ ہوتی، اس کائنات کے ذرے ذرے میں بے شمار قوتیں اور فائدے مالک کائنات نے رکھے ہیں۔ ان کا کبھی بھی ظہور نہ ہوتا، لیکن جب جب انسان کو ضرورتیں لاحق ہوتی گئیں۔ تب تب وہ اس کائنات کے کیمیاء مظاہر اور اشیاء سے وہ خفیہ قوتیں اپنے تجربہ اور سائنس کے علم سے ظاہر کرکے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے اور اسی ابتلا اور بااختیار ہونے کی صورت سے انسان میں باقاعدہ ترقی کرنے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے والا جذبہ پیدا ہوتا ہے، ورنہ مشینی صفت مخلوق کیسی بھی ہوتی اس سے ایسی ایجادات وجود میں نہ آئیں۔ وہ تو اپنی حرکت میں لانے والی تحریک پر ایک خاص سمت یا ڈائریکشن پر چلتا رہتا، دوسری طرف توجہ کرنا یا ترقی کرنے کا شعور ہی نہ ہوتا۔ لہٰذا ترقی یا گوناگونی اور رنگارنگی طرز وبود وباتوں کا تو خیال ہی نہیں آتا کیا یہ معمولی بات ہے؟ کیا یہ بڑی حکمت نہیں ہے جو کہ ایک حکیم علیم ہستی کی طرف رہنمائی کررہی ہے؟ اس پر خوب غور کرنا چاہیے۔

و:...... انسان کو اتنے اختیار اور ارادے کو عمل میں لانے کی آزادی کی وجہ سے اس عالم میں لامحالہ نمونے ظاہر ہونے تھے کوئی خیر کو تو کوئی شر کو اختیار، کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ تو کوئی اسفل السافلین کی طرف جانے کی سعی کرتا۔ کوئی بلند اخلاق کا مجسمہ ہوتا تو کوئی بداخلاقی کی بدترین مثال ہوتا۔ کیونکہ بدی کا اختیار اس سے سلب کیا جاتا تو آزمائش کا بنیادی ختم ہوجاتا۔ جس طرح تفصیلاً ذکر کر چکے ہیں۔

ج: ...... اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت بالکل صحیح وسالم اور دین اسلام کے مطابق بنائی ہے جس طرح قرآن میں ہے:

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ (الروم: ۳۰)

''پس آپ اپنے چہرے کو یا توجہ کو دین پر قائم رکھیں اس حال میں کہ تو باطل سے حق کی طرف جانے والا ہوتا۔''

یعنی وہ دین اسلام جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی فطرت بنائی ہے۔ صحیح حدیث بخاری وغیرہ میں ہے کہ:

((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ)) (الحديث)

''ہر بچہ اپنی صحیح فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے۔''

اسی طرح سورۃ التین میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝﴾ (التين: ٤)

''بیشک ہم نے انسان کو ایک بہترین بناوٹ میں پیدا کیا ہے۔''

بہرحال کسی بھی ماحول یا خاندان میں بچہ کا تولد ہو مگر وہ اپنی ماں کے پیٹ سے صحیح فطرت لے کر باہر آتا ہے، یعنی کسی کو مسلمان یا کافر بنا کر پیدا نہیں کرتا، لیکن اس عالم میں آنے کے بعد ماحول، سوسائٹی، خاندان اس کے رسم ورواج اور اس کے علاوہ دوسرے کئی اسباب اس کی فطرت کو بگاڑنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی ان کا فوری تدارک ہوا تو زائل ہو جاتے ہیں ورنہ آگے چل کر وہ لاعلاج اسٹیج پر پہنچ جاتے ہیں۔ (اعاذنا اللہ منھا)

بہرصورت انسانی فطرت تو سب کی صحیح ہوتی ہے، اس میں کوئی فرق نہیں، البتہ انسانی لیاقت صلاحیت، استعداد اور انسان میں رکھی ہوئی قوتوں میں کافی فرق ہوتا ہے، ایک انسان میں قوت برداشت بہت زیادہ ہوتی ہے تو کئی انسانوں میں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے، کسی انسان میں کوئی خاص لیاقت ہوتی ہے تو دوسرا اس سے محروم ہوتا ہے، کوئی انجینئر ہے تو کوئی

کامیاب ڈاکٹر، کوئی ماہر وکیل ہے تو کوئی خطابت کا شہسوار، کوئی حکمرانی، بادشاہی یا امارت و سیادت کا حامل ہے، تو دوسری طرف کوئی مزدوری کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک انسان جسمانی قوت میں اوپر ہے تو دوسرا نہایت ہی کمزور ہے۔ اسی طرح خارجی امور کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قدرتی لحاظ سے اس میں بھی مساوات نہیں ہے۔ ایک مالدار اور بڑا سرمایہ دار ہے تو دوسرا فقیر اور محتاج ہے، ایک شخص کے بے شمار اعوان، انصار، عزیز واقارب، خاندان وقبیلہ کے بے شمار افراد ہیں جو ہر معاملے میں اس کے ساتھ ہوتے ہیں تو دوسرے بیچارے کا کوئی یار دوست نہیں ہوتا۔ ایک طاؤسی تخت کی زینت بنا ہوا ہے تو دوسرے کو کوئی جوتوں کی جگہ پر بیٹھنے نہیں دیتا۔ درحقیقت یہ اختلاف اس عالم کی زیب وزینت ہے جس طرح شاعر ذوقؔ نے کہا ہے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

مگر یہ اختلاف مصنوعی نہیں بلکہ قدرتی ہے۔ اس لیے کہ زندگی کا ہر شعبے میں انسان کی آزمائش ہو سکے جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ﴾ (الانعام: ۱۶۵)

''اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے ہی بعض سے بعض کو بلند کیا تا کہ جو کچھ تمہیں عطا کیا ہے اس کے متعلق تمہاری آزمائش کرے۔''

ظاہر ہے کہ اگر دنیا کے تمام انسان غنی اور مالدار ہوتے تو مالی یا اقتصادی اور اجتماعی تعاون کے لحاظ سے ان کی کس طرح آزمائش ہوتی؟ اگر سارے طاقتور ہوتے یا سارے بے پرواہ ہوتے تو کسی محتاج یا کمزور، بیوہ اور مسکین کی مدد کر کے اس خوبی اور کمال کو انسان ذات کس طرح حاصل کرتی؟ حالانکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اس کا ابتلاء ہونا تھا، اسی طرح ا: رونی قوتوں میں بھی مساوات ہوتی۔ ایک دوسرے کا بر وتقویٰ میں تعاون کا سلسلہ

ناپید ہوتا تو پھر کسی انسان کو کسی بھی صفت کی تعریف وثنا کا موقع ہی نہ ملتا۔ دنیا ایک خشک اور بہجت ورونق سے عاری ایک اکتانے والی یکسانیت کا بے ڈھنگہ نمونہ بن جاتی۔ ہم انسانوں کی یہ حالت ہے کہ کسی بھی معاملے یا کام یا امیر میں یکسانیت کو ہرگز پسند وبرداشت نہیں کرتے۔ اسی لیے مالک الملک نے ہماری زندگی کو نیک دلچسپ نمونہ عطا کیا ہے، جس کے کسی بھی شعبے میں یکسانیت نہیں ہے۔ اللہ اکبر! اور اسی اختلاف کی وجہ سے لوگوں کے اعمال، عقائد، تصورات لائحہ عمل طریقہ کار حتیٰ کہ نیک وبد میں بھی بڑا فرق اور تفاوت وجود میں آ گیا جو ابتلاء کے لیے اختیار دے کر اس عالم رنگ وبو میں انسان کو بھیجنے کا لازمی نتیجہ تھا۔

ح:...... جب انسان کے تمام افراد کی فطرت صالح وسالم تھی تو پھر وہ خیر وشر میں کیسے تقسیم ہوا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے اس دہری تقسیم کے بھی کئی اسباب ہیں، مثلاً ماحول سوسائٹی خاندانی رسوم وروایات، بری صحبت اور ساتھ۔ جس میں زیادہ لیاقت تھی وہ بارگاہ الٰہی میں زیادہ مقبول ہوا یا کسی دنیاوی اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوا مگر دوسرے میں وہ لیاقت نہ تھی یا کم تھی اس کو پہلے کے مرتبہ ومقام پر حسد ہوا اور نتیجتاً اس کوئی نہایت ہی غلط قدم اٹھا اور اپنے محسود کی جان کے درپے ہوا یا اسے نقصان پہنچانے کی سوچنے لگا۔ ایک کو جسمانی طاقت بے پناہ ملی ہوئی تھی، جس نے انے اختیار کے مطابق اس کو غلط استعمال کیا اور اپنے کتنے ہی ہم نوعوں کی تباہی کا باعث بنا، کسی کو کوئی جسمانی ضرورت تمام زیادہ لاحق ہوئی مثلاً بھوک اور بدحالی وغیرہ یا جنسی ضرورت پوری کرنے کے لیے فوری کوئی ذریعہ نہ تھا، اس نے بجائے صبر کرنے کے بھوک مٹانے کی خاطر چوری کی یا ناجائز جگہ پر اپنی جنسی ضرورت کو پورا کرنا چاہا اسی طرح کئی دوسری امثال پیش کی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح ان دو بلاکوں میں تقسیم ہونا ناگزیر تھا، لیکن یہ سب کچھ قدرت کی طرف سے آزمائش تھی کہ بھوک اور بدحالی میں صبر کرتا ہے یا دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے۔ بے حد ضرورت میں اللہ کی رضا پر راضی رہتا ہے یا نہیں جس کی تفصیل اوپر گزر چکی۔ حقیقت میں انسان کا کمال بھی اس میں ہے کہ وہ اس دنیا میں رہے اس کے اسباب مال ومتاع، اہل وعیال تمام باتوں سے دلچسپی رکھے اور پھر بھی اللہ

کو راضی رکھے ورنہ اگر کوئی تارک دنیا ہو کر بیٹھ جائے تو اس میں کیا کمال ہے، قرآن نے تو انہی لوگوں کو سراہا ہے جو دنیا میں رہ کر اپنے رب کو راضی رکھتے ہیں۔ فرمایا:

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (النور: ۳۷)

''وہ لوگ جو اپنے کاروبار میں معروف ومشغول بھی ہیں تاہم اس حالت میں بھی اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔''

نبی ﷺ نے خصی ہونے سے منع فرمایا ہے کیونکہ خصی آدمی میں برائی کی قوت ہی نہیں ہوتی، لہٰذا وہ اگر برائی نہیں کرتا تو اس میں کیا کمال ہے اور اس کی کس طرح آزمائش ہوگی، کمال تو اس میں ہے کہ انسان میں طاقت مردانی بے پناہ ہو اور وہ اس کو ناجائز جگہ پر استعمال نہ کرے محض اللہ کے ڈر اور خوف کی وجہ سے۔ اس کو راضی رکھنے کے لیے ایسے کام کے قریب بھی نہیں جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے اس معاملے میں بڑی تعریف کی ہے اور فرمایا: ''وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔'' (یوسف)

اسی طرح انسانی خوبیوں اور خامیوں کے موروثی اثرات بھی ہوتے ہیں۔ والدین کی جسمانی یا روحانی مادی یا معنوی خوبیاں اور خامیاں اولاد کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض بیماریاں بھی موروثی ہوتی ہیں، آج کل ''نفسیات'' (Psy Chology) کے ماہرین کی بھی یہ تحقیق ہے کہ اولاد کی طرف آبا واجداد کی صفتیں یا خصائص منتقل ہوتے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ''حضرت آدم علیہ السلام سے خطا ہوئی تو اس کے اولاد میں یہ بات چلی، ان سے بھول ہوئی تو اس کی اولاد میں بھی یہ بات چلی آرہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ'' گویا ضروری اور حتمی نہیں ہے کہ خاندان یا والدین کی خصوصیتیں بالضرور اولاد کی طرف منتقل ہوتی ہوں، بلکہ نہیں بھی ہوتی۔ مقصد کہ یہ بھی ایک سبب ہوتا ہے جو گاہے بگاہے بعد کی اولاد کے سدھارے یا بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔ میرا ایک چشم دید واقعہ ایک مزدور کی دو بیویاں تھی، انسان کتنی بھی کوشش کرے لیکن دل کا میلان ایک کی طرف ہوتا ہے برابری اس معاملے میں ناممکن ہوتی ہے۔ اس آدمی کی دونوں بیویوں سے اولاد تھی۔ ایک بیوی سے زیادہ محبت اور دوسری سے تھوڑی کم محبت تھی،

جس کی وجہ سے ایک بیوی کو دوسری پر زیادہ غم اور غصہ تھا اندر ہی اندر غصہ کی لہر موجود تھی۔ ایک دن وہ مرد اپنے چھوٹے بیٹے (جو زیادہ محبت والی بیوی سے تھا) کو کندھے پر اٹھائے ہوئے تھا اور ساتھ ہی دوسرے کندھے پر دوسری بیوی کا چھوٹا بیٹا تھا، خاوند نے دوسری طرف توجہ کی تو چھوٹے بیٹے نے جو دوسرے آدمی کے کندھے پر تھا وہ اپنے دوسرے بھائی کا بازو پکڑ کر کاٹنے لگا (دانتوں سے) تو باپ نے دیکھ لیا اور اس سے چھڑایا، یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ کیا عجیب معاملہ ہے کہ ماں کے غم اور غصہ کا اثر چھوٹے بچے پر بھی نمایاں ہے، اللہ کی قدرت سے وہ بچہ پھر جلد ہی فوت ہوگیا، چونکہ دوسرا بیٹا اس سے چھوٹا تھا اس سے گمان ہو رہا تھا کہ اس عمر میں اگر اتنا غصہ ہے دوسرے بھائی پر تو بڑا ہو کر پتہ نہیں کیا کرے گا۔ دونوں مائیں اعلیٰ پوزیشن کی تھیں مرد بھی بڑی حیثیت کا تھا اور دوسری بیوی جس سے کم محبت تھی وہ خاندانی لحاظ سے ان دونوں سے بہتر تھی، اگر خدانخواستہ وہ بچہ ہوتا تو پتہ نہیں دوسرے بھائیوں کا کیا حشر کرتا لیکن عالم الغیب والشهادة نے اس کو پہلے ہی بلا لیا۔

ط:...... کوئی بھی آدمی کوئی کارخانہ بناتا ہے یا کوئی میکینک یا مشین وغیرہ بناتا ہے تو اسے ان کے متعلق مکمل معلومات رہتی ہے، مثلاً کارخانہ میں فلاں چیز کہاں پر ہے یا کہاں رکھی جائے یا فلاں پرزے کا کیا کام ہے اس کی کارکردگی میں کیا کیا موانع ہوتے ہیں یا پیدا ہونے کے امکانات ہوتے ہیں، اس لیے وہ ان کی مرمت وغیرہ کے لیے اوزار اور آلات کو تیار رکھتا ہے تاکہ بوقت ضرورت ان کی فوری اصلاح ہو سکے، اگر کسی میں کوئی نقص یا خرابی پیدا ہوتی ہے تو فوراً سمجھ جاتا ہے، فلاں پرزے میں خرابی ہے تو کیا اللہ سبحانہ وتعالیٰ جس نے یہ کائنات پیدا کی ہے۔ اس کو اس کے بارے میں علم نہیں تھا یا نہیں ہے؟ ایسی بے ہودہ بکواس کوئی جاہل ہی کر سکتا ہے کسی دوسرے میں جرأت نہیں ہو سکتی، لیکن انسان کے اندر علم اور اندازے کی ایک حد اور انتہا ہوتی ہے وہاں پہنچ کر اس کا علم اور اندازہ ختم ہو جاتا ہے مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم وسیع وعریض ہے جس کا اندازہ لگانے سے بھی انسان عاجز ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کے علم اور انسان کے علم میں یہاں فرق اور امتیازات ہیں وہاں یہ بھی ایک اہم فرق اور امتیاز

جہاں انسان کو کسی پرزے میں نقص یا خرابی پیدا ہونے کا اندازہ خرابی پیدا ہونے کے بعد ہوتا ہے، وہاں اللہ تعالیٰ کو اس کا پہلے ہی علم ہوتا ہے کہ دنیا کی فلاں چیز میں فلاں وقت یہ نقص یا خرابی پیدا ہوگی اور اس کے اسباب کا بھی پہلے ہی علم ہوتا ہے۔ اس خیر وشر کے یہ اسباب ہوتے ہیں، اس نکتہ کو خوب ذہن نشین کر لیں۔

ی: ...... جب کوئی اسکیم بنائی جاتی ہے تو اس کا نقشہ اور خاکہ ذہن میں بٹھایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسکیم تیار کرنے والوں کے ذہن میں اس کے نتائج یا اس کو عمل میں لانے سے جو اردگرد کے ماحول میں اثرات مرتب ہوتے ہیں وہاں یہ بھی ذہن میں موجود ہوتے ہیں جن کو بعد میں کاغذ پر منتقل کیا جاتا ہے، پھر اس کو عمل میں لانے کے لیے تیاریاں کی جاتی ہیں اور اس کی شروعات ہوتی ہیں، لیکن انسان کا علم محدود ہوتا ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی نتائج اس کے منصوبے کے خلاف آتے ہیں یا اندازے سے کم ہوتے ہیں یا ان کے ساتھ کئی دوسرے نتائج بھی پیدا ہو جاتے ہیں، جو اس کے ذہن میں نہیں ہوتے۔ بسا اوقات وہ پوری اسکیم فیل ہو جاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے مقرر منصوبے میں اس قسم کے نقص یا خرابی کا پیدا ہونا ناممکن ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم لامحدود ہے۔

ان دس نکات کو ذہن نشین کرنے کے بعد اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں، تقدیر کا معنی ہے اندازاً۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل میں ارادہ کیا کہ اس عالم کو تخلیق کیا جائے اس کے متعلق پروگرام اور اسکیم اس کے علم میں موجود تھی جس کی تفصیل (گذشتہ نکات کی روشنی میں) اس طرح ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ ایک ایسی دنیا وجود میں لائی جائے جس کے وجود میں آنے کے بعد ہی اس کی مخلوق کو معرفت یا پہچان حاصل ہوگی اور مخلوق کو بھی پتہ چلے گا کہ اس کا بھی کوئی ایک رب وحدہ لاشریک لہ ہے۔ جس نے اپنی پہچان اور صفات حمیدہ کے ظہور کے لیے اس دنیا کو پیدا کرنا چاہا، جس میں ایسی مخلوق پیدا کرنے کا ارادہ کیا جس کے پیدا ہونے کے بعد اللہ کی صفات کا بوجہ اتم ظہور ہوا اور وہ مخلوق ایسی ہو جو حاجت عقل واختیار ہو مجبور محض نہ ہو اپنے ارادے سے خیر وشر کی راہ لے سکے پھر

ان کو ارادے کی آزادی دے کر امتحان میں مبتلا کیا تا کہ ان تمام صفات وغرض وغایات کا ظہور ہو۔ (جن کی تفصیل نکات کے ضمن میں گزری) اس مخلوقات اور دنیا کے متعلق پورا خاکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ اس عالم میں جو مخلوق پیدا کروں گا وہ اپنے اختیار وارادے کی آزادی کے سبب لازمی طور چند بلاکوں میں بٹ جائے گی اور اس کے یہ یہ نتائج لامحالہ اٹل طور پر نکلیں گے جو ان اعمال کے نتائج ہوں گے، جس طرح مادیات کے بھی نتائج مشاہدے میں آتے ہیں یعنی کوئی اگر زہر کھاتا ہے تو ضرور مر جاتا ہے، کوئی مقوی چیز کھاتا ہے تو اس سے اس کی قوت اور طاقت ملتی ہے بعینہٖ اسی طرح اعمال کے بھی اللہ تعالیٰ نے نتائج مقرر کر دیے، اچھے کام کا نتیجہ یہ اور برے کام کا یہ نتیجہ نکلے گا اور مخلوق کو ارادے کو عمل میں لانے کی آزادی دے کر اس کی آزمائش کروں گا تا کہ اپنے اختیار سے وہ جو چاہے کر سکے اس کو مجبور محض نہیں بناؤں گا کہ وہ اپنی مرضی سے کوئی بھی کام نہ کر سکے کیونکہ یہ امتحان اور ابتلاء کے منافی ہے اور وہ جس بھی راستہ کو اختیار کرے گا اس کے اسباب بھی فراہم کیے جائیں گے۔ جو خیر کے لیے کوشاں ہوگا اس کے لیے بھی راہ ہموار ہوگی اور جو شر کی طرف مائل ہوگا اس کے لیے بھی دروازے کھلے ہوئے ہوں گے۔

﴿فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ○ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ○﴾ (اللیل: ۷، ۱۰)

کیونکہ آزمائش اس کے بغیر ناممکن ہے جس کی تفصیل نکات میں گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس دنیا کے نقشے کے مطابق یہ بھی علم تھا کہ اگر اس کی فطرت سالم پیدا ہوگی تاہم اس کو یہ اسباب سامنے آئیں گے، یہ حالات درپیش آئیں گے، ان مسائل سے دوچار ہوگا، اس کو یہ صحبت میسر ہوگی جس کا ساتھ دینے کے لیے یہ خاص امور سامنے آئیں گے، جس کی وجہ سے یہ یہ بلاک وجود میں آئیں گے ان کے اس حسن اختیار یا سوئے (برا) اختیار اور غلط انتخاب کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔

حاصل کلام کہ اس دنیا کے متعلق پورا نقشہ کہ یہ آسمان عالم کے اوپر چھت اور فرش کے لیے زمین اور باقی ضروریات کے لیے پہاڑ، دریا، باغ، باغیچے اور زمین کے اندر معدنی اشیاء

کہاں ہوں گی یا کہاں پر زیادہ ہوں گی اور روشنی کے لیے سورج اور چاند وستارے وغیرہ ہوں گے ان سب کے لیے خاص دائرہ یا جگہ یا حلقہ مقررہ ومعین ہوگا اس کرۂ ارض میں سمندر اور دریاؤں کی وراثت کس طرح ہوگی؟ خشکی کی اراضی کس طرح ہوگی؟ سورج زمین سے کتنا دور ہونا چاہیے؟ زمین پر موسموں کا اندازہ اور تقسیم ہونی چاہیے پھر ان موسمی مضر اثرات سے بچاؤ یا دوسری کائناتی نقصان کار اشیاء [illegible] لیے کیا تدابیر ہونی چاہئیں؟ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا علم واندازہ بہرحال اس بڑے [illegible] میں ضروریات کی تمام چیزیں موجود ہوں اس کے مکمل منصوبے کے بعد اس میں بارادہ مخلوق کو بسانے اور اس کے نسلی اضافے کے ان کا کرۂ ارض کے مختلف خطوں اور علاقوں میں آباد ہونا اور اس کے بعد اس کے ماحول حالات وکیفیات میں اختلاف کے سبب اسی مخلوق کے احوال واعمال کرنا، بودوباش میں اختلاف ہوگا اور جن کو جہاں خاص امور سے دوچار ہونا پڑے گا، اس کے مطابق خود کو ان حالات کے مطابق بنانے کی کوشش کرے گا، کچھ ناگزیر اسباب کی وجہ سے ان کے عقائد واعمال اخلاق وغیرہ میں اختلاف ہوگا۔ جس کی وجہ سے منافرت اور ایک دوسرے کے مقابلے بھی ہوں گے اور کئی وجوہ کی بنا پر وہ برائیوں اور بداخلاقیوں میں بھی سب گرفتار ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی حجت پوری کرنے کے لیے ان پر انبیاء بھیجے گا جو ان کو شر سے خیر کی طرف آنے کی دعوت دیں گے اور جنہوں نے ان کی بات کو مانا وہ دونوں جہانوں میں کامیاب ہوں گے اور جنہوں نے ان کی بات کو نہ مانا وہ نتیجتاً بڑے وبال سے دوچار ہوں گے یعنی اسی طرف اللہ تعالیٰ کو نہ صرف کلی یا اجمالی طرح بلکہ تفصیلی اور ہر جز کا علم تھا کہ اس آدمی کو یہ باتیں پیش آئیں گی۔ جس کی وجہ سے یہ ہدایت یافتہ ہوگا اور یہ اسباب سامنے آئیں گے جس کی بنا پر وہ گمراہ ہوگا۔ اس سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کو اس راستے پر چلایا یا خود اس سے یہ گناہ کا کام کروایا بلکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کو آزمانے کے لیے ارادہ کو عمل میں لانے کے لیے آزادی دی ہے جس کے نتیجے میں لامحالہ وہ طریقے وجود میں آنے تھے اور وجود میں آئے کہ جن کے نتائج بھی لازمی نکلنے تھے مطلب کہ اللہ تعالیٰ نے

انسان کو عمل کی آزادی دی ہے تاکہ اس کو آزمایا جائے اور انسان اس آزادی سے کوئی بھی کام لے چاہے اچھا لے یا برا۔ اپنی مرضی اور ارادے سے اللہ تعالیٰ نے اتنا کیا ہے کہ ایسا نظام قائم کردیا ہے جس سے انسانی ارادے کی آزادی بھی برقرار رہتی ہے اور آزمائش کی صورت بھی عمل میں جاتی ہے۔

فرض کریں کہ کسی آدمی کے چند نوکر یا ملازم ہوں یا چند بیٹے ہوں وہ ان نمونے اور طرز عمل سے اندازہ لگا لیتا ہے کہ فلاں خادم فرمانبردار ہے یا فلاں بیٹا فرمانبردار ہے، لیکن اگر وہ محض اپنے اندازے کے مطابق ان کے ساتھ نافرمانوں والا سلوک کرے گا تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ بابا سائیں ہمیں آزما لیتا، بغیر آزمانے کے ہمارے ساتھ یہ سلوک کرتا ہے یا یہ سزا دیتا ہے ان کی اس حجت کو ختم کرنے کے لیے ان پر کوئی کام رکھتا ہے یا ان کو کوئی ذمہ داری دیتا ہے، پھر وہ فرمانبرداری یا نافرمان اس ذمہ داری پوری کرنے یا نہ کرنے کی وجہ سے مالک یا باپ کی طرف سے مناسب سلوک یا جزا و سزا پالیں تو ان کو یہ حق کہاں ہے کہ وہ کہہ دیں ہم ایسے ہیں اس لیے اس کے علاوہ کیا بن سکتے تھے۔

کیونکہ اس آدمی کا علم ان کے طرز عمل کے سبب تھا، لہٰذا اس علم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نے ان کو مجبور کیا، اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تو تمام انسانوں کی فطرت صحیح سالم پیدا کی ہے، لیکن اس دنیا میں آنے کے بعد اس عالم کے جو اسباب اس کے سامنے آئے ہیں ان کو اپنی مرضی سے اختیار کرنے کے سبب وہ نتائج اس کے دامن میں پھنس جاتے ہیں، یہاں ہم انسانوں کو لوگوں کے طرز عمل سے اندازہ ہو جاتا ہے لیکن وہ طرز عمل کس سبب سے ہوا وہ کبھی معلوم ہو جاتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس کو یہ اسباب سامنے آئیں گے جس وجہ سے وہ اپنی آزادی کے اختیار کے مطابق اس کو اپنائے گا اور نتیجہ بھگتے گا، تو یہ آزادی آزمائش کے لیے ضروری تھی۔

دوسری مثال: ایک ماہر ڈاکٹر کسی مریض کے چیک اپ کے بعد اس کو کہہ دے کہ یہ نہیں بچے گا پھر وہ آدمی واقعتاً مرگیا تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ اس ڈاکٹر نے اس کو مار ڈالا

ہے؟ ہرگز نہیں! ڈاکٹر نے تو اس کی بیماری کی نوعیت اور کیفیت ڈگری اور درجے کے علم کے مطابق اس بات کا اظہار کیا البتہ یہ بیماری اس اسٹیج پر کیسے پہنچی یا شروع کیسے ہوئی اس کا پتہ کبھی کبھی ہوتا ہے تو کبھی کبھی نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ کو ہر انسان کی جسمانی یا روحانی بیماری کا علم ہوتا ہے اور اس کے پیدا ہونے کا بھی علم ہوتا ہے تو کیا یہ علم اعتراض جیسی بات ہے؟

بہر حال اس عالم کے اس مکمل نقشے یا خاکے کے علم اور اندازے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک کتاب میں ثبت کر دیا ہے جس کو وہ ''قرآن مبین'' یا ''امام مبین'' سے پکارتا ہے، مطلب کہ تقدیر کی معنی ہے علم یا اندازہ تو اس میں کیا خرابی ہے؟ اس سے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم اور اندازے کی وسعت معلوم ہوئی جو کہ اس کی کمال کی صفت ہے اس میں کوئی بھی خرابی نہیں ہے۔ یہاں اگر اللہ تعالیٰ یہ لکھ دیتے کہ فلاں بندے تو نے یہ کام کرنا ہے اور فلاں تو نے یہ کام کرنا ہے تو اس صورت میں کچھ بولنے کی گنجائش ہو سکتی تھی لیکن اس طرح نہیں، اس نے تو یہ لکھا ہے کہ فلاں آدمی ان وجوہات کی بنا پر اپنی آزادی سے کام لے کر یہ کام کرے گا خدارا انصاف کریں اس میں کیا خرابی ہے؟ یہ کون سی اعتراض جیسی بات ہے؟

جب کہ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کے علم حکمت، تقدیری اندازے کا بے انداز اور بے شمار ثبوت فراہم کر رہا ہے، تو انسان کے متعلق اس کے علم و اندازے کا انکار کیوں؟ یہاں پر یہ سوال بالکل فضول ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کیوں انسان کے سامنے یہ مختلف اسباب لائے ہیں جن کی وجہ سے وہ خیر اور شر کے مختلف حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں کیوں نہ ان کے سامنے ایک ہی راستہ لائے؟ اس لیے کہ اس صورت میں انسان مشینی صفت کی ایک مخلوق ہوتا اور ایک ہی راہ کو لے چلتا اور اس میں اس کے ارادے یا عمل کا کوئی دخل نہ ہوتا، اس حالت میں امتحان یا آزمائش والی بات سراسر مہمل اور بیکار ہو جاتی کہ اس کو کسی راستے اختیار کرنے کا کوئی اختیار ہی نہیں ہے اس لیے آزمائش کس چیز کی؟ بہر حال ابتلاء اور آزمائش اور کے لیے دونوں راستوں کا ہونا اور انسان کے سامنے پیش آنا اٹل اور ضروری تھا تا کہ ان میں خود جس کو چاہے اس کو اختیار کر لے، دنیا کمال حاصل کر لے یا اپنی لیاقت اور صلاحیت کو ضائع کر کے

ترقی اور فلاح کا دروازہ خود ہی بند کر دے۔ یہ حقیقت اس قدر واضح ہے جس کا انکار سوائے ضد اور عناد کے ممکن ہی نہیں ہے۔ یہاں پر یہ سوال بھی قابل دریافت ہے کہ تقدیر کے متعلق سوالات ملحد (اللہ تعالیٰ کے وجود انکاری) ان کی طرف سے پیش ہوئے ہیں یا کسی مسلمان جاہل کی طرف سے، اگر پہلی شق ہے تو درحقیقت ان سوالات کے جوابات دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تقدیر یا علم واندازہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفت ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کے وجود ہی کا منکر ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفت کے بارے میں بحث کرنا سراسر بیکار اور فضول ہے، بحث ومناظرے کے طریقے کے بھی برخلاف ہے تو وقت کا بھی ضیاع ہے۔

صفت کسی ذات کی فرع ہوتی ہے، جب کوئی ذات کو ہی نہیں مانتا تو اس کی صفت یا خوبی اور کمال پر بحث کرنا یا اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے چھان بین کرنا سراسر غیر معقول ہے۔ ان حضرات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں بحث کرتے ہوئے دلائل پیش کرنے چاہئیں۔ پھر جب وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے دل سے اقراری بنے تو پھر صفات کے متعلق تحقیق ہونی چاہیے اور حق کو معلوم کرنا چاہیے۔ یہ حضرات تو اللہ تعالیٰ کے وجود کے ہی منکر ہیں۔ باقی ایسے سوالات صرف لوگوں کو سمجھانے کی خاطر کرتے رہتے ہیں یہ طریقہ کار درست نہیں ہے اس طرح حق واضح نہیں ہوگا۔

لیکن اگر یہ سوال کسی جاہل مسلمان کی طرف سے ہے تو اس کو حکمت موعظہ حسنہ اور نرم وشریں الفاظ میں پوری حقیقت سمجھانی چاہیے کہ ''بھائی تقدیر کا معنیٰ ہے اللہ تعالیٰ کا اندازہ یا علم، لہٰذا اگر قائل نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارا معبود اللہ سبحانہ وتعالیٰ جس نے اس پوری کائنات کو پیدا کیا اور کائنات کے ذرے ذرے میں بے شمار حکمتیں رکھیں جس کے قلیل انداز کو اہل علم وسائنس روز بروز کائنات کے مظاہر سے اخذ اور استنباط کرتے رہتے ہیں۔ یہ معبود (معاذ اللہ) کوئی جاہل معبود ہے جس کو کوئی پتہ ہی نہیں ہے کہ اس کی پیدا کردہ مخلوق کیا کام کر رہی ہے یا کرے گی، یعنی نعوذ باللہ اس نے صرف اس مخلوق کو پیدا کر دیا باقی اس کو یہ پتہ نہیں تھا کہ اس میں صلاحیتیں اور لیاقتیں ہیں اور ان استعداد کے موجب ان سے کون سے

کام صادر ہوں گے، حالانکہ کوئی بھی انسان کوئی چیز یا مشین وغیرہ ایجاد کرتا ہے تو اس کو یہ بھی پتہ ہوتا ہے کہ یہ چیز کس کام کی ہے اس سے کیا فائدے اور کیا نقصانات ہوں گے، مگر اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ نہایت بدترین اور گھٹیا تصور ہے کہ اس کو کوئی پتہ ہی نہ تھا۔ (فیاللعجب)

اس تھوڑی سی حقیقت پر نظر ڈالو گے تو زیادہ الجھن اور خسارے سے بچاؤ ہو جائے گا۔

اس سوال کا جواب زیادہ لمبا ہو گیا ہے، لیکن کیا کریں میرے خیال اتنی تفصیل میں جائے بغیر سوال کا جواب شاید سمجھ میں نہ آتا۔ بہرکیف سوال کا جواب آپ کے سامنے ہے اگر ٹھیک ہے، تو یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مہربانی ہے جس نے مجھے اس کا علم دیا اور اس کے لکھنے کی توفیق دی اور اگر خدانخواستہ صحیح نہیں ہے تو یہ میرے نفس کی نادانی اور قلم کی کمزوری ہے۔ (اللھم اھدنا الصراط المستقیم)

کیا جہنم خالی کردی جائے گی؟

سوال: **ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بڑی وسیع ہے اور شفاعت بھی لازمی امر ہے اور بالآخر اللہ تعالیٰ اپنے رحم وکرم کے ساتھ جنت کو بھر کر جہنم کو خالی فرمادے گا اور جہنم کو بند کر دیا جائے گا نیز قیامت کے دن شرابی اور زانی وغیرہ کی شفاعت بھی ہوگی کیا یہ بات درست ہے؟**

الجواب بعون الوهاب: جہنم کے متعلق سلف وخلف کا اختلاف ہے کہ وہ ہمیشہ رہے گی یا بالآخر ختم ہو جائے گی یعنی بہت طویل عرصہ کے بعد بالآخر بند کر دی جائے گی اور پھر سب کے سب جنت میں چلے جائیں گے لیکن کتاب وسنت کے نصوص سے اس بندہ حقیر راقم الحروف کو یہی بات اور ان علماء کا موقف صحیح نظر آتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جہنم بھی ہمیشہ رہے گی ویسے اللہ تعالیٰ مالک ہے اگر کافر کو بھی معاف کر دے تو ہمیں پوچھنے کا کوئی حق نہیں وہ مالک العلام ہے اور حکیم وحلیم ہے اس کا کوئی بھی حکم حکمتوں سے خالی نہیں ہمیں کیا حق حاصل ہے کہ اس کے کسی کام پر صرف کوئی سوال ہی کریں مگر احادیث وآیات یہی بتاتی ہیں کہ کافر

لوگ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے یعنی ان کا خروج کبھی نہیں ہوگا۔ باقی سورۂ ہود کی اس آیت سے جو استدلال کرتے ہیں یعنی:

﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ (هود: ١٠٦، ١٠٧)

یعنی جہنمیوں کا جہنم میں رہنا آسمانوں اور زمینوں کے باقی رہنے تک بیان کیا گیا ہے تو جب آسمان وزمین فانی ہیں لہٰذا جہنم بھی فانی ہے یعنی ان کے بقول جتنا وقت آسمان وزمین اس میں رہے ہوں گے اتنا وقت وہ جہنمی جہنم میں رہیں گے پھر اس طویل عرصہ کے بعد جہنم بھی ختم ہو جائے گی اور جہنمی اس سے نکل جائیں گے لیکن یہ استدلال اس لیے درست نہیں کہ ان آسمانوں اور زمینوں سے مراد آخرت والے آسمان وزمینیں ہیں نہ کہ اس دنیا والے کیونکہ سورۂ ابراہیم میں اللہ کا فرمان ہے کہ:

﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ﴾ (ابراهيم: ٤٨)

''یعنی قیامت کے دن آسمان اور زمینیں دوسری شکل وصورت اختیار کریں گے۔''

ظاہر ہے کہ آسمان وزمین نہ دنیا کے ہیں اور نہ ہی آخرت کے کیونکہ آخرت والے آسمان اور زمینیں باقی رہیں گے تب تک وہ جہنم میں رہیں گے اس کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہوا کہ نہ ہی آخرت والے زمین وآسمان فنا ہوں گے اور نہ ہی جہنمی جہنم سے نکلیں گے لہٰذا اس آیت میں جہنم کے فنا ہونے کا کوئی بھی دلیل نہیں باقی ''الا ماشاء ربك'' کے الفاظ تو اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے آئے ہیں کہ کوئی ناسمجھ یہ نہ سمجھے کہ آخرت کی اشیاء کو بقاء اس لیے حاصل ہے کہ ان کے فنا پر اللہ تعالیٰ کو قدرت حاصل نہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ غلط فہمی اس طرح دور فرمائی کہ آخرت کے عالم اور اس میں جو کچھ ہے اسے بقاء اس لیے حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح چاہا ہے ورنہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو آخرت کے عالم کو بھی فنا کر دیتا یعنی اس میں غیر محدود قدرت کا اظہار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہی اہل جنت کے لیے بھی

وارد ہوئے ہیں۔یعنی

﴿وَ اَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ﴾ (هود: ۱۰۸)

یعنی جہنم خواہ جنت کا بقاء اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے اگر چاہے تو ان کو بھی فنا کر سکتا ہے مگر فنا نہ ہوں کیونکہ دوسرے مقامات پر رب تعالیٰ نے اپنی اٹل مشیت بیان فرمادی ہے کہ وہ فنا نہ ہوں گے اور جنتی خواہ جہنمی ان میں ہمیشہ رہیں گے اسی طرح سورۃ انعام میں بھی یہ الفاظ ہیں:

﴿قَالَ النَّارُ مَثْوٰكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ﴾ (الانعام: ۱۲۸)

اس کے متعلق بھی وہی گذارش پیش کی جا سکتی ہے۔ بہرحال جہنم کی فناء پر کوئی قاطع دلیل نہیں بلکہ خلود ودوام کی طرف مشیر دلائل موجود ہیں اگر ان پر کوئی قناعت نہیں کرتا تو زیادہ سے زیادہ اس کے متعلق توقف کرے یہ سمجھے کہ جیسا اللہ تعالیٰ نے چاہا ویسے ہی ہوگا ہمیں کیا مجال کہ اس کی مرضی میں دخل اندازی کریں۔ باقی اس یقین کے لیے کوئی ٹھوس دلیل نہیں کہ یقیناً جہنم فنا ہوگی باقی شفاعت کے لازی امر ہونے کا مطلب اگر یہ ہے کہ آخرت میں شفاعت واقع ہوگی تو یہ بات درست ہے مگر اللہ تعالیٰ کی اجازت سے:

﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ (البقرة: ۲۵۵)

اور وہ بھی ان کے لیے جو کافر ومشرک نہیں ہیں مشرکین اور کفار کے لیے کوئی شفارش نہیں کرے گا اور اگر شفاعت کے لازمی امر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے اوپر یہ کام لازم ہے کہ جو بھی شفاعت کرے اللہ تعالیٰ اسے رد نہ کر سکے تو یہ معنی قطعاً غلط ہے رب تعالیٰ کے اوپر کوئی بھی زدر یا جبر نہیں کرسکتا وہ خود صاحب اختیار ہے بندوں کو کیا مجال ہے کہ اس سے انسانوں کی طرح زبردستی کرسکیں اس طرح کی بات قطعاً غلط ہے باقی رہا یہ مسئلہ کہ جہنم سے زانی، شرابی اور بے نمازی نکلیں گے یا نہیں ان کی شفاعت ہوگی یا نہیں یہ مسئلہ تفصیل

طلب ہے یہاں پر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اپنی سمجھ کے مطابق اس پر کچھ روشنی ڈالتا ہوں۔ پھر اگر وہ صواب ہوئی تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے ورنہ اگر کوئی خطا واقع ہوئی تو "فمني ومن نفسي" معلوم ہونا چاہئے کہ زانی وشرابی کے متعلق مختلف احادیث مروی ہیں اور ہیں بھی وہ سب کی سب صحیح کچھ میں یہ بیان ہوا ہے:

((ولا يزني الزاني حين يزني وهو مؤمن ولا يشرب الخمر حين يشرب وهو مؤمن.)) [1]

نیز دیگر احادیث میں ہے کہ آخری نجات پانے والا شخص موحد ہوگا اور یہ صراحت بیان ہوئی ہے کہ وہ بالآخر جنت میں داخل ہوگا اور یہ صراحت بیان ہوئی ہے کہ وہ بالآخر جنت میں داخل ہوگا:

((وان زنی وان سرق.))

یعنی اگرچہ اس نے زنا کیا ہو یا چوری کی ہو۔ اور سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ (جو اس حدیث کے راوی ہیں) کے تین مرتبہ پوچھنے پر کہ "وان زنی وان سرق" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں مرتبہ جواب دیا "وان زنیٰ وان سرق" ایسی مختلف فیہ احادیث کے متعلق محدثین رحمہم اللہ کا یہ اصول ہے کہ اگر ان دونوں احادیث میں جمع وتطبیق ممکن ہو تو ان دونوں میں جمع وتطبیق پیش کی جائے گی۔ لہٰذا ان دونوں قسم کی احادیث میں جمع اس طرح کی جائے گی "اس تطبیق کی مؤید دیگر احادیث بھی ہیں جو بالکل صحیح ہیں۔" کہ جن احادیث میں یہ بیان ہے کہ زانی اور شرابی یا چور مومن نہیں، ان کا مطلب ہے کہ کامل مؤمن نہیں اور جن میں ان کی نجات کا ذکر ہے اور جنتی ہونے کا بیان ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ ابتداءً اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف نہ فرمایا تو بالآخر گناہوں کی سزا پا کر بعد میں جہنم سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہو جائیں گے جیسا کہ کئی صحیح احادیث میں بیان ہوا ہے کہ کچھ کو اللہ تعالیٰ ویسے ہی معاف فرما دے گا (گناہوں کی سزا پانے کے بغیر ہی) تو کچھ کو سزا بھی ملے گی اس کے بعد کچھ شفاعت کے ساتھ اور کچھ

---

[1] صحيح بخاري: كتاب المظالم، باب النهبیٰ بغير اذن صاحب، رقم الحديث، ٢٤٧٥.

ویسے ہی سزا پانے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جہنم سے نکلیں گے۔

علاوہ ازیں اس مطلب کی صحیح حدیث مؤید ہے جو سیدنا عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری وغیرہ میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھ سے شرک نہ کرنے زنا نہ کرنے چوری نہ کرنے وغیرہا وغیرہا پر بیعت کرو، پھر اگر جو شخص اپنی بیعت پر قائم رہا اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے لیکن اگر کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا یعنی ایسا کام کیا کہ حد کو پہنچ گیا (مثلاً چوری، زنا) پھر اس کے متعلق دنیا میں معلوم ہو جانے پر اس پر حد جاری ہو گئی تو وہ گناہ اس سے اتر گیا یعنی حد اس کے لیے کفارہ بن گئی۔ (اس سے ظاہر ہے کہ چور یا زانی بے ایمان نہیں ہے بلکہ گنہگار ہے کیونکہ حد تو مسلمان پر ہی نافذ ہوتی ہے اور اس کے لیے ہی کفارہ بن سکتی ہے نہ کہ کافر کے لیے اور اس سے بھی زیادہ صریح اس حدیث کا اگلا حصہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ" اور اگر وہ گناہ اس سے سرزد ہو گئے مگر اللہ تعالیٰ نے اسے چھپایا یعنی اس پر حد نافذ نہ ہوئی تو پھر وہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اگر چاہے تو اسے معاف کر دے اور چاہے تو اسے سزا دے۔ اس سے واضح ہوا کہ زانی یا چور بے ایمان نہیں ہے کیونکہ بے ایمان (کافر) کی مغفرت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا حالانکہ یہ صحیح حدیث بتاتی ہے کہ اس کی مغفرت اللہ تعالیٰ مشیت مبارک پر منحصر ہے، یعنی اگر چاہے اسے معاف کر دے اگر چاہے اسے سزا دے اور حدیث کا سیاق وسباق خود اس بات پر دال ہے کہ وہ سزا پا کر مغفرت سے مشرف ہوگا کیونکہ وہ صرف ایک گناہ ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں ہے کہ یہ کبیرہ گناہ ہیں جن کا مرتکب جہنم کا بھی مستحق ہے۔ بہرحال گناہ ہی کفر یا بے ایمانی نہیں" ہاں جو شخص ان گناہوں کو حلال سمجھے تو وہ بلاشک کافر ہے۔" اور بیشمار احادیث میں یہ بیان ہوا ہے کہ جن گناہوں کی وجہ کوئی شخص جہنم میں داخل ہوگا وہ بالآخر سزا پا کر پھر اس سے شفاعت کی وجہ سے یا پھر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے باہر نکل آئے گا اور امت اہل سنت کا" خوارج اور معتزلہ" کے علاوہ اس پر اجماع ہے کہ کبیرہ کا مرتکب ایسا کافر نہیں کہ اس کا جہنم سے نکلنا نہ ہو سکے اگرچہ کچھ مقامات پر ایسے گناہوں پر کفر کے لفظ کا اطلاق ہوا ہے لیکن اس سے

محدثین رحمہم اللہ مثلاً امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کفر دون کفر مراد لیتے ہیں نہ کہ وہ کفر جو ایمان کے مدمقابل ہے جیسا کہ حدیث شریف میں کفر کا اطلاق احسان فراموشی پر کیا گیا ہے ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم جہنم میں زیادہ تعداد میں جاؤ گی انہوں نے سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ "تکفرن"تم کفر کرتی ہوانہوں پھر دریافت کیا کہ کیا ہم اللہ سے کفر کرتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مردوں یعنی اپنے شوہروں کی احسان فراموشی کرتی ہو۔ اب دیکھیں اس مقام پر آپ نے مطلق کفر کا لفظ ارشاد فرمایا لیکن پھر پوچھنے کے بعد فرمایا کہ اس سے مراد کفر اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہیں ہے اسی طرح بھگوڑے غلام پر بھی کافر کے لفظ کا اطلاق ہوا ہے۔(صحیح مسلم)

حالانکہ غلام کا بھاگ جانا گناہ اپنی جگہ پر ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر تو نہیں اسی طرح صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ:

((سباب المسلم فسوق وقتاله كفر.))

"مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس کے ساتھ قتال (لڑنا) کفر ہے۔"

حالانکہ قرآن حکیم نے مسلمانوں میں سے دو جماعتوں کو مؤمن کے لفظ سے ملقب کیا ہے:

﴿وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾

(الحجرات : ٩)

یعنی قتال کی وجہ سے مومن سے ایمان خارج نہیں ہو جاتا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "مؤمن سے قتال کفر ہے۔" کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ کام کفریہ ہے یا کفر دون کفر ہے جس طرح اعمال صالحہ ایمان کے حصے ہیں مگر بعض اعمال کی اہمیت بتانے کے لیے ان پر ایمان کا اطلاق ہوتا ہے یا مثلاً سورۃ الفاتحہ کی اہمیت کی خاطر حدیث شریف میں اسے صلاۃ کہا گیا ہے حالانکہ صرف سورۃ الفاتحہ ہی تو نماز نہیں بلکہ اس کے علاوہ، قیام، رکوع، سجدہ وغیرہا اس کے ارکان ہیں اسی طرح گناہ بھی کفر کے اجزاء ہیں لہٰذا ان کے اوپر بسا اوقات کفر کا اطلاق ہوتا ہے تو پھر صرف اسی ایک جگہ پر وارد لفظ کفر کو دیکھ کر اور دیگر تمام دلائل کو نظر انداز کر دیا جائے

یا دیگر جملہ احادیث صحیحہ کو ترک کر کے اس کے مرتکب کو کافر قرار دے دیا جائے بلکہ اسے کافر کہنا نہایت خطرناک ہے کیونکہ یہ بھی تو آپ ﷺ کا ہی ارشاد ہے کہ:

((ایما امرئٍ قال لاخیه یا کافر فقد باء بها احدهما ان کان کما قال والا رجعت علیه)) [1]

''یعنی جو شخص اپنے بھائی کو کافر کے لقب سے پکارتا ہے تو پھر ان دونوں میں سے ایک ضرور کافر ہوگا۔''

اس کی صورت اس طرح ہے کہ مثلاً کوئی شخص کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور دوسرا شخص اسے دیکھ کر کافر کہہ دیتا ہے یا ویسے ہی اسے کافر کہہ کر پکارا تو اب اگر واقعتاً وہ کفر کا مرتکب ہوا ہے تو وہی کافر رہے گا ورنہ کہنے والا کافر بن جائے گا۔

آپ ﷺ نے فرمایا ''لاخیه'' یعنی اپنے بھائی کو یہ لفظ بتاتا ہے کہ وہ جس کو کافر کے لقب سے پکار رہا ہے وہ مسلمان ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس حدیث میں جو کفر کا لفظ استعمال ہے وہ اس لیے کہ اس کہنے والے نے اس کے متعلق کافر کا لفظ بولا ہے جسے مسلمان سمجھ کر پھر بھی کافر کہہ دیا تب کافر ہو گیا یعنی اس طرح کہنا بھی غلط ہے کیونکہ اس صورت میں آپ یہ نہ فرماتے کہ ''فقد باء بها احدهما'' بلکہ اس طرح فرماتے کہ ''فقد باء بها قائله'' مگر اس جگہ پر دونوں میں سے لاعلی التعیین کفر میں مبتلا ہونے والا کہا گیا ہے وہ اس لیے کہ ایسی صورت ہو کہ جسے کافر کہا گیا ہے اس سے کوئی ایسا گناہ صادر ہو گیا ہو یا اس نے ایسا نمونہ اختیار کیا ہو کہ اسے دیکھ کر دوسرا شخص اس کو کافر کہہ دے پھر اس صورت میں اگر واقعتاً اس نے وہ گناہ سمجھ کر کیا یا العیاذ باللہ مرتد ہو گیا ہے تو کافر کا اطلاق کرنے والا چھوٹ جائے گا اور وہ ویسے کافر رہے گا مگر اگر معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی وہ گناہ کا مستعمل نہیں اور نہ ہی نعوذ باللہ مرتد ہوا ہے تو پھر قائل اپنا خیر طلب کرے، اس حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے

---

[1] صحيح مسلم: كتاب الايمان ، باب بيان حال ايمان من قال لاخيه المسلم يا كافر ، رقم الحديث ، ٢١٥ .

کہ مسلمان کو ایسی فتویٰ بازی میں سخت احتیاط برتنی چاہیے اور جلد بازی سے ہرگز ہرگز کام نہ لے کیونکہ معاملہ نہایت خطرناک ہے اگر ہم کسی شخص کو مسلمان جاننے میں غلطی کے مرتکب ہوئے اور ہم نے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے اس پر کفر کی فتویٰ تھوپ دیا اور اس کے ساتھ کفار کا معاملہ اختیار کیا تو اس سے سخت خطرہ درپیش ہے اور وہ حکم الٹا ہمارے اوپر "العیاذ باللہ" آجائے گا۔

علاوہ ازیں خود قرآن میں سورۂ نساء میں دو جگہوں پر تصریح وارد ہوئی ہے کہ شرک کے علاوہ دیگر تمام گناہ اللہ تعالیٰ مشیت پر منحصر ہیں اگر چاہے معاف کردے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهِ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾

(النساء: ٤٨)

"بے شک اللہ تعالیٰ نہیں معاف کرے گا یہ کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اس کے علاوہ جسے چاہے معاف کردے۔"

نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ مغفرت یا عدم مغفرت آخرت سے متعلق ہے نہ کہ دنیا سے متعلق کیونکہ دنیا میں تو (یعنی زندگی میں) اگر ایک مشرک بھی توبہ تائب ہو کر اور صدق دل سے مسلمان ہو جائے تو اس کی مغفرت ہو جائے گی۔ مطلب کہ یہ آیت کریمہ بتا رہی ہے کہ آخرت میں شرک کے علاوہ دیگر گناہ اللہ تعالیٰ اگر معاف کرنا چاہیں تو معاف کر سکتے ہیں اور اس کی مؤید وہ حدیث بھی ہے جو ترمذی شریف میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس پر امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن صحیح کا حکم لگایا ہے اس میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں:

((یا ابن آدم انك لو اتیتنی بقراب الارض خطایا ثم لقیتنی لا تشرك بی شیئا لا تیتك بقرابها مغفرة .))

اس حدیث میں تصریح ہے کہ یہ دیگر تمام گناہوں کی مغفرت (شرک کے علاوہ) والی بات آخرت کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ مغفرت انہیں حاصل ہوگی جنہوں نے بالفعل دنیا میں توبہ نہیں کی ہوگی کیونکہ اگر انہوں نے دنیا میں صدق دل سے توبہ

کی ہوگی تو ان کی مغفرت تو دنیا میں ہی ہوگئی کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو بھی صدق دل سے توبہ کرے گا میں اسے معاف کردوں گا مگر جو اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر گناہ ہوں گے اور وہ وہ گناہ ہوں گے جن کی وہ توبہ نہ کرسکا ہوگا۔

خلاصہ کلام! جب سارے گناہ شرک کے علاوہ اللہ تعالیٰ چاہے تو معاف کرسکتا ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ ان گناہوں کے مرتکبین کافر نہیں ہوئے تھے کیونکہ کافر کی مغفرت آخرت میں نہیں ہوگی، پھر جب وہ کافر ہی نہ رہا جہنم میں 'یعنی جب اللہ تعالیٰ اسے اپنے گناہوں کے سبب جہنم میں بھیج دے۔'' ہمیشہ نہیں رہے گا بلکہ مقدر سزا کے بعد بالآخر جہنم سے نکلے گا کیونکہ ابدی خلود کفار کے لیے ہے اگرچہ کتاب وسنت میں کچھ گنہگاروں کی سزا جہنم سے نکلنے کا ذکر بھی ہے اور یہ سب احادیث صحیح ہیں الغرض زانی اور شراب نوش وغیرہما اگر ابتداءً اللہ تعالیٰ کی مغفرت ان کے نصیب میں نہ آسکی تو بھی سزا پاکر بالآخر جہنم سے نکلیں گے باقی رہا بے نمازی تو اس کے متعلق امت میں بہت اختلاف ہے خود جماعت اہلحدیث کے اکابرین میں بھی اختلاف ہے کچھ مولانا حصاروی جیسے تو اسے کافر بے ایمان اور دوزخ میں ابدی خلود کا مستحق قرار دیتے ہیں اور کچھ بزرگ اسے ایسا کافر قرار نہیں دیتے بلکہ اس کے متعلق جو کفر کے الفاظ کا اطلاق ہوا ہے ان سے کفر دون کفر مراد لیتے ہیں۔ اس راقم الحروف بندہ عیب دار گنہگار کے ذہن میں ان دونوں صورتوں کے علاوہ ایک اور صورت آئی ہے۔

بہرحال یہاں پر میں وہ تفصیل کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں بغور ملاحظہ فرمائیں!

اگر صحیح نظر آئے تو فبہا ورنہ جو بات زیادہ صحیح ودرست ہو اسے اختیار کیجئے۔ ''اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه .''

پہلے یہ حقیقت ذہن نشین کرنی چاہیے کہ کچھ باتوں میں شریعت مطہرہ دنیا وآخرت کے معاملات میں فرق کیا ہے۔ مثلاً کوئی شخص ہے جو اگرچہ مؤمن ہے مگر کفار اسے زبردستی باندھ کر مسلمانوں کے مقابلہ میں لے کر آئے ہیں (یعنی مسلمانوں اور کفار کے درمیان جنگ جاری ہو اور کفار نے ایک مسلمان کو زبردستی لاکر مسلمانوں کے مقابلہ میں لاکھڑا کردیا۔) تو

اس صورت میں وہ جبراً لایا ہوا مسلمان عند اللہ اگرچہ مسلمان ومؤمن ہے مگر اس بات کا علم مسلمانوں (جنگ میں شریک) کو نہیں آخر اتفاقاً وہ مسلمان جو جبراً کفار کے ساتھ ہے مسلمانوں کے زد میں آجاتا ہے۔ اور اس مسلمان کے متعلق دیگر مسلمان اس کو جو بظاہر کافر معلوم ہو رہا ہے چوٹ لگا کر مار دیتے ہیں تو اس صورت میں مسلمانوں کے اوپر کوئی گناہ نہیں کیونکہ انہوں نے اس کو مسلمان نہیں بلکہ کافر سمجھ کر مارا ہے یعنی دنیا میں تو وہ اس حالت کی وجہ سے کافر سمجھا گیا اور اس کے اوپر کفار کے احکام جاری ہو گئے لیکن آخرت میں اس کا معاملہ بالکل برعکس ہے یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ علم تھا کہ وہ مسلمان ہے مگر مجبوراً ظلم کی وجہ سے کفار کے ساتھ شامل ہو گیا ہے اس لیے رب کریم اس کا ایمان واسلام ضائع نہیں فرمائے گا۔

اور وہ جنت میں داخل ہو گا کیونکہ آخرت میں ہر کسی کے ساتھ وہی معاملہ ہو گا جس کا وہ ظاہراً وباطناً اور حقیقتاً واقعتاً مستحق ہے صرف ظاہر ہی پر فیصلہ نہ ہو گا اور چونکہ وہ مسلمان دنیا میں سچا ومخلص مؤمن تھا لیکن اس کا ایمان مجبوراً اور ظلم کی وجہ سے ظاہر نہ ہو سکا لیکن اس کا ایمان اس مالک العلام ذات سے تو مخفی نہ تھا جو عالم الغیب والشہادۃ ہے اور علیم بذات الصدور ہے بہرحال وہ مسلمان ظاہراً تو کفار کے ساتھ ہونے کی وجہ کافر سمجھا گیا اور اس پر انہی کے احکام لاگو ہوئے لیکن آخرت میں اس کی کیفیت ظاہر ہو جائے گی اور وہ اس سچے ایمان کی بدولت جنت میں داخل ہو گا۔

دوسری مثال حدیث شریف میں وارد ہوئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا آخری زمانہ میں ایک لشکر کعبۃ اللہ شریف کو شہید کرنے کے لیے آئے گا پھر جب وہ قریب ہوں گے تو سارے کے سارے زمین میں دھنس جائیں گے تب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (جو اس حدیث کی راویہ ہیں) نے عرض کیا اے اللہ کے رسول سب کے سب کیونکر دھنس جائیں گے حالانکہ ان میں کچھ تو واقعتاً کعبۃ اللہ شریف کو شہید کرنے کی نیت سے آئے ہوں گے مگر کچھ تو مجبوری کی وجہ سے یا کرایہ پر آئے ہوں گے یا راستے میں اتفاقاً مل گئے ہوں گے پھر سب کے ساتھ یہی معاملہ (زمین میں دھنس جانا) کس طرح ہو گا آپ ﷺ نے جواباً فرمایا فی الحال تو سب کے

سب زمین میں دھنس جائیں گے مگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی نیت کے مطابق اٹھائے گا یعنی جس کی نیت بری ہوگی وہ وہاں بھی سزا پائے گا یعنی کفار کے ساتھ جا کر ملے گا باقی جن کی یہ نیت نہ ہوگی وہ بری نیت لے کر آئے ہی نہیں ہوں گے تو ان کے ساتھ یہ معاملہ نہ ہوگا بلکہ اخروی عذاب سے نجات پائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں جو احکامات کچھ معاملات میں انسانوں پر جاری ہوتے ہیں۔ آخرت میں ان معاملات کے احکامات دنیا سے بالکل مختلف ہوں گے کیونکہ وہاں تو فیصلہ صحیح اور اصل واقعہ کے مطابق ہوں گے اور دنیا میں صرف ظاہر پر ہی حکم لگایا جاتا ہے اس سے یہ بھی سمجھ میں آیا کہ جب کسی عذاب یا کسی معاملہ میں ایک پوری جماعت (دنیا میں) گرفتار ہوئی تو اس سے یہی اندازہ لگانا صحیح نہیں ہوگا کہ وہ عذاب میں مبتلا انسان سارے کے سارے مجرم تھے بلکہ ممکن ہے ان میں سے کچھ ان گناہوں کے مرتکب نہ ہوں اگرچہ ظاہراً یہی اندازہ لگایا جائے گا کہ وہ سب ایک ہی بات میں یعنی سب کے سب مجرم ہیں جیسا کہ کعبۃ اللہ شریف کو شہید کرنے والے جب غرق ہوئے تو دیکھنے والے یہی اندازہ لگائیں گے کہ وہ سب نیت بد سے آئے تھے سب کے سب بے ایمان تھے۔

حالانکہ ارشاد گرامی کے مطابق آخرت میں ان کے درمیان تفریق کی جائے گی کیونکہ آخرت میں اصل معاملہ اپنی اصلی اور صحیح صورت میں جا کر ظاہر ہوگا جو کہ دنیا میں اہل دنیا سے اوجھل تھا۔ اسی طرح منافقین کا معاملہ بھی یہی ہے یعنی مسلمان انہیں مسلمانوں والے کام کرتے دیکھ کر مسلمان سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا سلوک اور اسی طرح کا معاملہ کرتے ہیں لیکن آخرت میں وہ منافقین مسلمانوں سے قطعی طور پر الگ ہو جائیں گے

جس طرح سورۃ حدید میں ارشاد ہے:

﴿يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَهُ بَابٌ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ

قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝ يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُن مَّعَكُمْ قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنَّكُمْ فَتَنتُمْ أَنفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَغَرَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ﴾ (الحدید: ۱۳، ۱۴)

حالانکہ دنیا میں مسلمانوں نے انہیں مسلمان سمجھ کر ان کے ساتھ وہی مسلمانوں والا سلوک اختیار کیا خود سیدنا و امامنا محمد رسول اللہ ﷺ سے رب کریم نے فرمایا کہ:

﴿وَمِمَّنْ حَوْلَكُم مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ ۖ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾ (التوبة: ۱۰۱)

''اور تمھارے گردو پیش جو دیہاتی ہیں (ان میں) منافق ہیں اور مدینہ والوں میں سے بھی جو نفاق پر اڑے ہوئے ہیں آپ انھیں نہیں جانتے ہم انھیں جانتے ہیں۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ کچھ منافقین ایسے بھی تھے جو سب کام مسلمانوں جیسے کرتے تھے نمازیں بھی پڑھتے تھے اور دیگر کام بھی کرتے تھے اس لیے خود اللہ تعالیٰ کے رسول اللہ ﷺ بھی انہیں پہچان نہ سکے صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ان کے نفاق کا علم تھا۔ اسی وجہ سے وہ دنیا میں مسلمان بنے رہے اور اہل دنیا نے ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیا انہیں رشتے دیے ان پر نماز جنازہ ادا کی، ان کو مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن کیا گیا کہ لیکن آگے چل کر وہ مسلمانوں سے بالکل الگ ہو جائیں گے اور اسی لیے مومنین سے کہیں گے کہ ہماری طرف دیکھیں تاکہ ہم تمہاری روشنی سے کچھ حصہ حاصل کریں اس طویل کلام کا مطلب یہ ہے کہ کچھ معاملات میں خصوصاً ایمانی اور قلبی حالات کے معاملات میں دنیا اور آخرت میں فرق کیا گیا ہے یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک شخص کو ہم سچا مومن سمجھیں اور واقعتاً وہ سچا مومن ہی ہو بلکہ ممکن ہے کہ وہ آخرت میں چل کر اپنی چھپی ہوئی منافقت کی وجہ مومنین سے الگ کفار کے ساتھ جا کر مل جائے بلکہ ان سے بھی نچلے طبقے میں:

﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَن تَجِدَ لَهُمْ

نَصِيرًا﴾ (النساء: ١٤٥)

''بے شک منافق جہنم کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور نہ کوئی آپ ان کا مددگار پائیں گے۔''

اور جسے ہم کافر سمجھیں اس کے متعلق یہ ضروری نہیں کہ وہ واقعتاً کافر ہو بلکہ ممکن ہے آخرت میں اس کا شمار مومنین کاملین میں ہو اور جنت میں اعلیٰ درجہ پر فائز ہو جائے یہ سب اس لیے ہے کہ انسانوں کو صرف ظاہر پر چلنے کا مکلّف بنایا گیا ہے ہم (یعنی انسان) صرف ظاہر پر فیصلہ کرنے اور اس کے مطابق احکام لاگو کرنے کے مجاز ہیں اندرونی معاملہ اس کا کیا ہے؟ اس کے متعلق ہمیں شریعت نے کسی بھی تکلیف کا پابند نہیں بنایا کیونکہ اس طرح کے معاملات ہم نہیں جان سکتے اور نہ ہی کوئی ایسا کوئی وسیلہ وذریعہ یا آلہ ہمیں ملا ہوا ہے جس کے ذریعہ کسی کے اندرونی کیفیت معلوم کرسکیں اندر کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے یہ اللہ جل وعلا کی ہی خصوصی صفت ہے جس میں اس کا کوئی بھی شریک وسہیم نہیں حتیٰ کہ ملک مقرب اور نبی مرسل بھی نہیں، اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب اصل مسئلہ کو لیا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ترک نماز نہایت کبیرہ گناہ ہے اور انسان کو جہنم کا مستحق بناتا ہے اور انسان اللہ کے نزدیک سخت مغضوب بن جاتا ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کام (ترک نماز) پر صحیح احادیث میں کفر کا اطلاق ہوا ہے لیکن ان کے علاوہ کئی دیگر احادیث میں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ (اور وہ احادیث سنداً ومتناً بالکل صحیح ہیں) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا کہ جاؤ اور جا کر جہنم سے ایسے لوگوں کو نکال لاؤ جن کی دل میں سے گندم کے دانے کے برابر ایمان ہو، جس کے دل میں جو کے دانے کے برابر ایمان ہو جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان ہو جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہو اور کچھ دیگر احادیث میں یہ بھی ہے کہ آخر ایسے انسانوں کو بھی جہنم سے نکالنے کا حکم ہوگا جنہوں نے کبھی بھی نیک عمل نہیں کیا ہوگا صرف ایمان کا ذرہ ہوگا جس کی وجہ سے اسے جہنم سے نکالا جائے گا باقی وہی جا کر رہیں گے جنہیں کتاب اللہ نے (جہنم سے نکلنے سے) روکا ہوگا یعنی مشرکین وکفار باقی

سب بالآخر نکالے جائیں گے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ترک نماز اگر واقعتاً ایسا کفر ہے جس کے لیے ابدی خلود فی جہنم ہے تو مذکورہ جہنمیوں کو کیونکر جہنم سے نکالا گیا؟ کیونکہ بے نمازی بھی قطعاً ان میں داخل ہیں اس لیے کہ نماز بھی ایک عمل ہے حالانکہ حدیث میں صراحتاً مذکور ہے جیسا کہ عرض کیا گیا کہ انہوں نے کوئی بھی نیک کام نہیں کیا ہوگا کیا نماز سے بڑھ کر بھی کوئی نیک عمل ہوسکتا ہے؟ جب آپ ﷺ نے فرمایا کہ انہوں نے کوئی بھی نیک عمل نہیں کیا ہوگا تو اس میں نماز بھی داخل تصور کی جائے گی۔ اسی طرح جن کے متعلق یہ کہا گیا کہ جہنم سے وہ بھی نکالے جائیں جن کے دل میں جو یا رائی کے دانے یا ذرہ برابر ایمان ہوگا اس سے بھی ظاہر ہے کہ وہ نماز میں ناقص ہوں گے ورنہ جو نماز کا پابند ہے اس کا ایمان بہت زیادہ کیا جائے گا کیونکہ نماز کو ایمان پکارا گیا ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ﴾ (البقرۃ: ۱۴۳)

''اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ تمھارے ایمان کو ضائع کردے۔''

پھر جو شخص یہ کہتا ہے کہ بے نمازی شخص ابدی خلود فی جہنم کا مستحق ہے اور وہ پکا کافر ہے وہ گویا یہ کہتا ہے کہ نمازی شخص کا ایمان بالکل کمزور ہے حتی کہ اس کے اوپر ذرہ برابر یا جو کے بقدر کا اطلاق ہوسکتا ہے ہاں یہ بات درست ہے کہ کچھ دیگر گناہوں کی وجہ سے خود نمازی لوگوں کو بھی جہنم کی سزا ملے گی۔ (العیاذ باللہ) لیکن اس کے متعلق حدیث شریف کا یہ کہنا کہ اس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہو کس طرح درست ہوسکتا ہے اور یہ کہنا بھی درست نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے کوئی نیک کام کیا ہی نہ ہو حالانکہ ان بزرگوں کے بقول نماز جیسا نیک عمل ایمان میں نہایت اعلیٰ درجہ رکھتا ہے وہ تو اس کے اندر ضرور ہوگا ورنہ ان کے خیال کے مطابق وہ جہنم سے نہیں نکل سکتا، پھر ایسے عظیم عمل والے کے متعلق حدیث کہتی ہے کہ انہوں نے کوئی نیک کام کیا ہی نہیں ہوگا کس طرح درست ہوسکتا ہے۔

ان کے علاوہ دیگر کئی احادیث موجود ہیں جن سے بھی واضح ہوتا ہے کہ کتنے ہی انسانوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن معاف فرمادے گا۔ حالانکہ موحد ہونے کے علاوہ انہوں

نے کوئی نیک عمل کیا ہی نہیں ہوگا مگر ان تمام احادیث پر ایک مومن کو ایمان لانا ہے کسی کو ترک نہیں کرنا یہ بھی سچ اور وہ بھی سچ ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ شارع علیہ السلام کی ہر بات پر آمنا وصدقنا، سمعنا واطعنا کہیں۔ بہرحال مجموعی طور پر کتنی ہی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے سنگین گناہوں (مثلاً ترک نماز) کے مرتکبین کی بھی بالآخر نجات ہو جائے گی۔

اگر کوئی سورۂ مدثر کی یہ آیت پیش کرے گا کہ:

﴿فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ﴾ (المدثر: ٤٨)

''میں ان کو سفارشیوں کی سفارش فائدہ نہیں پہنچائے گی۔''

اور اس آیت سے چند آیات پہلے یہ الفاظ ہیں کہ:

﴿فِي جَنَّاتٍ يَتَسَاءَلُونَ ○ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ○ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ○ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ○﴾ (المدثر: ٤٠ تا ٤٣)

''یعنی جہنمی کہیں گے کہ ہمیں جہنم وجہ سے جا پڑا ہے کہ ہم بے نمازی تھے، پھر ان کو کوئی شفاعت بھی فائدہ نہیں پہنچا سکے گی۔''

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ میں ہے کہ جہنمی کہیں گے:

﴿لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ﴾ (المدثر: ٤٣)

''کہ ہم نمازی نہیں تھے۔''

کے ساتھ کچھ اور کام اور غلط اعتقاد بیان کریں گے جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ:

﴿وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ﴾ (المدثر: ٤٦)

''یعنی ہم دنیا میں قیامت کے دن (انصاف کے دن) کو نہیں مانتے تھے۔''

اور ظاہر ہے کہ قیامت کے دن پر ایمان نہ رکھنا کفر ہے لہٰذا ایسے لوگوں کو شفاعت واقعتاً کچھ فائدہ نہیں دے گی بلکہ ایسے لوگ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اس میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں۔ ان آیات سے مجموعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترک نماز جہنم میں جانے کا سبب ہے تو یہ بات تو مسلم ہے کہ بے نمازی جہنم میں جائیں گے باقی رہا جانے کے بعد نکلیں گے

یہ الگ بات ہے، اس کی طرف ان آیات میں کچھ تعرض نہیں۔ یہ مسئلہ دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں بیان ہوا ہے یعنی اپنی سزا پانے کے بعد نکالے جائیں گے باقی رہا یہ سوال کہ بے نمازیوں کے متعلق کفر کا اطلاق ہوا ہے اور انتہائی شدید وعیدیں وارد ہوئی ہیں ان کا کیا مطلب ہے؟ اس کے متعلق گذارش ہے کہ ایمان چونکہ دل کا فعل ہے اور اعتقادی معاملہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو علم ہی نہیں ہوسکتا اسی وجہ سے ہمارے لیے کفر اور ایمان یا کافر اور مؤمن کے امتیاز کے لیے علامت طور نماز کو مقرر کیا گیا ہے یعنی اگر کوئی نماز پڑھتا ہے تو ہم اسے مسلمان سمجھیں گے اور اپنی مسلم برادری میں اسے شامل رکھیں گے اور اس کے ساتھ عام مسلمانوں جیسا سلوک ومعاملہ کریں گے مگر جب نماز کا تارک ہے تو وہ ہماری اس مسلم برادری سے خارج ہے اور ہم اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ سلوک نہیں کریں گے۔

چونکہ تارک نماز میں یہ احتمالات ہوسکتے ہیں کہ ترک نماز یا تو سستی وغفلت کی بناء پر کر رہا ہے اگرچہ دل میں اسے برا تصور کرتا ہے اور اسے گناہ سمجھتا ہے اور نماز کی فرضیت اور اسلام کے اہم رکن ہونے کا بھی قائل ہے اسی طرح اس کے متعلق یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ وہ شخص سرے سے نماز کی فرضیت کا ہی قائل نہیں اور ترک نماز کو حلال جانتا ہے اس لیے نماز کو محض غفلت کی وجہ سے نہیں بلکہ اسے فرض نہ سمجھنے کی وجہ سے چھوڑتا ہے لہٰذا آخرت میں ان دونوں احتمالات میں سے جو بھی احتمال ہوگا اس کے ساتھ آخرت میں اسی طرح کا سلوک کیا جائے گا۔

پہلی قسم ایمان سے خارج نہیں اور وہ اس سنگین جرم کی سزا پانے کے بعد نجات پائے گا لیکن دوسرا تو کافر ہے لہٰذا اس کے لیے ابدی خلود فی جہنم ہے۔ مگر ہمیں وہی حکم کیا گیا ہے کہ ہم اس کے ساتھ (بے نمازی کے ساتھ) مسلمانوں والا سلوک نہ کریں وہ اس لیے کہ ایسے شخص کے متعلق ہمارے پاس کوئی اور ثبوت نہیں جس کے ذریعے ہم اسے مسلم یا مومن قرار دیں مذکورہ بالا دونوں احتمالات اس کے اندر موجود ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص ہمیں یہ کہے کہ میں نماز کو فرض سمجھتا ہوں مگر غفلت اور سستی کی وجہ سے ادا نہیں کرتا پھر بھی ہم اس کی بات پر اعتماد

کیسے کریں کیونکہ اس کے اس طرح کہنے میں بھی جھوٹ اور منافقت کا احتمال ہے یعنی ممکن ہے کہ وہ محض اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے لیے جھوٹ بول رہا ہو ورنہ اس کے دل کی کیفیت کچھ اور ہو اور دل کی صحیح کیفیت اور اس میں ایمان ہے یا نہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے ہمیں کیا علم۔

اس لیے ہمارے لیے اسلام اور ایمان کی ظاہری علامت نماز ہی کو بنایا گیا ہے کیونکہ ہم تو صرف ظاہر پر ہی حکم لگا سکتے ہیں، پھر اگر کوئی نماز پڑھتا ہے ہم اسے مسلمان کہیں گے اگرچہ وہ اندرونی کیفیت میں کافر ہو۔ اس کے متعلق فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی فرمائے گا اور جو تارک نماز ہے اسے ہم مسلمان نہیں سمجھیں گے باقی اگر اس کے اندر ایمان موجود ہوگا تو اس کے ساتھ آخرت میں رب تعالیٰ خود ہی فیصلہ فرمائے گا کیونکہ وہاں پر (قیامت کے دن) فیصلہ اصل حقیقت کی بناء پر ہوگا نہ کہ ظاہر کے اعتبار سے یہی وجہ ہے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کسی شہر یا گاؤں پر حملہ کرنے سے پہلے کچھ وقت وہاں رہتے تھے اگر اذان کی آواز آتی تھی تو حملہ کا پروگرام منسوخ کیا جاتا تھا کیونکہ تصور کیا جاتا تھا کہ یہ مسلمانوں کا گاؤں ہے مگر جب اذان نہیں آتی تھی تو پھر حملہ کا حکم فرماتے تھے کیونکہ وہ مسلمانوں کا گاؤں ہی نہیں۔

مطلب کہ بے نمازی پر کفر کا اطلاق یا ترک نماز پر کفر کا اطلاق اس معنی میں ہے کہ نماز ایمان اور کفر میں امتیاز کرنے کے لیے ایک حسی علامت ہے جو اس دنیا میں ہمیں سمجھائی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہم جسے ترک نماز کی وجہ سے مسلمان نہ سمجھیں وہ عنداللہ بھی واقعتاً مومن نہیں بلکہ ممکن ہے کہ وہ رب تعالیٰ کے نزدیک صاحب ایمان ہو چکا ہے وہ ایمان ذرہ برابر ہی کیوں نہ ہو وہ ایمان آخرت میں ظاہر ہوگا اس دنیا میں تو ہم اسے مسلمان نہیں سمجھیں گے اسی وجہ سے بے نمازی کی نماز جنازہ بھی ادا نہیں کی جائے گی کیونکہ ہمارے لیے اس دنیا میں مومن اور کافر کی پہچان کے لیے علامت نماز ہی کو قرار دیا گیا ہے یعنی ایسے شخص کو جو کافر قرار دیا گیا ہے وہ اس دنیا کے اعتبار سے ہے اور اس دنیا کے احکامات کے اجراء کے لیے نہ کہ اصلاً و واقعتاً وہ ضرور بالضرور کافر ہے۔ اگر ابتدا میں ذکر کی گئی حقیقت
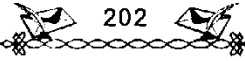
کو یاد کریں گے اور دنیا اور آخرت کے معاملات میں تفریق کو دوبارہ ذہن میں لائیں تو میری یہ بات آپ کو باآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔

خلاصہ کلام! کہ بے نمازی ہماری اسلامی برادری سے خارج ہے کیونکہ اس کے اندر ایمان اور اسلام کی ظاہری علامت (نماز) موجود نہیں جو اس کے مسلمان ہونے کے لیے مقرر کی گئی تھی باقی اس کی دل میں ایمان ہے یا نہیں یہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے اگر ایمان اس کے دل میں ہوگا تو رب کریم خود ہی اس کے ساتھ معاملہ فرمائے گا چاہے اسے ویسے معاف کردے یا چاہے سزا دے کر پھر معاف کرے وہ خودمختار ہے ہمیں وہاں پوچھنے کی بھی اجازت نہیں:

﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ (الانبیاء: ۲۳)

''اس سے نہیں پوچھا جاتا جو وہ کرتا ہے لیکن ان سے پوچھا جائے گا۔''

بہرحال مجھے یہی بات سمجھ میں آئی ہے اس کے مطابق کسی بھی حدیث کو ترک کرنا لازم نہیں آتا بلکہ سب پر عمل ہو جاتا ہے مزید حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ لانہ ھو اعلم بالصواب.

انسان اور روح

سوال: انسان کے ساتھ ارواح کا تعلق کس طرح ہے اس کے متعلق بحث کریں اور ہم کو حقیقت سے آگاہ فرمائیں؟

الجواب بعون الوھاب: انسانی روح اس طرح ہے جس طرح انسانی جسم کپڑوں میں۔ جس طرح کپڑے انسانی جسم کے اوپر پہنے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح سمجھیں کہ یہ خاکی جسم روح کے اوپر اس طرح ڈھانپا ہوا ہے اور اس روح کو بھی اس ظاہری جسم کے موافق صورت ملی ہوئی ہے یعنی روح محض ہوا نہیں ہے بلکہ ایک لطیف وباریک صورت والی چیز ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ قرآن واحادیث میں وارد ہے کہ فرشتے انسانی روح قبض کرکے جنت یا جہنم کے کفن میں اس کو لپیٹتے ہیں اگر روح کوئی چیز نہ ہوتی تو اس کو جنتی یا جہنمی لباس میں ڈھانپنے کا کیا مطلب؟ اس کے بعد حدیث میں ہے کہ انسانی نظر اس وقت اپنے روح کا

تعاقب کرتی ہے اگر روح کوئی محسوس چیز نہ ہوتی تو انسانی نظر آخر کس چیز کا تعاقب کرتی ہے؟ اس کے بعد احادیث میں ہے وہ روح عالم برزخ میں پہلے والوں سے ملتی ہے، پہلے والے انسان نو وارد روح سے دنیا والوں کا حال احوال پوچھتے ہیں۔ اگر روح کو کوئی صورت نہ ہوتی تو آخر پہلے پہنچے ہوئے انسان اس تازہ روح کو کس طرح پہچانتے ہیں اور یہ نو وارد روح ان کو کس طرح پہچانتی ہے کہ یہ میرے فلاں عزیز یا دوست ہیں؟ ضرور ان ارواح کو کوئی جانی پہچانی صورت ملی ہوئی ہے جس کو دیکھ کر وہ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور حال احوال کرتے ہیں۔ شہیدوں کے لیے تو حدیث میں آتا ہے کہ ان کو سبز پرندوں کی صورت میں جنت میں رکھا گیا ہے جہاں وہ اللہ کا دیا ہوا رزق حاصل کر رہے ہیں بس آپ کے سوال کا جواب اسی میں ہے۔ یعنی انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسام مبارک تو اپنی اپنی قبروں میں مدفون ہیں لیکن ان کے پاک اور طیبہ ارواح کو ضرور کوئی نہ کوئی صورت ملی ہوئی ہوگی اور وہ ارواح طیبہ آسمانوں پر اپنے اپنے مقام پر ان صورتوں میں موجود ہیں لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات بھی ان کو دی ہوئی صورتوں کے ساتھ ہوئی سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے، کیونکہ وہ وہاں پر اپنے جسم اطہر کے ساتھ موجود تھے پھر جس طرح دوسرے مسلمانوں کی ارواح مرنے کے بعد آپس میں ملتے ہیں اور حال احوال لیتے ہیں اس طرح اگرچہ کسی بھی انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ملاقات ہوئی اور ان کے ساتھ گفتگو ہوئی جب کہ عام مومنوں کے ارواح کی بھی یہی حالت ہے کہ وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور حال احوال لیتے ہیں۔ تو انبیاء کی ارواح کو بوجہ اتم واعلیٰ یہ سعادت اور صورت حال حاصل ہے لہٰذا ان کی اس ملاقات وگفتگو میں نہ کوئی بُعد ہے نہ استحال نہ عجب اور نہ ہی کوئی غرابت اور ویسے بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کے آگے اس کے بارے میں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا رب کریم سب کچھ کر سکتا ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

بعینہ اسی طرح ان انبیاء کرام علیہم السلام کی ارواح بیت المقدس میں لائی گئیں اور ان تمام ارواح نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ (جس طرح احادیث میں وارد ہے)

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب

روح کی واپسی

سوال: اعادۂ روح کا عقیدہ قرآن وحدیث کے مطابق ہے یا مخالف اور کیا یہ عقیدہ رکھنا شرک ہے، اور قرآن پاک کی آیت کے خلاف تو نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: قبر میں سوال وجواب کے لیے روح کے اعادہ کا عقیدہ صحیح حدیث سے جو صحیح مسلم وامام کے احمد کے مسند وغیرہ میں صحیح سندوں سے ثابت ہے لہٰذا یہ عقیدہ شرک کیسا؟ اور یہ عقیدہ قرآن کریم کی کسی آیت کے خلاف نہیں کیونکہ یہ اعادہ عالم برزخ میں ہے جس کے احکام اس دنیوی عالم سے بالکلیہ مختلف ہیں، ان کے احکام کو دنیاوی باتوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا یہ اعادہ دنیوی ہوتا تو اس کے متعلق کچھ نہ کچھ زبان کھولنے کی گنجائش ہوتی لیکن جب یہ بات ہی عالم برزخ ہے اور یہ عالم بالکل علیحدہ عالم ہے، لہٰذا اس سے کوئی استحالہ لازم نہیں آتا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور جمہور سلف صالحین کا یہی عقیدہ ہے اس سے انکار یا تو معتزلہ نے کیا ہے یا آج کل کے کچھ ملحد یا مدعی اجتہاد۔ اللہ تعالیٰ گمراہی سے پناہ میں رکھے۔ آمین واللہ اعلم

نظر کا لگنا

سوال: نظر بد لگتی ہے یا نہیں تفصیل کے ساتھ جواب دیں؟ بینوا توجروا

الجواب بعون الوهاب: نظر بالکل لگتی ہے اس کے متعلق احادیث صحیحہ کے اندر موجود ہے جو کہ صحاح ستہ اور مشکوٰۃ وغیرہ میں آپ ﷺ کے دور کا ایک واقعہ بھی بیان ہے کہ ایک آدمی کو کسی غیر مسلم آدمی کی نظر بد لگی اور اس کو بہت تکلیف ہوئی، پھر آپ ﷺ نے ان کو حکم فرمایا کہ غسل کر کے اس کا پانی دے دے پھر اس پانی سے اس نظر والے آدمی کو نہلایا گیا۔

نفع ونقصان بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن اس کو شرک سمجھنا غلط ہے۔ اصل حقیقت پر پوری طرح غور نہیں کیا گیا ہے بات دراصل یہ ہے کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے جہاں

پر انسان کو عمل کرنا پڑتا ہے، دین، دنیا اور رزق حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے اگرچہ ہر چلنے پھرنے والے چیز کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ (هود: ١٦)

''تاہم انسان کو یہ حکم ہے کہ وہ حصول رزق کے لیے جدوجہد کرے، اس کے حصول کے اسباب تلاش کرے۔''

باقی نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر کوئی انسان اس قسم کی جدوجہد نہیں کرتا اور اس کو رزق نہیں ملتا تو یہ اس کا قصور لکھا جائے گا کہ جہاں پر اس کو امر تھا وہاں پر اس نے قصور کیا۔ تو جس طرح رزق کے لیے جدوجہد کرنے والے کو کچھ حاصل ہوا تو واقعی وہ اس کی کوشش کا نتیجہ کہا جائے گا لیکن اس کی وجہ سے یوں نہیں کہا جائے گا کہ اس کے سبب کی وجہ سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نعوذ باللہ رازق نہیں رہا بلکہ انسان خود رزق حاصل کرتا ہے ہرگز نہیں، اس کے باوجود رزاق اللہ ہی ہے کیونکہ اسی نے ہی تو ان اسباب کو حصول رزق کا سبب بنایا ہے اگر اللہ تعالیٰ ان اسباب سے یہ لیاقت یا فائدہ نکال دے تو وہ سراسر بیکار ہو جائیں گے بعینہ اسی طرح نفع ونقصان یقیناً اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن اس جہاں میں ان دونوں کے اسباب بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں جو بھی ان کو اختیار کرتا ہے اس کو نفع یا نقصان ملتا ہے۔ یہ اسباب بذات خود نافع یا ضار نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ان میں نفع یا نقصان رکھا ہے مثلاً کوئی انسان کسی کو قتل کرتا ہے تو وہ آدمی مر جاتا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ محی وممیت اللہ تعالیٰ کی ذات ہے پھر نظر بد کو شرک کہنے والوں کے مطابق قاتل انسان مارنے والا نہیں ہے کیونکہ مارنے والی تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

لہٰذا جو یہ کہے کہ فلاں نے فلاں کو قتل کر دیا تو اس نے گویا کہ ان کے کہنے کے مطابق شرک کیا اور قاتل کو بھی کوئی سزا نہیں ملنی چاہیے کیونکہ مارنے والا تو وہ ہے ہی نہیں۔ حالانکہ پوری دنیا اس کو قاتل اور خون کرنے والا کہے گی دوسرے کسی کے دل میں یہ بات بھی پیدا نہیں ہوئی کہ اس طرح کہنے سے وہ مشرک ہو جائے گا۔ کیونکہ اصل حقیقت اس طرح ہے کہ

اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے عالم اسباب بنایا ہے اور اس میں اپنے اٹل قانون بنائے ہیں کہ جو اس طرح کرے گا اس کا اٹل طور پر یہ نتیجہ نکلے گا یا کوئی کسی کو کسی چیز سے قتل کرنے کا ارادہ کرے یا عملی قدم اٹھائے پھر اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مشیت بھی اس کے موافق ہے تو اس کے مرنے کا نتیجہ نکلے گا اور جو زہر کھائے گا اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ آدمی مرجائے گا اور جو کوئی صحیح دوا استعمال کرے گا اس کو صحت عطا ہوگی بہرحال ہر ذرہ برابر کے متعلق مولیٰ کریم نے ایک قانون اور سنت جاریہ قائم کردی ہے اور اس کے نتائج مقرر کردیئے ہیں۔

لہٰذا انسان نافع یا ضار کوئی بھی کام کرے وہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قانون اور نتیجہ کے مطابق وجود میں آیا ہے لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا اور انسان کی طرف اس کی نسبت اس لیے کی جاتی ہے کہ اس نے اس سلسلہ میں اپنی کوشش کی اور مقرر کردہ نتیجہ کے حصول کا سبب بنا۔ یعنی نفع ونقصان کا انسان صرف سبب بنتا ہے اور اس کے نتیجہ کے لیے وہ کوشاں رہتا ہے اس لیے اس کی نسبت اس کی طرف کی جاتی ہے۔ جرم وسزا یا اجر بھی اس کوشش کی وجہ سے ملتا ہے اور ایک آدمی اگر کسی کو گولی مارتا ہے تو اس کو مارنے والا اللہ تعالیٰ ہے لیکن گولی مارنے کا مرتکب وہی قاتل ہے مطلب کہ انسان کو سب کچھ اس کی کوشش اور اسباب کو اختیار کرنے کی وجہ سے ملتا ہے ورنہ وہ مکمل نتیجہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی نکالتا ہے اور اسی نے ہی فعل کا نتیجہ متعین فرمایا ہے یہی وجہ ہے بسا اوقات کئی لوگ گولیاں لگنے کے باوجود بچ جاتے ہیں یا کوئی آدمی زہر کھانے کے باوجود بچ جاتا ہے کیونکہ اصل مارنے والی تو اللہ کی ذات ہے اس کو مارنا نہیں تھا لہٰذا وہ بچ گیا تاہم جس نے گولی ماری یا زہر کھایا وہ جرم سے آزاد نہیں سمجھا جائے گا کیونکہ اس کے ہاتھ وہی تھا جو اس نے کیا یقیناً وہ گناہ اس کو ملے گا پھر اللہ چاہے تو اس کو معاف کردے، چاہے تو اس کو سزا دے۔ باقی گولیوں کا یا زہر کھانے کا نتیجہ ''مرنا'' اس آدمی کے ہاتھ میں نہیں تھا۔

لہٰذا قدرت کے ارادہ کے ماتحت وہ بچ گیا مگر زہر کھانے والا اور گولیاں مارنے والا اپنی کوشش اور اسباب کی وجہ سے گنہگار ضرور ہوگا۔ بعینہٖ اسی طرح نظر بد کو بھی اللہ تعالیٰ نے

دوسرے کو نقصان پہنچانے کا سبب بنایا ہے لیکن اگر اللہ نے نہیں چاہا تو نظر بد نہیں لگے گی۔ باقی اگر نظر بد لگانے والا اندرونی حسد یا بغض کی وجہ سے نظر بد لگاتا ہے تو اس کا ضرور اس کو گناہ ملے گا پھر آگے نظر بد لگے یا نہ لگے لیکن اگر حسد یا بغض کی وجہ سے نہیں بلکہ غیر ارادی طور پر یا کسی کو کوئی چیز پسند آئی اور اس کو نظر بد لگ گئی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے یہی سبب ہے کہ حدیثوں میں وارد ہے کہ اپنے آپ پر اور اپنے مال ومتاع اور اولاد پر بھی نظر بد لگ جاتی ہے حالانکہ اپنے مال متاع اولاد کا تو ہر کوئی خیر خواہ ہوتا ہے، اس لیے ہمیں یہ سکھایا گیا ہے کہ اپنی یا کسی اور کی کوئی چیز اگر پسند آجائے تو "ماشاء الله لا قوة الا بالله بارك الله فيها" کے الفاظ کہے جائیں ان شاء اللہ نظر نہیں لگے گی۔

اسی طرح سحر کو بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نقصان کا سبب بنایا ہے خود یہودیوں نے نبی کریم ﷺ پر سحر کیا جس کی وجہ سے آپ ﷺ پر کچھ عرصہ جسمانی تکلیف لاحق رہی، آپ ﷺ کے تو درجات اللہ تعالیٰ نے بلند تر بلند کئے لیکن یہودی اس سبب کی وجہ سے سنگین گناہ کا مرتکب بنا جس کا انتہائی ہولناک نتیجہ قیامت کے دن اس کو ملے گا لیکن اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو اس سحر سے بھی مسحور کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

﴿وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (البقرة: ١٠٢)

لیکن جس نے سحر کیا وہ ہرگز گناہ سے نہیں بچ سکے گا۔

خلاصہ کلام کہ نظر بد وغیرہ صرف اسباب ہیں جو کہ خود اللہ نے پیدا کئے ہیں پھر جو کوئی ان اسباب کے دامن میں آئے گا وہ اس گناہ کا مرتکب لکھا جائے گا۔ دوسرے کو اس کا نقصان پہنچے یا نہ پہنچے کیونکہ وہ تو اسباب کو کام میں لا چکا اور اس کے ہاتھ میں بھی صرف یہی تھا باقی نظر بد لگانے کو شرک کہنے والوں کے خیال کے مطابق کوئی بھی مجرم مجرم نہیں ہے اگرچہ وہ قاتل ہی کیوں نہ ہو کیونکہ ممیت (مارنے والی ذات) اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہے اور اگر کوئی زہر کھائے تو وہ خودکشی کا مرتکب نہیں لکھا جائے گا کیونکہ مارنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جو دوسرے کو مارنے والا کہے وہ ان حضرات کے کہنے کے مطابق شرک

ہے۔ پھر بتائیں کہ دنیا میں کون سی بات شرک سے آزاد رہے گی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار . هذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب .

امیر اور غریب کیوں؟

سوال: دنیا میں غنی اور فقیر، امیر اور غریب کے رزق کا فرق کیوں؟

الجواب بعون الوهاب: اس سوال کا جواب سوال نمبر۲ میں تقدیر کے متعلق مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے ضمناً عرض کیا ہے کہ یہ سب کچھ ابتلاء اور آزمائش کے لیے ضروری تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر سارے غنی اور امیر ہوتے تو باہمی تعاون اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا سوال ہی ختم ہو جاتا۔ اسی فرق کی بنا پر ہی زکوٰۃ، صدقات، خیرات وغیرہ غریب مسکین ومحتاج کی مدد کرنے کے لیے اور خیر کے کاموں میں خرچ کرنے کے لیے مقرر ہوئے، یہ ساری باتیں اسی فرق اور امتیاز پر ہی مبنی ہیں، پچھلے صفحات میں سورۃ انعام کی آیت نقل کی گئی ہے جس میں اسی اونچ نیچ کی علت بیان ہے جس کو ملاحظہ کیجئے اگر سارے امیر اور مالدار ہوتے تو ان باتوں کا وجود کہاں رہتا؟ حالانکہ آج کل دنیا ہر اس شخص کی تعریف کرتی ہے جو غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرتا ہے، اپنوں اور بیگانوں کی ضرورت کے وقت اعانت کرتا ہے، خیر کے کاموں میں مثلاً ہسپتال، تعلیمی ادارے اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں خرچ کرتا ہے، ہر کوئی اس کی تعریف کرتا ہے حتیٰ کہ وہ ملحد بھی اس کی تعریف کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگر یہ تقسیم قدرتی نہ ہوتی تو ان خوبیوں کو گننے والا دنیا میں موجود ہی نہ ہوتا۔ کیا ایسے حضرات دنیا سے ایک فیاض اور دوسروں کو نفع پہنچانے والے لوگوں کے خاتمے کے خواہاں ہیں؟

بہرصورت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو انسان ذات کی آزمائش جس طرح باقی کتنی باتوں سے کرنی تھی اسی طرح اس کی ذات وصفات کے شعبے میں بھی آزمائش کرنی تھی تاکہ ظاہر ہو کہ فقیر اپنی فقیری پر صبر وشکر، تحمل برداشت سے کام لیتا ہے یا نہیں، غنی اپنی ملکیت سے ان

ناداروں کی اعانت کرتا ہے یا نہیں، خیر کی ضرورتوں میں انفاق سے حصہ لیتا ہے یا نہیں، پھر اعتراض کس چیز کا ہے؟ اس طرح سے ہر انسان دوسرے کی طرف محتاج ہے۔ ایک دوسرے کے تعاون کا ضرورت مند ہے، ورنہ ان عقل کے دشمنوں کے خیال مطابق دنیا سے باہمی تعاون کا باب ہی ختم ہو جائے گا۔ دوسرے کو چاہنے والا کوئی بھی نہ رہے گا۔ ایسا بے ہودہ سوال تو ہر کوئی کرسکتا ہے۔ کوئی بیوقوف تو اس طرح بھی کہہ سکتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیمار اور تندرست پیدا کیے سارے صحت مند کیوں نہ پیدا کیے، سارے مرد یا ساری عورتیں کیوں نہ پیدا کیں، سارے گورے پیدا کیوں نہ کیے؟ سب کو ہمیشہ کے لیے کیوں نہیں پیدا کیا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہر کوئی سمجھتا ہے کہ اس قسم کے سوالات فضول اور بے ہودہ ہیں، درحقیقت اس اختلاف کا ہی نتیجہ ہے کہ دنیا نہایت ہی دلکش ہوئی پڑی ہے ۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن

اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

ورنہ ان کے خیال کے موجب پوری یکسانیت ہوتی ہے تو دنیا ایک منٹ بھی رہنے کے قابل نہ ہوتی، لیکن سمجھ میں آتا ہے کہ ان لوگوں کا اصل مقصد یہی ہے کہ نعوذ باللہ اللہ ہے ہی نہیں۔ تبھی تو انسان سارے کام اپنی مرضی سے کرتا ہے یہ فرق اور امتیازات خود اس نے ایجاد کیے ہیں۔ لہٰذا ان کے ساتھ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے وجود پر بحث کی جائے، پھر اگر وہ اللہ کے وجود کے اقراری ہو جاتے ہیں تو دوسرے سوالات بھی حل ہو جائیں گے۔ ورنہ ان کے ساتھ گفتگو کرنا بیکار رہے۔ واللہ اعلم

کُلِّ مولود

سوال: **کوئی بچہ مسلمان کے گھر میں تو کوئی ہندو کے گھر میں پیدا ہوتا ہے تو پھر نتیجہ پر اعتراض کیوں؟**

الجواب بعون الوھاب: حقیقت میں اس سوال کا جواب تقدیر والے سوال کے

جواب میں ذکر کر دیا گیا ہے، لہٰذا اس کو دہرانا سراسر بے فائدہ ہے کیونکہ جو پہلے ذکر کر کے آیا ہوں اس پر تھوڑا غور کرو گے تو آپ کو جواب مل جائے گا۔ لیکن جب آپ نے سوال کیا ہے تو مجبوراً کچھ عرض کرنا پڑ رہا ہے۔ اول تو سوچ کی بات یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہر ایک کی فطرت صحیح سالم پیدا کی ہے (جس طرح قرآن کریم اور حدیث شریف میں ذکر کر کے آیا ہوں لیکن یہ ہندو یا مسلمان، عیسائی یا یہودی، مجوسی یا ملحد کمیونسٹ یا دہریے یہ ساری تفریق انسانوں نے خود اپنے اختیار کو غلط استعمال کرتے ہوئے وجود میں لائی ہیں، اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کیا قصور، باقی اللہ سبحانہ وتعالیٰ سب کو مسلمانوں کے گھروں میں پیدا کرتا ہے تو اس کا مطلب دوسرے الفاظوں میں اس طرح ہوا کہ اللہ تعالیٰ سب کو مسلمان کرنا یہ تب ہی ہوسکتا تھا جب اللہ تعالیٰ انسانوں سے دنیا میں دیا ہوا اختیار سلب کر لیتا اور ان کو کسی بھی راستے لینے کا اختیار ہی نہ ہوتا اور انسان محض مشینی صفت تخلیق بن جاتا جس طرح سورج، چاند، ستارے اور دوسرے اجرام فلکی بغیر شعور اور بغیر اپنے اختیار وارادے کے اپنے مدار پر حرکت کرتے ہیں، انسان بھی اگر اس طرح بے شعور اور بے ارادہ جمادات کے زمرے میں آتا تو پھر انسان کا فضل کمال کہاں سے آتا، اس کے علم سے جو وجود میں آیا وہ کہاں سے آتا۔ اشرف المخلوقات کا لقب کیسے ملتا اور اعلیٰ مرتبہ کیسے حاصل کرتا؟ انسان کا مرتبہ بلند اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے ارادہ واختیار سے کوئی اعلیٰ درجے کا کام سرانجام دیتا ہے ورنہ مشینی صفت کی کسی بھی چیز کو کوئی بھی داد نہیں دیتا، اس حقیقت کو سمجھنے سے یہ لوگ قاصر ہیں تو اس کے لیے راقم الحروف کیا کچھ کر سکتا ہے، علاوہ ازیں! میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ انسان یہاں امتحان گاہ میں ہے، لہٰذا اس کو مجبور محض بنایا۔ سراسر خلاف ہے آزمائش ارادے کی آزادی کے متقاضی ہے۔ لہٰذا اس ارادے کی تذادی سے لازماً مختلف راستے پیدا ہونے تھے پھر اعتراض کس چیز کا؟ مزید یہ گذارش کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل جیسی بے بہا قوت سے نوازا ہے۔ تو ہندو کے گھر پیدا ہونے والا یا کسی اور کے گھر پر پیدا ہونے والا بچہ اس کو بھی عقل جیسی نعمت ملی ہوئی ہے جب تک نابالغ ہے اس پر کوئی قلم نہیں ہے کیونکہ اس وقت یہ کامل

عقل والا نہیں ہے، لیکن بلوغت کے بعد انسان عقل کے کمال کو پہنچ جاتا ہے، لہٰذا وہ چاہے تو عقل سے کام لے کر مسلمان ہوسکتا ہے اور کتنے ہی ہندو بلوغت کے بعد تحقیق کر کے قرآن وحدیث کا تدبر سے مطالعے کر کے اسلام کے پیروکار بن گئے ہیں۔ ہندوں مخالفوں کی مخالفت کے باوجود اسلام کو ترک نہیں کیا۔ ایسے مقالات ہمارے سامنے موجود ہیں۔ لہٰذا صرف ہندو کے گھر میں پیدا ہونا اسلام کے ترک کے لیے ایک بے حقیقت بہانہ تو بن سکتا ہے لیکن صحیح جواب ہرگز نہیں بنتا۔ قیامت کے دن کوئی بھی انسان یہ نہیں کہہ سکے گا کہ اے اللہ تو نے مجھے ہندو کے گھر میں پیدا کیا اور میں مجبور تھا، اگر کسی نے اس طرح کیا تو آپ فرمائیں گے کہ فلاں کیا میں نے تم کو عقل جیسے انمول موتی سے نہیں نوازا تھا؟ کیا تو اس سے کام لے کر سیدھا راستہ نہیں لے سکتا تھا؟ آخر تو نے آباء واجداد کی تقلید سے منہ موڑ کر اور بندھن توڑ کر حق کا راستہ کیوں نہیں لیا۔ حالانکہ دنیاوی معاملات میں تو نے کئی اعتبار سے زمانے کے حالات کے تقاضے کے مطابق آباء اجداد کی باتوں کو ترک کیا۔ تو پھر اسلام اور کفر کے متعلق سوچ کر اپنے آباء اجداء کی تقلید کو توڑ کر سیدھا راستہ کیوں اختیار نہ کیا؟ اس سوال کا جواب نہ ان کے پاس اب ہے اور نہ ہی قیامت کے دن ہوگا، بہر حال اگر عقل ہے تو یہ سوال ختم ہے کہ ہندو کے گھر میں پیدا ہوا ہے ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ ہندو کے گھر پیدا ہونے والے بچے عقل سے کام لے کر مسلمان بن جاتے ہیں لیکن مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے والے بچے عقل سے کام نہ لے کر گمراہی کو اختیار کرتے رہتے ہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ صرف مسلمان یا ہندو کے گھر میں پیدا ہونا ہدایت گمراہی کے لیے کافی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ سوال بیہودگی، حماقت اور بے عقلی کا نمایا ثبوت ہے۔ مزید گزشتہ صفحات کا مطالعہ کریں گے تو حقیقت واضح ہو جائے گی۔ (واللہ اعلم)

نور و بشر کی حقیقت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سب سے پہلے

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو اپنے نور سے پیدا کیا جس کا نام محمد ﷺ رکھا پھر پوری مخلوق کو آپ ﷺ کے نور اور پسینہ سے پیدا کیا، آسمان، زمین، عرش وکرسی لوح وقلم وغیرہ جنت جہنم، فرشتے وغیرہ بھی اسی نور سے پیدا کیے کیا یہ بات درست ہے یا نہیں؟" بینوا وتوجروا بالدلیل الصحیح؟

الجواب بعون الوھاب: یہ مسئلہ دراصل ان لوگوں کی طرف سے گھڑا گیا ہے جو مشرکانہ خیالات رکھتے ہیں۔ رسالت مآب ﷺ کے بارے میں ان حضرات کا خیال ہے کہ آپ ﷺ انسانوں میں سے ہیں ہی نہیں، اس لیے یہ حضرات آپ ﷺ پر بشر کا اطلاق جائز نہیں سمجھتے بلکہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نور ہیں اور نور کا مطلب ان کے پاس یہ ہے کہ معاذ اللہ! اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ذات مبارکہ سے تمام نور نکال کر الگ کر کے اس سے نبی ﷺ کو بنایا یعنی ان حضرات کے ہاں اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ کسی مادی چیز کا مجموعہ ہے جس سے کچھ نکال کر کسی دوسری چیز کو بنایا گیا مثلاً مٹی کا ڈھیر ہو جس سے کچھ نکال کر کوئی چیز بنائی گئی ہو۔ اس طرح کے عقیدہ کا کفریہ عقیدہ ہونے کے بارے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا اس بدعقیدہ کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اگر اپنی ذات میں سے کوئی حصہ نکالا ہے تو وہاں پر پڑنے والے خلا کو کس چیز سے بھرا یا وہ خال ویسا کا ویسا رہ گیا اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ خود اللہ ہیں جس طرح اس قسم کے عقیدہ رکھنے والے اس طرح کے اشعار کہنے سے بھی نہیں ڈرتے۔

جو تھا مستوی عرش پر خدا ہو کر
اتر پڑا مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

اب اس سے بڑھ کر کفر یا الحاد کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ کے رسول کریم ﷺ کو بعینہٖ اللہ بنا دیا گیا ہے یہی تو نصاریٰ کا عقیدہ تھا وہ کہتے تھے کہ "اِنَّ اللّٰہ ھو المسیح ابن مریم" یعنی عیسیٰ بن مریم ہی تو اللہ ہیں۔" افسوس کہ ہمارے نام نہاد مسلمان بھی نصاریٰ کے اس عقیدہ کو اختیار کر کے رسول اللہ ﷺ کو اللہ بنا دیا ہے جب کہ قرآن کریم نے تو تین

جگہوں پر نبی کریم ﷺ کے بشر ہونے کی تصریح کی ہے۔

مثال نمبر ۱: ﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾

(بنی اسرائیل: ۹۳)

''کہو کہ میرا رب پاک ہے کیا میں بشر رسول ہونے کا علاوہ اور کچھ ہوں کیا؟''

یعنی اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوں صرف بشر اور رسول ہی ہوں۔

مثال نمبر ۲: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ﴾

(الکهف: ۱۱۰)

''اے اللہ کے نبی تو لوگوں کو واضح کر کے بتا دے کہ میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں۔ (یعنی انسان ہوں) اور میری طرف وحی کی جاتی ہے۔''

مثال نمبر ۳: ﴿قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ﴾ (حم السجدة: ٦)

یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کی بشریت کی واضح الفاظوں میں تصریح فرمائی ہے مگر قرآن کریم میں نور ہونے کے بارے میں ایک جگہ بھی تصریح نہیں فرمائی اسی طرح قرآن کریم میں دوسری جگہوں پر قرآن کریم پر تو نور کا اطلاق ہوا ہے اور اس کی تصریح بھی ہوئی ہے:

مثال نمبر ۱: ﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الاعراف: ۱۵۷)

''یعنی جن لوگوں نے نبی پر ایمان لایا اور ان کی تعظیم اور مدد کی اور اس نور کی اتباع کی جو وہ ساتھ لائے ہیں تو وہ لوگ کامیاب ہیں۔''

اور یہ بالکل واضح ہے کہ جو نور نبی ﷺ ساتھ لائے ہیں اس سے مراد قرآن کریم ہے:

مثال نمبر ۲: ﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ (التغابن: ۸)

''پس تم ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اور اس نور کے ساتھ جو ہم نے نازل کیا ہے اور تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

اور قرآن کریم پر نور کا اطلاق اس لیے ہے کہ جس طرح نور (یعنی روشنی) میں سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے اسی طرح قرآن کریم سے بھی ضلالت کفر وشرک کی تاریکیوں سے نکل کر ہدایت وایمان کی روشنی میں آیا جا سکتا ہے۔ اور ہر ایک کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ایمان کیا ہے کفر کیا ہے؟ ضلالت کیا ہے؟ ہدایت کیا ہے؟ بہر حال قرآن کریم اللہ کی کتاب قرآن پر نور کا اطلاق تو ہوا ہے مگر نبی ﷺ پر وضاحت کے ساتھ کسی ایک جگہ پر بھی نور کا اطلاق نہیں ہوا بلکہ ان کے بشر ہونے کی صراحت کی گئی ہے جس طرح پہلے گزر چکا ہے کچھ حضرات سورۂ مائدہ کی اس آیت کریمہ:

﴿قَدْ جَآءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ﴾ (المائدة: ١٥)

''یعنی تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور اور واضح کتاب آ چکی ہے۔''

ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس آیت کریمہ میں نور پر ''کتابٌ مبین'' کو معطوف بنایا گیا ہے اور عطف مغایرۃ کو چاہتا ہے اس لیے کتاب مبین اور نور دو علیحدہ چیزیں ہیں لہٰذا کتاب مبین سے تو قرآن ہی مراد ہے لیکن نور سے مراد نبی ﷺ ہیں۔ حالانکہ ہم پہلے بھی یہ واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کریم میں قرآن پر نور کی صراحت واضح نہیں ہے۔ لہٰذا بموجب قائدہ "القرآن یفسر بعضه بعضا" اس آیت کریمہ میں بھی نور سے مراد قرآن عزیز ہے اور ایک چیز کی چند صفتیں صرف عطف کے ساتھ آ جاتی ہیں۔ اور باقی رہی، مغایرۃ والی بات تو عطف مغایرۃ کو چاہتا ہے اور ان صفتوں میں معنوی مغایرۃ جو عطف کے لیے کافی ہے۔ اس کے مثال قرآن کریم میں بھی کافی ہیں مثلاً سورۃ حجر کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الحجر: ١)

''یعنی الر، یہ آیتیں ہیں کتاب کی قرآن مبین کی۔''

اور ظاہر ہے کہ کتاب اور قرآن دونوں سے مراد قرآن ہی ہے کتاب اس لیے کہا جاتا ہے کہ لکھا ہوا ہے اسی طرح سورت نمل کی بھی ابتدائی آیات میں ہے:

﴿طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ (النمل: ١)

ان دونوں آیات کے درمیان واؤ عاطفہ ہے مگر مراد ایک ہی چیز ہے یعنی قرآن کریم کیونکہ قرآن اور کتاب میں جو معنوی مغایرۃ ہے وہی عطف کے لیے کافی ہے۔ اسی طرح سورۃ الاحزاب میں نبی ﷺ کی چند وصفیں بیان ہوئی ہیں۔ جیسے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ○ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا﴾ (الاحزاب: ٤٥، ٤٦)

قارئین کرام! غور کریں! یہاں پر نبی ﷺ کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں۔ شاہد، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ، سراجاً، منیراً اور یہ تمام وصفیں عطف کے ساتھ آئی ہیں لیکن یہاں پر یہ کہنا کہ مبشر اور نذیر کوئی الگ الگ ہستیاں ہیں کیونکہ واؤ عاطفہ مغایرۃ کو چاہتا ہے تو کیا اس طرح کہنا درست ہوگا ہرگز ہرگز نہیں۔ کیونکہ شاہد، مبشر، نذیر وغیرہا کے معنی میں کچھ مغایرۃ ہے جو کہ عطف کو بنانے کے لیے کافی ہے خلاصہ کہ ان صاحبوں نے جو واؤ عطف کی مغایرۃ کا بت کھڑا کیا تھا وہ حق آنے کے بعد سرنگوں ہوگیا۔

﴿جاء الحق وزهق الباطل﴾

اب مطلب یہ ہوا کہ سورۃ المائدۃ میں نور سے مراد بھی قرآن کریم ہے جس طرح آیات میں قرآن کا اطلاق ہے اور نور کہنے کی وجہ شبہ بھی ہم نے بیان کردی ہے اور وہ آیات بھی بیان فرمادیں جن میں نبی ﷺ کے بشر ہونے کی صراحت موجود ہے۔ سورۃ کہف اور حم سجدہ والی آیات ﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ والی آیت کے بارے میں مشرکانہ خیالات رکھنے والے حضرات ایسی مجلسوں میں جن میں کوئی عربی کا جاننے والا یا ماہر نہیں ہوتا وہاں پر اپنے تجاہل عارفانہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہوئے سادہ لوح مسلمانوں کو یہ کہہ کر گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ وہابی حضرات آپ کو اس آیت کا غلط مطلب بتاتے ہیں کیونکہ انما میں (ان کے کہنے کے مطابق) ما نافیہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ نہیں ہوں میں آپ جیسا انسان لیکن بھائی! یہ وہابی حضرات اللہ کے کلام میں بھی اپنے مطلب کی معانی نکالتے ہیں اور لوگوں کو حق سے دور کرتے ہیں۔ درحقیقت اس جگہ یا اس

جیسی دوسری جگہوں پر "انما" کا کلمہ حصر کا ہے جس کی صحیح معنی یہاں پر یہ ہوگا کہ میں صرف تمہاری طرح انسان ہوں۔ لیکن ان لوگوں نے تو عربی کے قوانین کو نظر انداز کر دیا اور صرف عوام کو دھوکہ دینے کے لیے اللہ کے کلام میں تحریف کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ علامہ ابن ہشام انصاری اپنی مایہ ناز کتاب مغنی اللبیب کی جلد۲ صفحہ۹ پر لکھتے ہیں:

((ولیث ما للنفی بل هی بمنزلتها فی اخواتهما لیتما ولعلما ولکنا وکانّما.))

"یعنی ان کے ساتھ جو "ما" زائدہ یا کافہ آتی ہے وہ نفی کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ اپنی دوسری اخوات کی طرح آتی ہے۔ (یعنی جس طرح ان حروف میں ما زائدہ کافۃ ہے اسی طرح اِنَّ واَنَّ کے ساتھ بھی جو ما ہے وہ بھی زائدہ ہے نہ کہ نافیہ) لہٰذا جو اِنَّ مشبہ بالفعل ہے وہ "ما" نافیہ پر داخل نہیں ہوتی یعنی ان کو اپنے عمل سے روکتی ہے اور "ما" اور "الا" حصر کی معنی پیدا کرتے ہیں یا اِنَّ کے بعد آنے والی ما موصولہ ہوتی ہے اور موصولہ اسم ہوتا ہے اس صورت میں "ما" موصولہ ان کا اسم بن جائے گی لیکن اگر ان حضرات کے کہنے کے مطابق "ما" کو نافیہ بنایا جائے تو یہ "ما" صرفی ہوگی پھر اسم میں ان کا اسم یا مسند الیہ بننے کی لیاقت ہی نہیں رہے گی کیونکہ حرف نہ مسند بن سکتا ہے اور نہ ہی مسند الیہ لہٰذا اس صورت میں اِنَّ کا اسم کس چیز کو بنایا جائے۔ "ما" اگر نافیہ بنائی جائے گی تو "ما" "اِنَّ" کا اسم بنے گی اور "بشر مثلکم" اس کی خبر بنے گی پھر بتائیں کہ ما اسم اور خبر سے مل کر کیا عبارت بنے گی؟ اگر کہو گے؟ یہ جملہ تاویل مصدر میں ہو کر ان کا اسم بنے گا تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ بیشک میرا آپ جیسا انسان نہ ہونے کی وحی کی جاتی ہے میری طرف۔

قارئین کرام! انصاف کریں کہ اس جملہ کے یہ معنی کیا دیوانہ کے علاوہ کوئی اور کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں بہرحال ایک تو ان "ما" نافیہ پر عمل نہیں کرتی دوسرا کہ اگر تھوڑے سے وقت کے لیے اس کو مانا بھی جائے تو اس کے معنی ایسے غلط ہوں گے کہ اس کو صحیح کرنے کی کوئی صورت بھی نہیں بچتی، تعجب ہے کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے کلام میں اس طرح کی جرأت کس

طرح ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اسی آیت کریمہ کے اندر ﴿یُوْحٰی الیَّ﴾ کے بعد پھر دوبارہ یہ الفاظ ہیں۔ ﴿انما الٰھکم الٰہ واحد﴾ تو کیا یہ حضرات اس کے بھی معنی کریں گے کہ ''نہیں ہے تمہارا ایک اللہ''؟ اگر نہیں تو پھر اس سے پہلے والے جملہ میں اس خود ساختہ معنی پر اتنی ہٹ دھرمی کیوں؟ قرآن کریم میں یہ ایک مثال نہیں ہے بلکہ ترکیب کی کتنی ہی مثالیں ہیں ہم یہاں پر چند مثالیں بیان کرتے ہیں قرآن کریم میں سورت توبہ میں ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ (التوبة: ۲۸)

عربیت کے ان نئے مجتہدین کے مطابق اس کی معنی یہ ہوگی کہ نہیں ہیں مشرک پلید۔

سورۃ الانفال میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ ....الآية﴾

(الانفال: ۲)

معنی اس کے (ان کے قائدے) کے مطابق یہ ہوگا کہ وہ لوگ مومن نہیں ہیں جن کے دل اللہ کے ذکر پر خوف کے مارے کانپ جاتے ہیں۔

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ (الحجرات: ۱۰)

''بیشک مومن بھائی نہیں ہیں۔'' اور

﴿قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَا اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ (ملك: ۲۶)

آپ کہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس علم ہی نہیں ہے اور نہیں ہوں میں واضح ڈرانے والا۔

بہرحال ہم نے تو یہاں پر چند مثالیں عرض رکھیں بلکہ قرآن کریم تو ایسی ترکیبوں سے بھرا ہوا ہے پھر یہ حضرات آخر کہاں تک اپنی خود ساختہ معنی کرتے رہیں گے۔

حاصل کلام! کہ اِنما میں ''ما'' نافیہ بنانے کی وجہ سے جو مفاسد پیدا ہوں گے ان کا کوئی حل نہیں ہے اور معاذ اللہ قرآن جیسی کتاب مہمل بن جاتی ہے۔ قارئین کی آسانی کی بنا پر ہم صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ ان کے بعد آنے والی ''ما'' کی ہم نے دو اقسام بیان کی ہیں۔ ایک ما کافہ جو کہ اِنَّ کو عمل سے روکتی ہے اگر اِنَّ کے ساتھ آئے گی تو اس سے مل کر

بالکل ایک حرف بن جاتی ہے یہی وجہ ہے قرآن میں یہ جہاں پر بھی آئی ہے وہاں وہ ان کے ساتھ متصل آئی ہے۔ اگر ما نافیہ ہوتی تو دونوں کو الگ الگ لکھا جاتا اور اکٹھی صورت میں انما کلمہ حصر بن جاتا ہے اور دوسری "ما" موصولہ کی آتی ہے اس کی صورت اس طرح ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ الگ آتی ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ سورت انعام میں فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ .... ﴾ (الانعام : ١٣٤)

"بیشک وہ چیز جس کا تمہارے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور آنی ہے۔"

اسی طرح قرآن کریم میں دوسری کئی ایک مثال دیکھی جا سکتی ہیں۔

خلاصہ کلام :...... کہ جب انما حصر کا کلمہ ہوتا ہے تو وہاں پر "ان" اور "ما" دونوں بالکل متصل آتے ہیں یعنی دونوں مل کر ایک کلمہ بن جاتے ہیں لیکن ما موصولہ کی صورت میں دونوں علیحدہ کتابت کی جاتی ہیں۔ باقی رہا مسئلہ "مـــا" نافیہ کا تو اس پر ان داخل ہی نہیں ہوتا اور اس ما کو نافیہ قرار دینے سے عبارت کے معنی بالکل غلط بن جاتے ہیں کچھ حضرات اپنے گمراہی والے عقیدہ پر دلیل کے طور پر مصنف عبدالرزاق کی طرف منسوب وہ روایت پیش کرتے ہیں جو جابر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے جو اس طرح ہے:

((قال قلت یا رسول اللہ بابی انت وامی اخبرنی ان اول شی خلق اللہ قبل الاشیاء قال یا جابر ان اللہ تعالیٰ خلق قبل الاشیاء نور نبیك من نورہ...... الخ .)) (روایت کافی لمبی ہے)

ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول میرے والدین آپ پر قربان ہوں مجھے خبر دیں سب سے پہلی چیز کے بارے میں جو سب سے پہلے اللہ نے پیدا کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے جابر بیشک اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور سے پیدا کیا۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس روایت میں صراحت ہے تمام مخلوق کی پیدائش سے قبل اللہ نے اپنے نور سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نور پیدا کیا اور پھر تمام اشیاء کو

اس نور سے پیدا کیا۔ (جس طرح آگے روایت میں بیان ہوتا ہے) افسوس اس بات پر ہے کہ یہ حضرات اپنے ضلالت سے پُر عقیدے کو ثابت کرنے کے لیے اللہ کے رسول ﷺ پر افتراء بازی سے بھی نہیں ڈرتے اور انہیں اس خوش آمدید کا بھی ڈر نہیں جو احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ:

((من كذب عليّ متعمدًا فليتبوّأ مقعدهٗ من النار.))[1]

''جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر افتراء باندھتا ہے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنا لے۔''

حقیقت یہ ہے کہ اس روایت کی اصل سند بھی موجود نہیں ہے۔ ایسی بے سند روایت کو لے کر اس سے اہم عقیدہ کے اثبات کا کام اس آدمی کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا جو خود بھی گمراہ ہے اور دوسرے کو بھی گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ اعاذنا اللہ'' باقی اس روایت کی نسبت جو مصنف عبدالرزاق کی طرف کی جاتی ہے تو یہ درست نہیں ہے مصنف عبدالرزاق مطبوعہ کامل طبع ہند الحمد للہ ہمارے کتب خانہ میں موجود ہے جس کا تتبع کر کے ہر منصب مزاج معلوم کر سکتا ہے کہ اس موضوع روایت کا اس کتاب میں نام ونشان بھی نہیں ہے پتہ نہیں ان حضرات نے اس بے سند روایت کی نسبت کس بل بوتے پر اس کتاب کی طرف کی ہے شاید ان کا یہی خیال ہوگا کہ مذکورہ کتاب نہ تو چھپ کر منظر عام پر آئے گی اور نہ ہی ہمارے افتراء کی قلعی کھلے گی مگر اللہ کے فضل وکرم سے یہ کتاب چھپ کر منظر عام پر آگئی جس سے ہر آدمی کو برائے راست استفادہ کرنے کا موقع میسر ہوگیا۔ اور اس کتاب کا ناقص قلمی نسخہ بھی ہمارے کتب خانہ میں موجود ہے مگر اس میں اس روایت کا پتہ نہیں پڑتا کچھ حضرات ہمارے پاس آئے انہوں نے اس قلمی نسخہ کو آگے پیچھے کیا تا کہ وہ خود ساختہ روایت ان کو مل جائے لیکن وہ روایت نہ اس کتاب میں تھی اور نہ ہی ان کو مل سکی۔

خلاصہ کلام کہ اس روایت کی نسبت مصنف عبدالرزاق کی طرف درست نہیں ہے دوسری کسی کتاب میں اس کی کوئی سند نہیں ہے چہ جائے کہ وہ موضوع ہو پھر ایسی بے سند روایات سے

[1] ابوداؤد، كتاب العلم باب التشديد في الكذب على رسول الله ﷺ، رقم الحديث: ٣٦٥١.

عقیدے کا اثبات کس طرح ممکن ہے جب کہ خود کے ہاں معمولی ضعف والی روایت بھی عقائد کے باب میں مقبول نہیں ہے تو موضوع اور بے سند روایت اس باب میں کس طرح مقبول ہو گی۔ اس سے ہر ذی عقل اور انصاف والا آدمی معلوم کر لے گا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

ضمیمہ

اور اسی طرح نبی ﷺ کا اللہ تعالیٰ کے نور سے پیدا ہونے کے بارے میں دوسری روایت موضوعہ بھی ملی ہے جو کہ حافظ ذہبیؒ اپنی کتاب میزان الاعتدال جلد ا، صفحہ ۱۲۶ طبع جدید میں شیخ ابونعیم اصفہان کی امالی سے اس سند سے ذکر کی ہے۔

((حدثنا محمد بن محمد بن عمرو بن زید املاءً حدثنا احمد بن یوسف المنبجی حدثنا ابو شعیب صالح بن زیاد السوسی حدثنا الهیثم بن جمیل حدثنا ابو معشر عن القبری عن ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ خلقنی الله من نوره وخلق ابابکر من نوری وخلق عمر من نوری وخلق امتی من نور عمر وعمر سراج اهل الجنة.))

''سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے پیدا کیا پھر میرے نور سے ابوبکر کو پیدا کیا، اور پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نور سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پیدا کیا پھر پوری امت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے نور سے پیدا کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پوری امت کے چراغ ہے۔''

علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ ابونعیم اس روایت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''کہ یہ روایت باطل ہے کتاب اللہ کے مخالف ہے اور اس میں راوی ابومعشر جس کو جھوٹا کہا ہے اور صحیحین اس کی روایت اپنی کتاب میں نہیں لائے ہیں اور دوسرا راوی ابوشعیب سوسی جو کہ متروک ہے جس کے ترک پر تمام محدثین متفق

ہیں اور اسی طرح ہیثم بھی جس کی کوئی بھی روایت صحیحین میں نہیں لائی گئی ہے
اس کے بعد امام ذہبی فرماتے ہیں کہ میرے پاس اس روایت موضوع کی آفت
(قہر) احمد بن یوسف منبجی ہیں کیونکہ وہ غیر معروف مجہول آدمی ہے اور وہی یہ
جھوٹی خبر لائے ہیں۔''

یہ حضرات اس طرح کی موضوع اور واہیہ روایت کا سہارا لیتے ہیں ورنہ ان کے دامن میں کوئی صحیح روایت ہے ہی نہیں اور ایک دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں انہیں اپنی افتراء پر درازیں سے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ اللهم اهدنا الى سواء الصراط . هذا ما عندي والله اعلم بالصواب .

معصوم عن الخطاء کون؟

سوال: کیا نبی کریم ﷺ کے علاوہ بھی کوئی معصوم ہے؟ **بینوا توجروا!**

الجواب بعون الوهاب: قرآن وحدیث کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی بھی معصوم نہیں ہے بلکہ اس سے علمی وعملی خطائیں سرزد ہوسکتی ہیں۔حتی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی معصومین نہیں تھے۔لہٰذا کسی بھی مملکت کے سربراہ کے معصوم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اللہ کے رسول ﷺ چونکہ وحی کی روشنی میں تبلیغ کرتے ہیں اس لیے ان کی ہر بات صحیح ہوتی ہے دین کی تبلیغ میں وہ معصوم ہوتا ہے قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى﴾ (النجم : ٣)

''اور وہ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتا۔''

اس لیے ہر بات اور ہر معاملہ میں بالکلیہ اطاعت اور فرمانبرداری کا حق صرف اللہ کے رسول ﷺ کا ہے دوسرے کسی کی بھی اطاعت (چاہے وہ ماں ہو باپ ہو یا عالم ہو یا حاکم و مملکت کا سربراہ ہو) اس کی اطاعت مشروط ہے اگر اس کی بتائی ہوئی بات یا حکم قرآن و حدیث کے موافق ہے تو اس صورت میں اس کی اطاعت بھی لازمی ہے اور وہ اطاعت اللہ اور

اس کے رسول کی ہو گی، لیکن اگر ان کا حکم کتاب وسنت کے برخلاف ہے تو ان کی ہرگز تابعداری نہیں کی جائے گی۔ حدیث میں ہے:

((لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق .)) [1]

”ہر وہ بات جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آئے اس میں کسی مخلوق کی بات کو نہیں کیا جائے گا۔“

چونکہ قرآن وحدیث کی مخالفت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے اس لیے کسی کی اطاعت نہیں کی جائے گی اگرچہ وہ مملکت کا سربراہ کیوں نہ ہو۔

اسی طرح خلیفہ بھی اس کو ہونا چاہیے جس کو باقاعدہ مسلمانوں کے دین دار طبقہ کے اہل فکر ودانش حضرات نے چنا ہو باقی اگر کوئی زبردستی حاکم بن کر کھڑا ہو جائے تو وہ باقاعدہ خلیفہ نہیں ہوا لیکن پھر بھی اگر وہ زبردستی حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد اسلام کی پیروی کرتا ہے اور احکام الٰہی کی تکمیل کرتا ہے اور ہر عام وخاص کو قرآن وحدیث کی طرف لے آتا ہے تو اس صورت میں بھی اس کی اطاعت بہرحال شرعی طور پر لازمی بن جاتی ہے۔

جس طرح احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے، باقی وہ آدمی جو اسلام کے احکامات کی سراسر خلاف ورزی کرتا ہے اور شرک وبدعت کو فروغ دیتا ہے اور شرکی اڈوں کی سرپرستی کرتا ہے قبر پرستی جیسے سنگین جرائم میں گرفتار ہے تو اس کو خلیفہ نہیں چننا چاہیے وہ مسلمان نہیں ہے۔ آج کل کے حکمرانوں کی یہی کیفیت ہے وہ شرک کے اڈوں کی سرپرستی کر رہے ہیں قبروں پر جا کر ان پر پھولوں کی چادریں چڑھاتے ہیں اور قبر وقبا پرستی کی خوب زور شور سے ترویج کر رہے ہیں ایسے لوگ خلیفہ تو کیا مسلمانی سے بھی دور ہیں وہ ہمارے سربراہ یا پیشوا ہرگز نہیں بن سکتے۔ اگر یہ ظلم وجبر سے رعیت سے کام لیں گے تو اس کے تمام خراب نتائج نکلیں گے جو ان کو بھگتنے پڑیں گے اس طرح کے حکمرانوں کی اطاعت ہم پر لازم قطعی نہیں ہے۔

ملک کے سربراہ کو متشرع اور دین دار ہونا چاہیے نہ کہ سیرت وصورت میں شیطانی

---

[1] مسند احمد، جلد ۵، ص ۶۶، رقم الحدیث: ۲۰۶۸۰

طریقہ اختیار کرنے والے کو ملک کا سربراہ ہونا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب!

رسول کا ہم زبان ہونا

سوال: جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہر نبی کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تو حضرت محمد ﷺ کو پوری دنیا کے لیے کیوں مبعوث کیا گیا، حالانکہ ان کی زبان عربی تھی۔ لہٰذا آپ ﷺ صرف عالم عرب کے لیے نبی ہوتے، سندھیوں کے لیے کوئی سندھی اور انگریزوں کے لیے کوئی انگریز رسول بن کر آتے۔ وغیرہ وغیرہ؟

الجواب بعون الوهاب: قرآن کریم میں واضح ہے کہ:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾

(ابراهيم : ٤)

''یعنی نہیں بھیجا ہم نے کوئی بھی رسول مگر اس کی قوم کی زبان کے ساتھ تاکہ ان پر بیان کرے۔''

اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہر ملک اور ہر قوم میں کوئی نہ کوئی نبی بھیجا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ٥﴾ (الرعد : ٧)

''یعنی ہر قوم کے لیے کوئی نہ کوئی ہادی ''پیغمبر'' تھا۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ (فاطر : ٢٤)

''یعنی ہر امت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے کوئی نہ کوئی ڈرانے والا گزر چکا ہے۔''

لہٰذا سرزمین سندھ اور انگریزوں کے ملک میں اور دوسرے سارے ممالک یا خطہ میں کوئی نہ کوئی آتا رہا ہے لیکن قرآن کریم میں کسی بھی جگہ پر اس طرح نہیں ہے کہ میں ہمیشہ

اس طرح ہر ملک میں الگ الگ نبی بھیجتا رہا ہوں۔ اور کوئی بھی ساری دنیا کے لیے ایک جامع نبی نہیں بھیجوں گا، لہٰذا یہ اعتراض فضول ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ایک ایسا جامع کمالات نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام بھیجا جو پوری دنیا کے لیے قیامت کے دن تک ہو اور اس کی لائی ہوئی شریعت کامل ومکمل ہو جو تا قیامت لوگوں کی رہنمائی کرتی رہے۔ جب بھی کوئی مسئلہ درپیش آئے تو اس میں اس کا حل موجود ہو۔ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ساتھ ایسی کتاب بھی دی جو تا قیامت لوگوں کے لیے رہنماء اور ہادی ہے، جس کا مثل لانے سے انس وجن عاجز ہیں۔ جب اس کتاب کو تا قیامت رہنا تھا تو اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود اٹھایا۔ یہی وجہ ہے دشمنانِ اسلام کی بھر پور کوشش کے باوجود اس میں ایک حرف کا بھی الحاق یا اضافہ یا کمی وبیشی ہرگز نہ ہو سکی۔ حالانکہ توریت، انجیل اور دوسرے آسمانی کتب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہوئے تھے اور سچے تھے ان کے لانے والے بھی سچے پیغمبر تھے لیکن ان کی نبوت عموی اور ساری دنیا کے لیے نہ تھی اور نہ ہی ہمیشہ کے لیے تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے بعد ان کی کتابوں میں تحریف، تبدیل اور اضافات ہو گئے۔ جس کا اقرار ان کتابوں کے ماننے والے بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس کتاب (قرآن کریم) کا ایک حرف بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکا۔ اگرچہ اس کو آئے ہوئے ۱۴۰۰ چودہ سو سال سے بھی زائد عرصہ ہو گیا ہے۔ یہ قرآن شریف کا دائمی معجزہ ہے، ورنہ دوسری کوئی بھی کتاب اتنا عرصہ تو کیا تین سو سال بھی محفوظ نہ رہ سکی اور اس میں تحریف ہو گئی۔ اس طرح بھی نہیں ہے کہ قرآن کریم اس وقت یا آج کے عربوں کے لیے معجزہ تھی یا ہے بلکہ پوری دنیا کے لیے ہے، آج بھی دنیا میں کتنے ہی عیسائی ایسے ہیں جو عربی پر بڑی مہارت رکھتے ہیں ان جتنی مہارت ہمارے پڑھے لکھے عالم بھی نہیں رکھتے۔ انہوں نے بیشتر کتب عربی زبان میں لکھی ہیں۔ عربی لغت کی کتنی ہی کتابیں لکھی ہیں جو دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلی ہوئی ہیں لیکن عربی کے ان ماہر عیسائیوں کو بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ قرآن کریم کے اس چیلنج کو قبول کر سکیں کیوں؟

اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم کا مقابلہ انسانی طاقت سے ماوراء ہے، یہی معجزہ رہتی دنیا تک ہمارے نبی ﷺ کی صداقت کا ایک عظیم الشان ثبوت ہے۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا کی یہ حالت تھی کہ پوری دنیا میں تقریباً (ماسوائے امریکا) لوگوں کے ایک دوسرے سے روابط قائم تھے گزرے ہوئے نبیوں کی طرح ہر دنیا کا خطہ اور علاقہ الگ تھلگ نہیں تھا، یعنی آپ ﷺ کی بعثت کے وقت پوری دنیا ایک گھر کی مانند بنی ہوئی تھی اس وقت سے لے کر آج تک پوری دنیا کے علاقے ایک دوسرے کے بالکل قریب آتے رہے اور آج دنیا کی کیا حالت ہے کہ جو بالکل ایک گھر کی مثل بن چکی ہے اور پوری دنیا کا احوال ایک ہی وقت میں انسان اپنے گھر بیٹھے بیٹھے معلوم کر سکتا ہے اور سن سکتا ہے۔ لہٰذا ایک ہی گھر کے لیے سربراہ یا نبی بھی ایک ہی ہونا چاہیے نہ کہ زیادہ کیونکہ دنیا کی موجودہ حالت نبی ﷺ کی بعثت سے شروع ہوئی ہے جس کا تقاضا ہے کہ دنیا کا مرشد، ہادی، رہنما اور پیغمبر ایک ہی ہونا چاہیے تا کہ ساری دنیا ایک ہی برادری کے دھاگے میں بندھی ہوئی ہے۔ ہر ملک کے جدا جدا نبی نہ ہوں کیونکہ یہ نمونہ عالمی برادری کے منافی ہے اور افتراش انتشار کی علامت ہے، بہرحال آپ ﷺ کی بعثت مبارکہ کے وقت ساری دنیا اپنی زبان حال سے یہ تقاضا کر رہی تھی کہ ہمارا پیشوا لیڈر اور بشیر ونذیر ایک ہی ہونا چاہیے، یہی وجہ ہے کہ مالک الملک جو کہ عالم الغیب ہے، انسانیت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اور ان کی زبان حال کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے ایک عظیم الشان نبی مبعوث کیا جو ایسی کتاب کے ساتھ آیا جو رہتی دنیا تک معجزہ ہے اور تمام انسانوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہے۔ آنے والے مسائل کا حل بھی اس میں موجود ہے اور ملتا رہے گا اور اسی کلام پاک اور اس کے لانے والے عظیم الشان پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوری دنیا کو یہ شاندار تصور (Grand-Conception) عطا فرمایا کہ یہ پوری دنیا اور اس کے باشندے ایک ہی عالم برداری کے اجزاء یا افراد ہیں حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بھری مجلس میں یہ واشگاف اعلان فرمایا کہ کسی عربی کو عجمی (غیر عربی) پر محض اس وجہ سے فضیلت نہیں ہے کہ وہ عربی ہے، کسی

عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر فضیلت نہیں، سب کے سب آدم کی اولاد ہیں، آدم کو اللہ نے مٹی سے بنایا تھا، تم میں سے اگر کسی کو کوئی فضیلت حاصل ہے تو محض تقویٰ کی بنا پر ہے، ورنہ اگر اب بھی ہر ملک کا الگ الگ نبی ہوتا تو آج تک دنیا کے اس شاندار تصور کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکتا تھا۔ بلکہ دنیا اور بھی زیادہ متفرق برادریوں میں تقسیم ہو جاتی۔ اسلام اس شاندار تصور کا مظاہرہ ہر سال حجاز مقدس میں کرتا رہتا ہے، جہاں ہر دنیا کے مختلف خطوں سے آئے ہوئے لوگ مختلف ذات، زبان قبیلے اور الگ الگ خصوصیات اور امتیازات اور اونچ نیچ کے باوجود بھی ایک ہی لباس میں ملبوس ہو کر ایک ہی نمونہ وہیئت میں ایک ہی رب وحدہ لاشریک لہ کے سامنے جھک کر دعا مانگتے ہیں، وہاں پر کوئی امتیاز نظر نہیں آتا، اگرچہ آپس میں باہمی کئی امتیازات کیوں نہ ہوں۔ کیا اس قسم کا تصور اور اس کا عملی مظاہرہ کسی دوسرے مذہب یا قوم یا کسی علاقے یا ملک کے لوگوں نے سوائے اسلام کے پیش کیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بے شمار فوائد اور انسانیت کی بھلائی کی باتوں میں سے یہ بھی ایک نہایت عظیم الشان عملی نمونہ ہے اس جیسا نہ کوئی پیش کر سکا ہے اور نہ ہی کر سکے گا، پس رہا یہ سوال کہ اس مقصد کے لیے عرب وحجاز کے خطے کو منتخب کر کے ایسے پیغمبر کا کیوں انتخاب کیا گیا، دوسرے ملکوں سے کیوں نہ ہوا اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ سندھ سے یا یورپ وغیرہ سے یا کسی اور ملک یا خطہ سے پیغمبر کا انتخاب کرتا تو بھی یہی سوال اٹھایا جاتا، لہٰذا ایسے عظیم الشان پیغمبر کے انتخاب کے لیے عالمی برادری کو وجود میں لانے کے لیے جس بھی خطہ کا انتخاب ہوتا تو لازماً دوسرے ممالک سے اعتراض دہرایا جاتا، کہ اس مقصد کے لیے فلاں علاقہ ہی کیوں منتخب کیا گیا؟ ہمارا خطہ کیوں نہ منتخب کیا گیا، حالانکہ اسی عالمی برادری کے وجود میں لانے کے لیے ضروری تھا کہ ساری دنیا کے لیے ایک ہی پیشوا اور پیغمبر ہونا چاہیے، اس لیے جہاں بھی اس کا انتخاب ہوتا تو دوسرے خطے کے لوگ یہ سوال اٹھاتے، اس لیے انسانوں کو چاہیے کہ اس بارے میں معاملہ اللہ پر ہی چھوڑ دیں کیونکہ جہاں بھی اس کو مناسب نظر آیا اس نے وہاں سے اس کا انتخاب کر ہی لیا اس میں کیا خرابی ہے؟ کیا اللہ کے ماننے

والوں کا اللہ تعالیٰ پر اتنا بھی بھروسہ نہیں ہے کہ اس نے جو بھی اور جہاں بھی انتخاب کیا اس میں ہمارے لیے بھلائی ہی بھلائی ہے۔ اگر یہ اعتراض کرنے والے اللہ کے وجود کے منکر ہیں تو ان کو اس اعتراض کا کوئی حق بھی نہیں علاوہ ازیں جس خطہ سے دین اسلام کی تبلیغ کی ابتدا ہوئی یعنی (مکہ معظّمہ) وہ پرانی دنیا، ایشیا، یورپ، افریقہ کے تقریباً بیچ کی جگہ ہے۔ چنانچہ جغرافیہ جاننے والوں پر یہ مخفی نہیں ہے اس کے متعلق معلومات کے لیے قاضی سلیمان منصور پوری کی کتاب رحمۃ للعالمین کی پہلی جلد کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ بہر حال مکہ معظّمہ پوری دنیا کا سینٹر ہونے کی بنا پر زیادہ حقدار تھا اور وہاں سے ہر ملک کی طرف دین کی آواز پہنچی اسی مرکزی حیثیت کی بنا پر عرب کا خطہ منتخب کرنا زیادہ موزوں تھا اور بلا شک وشبہ نبی اکرم ﷺ کی ہستی اس پورے علاقے میں ایک ہی ہستی تھی جو اس عظیم منصب کی حقدار تھی۔ بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں ایک بھی ایسی ہستی نہ تھی جو اس عظیم الشان منصب کے لیے منتخب کی جاتی۔ پوری دنیا میں صرف حضرت محمد ﷺ کی ہی بابرکت ہستی تھی جس کو اس کامل دین کا علمبردار بنایا گیا کیونکہ وہی اس بڑے منصب کے حقدار تھے، لہٰذا جب اللہ عالم الغیب والشہادہ نے پوری دنیائے عرب وعجم پر نظر ڈالی تو سارے مغضوب علیہم نظر آئے۔ کوئی بھی اس منصب کے لائق نظر نہیں آیا کہ جس کو اس رحمت والے دین کا حامل بنایا جائے، سوائے پیارے پیغمبر جناب محمد ﷺ کی بابرکت ہستی کے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ہی ان کا انتخاب فرمایا اس میں کیا اعتراض اور کون سی قباحت ہے؟ یہاں یہ ضرور ہے کہ انگریزی زبان بھی کافی دنیا میں بولی جاتی ہے، عالمی زبانوں میں سے ایک ہے لیکن کوئی انصاف کرے جس کو دونوں زبانوں (عربی، انگریزی) پر مکمل عبور ہو وہ یقیناً یہ مانے گا کہ عربی زبان میں جو وسعت ہے اس کا عشر وعشیر بھی انگریزی زبان میں نہیں ہے۔ اسی عربی زبان ایک سائینٹفک (Scientfic) ہے اس کے نحو، صرف، علم البلاغہ اور علم لغت کے مہارت رکھنے والوں سے پوچھو گے تو معلوم ہوگا کہ عربی زبان مختلف زبانوں سے کس قدر وسیع واعلیٰ درجہ پر فائز ہے۔ دنیا کی کوئی بھی زبان اس کا ہرگز ہرگز مقابلہ نہیں کرسکتی، یہ ہمارا دعویٰ ہے۔ جس کو کوئی

ان شاء اللہ رد نہیں کر سکتا، لہٰذا ایسے عالمی دین اور عالمی برادری کو وجود میں لانے کے لیے زبان بھی ایسی کا انتخاب ہونا چاہیے تھا جو سب زبانوں سے اعلیٰ ہو۔ عربی زبان کی لطافت نحو اور صرف زیر وزبر اور پیش یا الف، واؤ اور ی کے اختلاف کے لحاظ سے معنیٰ میں بے پناہ اختلاف آجاتا ہے یہ ایسی خصوصیت ہے جو دوسری زبان میں نہیں ملتی، اس ایک زبان میں مہارت لانے کے لیے جتنے علوم کی ضرورت ہوتی اتنے علوم کی ضرورت دوسری زبانوں میں نہیں ہوتی۔ لہٰذا کامل دین کے لیے عربی زبان کا انتخاب عین حکمت کا تقاضا تھی، اگر اس کی جگہ دوسری زبان منتخب کی جاتی تو وہ ہرگز اس کامل دین کے لیے موزوں نہ ہوتی، علاوہ ازیں جب اس دنیا کو ہمیشہ کے لیے رہنا تھا اور انسان کو کئی مسائل درپیش آتے رہتے ہیں لہٰذا اس کے لیے ایسی زبان کا اختیار کرنا ضروری تھا جس میں رہتی دنیا تک انسانوں کے مسائل کا حل موجود ہو، یہ عربی زبان اور اس کے الفاظ کے معانی کی بے پناہ وسعت ہی ہے کہ ہر زمانہ کی ضرورتوں کا ساتھ دیتی رہی ہے اور ہر دور میں انسانی مسائل کا حل اس میں دستیاب رہا ہے، دوسری زبان یہ پارٹ ہرگز ادا نہیں کر سکتی تھی، یہ صحیح ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی قوم کی بھی زبان عربی تھی کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ نبی ﷺ پوری دنیا میں جا کر ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچائیں۔ ان کی ڈائریکٹ (Direct preching) ایک قوم تک ہی رہ سکتی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو ڈائریکٹ عربوں کی طرف بھیجا تاکہ وہ اس کے حامل بن کر اس دین کو دوسرے ملکوں اور انسانوں تک پہنچائیں اس طرح یہ دین۔ قرآن وسنت پوری دنیا میں پہنچ گئے۔

یہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایسا انتظام ضرور کیا کہ اپنے کلام پاک کے تراجم پوری دنیا کے مشہور زبانوں میں میسر کروائے، اس طرح دنیا کلام پاک سے اپنی اپنی زبان میں مستفید ہوتی رہے، اور ہوتی رہے گی۔ (ان شاء اللہ)

خلاصہ کلام کہ جب تک دنیا اپنی صغر سنی میں تھی اور اپنے کمال کو نہ پہنچی تھی تب تک تو ہر ملک میں الگ الگ نبی آرہے تھے لیکن جب دنیا اپنی بلوغت وکمال کو پہنچی اور اپنے لسان

حال سے تقاضا کرنے لگی کہ اب میرے لیے ایک ہی رہنمائے آئے، ایک ہی دستور یا آئین، نمونہ یا لائحہ عمل آئے اور میرے تمام افراد ایک ہی برادری میں پرو لیے گئے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی بے پناہ رحمت اور فضل عظیم کے ساتھ یہ دعا قبول کی اور ان انسانوں میں سے ہی ایک عظیم الشان نبی جس کی صداقت وامانت، تقویٰ اور دیانت عالم آشکار تھی۔ اس سفیر کی جو زبان پوری دنیا کی زبانوں سے اعلیٰ تھی اس کو ایسے خطہ سے مبعوث کیا جو پوری دنیا کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا تھا جس نے آکر پوری دنیا کے انسانوں کو امن کا پیغام دیا۔ ان سب کو ایک ہی عالمی برادری سے منسلک کیا ان کو ایسا کامل دین عطا کیا جو کامل ہونے کے ساتھ ساتھ رہتی دنیا تک کے انسانوں کی ضروریات کو پورا کرتا رہے، اور وہ سارے ایک ہی معبود کے بندے بن کر آپس میں بھائی بھائی بن کر رہیں، کوئی بھی اپنے آپ کو دوسروں کا خادم سمجھے، یہ سارا نظام یا مقصد خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کے ورود مسعود کے ساتھ پورا ہوا، اس میں کون سی ایسی بات ہے جو اعتراض کے لائق ہے، باقی ان علم اور روشنی کے چمڑوں کو اسلام کے نہ غروب ہونے والے سورج (رسول اللہ ﷺ) سے خواہ مخواہ ضد یا عداوت ہے تو اس کا علاج ممکن ہی نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

سایہ رسول اللہ ﷺ

سوال: کیا آپ ﷺ کا سایہ تھا؟

الجواب بعون الوهاب: کچھ حضرات آپ ﷺ کے نور ہونے پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ آپ کا سایہ نہیں تھا۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے اولاً اس لیے کہ اللہ کی مخلوقات میں جتنی بھی حیات ہیں ان سب کا سایہ ہے نبی ﷺ کا اس سے مستثنیٰ ہونے کے لیے کتاب وسنت سے صحیح دلیل کا ہونا انتہائی ضروری ہے بغیر دلیل ایسی بات ہرگز قبول نہیں کی جاسکتی۔ ثانیاً مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور دونوں روایات کی سند حسن ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ حج کے سفر کے دوران کسی

بات پر حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے ناراض ہوئے اور سفر حج سے لوٹنے کے بعد بھی دو ماہ تک ناراض رہے اور بی بی صاحبہ کے پاس نہیں جاتے تھے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی روایت اس طرح ہے کہ

((فلما كان شهر ربيع الاول دخل عليها فرأت ظله فقالت ان هذا الظل رجل وما يدخل على النبى ﷺ فمن هذا فدخل النبى ﷺ الحديث .))

''یعنی جب ربیع الاول کا مہینا آیا تو آپ ﷺ بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے پاس آئے جنہوں نے آتے ہوئے نبی ﷺ کا سایہ دیکھا پھر کہا کہ یہ تو کسی آدمی کا سایہ ہے اور نبی ﷺ تو میرے پاس آتے ہی نہیں ہیں پھر یہ کون ہوسکتا ہے۔ پھر نبی ﷺ اس پر داخل ہوئے۔ پھر نبی ﷺ ان سے راضی ہوئے۔''

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کا سایہ موجود تھا جو آپ کی بیوی ام المومنین رضی اللہ عنہا نے دیکھا اس طرح کے صحیح دلیل ملنے کے بعد عوام کے یہاں اس بے ثبوت دلیل کی کوئی وقعت ہی نہ رہی۔ الحمد لله على ذالك

معراج نبوی ﷺ

سوال: آپ ﷺ کو معراج جسمانی ہوا تھا یا روحانی؟ بینوا وتوجروا!

الجواب بعون الوهاب: نبی مکرم ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ہی رات میں دو احسان ہوئے۔ ① اسراء۔ ② معراج دونوں روح مع الجسم سے ہوئے اسراء مسجد حرام (مکہ مکرمہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک ہوا اور معراج وہاں بیت المقدس سے آسمانوں کی سیر ہوئی۔ دونوں کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ اسراء کا تذکرہ سورۃ بنی اسرائیل کی ابتدا میں ہے اللہ رب العالمین فرماتے ہیں:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ

الْاَقْصَى﴾ (بنی اسرائیل : ۱)

''پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو ایک رات میں مسجد حرام سے لے کر مسجد اقصیٰ تک سیر کروائی۔''

اور ظاہر ہے کہ عبد کا اطلاق جسم اور روح دونوں پر ہوتا ہے نہ کہ صرف روح پر۔ اسی طرح ''اسریٰ'' کے لفظ سے صرف روح مراد لینا غلط ہے کیونکہ اگر واقعہ یہ روحانی ہوا تھا تو اس کے لیے قرآن کریم اس طرح فرماتا کہ:

((سبحان الذی اسریٰ عبدہ المسجد الاقصیٰ فی المسجد الحرام .))

بلکہ اس کی جگہ اس طرح کے الفاظ کہ'' اپنے بندے کو یہاں سے لے کر وہاں تک سیر کروائی۔''

یہ دلالت کرتے ہیں کہ یہ معاملہ روحانی ہرگز نہ تھا اس کے بعد احادیث صحیحہ میں وارد ہوا ہے کہ آپ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک پہنچانے کے لیے براق نامی جانور لایا گیا تھا جس پر آپ سوار ہوئے۔ کیا روحانی طور پر سیر کے لیے اس طرح سواری کے لیے جانور کی ضرورت تھی؟ اس کے بعد مسجد اقصیٰ سے آسمانوں کی طرف ارتقاء ایک نورانی سیڑھی کے ذریعے ہوا اس لیے اسے معراج کہا جاتا ہے اور معراج کی معنی سیڑھی ہے اس کے لیے صحیح بخاری کی شرح فتح الباری کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ کی جملہ احادیث مع آیات یکجا کر دی ہیں جن سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ معاملہ روح اور جسم دونوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے نہ کہ صرف روح سے پھر ہر آسمان کی ابتدا میں سیدنا جبریل علیہ السلام دروازہ کھلوا رہے تھے اور اس دروازے کے چوکیدار یا خازن کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھنا اور جبریل امین علیہ السلام کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بتانا اس کے بعد دروازہ کھلنا یہ سب باتیں جسم اور روح دونوں پر دلالت کرتی ہیں۔ روحانی یا خواب میں تو (اکثر طور پر) صرف یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ میں فلاں جگہ پہنچ گیا ہوں، درمیان کے معاملات سامنے نہیں آتے۔

علاوہ ازیں حدیث شریف میں ہے کہ جبریل علیہ السلام نے آکر مجھے نیند سے بیدار کیا اور وہاں سے لے جاکر زمزم کے کنویں کے پاس آئے اور میری قلب (دل) کو نکال کر پانی کے ساتھ دھویا پھر اس میں ایمان اور حکمت بھر دی اور پھر واپس اسی جگہ رکھ دیا اور وہاں سے باہر لے جاکر براق پر سوار کیا۔ کیا روح کے لیے اس طرح کی تفصیلات ومعاملات کی ضرورت تھی؟ معراج کا تذکرہ سورۃ النجم میں ہے کہ:

﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۝ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى﴾

(النجم: ۱۳ تا ۱۷)

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری مرتبہ اترتے وقت جبریل علیہ السلام کو سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک دیکھا اور وہ سدرۃ المنتہیٰ مؤمنین کی ہمیشہ رہنے کی جگہ جنت کے قریب تھی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی کچھ آیات کبریٰ کا مشاہدہ کیا اس مشاہدہ کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک نہ تو حد سے متجاوز ہوئی اور نہ ہی سیدھی راہ سے ہٹی آخر روحانی معاملہ میں اس طرح چڑھنا اور اترنا اور نظر کا حد سے متجاوز نہ ہونا وغیرہ کچھ بھی نہیں ہوتا یہ معاملہ تو ادھر ہی بیٹھے بیٹھے مشاہدہ میں آتا ہے اس کے لیے سواری پر اوپر نیچے اترنے کی باتوں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ آپ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معراج کے علاوہ روحانی طور پر یا خواب میں کئی مرتبہ مشاہدات کروائے گئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بیان تو فرمائے لیکن ساتھ یہ فرماتے کہ میں نے خواب میں یہ دیکھا ہے لیکن چونکہ یہ معاملہ خواب سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کا تعلق جسم سے ہے لہٰذا اس میں خواب کی تصریح نہیں فرمائی بلکہ اس میں خواب کے برعکس اوپر چڑھنے، اترنے وغیرہ کا ذکر ہے۔ کیا ایک سلیم الفطرت انسان ان دونوں واقعات میں فرق اور تفاوت سمجھ نہیں سکتا؟ باتیں تو اور بھی زیادہ ہیں لیکن طوالت سے کام لینا مناسب نہیں صرف آخری ایک بات پر اکتفاء کرتے ہیں۔ اگر یہ معاملہ بالفرض روحانی یا خواب کا ہوتا تو صبح کے وقت جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سفر اور مشاہدہ کا تذکرہ فرمایا تو کچھ ضعیف الایمان

شک میں پڑ گئے اور کچھ کفار نے اعتراض کیا کہ ہمیں بیت المقدس آنے جانے میں کئی ماہ بیت جاتے ہیں تو ایک ہی رات میں (اوپر آسمانوں والی بات تو دور رہی) بیت المقدس جا کر پھر واپس بھی آ گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ اعتراض جسمانی معاملہ پر ہے ورنہ خواب میں یا روحانی طرح انسان کہیں دور جا کر بہت کچھ دیکھ آتا ہے کبھی دیکھتا ہے کہ میں مکہ مکرمہ میں پہنچ گیا ہوں طواف کر رہا ہوں حجر اسود کو بوسہ دے رہا ہوں، ان سب معاملات کو بتانے پر کوئی بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ آج رات میں جاگتے ہوئے مکہ مکرمہ گیا تھا طواف وغیرہ کر کے واپس آ گیا ہوں تو یہ بات قابل اعتراض ہے اور واقع لوگ اس پر اعتراض کریں گے۔

اسی طرح اگر یہ معاملہ صرف روحانی تھا تو کفار کا اعتراض بالکل بے معنی ہے اور وہ اس طرح نہ کہتے کہ اگر واقعتاً تم گئے ہو تو ہمیں بیت المقدس کی نشانیاں بتا دو اور آپ ﷺ بھی ان کی اس بات پر پریشان نہ ہوتے کہ میں خاص طور پر نشانیاں نوٹ کرنے تو نہیں گیا تھا اور اب ان کو کیا بتاؤں بلکہ آپ ﷺ فرما دیتے کہ میں نے یہ دعویٰ تو نہیں کیا کہ میں جسم کے ساتھ سیر کر کے آیا ہوں یہ صرف خواب یا روحانی معاملہ تھا۔ اس طرح فرما دیتے اور سارا معاملہ ختم ہو جاتا۔ جب آپ ﷺ کی معراج والی یہی بات ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے کفار نے بطور اعتراض پیش کی تو انہوں نے فرمایا: اگر نبی ﷺ نے یہ بات کہی ہے تو آپ ﷺ نے بالکل سچ فرمایا ہے واقعتاً آپ نے یہ سیر کی ہے اس میں بھی واضح دلالت موجود ہے کہ یہ معاملہ جسمانی تھا کیونکہ اگر یہ واقعہ روحانی تھا یا محض خواب تھا تو پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ صاف فرما دیتے ارے کیا بات کرتے ہو یہ تو روحانی معاملہ ہے یا خواب کا واقعہ ہے اس پر اعتراض کیا معنی رکھتا ہے؟ بہرحال ایک منصف مزاج اور حق پرست کے لیے مذکورہ بالا دلائل کافی وشافی ہیں باقی کج بحث اور ہٹ دھرم لوگ کبھی بھی حق کو سمجھ نہیں سکتے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حقیقت ایمان

سوال: ایمان بڑھتا اور کم ہوتا ہے یا نہیں؟ بینوا بالدلیل توجروا؟

الجواب بعون الوهاب: اعمال صالحہ اور پختہ یقین کی وجہ سے ایمان بڑھتا ہے اور بدعملی اور کم یقینی کی وجہ سے کم ہوجاتا ہے اس کا ثبوت قرآن وحدیث میں کئی جگہوں پر ہے جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ﴾

(التوبة: ١٢٤)

﴿وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا﴾ (الانفال: ٢)

اور ظاہر ہے کہ جو چیز بڑھتی ہے وہ لازمی اور یقینی طور پر کم بھی ہوسکتی ہے جب قرآن سے زیادتی ایمان کا ثبوت ملا تو اس کی مخالف یہ بات ہوئی کہ ایمان ناقص یا کم بھی ہوا۔ یہ ایسی واضح حقیقت ہے جس کا سوائے کم عقل کے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا، واللہ اعلم بالصواب

اس سلسلہ میں صحیح بخاری کے کتاب الایمان کو مطالعہ میں لانا انتہائی مفید ثابت ہو گا۔ واللہ اعلم

حیات انبیاء علیہم السلام

سوال: کیا انبیاء کرام علیہم السلام قبروں میں زندہ ہیں، اگر زندہ ہیں تو ان کی زندگی کی حقیقت کتب شرع میں ہے یا نہیں، نیز حدیث ((الانبیاء احیاء فی قبورھم.)) بیہقی کا کیا مطلب ہے؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہئے کہ سوال میں مذکورہ حدیث (الانبیاء احیاء) کو بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ بنام حیاۃ الانبیاء میں تین اسناد کے ساتھ مرفوعاً اور ایک سند کے ساتھ موقوفاً ذکر کیا ہے اور چاروں طرق سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر ختم ہوجاتے

ہیں لیکن ان چاروں احادیث کی اسناد بالکل ضعیف اور نا قابل احتجاج ہیں بلکہ ان کے موضوع ہونے کا قائل ہوا جائے تو یہ مبالغہ نہیں ہوگا ذیل میں وہ احادیث بمع اسانید ذکر کر کے ان کے رواۃ کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ملاحظہ فرمائیں!

قال البیهقی فی رسالته المسماة بحیاة الانبیاء:

❶...... ((اخبرنا ابو سعید احمد بن محمد بن الخلیل الصوفی احمد الله قال انبأ ابو احمد عبدالله بن عدی الحافظ قال ثنا قسطنطین بن عبدالله الرومی قال ثنا الحسن بن عرفة قال حدثنی الحسن بن قتیبة المدائنی ثنا المسلم بن سعید الثقفی عن الحجاج بن الاسود عن ثابت البنانی عن انس رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ الانبیاء احیاء فی قبورهم یصلون.))

اس روایت میں دو راوی ہیں جن کے اوپر ہم نے ۱،۲ کے تعداد لگائے ہیں ان میں سے پہلا قسطنطین بن عبداللہ الرومی ہے یہ مجہول ہے اور جہالت راوی کی جرح شدید کے باب میں سے ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی رومی شخص تھا جیسا کہ اس کے نام اورنسبت سے ظاہر ہے اور رومیوں کی اسلام دشمنی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں اسلام نے ان کی حکومت کو طشت از بام کر دیا روی تخت تاج سے محروم ہوگیا قیصر روم ہمیشہ کے لیے صفحہ وجود سے معدوم ہوگیا" وملك قیصر فلا قیصر بعده" لہٰذا وہ اسلام سے جوبھی دشمنی کریں وہ کم ہے لہٰذا اس روایت کو گھڑنے میں اس کی کارروائی ہوسکتی ہے اس کے بعد حسن بن قتیبہ کا نام ہے اس کے متعلق امام دارقطنی فرماتے ہیں'' متروک الحدیث'' اصول حدیث کے ماہرین کو بخوبی معلوم ہے کہ متروک راوی روایت نہ متابعت اور نہ ہی استشہاداً پیش کی جاسکتی ہے کیونکہ ایسا راوی شدید مجروح ہے کیونکہ متروک عموماً واغلباً متھم بالکذب ہوتا ہے لہٰذا یہ روایت ان دو اسباب کی وجہ سے نا قابل استشہاد ہے لہٰذا اسے حدیث کہنا بھی درست نہیں۔

۲...... ((قال البيهقي في الرسالة السابقة اخبرنا الثقة من اهل العلم قال انبأ ابو عمرو بن حمدان قال انبأ ابو يعلى الموصلي ثنا ابو الجهم الازرق بن علي ثنا يحييٰ بن ابي بكر ثنا المسلم بن سعيد عن الحجاج عن ثابت البناني عن انس بن مالك رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ الانبياء احياء في قبورهم يصلون .))

اس روایت میں بھی دو راوی مجروح ہیں ایک بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کا شیخ کیونکہ وہ مبہم ہے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کا اس کا نام "الثقة من اهل العلم" لکھنا کافی نہیں کیونکہ کوئی تلمیذ مرتباً اپنے استاذ کو یا شیخ کو ثقہ یا قابل اعتماد سمجھتا ہے لیکن وہ مجروح اور نا قابل حجت ہوتا ہے کیونکہ اسے اس کے متعلق مکمل خبر نہیں ہوتی کہ فلاں میں کوئی یہ خرابی بھی ہے اور اس خرابی یا نقص یا سبب جرح کا علم کسی دوسرے امام فن کو ہوتا ہے اور چونکہ جرح خصوصاً مبین اور مفسر تعدیل پر مقدم ہوتی ہے لہٰذا ممکن ہے کہ جسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ ثقہ سمجھ رہیں ہوں وہ مجروح شدید ہو اور اس کی جرح مفسر بھی ہو لہٰذا جب تک اس کا نام بیہقی صاحب نہیں لیتے تب تک وہ مبہم کے حکم میں ہیں اور ابہام کسی بھی حدیث پر صحت کا حکم لگانے سے مانع ہے "كما لا يخفى على من له مما رسته والمام باصول الحديث" دوسرا نام یحییٰ بن ابی بکر کا ہے جس کا کتب رجال میں کوئی تذکرہ موجود نہیں لہٰذا ایسے مجاہیل اور غیر معروف اور مبہم رواۃ پر مبنی روایت کا حال کیا ہونا چاہیے۔

ہر منصف مزاج اور اعتدال پسند شخص خود فیصلہ کر سکتا ہے۔

۳...... ((قال البيهقي في الرسالة الماضية اخبرنا ابو عبدالله الحافظ ثنا ابو حامد احمد بن علي الحسنوي املاء ثنا ابو عبدالله محمد بن عباس الحمصي ثنا ابو الربيع الزهراني ثنا اسماعيل بن طلحة بن يزيد عن محمد بن عبد الرحمان بن

ابی لیلیٰ عن ثابت عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال ان الانبیاء لا یترکون فی قبورھم بعد اربعین لیلة ولکنھم یصلون بین یدی اللہ عزوجل حتی ینفخ فی الصور.))

اس روایت میں چار آفتیں ہیں پہلی بیہقی کے شیخ ابوعبداللہ الحافظ کا استاذ ابو حامد احمد بن علی الحسنوی ہے یہ متہم بالکذب راوی ہے خود امام حاکم نے اس متعلق فرمایا ہے کہ "ھو فی الجملة غیر محتج بحدیث" یعنی اس راوی کی حدیث قابل احتجاج نہیں اور خطیب بغدادی فرماتے ہیں "لم یکن بثقة" یعنی یہ ثقہ نہیں ہے۔ یہ "صیغہ لم یکن بثقة یا لیس بثقة" شدید جرح کے الفاظ ہیں اور اس کے متعلق امام محمد بن یوسف جرجانی فرماتے ہیں کہ "ھو کذاب" یعنی یہ کذاب ہے یعنی یہ جھوٹی حدیثیں بنانے والا ہے اسی طرح کے الفاظ اس کے متعلق مشہور محدث ابو العباس الاصم نے بھی فرمائے ہیں بہرحال یہ راوی کذاب ہے۔

دوسری آفت ابوعبداللہ محمد بن الحمصی ہے اس کا ترجمہ کہیں بھی موجود نہیں معلوم نہیں، کہاں کی آفت ہے اسی طرح ایک اور آفت اسماعیل بن طلحہ بن یزید ہے یہ بھی غیر معروف ہے اس کا ترجمہ بھی ہمیں کہیں نہیں ملا ہم ہماری بات چھوڑیں آج کے مشہور محقق ناصر الدین الالبانی جو عرب کے مشہور محقق فاضل عالم ہیں اور حدیث کے علوم میں مہارت تامہ رکھتے ہیں فن رجال میں بھی کافی مہارت رکھتے ہیں وہ بھی اپنے رسالہ سلسلة الاحادیث الضعیفہ والموضوعة کے جزء ثالث میں لکھتے ہیں کہ محمد بن عباس اور اسماعیل بن طلحہ کا علم انہیں نہیں ہو سکا اور نہ ہی انہیں یہ معلوم ہو سکا کہ کسی محدث نے ان کا ترجمہ قائم بھی کیا یا نہیں اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں راوی کیا ہیں دونوں مجہول وغیر معروف ہیں چوتھی آفت محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی صورت میں ہے اس کے متعلق رجال کی کتب میں ہے کہ سئی الحفظ جداً یعنی اس کا حافظہ سخت بگڑ چکا تھا۔ بہرحال ان آفات میں سے ہر کوئی اپنی مثال آپ ہے ایک آفت بھی اس روایت کے ساقط الاعتبار ہونے کے لیے کافی ہے چہ جائیکہ ایک دو کے

بجائے ایک جگہ پر چار جمع ہو جائیں تو اس روایت کا کیا حال ہو گا خود فیصلہ کریں۔ واللّٰہ الهادي الى سواء الصراط .

۴ ...... چوتھی روایت موقوف ہے۔ قال البيهقي في الرسالة المذكورة:

((اخبرنا ابو عثمان الامام رحمه الله انبأ زاهر بن احمد انبأ ابو جعفر محمد بن معاذ المالينى ثنا الحسين بن الحسن ثناء مؤمل ثنا عبدالله بن ابى حميد (واسم ابى حميد غالب) الهذلى عن ابى المليح عن انس بن مالك الانبياء فى قبورهم احياء يصلون .))

یہ موقوف روایت بھی بالکل نا قابل توجہ ہے کیونکہ اس میں تین راوی مجروح ہیں پہلا راوی ابو جعفر محمد بن معاذ المالینی غیر معروف ہے اس کا ترجمہ کہیں نہیں ملا۔

دوسرا راوی مؤمل ہے یہ ابن عبدالرحمٰن بن العباس ابن عبداللہ بن عثمان بن ابی العاص ثقفی ہے اور بصری ہے اس کے متعلق حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب تقریب التهذیب میں لکھتے ہیں کہ ضعیفٌ یعنی یہ راوی ضعیف ہے۔

تیسرا راوی عبید اللہ بن ابن حمید الهذلی ہے اس کے متعلق حافظ صاحب تقریب میں فرماتے ہیں کہ "ابو الخطاب البصری متروک الحدیث" یعنی یہ تیسرا راوی پہلے دو راویوں سے بھی گیا گذرا ہے بہرحال اس روایت کے چار طرق امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ میں ذکر فرمائے ہیں جن کا حال آپ نے بخوبی ذہن نشین کر لیا ہو گا یعنی یہ روایات قطعاً قابل اعتبار اور قابل احتجاج نہیں رہی باقی رہا یہ مسئلہ کہ انبیاء علیہم السلام عالم برزخ میں ہیں یا نہیں تو اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ جب نص قرآنی کے مطابق شہداء زندہ ہیں تو انبیاء علیہم السلام شہداء کے بھی سردار ہیں کس طرح زندہ نہ ہوں گے یقیناً زندہ ہیں لیکن اس زندگی اور اس دنیا والی زندگی میں عظیم تفاوت اور بڑا فرق ہے۔ ان کے زندہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہ نکالا جائے کہ انہیں دنیوی زندگی حاصل ہے اور اس دنیا کی طرح لذتوں سے متمتع بھی ہوتے رہتے ہیں جس

طرح کچھ جاہلوں کا خیال ہے بلکہ یہ دنیوی زندگی یقیناً ان انبیاء علیہم السلام کی وفات اور شہداء کی شہادت پر ختم ہوگئی اس پر عقل ونقل اور حس ومشاہدہ شاہد ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿انك ميت وانهم ميتون﴾

﴿كل نفس ذائقة الموت.....﴾ ﴿وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم على اعقابكم ..... الآية﴾

بہرحال کتاب وسنت، حس ومشاہد اس پر دال ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اور شہداء اس دنیا سے تو کوچ کر گئے ہیں اور ان پر موت واقع ہو چکی ہے اور ان کی دنیاوی زندگی ختم ہو چکی ہے یہی سبب ہے کہ ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے ہیں کہ آپ کی عمر مبارک ۶۳ سال تھی ورنہ اگر دنیوی زندگی ختم نہ ہوئی ہوتی تو آج کل آپ کی عمر مبارک چودہ سو سالوں سے بھی متجاوز ہوتی۔

((وهذا ظاهر وباهر لاينكر مبتدئی فضلاً عن عالم.))

بہرحال جب دنیوی زندگی اختتام پذیر ہوئی تو پھر آپ کو کونسی زندگی حاصل ہے اس کے متعلق قرآن کریم ہی رہنمائی کرتا ہے کہ:

﴿بل احياء ولكن لا تشعرون﴾

یعنی انہیں ایسی زندگی حاصل ہے جس کا شعور واحساس تمہیں نہیں ہوسکتا، دوسری جگہ پر ارشاد فرمایا کہ:

﴿بل احياء عند ربهم يرزقون﴾ (آل عمران)

یعنی وہ زندہ ہیں اُس عالم میں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں انہیں رزق دیا جاتا ہے نہ کہ اس دنیا میں ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں زندہ ہونے کا احساس ہمیں نہیں ہوسکتا کیونکہ ہم صرف اس محسوس زندگی کا ہی شعور واحساس رکھتے ہیں باقی دیگر معاملات اور جو عالم ہماری حواس سے ماوراء ہے اسے سمجھنا اور اس کا احساس رکھنے کے متعلق قدرت کی طرف سے ہمیں کوئی بھی آلہ یا وسیلہ یا ذریعہ نہیں ملا ہے مطلب کہ انہیں زندگی تو حاصل ہے اور بوجہ اتم حاصل ہے لیکن اُس عالم میں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ کہ اس دنیا میں بس اس کے متعلق اتنا ہی کلام کیا جا

سکتا ہے مزید کچھ کہنا حد سے متجاوز ہونا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے کام سے محفوظ رکھے آمین!
عقلمند کے لیے اتنا ہی کافی وشافی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

کیا ہندوؤں میں نبوت تھی؟

سوال: کرشن گوتم بدھ اور زردشت کے متعلق وضاحت کریں؟

الجواب بعون الوھاب: کرشن گوتم بدھ اور زردشت وغیرہم کے متعلق صحیح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ قرآن وحدیث میں ان کے متعلق کچھ بھی نہیں آیا ہے۔ قرآن نے اصولی طور پر بتایا ہے کہ ہم نے ہر ملک میں کوئی نہ کوئی نبی اور ہادی نذیر ضرور بھیجا ہے اور قرآن کریم میں کچھ نبیوں کا احوال بیان بھی کیا گیا ہے اور کچھ کا نہیں اور ہمارا یہ بھی ایمان ہے کہ ہندوستان اور دوسرے ممالک میں بھی نبی ضرور آئے ہوں گے۔ لیکن کیا وہ مذکورہ آدمی ہو سکتے ہیں؟ اس کے بارے میں ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔

کہ واقعی وہ نبی ہوں لیکن بعد کے لوگوں نے ان کی تعلیم کو بگاڑ کر کفر وشرک کی ملاوٹ کر دی ہو جس طرح یہود ونصاریٰ نے کیا کہ ان کا اصل دین تو صحیح تھا لیکن ان کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد انہوں نے تورات وانجیل میں تحریف کر دی اور ان کی تعلیمات کو بگاڑ دیا۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ مذکورہ ہستیاں بھی اصل میں نبی ہوں لیکن ان کے جانے کے بعد ان کی امت نے راستے کو تبدیل کر دیا ہو بہرحال ان کتابوں میں تحریف ہو چکی ہے اس لیے ان میں حق کی تلاش عبث اور فضول ہے۔

صحیح معنی میں حق صرف کتاب اللہ یعنی قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ لہٰذا حق صرف وہاں سے معلوم ہوگا اور یہ ہو سکتا ہے کہ یہ واقعی نبی نہ ہوں بلکہ محض فلسفی یا معلم وغیرہ ہوں۔ بہرحال چونکہ کتاب وسنت میں ان کے متعلق کوئی وضاحت نہیں ہے اس لیے حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس سلسلہ میں سکوت وتوقف اختیار کیا جائے۔ واللہ اعلم!

باقی حضرت لقمان علیہ السلام ایک دانا، وحکیم اور نیک بندہ تھا۔ قرآن کریم کے طرز بیان سے

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی نہیں تھے بلکہ ایک دانا اور نیک صالح بندہ تھا، باقی حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں صحیح بات یہ ہے وہ نبی تھے کیونکہ قرآن کریم میں ان کے احوال کے آخر میں خضر علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي﴾ (الکہف: ۸۲)

''اور یہ میں نے اپنی طرف سے نہیں کیا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام صاحب وحی تھے اور وحی انبیاء کرام کی طرف ہی آتی ہے اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو علم سیکھنے کی غرض ان کی طرف بھیجا اور ظاہر ہے کہ ایک نبی کو نبی کی طرف ہی علم سیکھنے کی غرض بھیجنا مناسب ہے نہ کہ غیر نبی کی طرف۔ واللہ اعلم!

باقی حضرت خضر علیہ السلام کے بارے صحیح بات یہ ہے کہ وہ فوت ہو چکے ہیں کیونکہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے وعدہ لیا گیا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتی میں جو بھی زندہ رہا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ضرور ایمان لائے گا اور آپ کی مدد کرے گا جس طرح سورۃ آل عمران پارہ ۳ رکوع ۹ میں ہے۔

لہٰذا حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہوتے تو ضرور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کے لیے آتے اور آپ پر ایمان لاتے مگر ایسا کوئی بھی واقعہ نہیں ہے، لہٰذا وہ فوت ہو چکے ہیں۔ قرآن وحدیث کے مطابق اس وقت صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں جو کہ آسمان پر ہیں اور آخری وقت میں نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ باقی کسی بھی نبی کے زندہ ہونے کا کوئی پختہ اور کھرا ثبوت نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

کتاب الصلاۃ
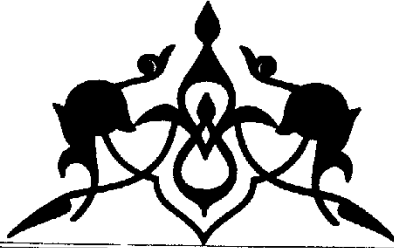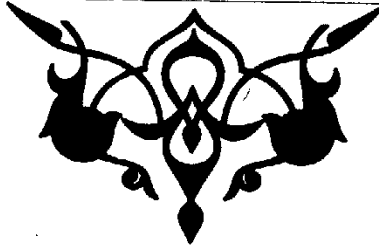
بے وضو شخص کا قرآن پڑھنا

سوال: بغیر وضو قرآن مجید ہاتھ میں لے کر پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوھاب: اُس کتاب (یعنی خط) میں جس کو جناب حضرت رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن حزم کے لیے لکھوائی تھی من جملہ اور احکام کہ یہ بھی تحریر کیا گیا تھا کہ ''لا یمس القرآن الا طاھر'' یعنی طہارۃ وپاکی وضو کے بغیر کوئی آدمی قرآن کریم نہ چھوئے اس حدیث کو امام مالک نے مرسل روایت کیا ہے لیکن نسائی اور ابن حبان نے موصول ذکر کیا ہے اگرچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بلوغ المرام میں نسائی کی روایت کے متعلق ''انہ معلول'' کہا ہے یعنی یہ حدیث معلول ہے یعنی لیکن اس میں علت ہے اس کے شارح صاحب سبل السلام فرماتے ہیں کہ مصنف نے اس حدیث کو معلول اس لیے کہا ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی سلیمان بن داؤد ہیں اور مصنف اس کو وہم کی وجہ سے سلیمان بن داؤد الیمانی سمجھ بیٹھے ہیں۔ [1]

(جو اتفاقاً ضعیف ومتروک ہے) لیکن اس سند میں سلیمان بن داؤد یمانی نہیں ہیں بلکہ سلیمان بن داؤد خولانی ہیں جو ثقہ ہیں اس پر ابوزرعہ نے ثنا کی ہے اور اسی طرح حافظ ابو حاتم اور عثمان بن سعید اور دوسرے حفاظ حدیث میں سے ایک جماعت نے بھی اس پر ثنا کی ہے یعنی اس کی توثیق کی ہے لہٰذا یہ علت حدیث کی سند میں نہ رہی اور سند قابل اعتماد بن جاتی ہے جاننا چاہیے کہ اس کتاب (یعنی جو عمرو بن حزم کے لیے آنحضرت ﷺ نے تحریر کروائی تھی) کے متعلق حفاظ حدیث میں اختلاف ہے لیکن محققین نے اس کتاب کو قبول کیا ہے۔

علامہ مبارکپوری تحفۃ الاحوذی میں فرماتے ہیں:

((قال ابن عبدالبر انه اشبه المتواتر لتلقی الناس له بالقبول.))

''یعنی ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ یہ کتاب متواتر کے مشابہ ہے کیونکہ لوگوں نے

---

[1] سبل السلام ج۱، ص ۷۰.

اسے قبولیت سے لیا ہے۔"

((وقال یعقوب ابن سفیان" لا اعلم کتابا اصح من هٰذا الکتاب فان اصحاب رسول الله ﷺ والتابعین یرجعون الیه ویدعون رأیهم .))

"یعنی مشہور محدث یعقوب بن سفیان فرماتے ہیں کہ مجھے اس کتاب سے زیادہ صحیح کتاب کا علم نہیں (یعنی یہی زیادہ صحیح کتاب ہے۔) کیونکہ حضرت رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین بھی اس کتاب کی طرف رجوع کرتے تھے۔ (یعنی احکام کے سلسلہ میں) اور اس کی وجہ سے اپنی رائے کو بھی چھوڑ دیتے تھے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب صحیح ہے:

((وقال الحاکم قد شاهد عمر بن عبدالعزیز وامام عصره الزهری بالصحیحة بهٰذا لکتاب .))

"اور مشہور محدث امام حاکم فرماتے ہیں کہ اس کتاب کی صحت پر حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ راشد اور اپنے عصر کے امام مشہور محدث زہری شہادت دے چکے ہیں۔"

خلاصہ کلام! راجح یہی ہے کہ یہ کتاب صحیح ہے اور یہ کتاب آنحضرت ﷺ نے عمرو بن حزم کے لیے لکھوائی تھی اور اس میں یہ حکم موجود ہے کہ قرآن مجید کو طہارت (وضو) کے بغیر مس نہ کیا جائے اس کی مؤید اور بھی حدیثیں ہیں۔ مثلاً طبرانی، صغیر وکبیر میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

((وعن رسول الله ﷺ قال لا یمس القرآن الا طاهر .)) [1]

"بیشک حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مس نہ کرے قرآن کو مگر طاہر (پاک وضو سے)"

---

[1] ذکر الهیثمی فی مجمع الزوائد (۱/ ۲۷۶).

اور ہیثمی مجمع الزوائد میں فرماتے ہیں کہ:

((ورجاله موثقون.)) (المجمع جلد نمبر ١)

اس حدیث کی سند کے سب راوی پختہ ہیں اسی طرح حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((قال عثمان بن ابی العاص وکان شابا: وفدنا علی رسول الله ﷺ فوجدونی افضلهم اخذا للقرآن وقد فضلتهم بسورة البقرة فقال النبی ﷺ قد امرتك علی اصحابك وانت اصغرهم ولا تمس القرآن الا وانت طاهر.)) [1]

''حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد کی صورت میں آئے پھر ہمارے ساتھیوں نے محسوس کیا کہ میں ان سے زیادہ قرآن لے سکتا ہوں یا لے چکا ہوں اور میں ان سے پہلے سورۂ بقرہ کو حاصل کرنے کی فضیلت پا چکا تھا پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تجھے تمہارے ساتھیوں کا امیر بنایا ہے (یعنی تمہارے زیادہ قرآن کے حصول کی وجہ سے) (گو) تم ان سے چھوٹے ہو اور قرآن کو طہارۃ کے بغیر مس نہ کرنا۔''

ہیثمی مجمع الزوائد جلد نمبر ١ میں فرماتے ہیں:

((رواه الطبرانی فی الکبیر.))

یعنی یہ حدیث طبرانی نے کبیر میں ذکر کی ہے:

((وفيه اسمعيل بن رافع ضعفه یحییٰ بن معین والنسائی وقال البخاری ....مقارب الحدیث.))

''یعنی اس حدیث کی سند میں ایک راوی بنام اسمٰعیل بن رافع واقع ہیں جس کو

---

[1] ذکره الهیثمی فی مجمع الزوائد (١/ ٢٧٧).

یحییٰ بن معین اور نسائی نے ضعیف کہا ہے۔"

اور امام بخاری فرماتے ہیں کہ ثقہ ہیں اور ان کا حال حدیث میں ثقاہت کے قریب ہے حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں فرماتے ہیں کہ "ضعیف الحفظ" یعنی یہ راوی حافظہ کا کمزور تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ راوی صدوق ہے درشدید مجروح نہیں ہے بلکہ جن محدثین نے ان کو کمزور کہا ہے وہ حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے نہ کسی اور وجہ سے لہٰذا ایسے راوی سے متابعات وشواہد میں کام لیا جا سکتا ہے چونکہ اس سے پہلے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث گذر چکی ہے جس کی سند کے سب راوی ثقہ ہیں تو یہ حدیث جس کی سند کا راوی ضعف کا حامل ہے اس کی مؤید بن جائے گی۔

ویسے بھی قرآن حکیم شعائر اللہ میں سے ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن حکیم میں شعائر اللہ کے متعلق فرمایا ہے کہ:

﴿وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ (الحج: ۳۲)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم کرنا دلوں کی تقویٰ میں سے ہے لہٰذا قرآن مجید کی عظمت وعلو شان بھی اس کا متقاضی ہے کہ اس کو بغیر طہارۃ لے کر نہ پڑھا جائے۔ هذا ما عندي والله اعلم بالصواب

مرض انزائم کا حکم

سوال: ایک آدمی کو مسلسل البول کی بیماری ہے اور چلتے پھرتے پیشاب کے قطرے گرتے رہتے ہیں یعنی وہ پاک رہ ہی نہیں سکتا اور وہ بیچارہ ہر نماز کے وقت وضوء کرتا ہے اور اپنی شرمگاہ پر بھی پانی چھڑکتا ہے کیونکہ وہ نماز چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے کہ "مفتاح الصلوٰة الطهور" "نماز کی کنجی پاکی ہے۔" لہٰذا چونکہ یہ آدمی پاک نہیں رہ سکتا اس لیے اس کی نماز نہیں ہوتی اب اس کے متعلق قرآن سے صحیح مسئلہ بتایا جائے؟

الجواب بعون الوهاب: نماز اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض ہے اور اس کو کسی حالت میں ترک نہیں کیا جا سکتا تو لیٹے لیٹے ہی پڑھے لیکن بالکلیہ ترک کی اجازت نہیں۔ اسی طرح نماز کے لیے طہارۃ بھی شرط ہے لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں یہ قاعدہ بھی بیان فرما دیا ہے کہ

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ....﴾ (البقرة: ٢٨٦)

''کسی متنفس کو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی وسعت قدرت سے زیادہ مکلف نہیں بناتا۔''

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کسی آدمی کو ایسی تکلیف نہیں دیتا یا کسی کو ایسا حکم نہیں دیا کرتا جو اس کی وسعت اور مقدور سے باہر ہے اس لیے اگرچہ پیشاب وغیرہ کی نجاست سے پرہیز کرنا تو واجب ہے اس سے پاکی حاصل کرنا اشد ضروری ہے لیکن اگر ایک آدمی کسی عارضہ کی وجہ سے اس سے پرہیز کر ہی نہیں سکتا تو پھر بھی اس کو یہ حکم دیتا کہ تم نماز بھی ضرور پڑھو اور پاکی بھی ضرور ہی حاصل کرو ایسا حکم دیتا ہے جو تکلیف مالا یطاق کی ضمن میں آجاتا ہے ویسے اللہ تعالیٰ مالک ہے ہم اس کے مملوک ہیں اس لیے وہ ہمیں کیسا ہی شاق حکم دے ہمیں اس کے بارہ میں چوں وچراں کرنے کا حق نہیں ہے اور سر تسلیم خم کرنا ہمارا فرض ہے لیکن اس ذات جل وعلا نے خود ہی اپنے فضل وکرم سے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ تکلیف مالا یطاق نہیں دیا کرتا۔

اس لیے یہ مریض اپنی قدرت کے مطابق حتی الامکان پیشاب سے پرہیز کرتا ہے اور اس سے طہارت حاصل کرتا ہے تو مزید جو کچھ ہوگا وہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے معاف فرمائے گا اور ان شاء اللہ اس سے مؤاخذہ نہ ہوگا۔ (بشرطیکہ حتی المقدور وہ ہر طرح کی اس سے پرہیز کرنے کی سعی کرے اگر خود ہی تساہل سے کام لے گا تو یقیناً مؤاخذہ ہوگا) ہماری اس تحقیق پر ایک حدیث سے بھی دلیل لائی جا سکتی ہے۔ بخاری شریف میں باب استحاضہ میں ایک حدیث وارد ہے۔ ملاحظہ فرمائیے!

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش نے حضرت رسول اللہ ﷺ کی جناب میں یہ عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ میں

پاک ہوتی ہی نہیں ہوں (یعنی خون ہمیشہ جاری رہتا ہے) پھر کیا میں نماز کو ترک کر دوں؟ تو حضرت رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ یہ حیض نہیں ہے (یعنی جس کی وجہ سے نماز کو ترک کیا جاتا ہے۔) بلکہ یہ رگ کا خون ہے پھر (تم ایسا کرو کہ) جب حیض کے دن آئیں تو نماز کو چھوڑ دو۔ جب حیض کے دن پورے ہو جائیں۔ یعنی جتنے دن تم کو گذشتہ حیض آیا کرتا تھا وہ ختم ہو جائیں تو خون کو دھوڑالو اور پھر نماز پڑھتی رہو۔ (یہ خون تم کو نماز سے نہیں روکے گا)

اور اسی بخاری کی اسی حدیث میں دوسری سند سے یہ الفاظ اس میں زائد ہیں کہ:

((توضئی لکل صلوٰۃ))

''یعنی پھر تم ہر نماز کے لیے نیا وضو کرتی رہو۔''

اس میں جو یہ الفاظ آئے ہیں کہ:

((انی لا اطھر .))

''میں پاک رہ ہی نہیں سکتی۔''

ان سے بجا طور پر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ جو کوئی شخص کسی بیماری یا عارضہ کی وجہ سے (جس طرح وہ عورت سائلہ بیماری کی وجہ سے خون سے پاک رہ نہیں سکتی تھی) پاک نہیں رہ سکتا (کسی بھی عارضہ سے، خون کے بہنے سے یا پیشاب کے قطرات بہنے سے یا کسی اور عارضہ کی وجہ سے) تو اس کو بھی نماز ترک کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے مستحاضہ عورت کو نماز کے ترک کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ اسی حال میں نماز پڑھنے کا حکم فرمایا کیونکہ نماز تو کسی حال میں بھی ترک نہیں کی جا سکتی۔

اسی طرح تسلسل البول والے مریض کو بھی ہر حال میں نماز پڑھنی ہو گی۔ اور ان کی یہ بیماری نماز سے نہیں روک سکتی البتہ اس کو ہر نماز کے لیے نیا وضو کرنا پڑے گا جس طرح آپ نے اس عورت کو ہر نماز کے لیے نئے وضو کرنے کا حکم فرمایا۔

خلاصہ کلام کہ تسلسل البول کے مریض کو کسی حالت میں بھی نماز ترک کرنی نہیں چاہیے

اور اس کی نماز ہو جاتی ہے البتہ اس کو اپنی طہارۃ کے لیے حتی الامکان پوری کوشش کرنی چاہیے اور ہر نماز کے وقت نیا وضو کرے اور اپنی شرمگاہ کو دھو ڈالے پھر نماز پڑھتا رہے۔ انشاء اللہ مقبول ہوگی۔ هذا ما عندی والعلم عند اللّٰه العلّام وهو اعلم بالصواب.

ہندو دھوبی کا حکم

سوال: کیا ایک ہندو مسلمان کے کپڑے دھو سکتا ہے؟

الجواب بعون الوهاب: جی ہاں مسلمان کے کپڑے ہندو دھو سکتا ہے۔ کیونکہ حدیث میں موجود ہے کہ ایک یہودی کا بیٹا نبی ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا۔

((عن انس رضی اللہ عنہ قال كان غلام يهودی يخدم النبی ﷺ فمرض فاتاه النبی ﷺ يعوده فقعد عند رأسه فقال له اسلم فنظر الى ابيه وهو عنده فقال اطع ابا القاسم فاسلم فخرج النبی ﷺ وهو يقول الحمد لله الذی انقذه من النار.))[1]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غیر مسلم کی خدمت مسلمان کے لیے جائز ہے۔

مریض کی امامت

سوال: سلسل البول کا مریض دوسرے کسی امام کے نہ ہونے کے سبب نماز کی امامت کرا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: سلسل البول کا عارضہ بھی ایک بیماری ہے جیسے دوسری بیماریاں ہیں اور جیسے دوسری بیماریوں والا امام ہو سکتا ہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ اگر دوسرا امام نہ ہو اور یہ سلس البول کا مریض امامت کا زیادہ حقدار ہو تو پھر علیحدہ علیحدہ نماز

[1] صحيح بخاری، كتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی فمات هل يصلى عليه...... رقم الحديث:١٣٥٦.

پڑھنے سے بہتر ہے اسے امام بنا کر باجماعت نماز پڑھنی چاہیے حضور اکرم ﷺ ایک مرتبہ گر پڑے تو آپ کی ٹانگ مبارک میں زخم آ گیا مگر آپ ﷺ نے اپنی جگہ میں بیٹھ کر نماز پڑھائی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے ان کی اقتدا میں نماز پڑھی۔

اس طرح آخری عمر میں بھی آپ ﷺ نے ایک دفعہ حالت بیماری میں نماز پڑھائی معلوم ہوا کہ بیماری والا نماز پڑھا سکتا ہے البتہ جو خود پاکی کی کوشش نہیں کرتا اور پیشاب وغیرہ سے پرہیز نہیں کرتا تو ایسے آدمی کے پیچھے ہرگز نماز نہیں پڑھنی چاہیے باقی سلسل البول کا مریض تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے وہ مجبور ہے لہٰذا اس کے پیچھے بوقت ضرورت اقتدا کرنی درست ہے۔ هٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب.

وضو سے پہلے کیا پڑھے

سوال: وضو شروع کرتے وقت پوری بسم اللہ یا صرف بسم اللہ والحمد للہ پڑھنی چاہیے؟

الجواب بعون الوهاب: ◆ صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو کی ابتدا میں ''بسم اللہ والحمد للہ'' پڑھنا چاہیے جیسا کہ الطبرانی الصغیر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((قال رسول الله ﷺ يا ابا هريرة اذا توضات فقل بسم الله والحمد لله فان حفظتك لا تبرح مكتب لك الحسنات حتى نحدث من ذلك الوضوء))

''اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جب تو وضو کرے تو بسم اللہ، والحمد للہ کہا کرو کیونکہ تم پر جو اللہ تعالیٰ کے نگران فرشتے ہیں، وہ تمہارے لیے نیکیاں لکھتے رہیں گے، جب تک کہ تم اس وضو سے محدث (بے وضو) نہ ہو جاؤ۔''

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کی اسناد حسن ہے۔(مجمع الزوائد: ۱/ ۲۲۰)

◆ ۲ اور وضو کے دوران یہ دعا پڑھنی چاہیے:

((اللهم اغفرلى ذنبى ووسع لى فى دارى وبارك لى فى

رزقی .))

جیسا کہ امام نسائی، امام حاکم اور دیگر ائمہ نے اس کو حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور امام نووی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الاذکار میں اس کی سند کی تصحیح کی ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے الاذکار میں اس کی تصحیح پر اعتراض کیا ہے لیکن یہ اعتراض عند المحققین مرفوع ہے۔ واللہ اعلم

كِتَابُ الصَّلاةِ
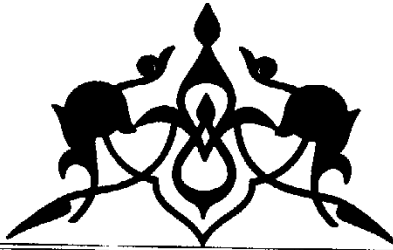
حکم البسملہ

سوال: نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً پڑھنا سنت ہے یا سراً۔ بعض شیوخ کا مؤقف ہے کہ جہراً پڑھنا ضروری ہے آیا یہ ان کا مؤقف درست ہے مہربانی فرما کر فریقین کے دلائل سے واضح کریں کہ صحیح مسلک کیا ہے؟

الجواب بعون الوھاب: نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سراً پڑھنا افضل ہے۔

دلائل درج ذیل ہیں: صحیحین کی احادیث متفقہ طور صحیحہ ہیں اس لیے ان کی احادیث کی سندیں نہیں لکھوں گا۔

❶: امام محدثین امام بخاری رحمہ اللہ اپنی صحیح میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

((ان النبی ﷺ وابا بکر وعمر رضی اللہ عنہما کانوا یفتتحون الصلوٰۃ بالحمد للہ رب العالمین.))

''اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ اور شیخین رضی اللہ عنہما نماز میں قراءۃ ان الفاظ یعنی الحمد للہ رب العالمین سے شروع فرماتے اور یہ نص ہے اس بات پر آپ ﷺ اور شیخین رضی اللہ عنہما قرأۃ کی ابتداء میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً نہیں پڑھا کرتے تھے بعض افاضل نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید میں اس حدیث صحیح وصریح کا یہ جواب دیا ہے کہ اس حدیث میں الحمد اللہ رب العالمین سے مراد سورۃ فاتحہ ہے کیونکہ صحیح حدیث میں فاتحہ کا نام ''الحمد للہ رب العالمین'' بھی آیا ہے لہٰذا اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قرأۃ سورۃ فاتحہ سے شروع فرماتے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان الفاظ سے شروع فرماتے۔

الجواب یہ صحیح ہے کہ سورۃ فاتحہ کا نام ''الحمد للہ رب العالمین'' صحیح حدیث میں وارد ہے لیکن یہاں اس حدیث میں اس سے سورۃ فاتحہ مراد لینا بہ چند وجوہ ممنوع ہے۔ یہ چند وجوہ میں نے اپنی کتاب ''تحصیل المعلاۃ'' میں تفصیل کے ساتھ درج کی ہیں جو عربی میں

خاص اس مسئلہ پر راقم الحروف نے تالیف کیا ہے۔ اس جگہ طوالت سے بچنے کے لیے صرف ایک وجہ درج کرتا ہوں جو صحیح السند حدیث ہے۔ ثابت اور اس بات کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے کہ اس جگہ مراد یہی ہے کہ قرأت ان الفاظ (یعنی الحمد للہ رب العالمین) بلا جہر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) سے ہی فرماتے تھے۔

❷: امام ابویعلیٰ الموصلی اپنی مسند میں فرماتے ہیں:

((حدثنا محمد (هو ابن المثنى) نا محمد بن جعفر نا شعبة عن قتادة عن انس صليت خلف رسول الله ﷺ وخلف ابى بكر وعمرو عثمان لم يكونوا يستفتحون القرأة بسم الله الرحمن الرحيم قال شعبة فقلت لقتادة اسمعت من انس قال نعم ونحن سالناه عنه.)) ❶

اس حدیث کی سند اصح الاسانید میں سے ہے اور اس میں بعض صریح یہ بیان ہے کہ آپ ﷺ، ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم قرأۃ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع نہیں کرتے تھے۔ راوی وہی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں اور باقاعدہ الحديث يفسر بعضه بعضا مسند ابی یعلی کی یہ صحیح السند حدیث صحیح بخاری والی حدیث کی وضاحت کر دیتی ہے کہ وہاں بھی مراد قرأۃ کی شروعات ان الفاظ "الحمد لله رب العالمين" سے کیا کرتے تھے۔ بات تو بالکل واضح ہے۔ لیکن انصاف مطلوب ہے اور تعصب واعتساف سے اجتناب ضروری ہے۔ یہی روایت امام ابویعلیٰ اسی مسند میں اپنے ایک دوسرے شیخ سے بھی لاتے ہیں۔

❸: ((حدثنا احمد (هو ابن ابراهيم الدورقى كما صرح به الحافظ ابن حجر رحمه الله فى النكت) نا ابو داؤد (هو الطيالسى) قال انبأنا شعبة عن قتادة عن انس قال صليت خلف رسول الله ﷺ وخلف ابى بكر وخلف عمر وخلف عثمان فلم

❶ المسند ابی یعلیٰ ج۳، ص ۱۶۰، رقم الحدیث ۳۲۳۳.

یکونوا یستفتحون القرأۃ ببسم اللہ الرحمن الرحیم قال شعبۃ فقلت لقتادۃ اسمعتہ من انس قال نعم سألناہ عنہ .)) ❶

اور یہی حدیث امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند امام عبداللہ بھی مسند کے زیادات میں ابو داؤد طیالسی کے طریق سے لائے ہیں۔ اسی طرح امام اسماعیل بھی اس حدیث کو لائے ہیں (ابو داؤد طیالسی کے طریق سے اور اسی طرح ابو نعیم اصفہانی بھی اس حدیث کو اپنی مستخرج میں لائے ہیں ابو داؤد طیالسی کے طریق سے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے النکت میں ذکر کیا ہے۔

❹: امام مسلم بن الحجاج رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح میں فرماتے ہیں:

((باب حجۃ من قال لا یجہر بالبسملۃ حدثنا محمد بن المثنیٰ وابن بشار کلاھما عن غندر ھو محمد بن جعفر قال ابن المثنیٰ ثنا محمد بن جعفر قال ثنا شعبہ قال سمعت قتادۃ یحدث عن انس قال صلیت مع رسول اللہ ﷺ وابی بکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم فلم اسمع احدامنہم یقرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم .))

آگے پھر فرماتے ہیں:

((حدثنا محمد بن المثنیٰ قال ثنا ابو داؤد قال ثنا شعبۃ فی ھذا الاسناد وزاد فقلت لقتادۃ اسمعت من انس قال نعم ونحن سألناہ عنہ .))

اس جگہ صحیح مسلم کی حدیث کی سند ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بعض فضلاء نے امام مسلم کی ایک حدیث میں ایک علت پیش فرمائی ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، اس لیے میں نے بمع سند یہ حدیث ذکر کی ہے اور اس کی سند میں وہ علت بالکل نہیں ہے اور سند صحیح ہے۔
اس حدیث سے بھی واضح طور پر معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ اور خلفاء ثلاثہ راشدین رضی اللہ عنہم

❶ المسند لابی یعلی الموصلی، ج۳، ص ۱۰۶، رقم الحدیث: ۲۹۹۶.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً نہیں پڑھا کرتے تھے، اس لیے حضرت انس خادم رسول اللہ ﷺ قرأۃ کی ابتداء میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سن نہ سکے۔ بعض افاضل عصریہ نے اس طرح گل افشانی کی ہے کہ عدم سماع سے عدم جہر لازم نہیں آتا ہوسکتا ہے کہ آدمی امام سے دور ہو اور اس کی آواز سن نہ سکے لہٰذا اس صحیح حدیث سے بسملہ کا عدم جہر ثابت نہیں ہوتا۔

لیکن یہ احتمال درست نہیں۔ اس کے درست نہ ہونے کے وجوہ ایسی واضح ہیں کہ ہر منصف مزاج اہل علم تھوڑے سے غور وفکر سے ان کے بطلان کی وجوہ کو پا سکتا ہے۔

یہ درست اس لیے نہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے ایک جلیل القدر صحابی جس نے آپ کی خدمت دس سال کی۔ سفر وحضر میں آپ ﷺ کے ساتھ رہے، یعنی یہ صحابی خادم رسول ﷺ اپنی طویل صحبت کے باوصف یہ بھی نہ سن سکا کہ آپ ﷺ بسم اللہ الرحمٰن الرحمٰن جہراً پڑھتے تھے نہیں یا وہ ہمیشہ دانستہ بالکل دیر سے نماز کے لیے آتے اور بالکل آخری صفوں میں کھڑے ہوتے جس کی وجہ سے وہ بسم اللہ سن نہ سکے اور لطف یہ کہ الحمد للہ رب العالمین تو سن لیا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ سن سکا فیاللعجب وضیعة الادب''

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد خلفاء راشدین ثلاثہ کے ساتھ بھی ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے اور اس طویل مدت میں بھی وہ ان خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں سن سکا صرف الحمد للہ رب العالمین ہی سن سکا اس بات میں کہاں تک معقولیت ہے وہ آں محترم خود سوچیں ہم کہیں گے تو شکایت ہوگی۔

بہرحال اس احتمال کا فساد وبطلان اظہر من الشمس ہے ہاں اگر کسی کو نظر نہ آئے تو اس کا کیا علاج۔

۵: ((حدثنا عبداللہ حدثنی ابی ثنا وکیع ثنا شعبة عن قتادة عن انس قال صلیت خلف رسول اللہ ﷺ وخلف ابی بکر وعمر وعثمان کانوا لا یجهرون بسم اللہ الرحمن الرحیم.))

(المسند للامام احمد: ج ۲، ص ۱۷۹)

اس حدیث کی سند کے رواۃ ''عن آخرھم حفاظ ثقات واثبات'' ہیں اور یہ سند بھی اصح الاسانید میں سے ہے۔ اس میں تصریح ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اور خلفاء ثلاثہ ابوبکر، عمر وعثمان رضی اللہ عنہم نماز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم جہر سے نہیں پڑھتے تھے۔

۶: ((اخبرنا ابو طاهرنا ابوبكر نا ابو سعيد الاشح ناابن ادريس سمعت سعيد بن ابى عروبة عن قتادة عن انس بن مالك رضي الله عنه ان رسول الله ﷺ لم يجهر بسم الله الرحمن الرحيم ولا ابوبكر ولا عمر ولا عثمان رضي الله عنهم .)) [1]

اور یہی حدیث امام نسائی بھی اپنی مجتبیٰ میں لائے ہیں اور سند میں سعید بن ابی عروبہ کے ساتھ شعبہ کو بھی ملایا ہے جس سے قتادہ کی تدلیس کا شبہ رفع ہو جاتا ہے اس کے یہ الفاظ ہیں۔

((صليت خلف رسول الله ﷺ وابى بكر وعمر وعثمان رضي الله عنهم فلم اسمع احدامنهم يجهر بسم الله الرحمن الرحيم .))

اس کے بعد چند اور احادیث بھی ذکر فرمائی ہیں جن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے قتادہ کی متابعت کرنے والے دوسرے ثقات رواۃ کا ذکر ہے۔

لیجئے جناب! یہاں ''لم اسمع'' کے ساتھ جہر کی نفی بھی آ گئی۔ کیا اب بھی ''لم اسمع'' کے متعلق وہی مرغی کی ایک ٹانگ کہنے پر اصرار کیا جائے گا؟ اس حدیث کے رواۃ بھی سب کے سب ثقہ وثبت ہیں۔

۷: ((حدثنا عبدالله حدثنى ابى ثنا الاحوص ابن جواب ثنا عمار بن زريق عن الاعمش عن شعبة عن ثابت عن انس رضي الله عنه قال صليت مع رسول الله ﷺ ومع ابى بكر ومع

[1] الصحيح لابن خزيمة مطبوعه:ج۱، ص۲۵۰.

عمر فلم یجھروا بسم اللہ الرحمن الرحیم .))[1]
یہ حدیث امام ابن خزیمہ نے بھی اپنی صحیح میں احوص بن جواب کے طریق سے ذکر کی ہے۔

◆ امام نسائی اپنی مجتبیٰ میں فرماتے ہیں:
((اخبرنا محمد بن علی بن الحسن بن شقیق قال سمعت ابی یقول اخبرنا ابو حمزۃ . (ھو محمد بن میمون السکری المروزی) عن منصور بن زاذان عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ قال صلی بنا رسول اللہ ﷺ فلم یسمعنا قرأۃ بسم اللہ الرحمن الرحیم و صلی بنا ابوبکر و عمر فلم نسمعھا منھما .))
یہ حدیث بھی صحیح الاسناد ہے اور اس کے سب رجال ثقات ہیں اور اس پر امام نسائی رحمہ اللہ نے بھی ترک الجہر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا باب منعقد فرمایا ہے۔

◆: ((اخبرنا ابو طاھر الفقیہ انبأ ابوبکر محمد ابن الحسین القطان ثنا علی بن الحسن الھلالی ثنا عبداللہ بن الولید (ھو العدنی) عن سفیان عن خالد الحذاء عن ابی نعامۃ الحنفی عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ قال کان رسول اللہ ﷺ و ابوبکر و عمر لا یقرؤن یعنی لا یجھرون بسم اللہ الرحمن الرحیم .))[2]
آگے امام بیہقی فرماتے ہیں کہ امام سفیان ثوری سے حسین بن حفص نے بھی یہ روایت کی ہے اور اس میں یہ کہا "لا یجھرون" اور "لا یقرؤن" نہیں کہا۔ اس حدیث کی سند بھی حسن ہے باقی بعض علماء نے جو اس حدیث کے متعلق اضطراب کی علت پیش کی ہے وہ قطعاً صحیح نہیں اس میں چونکہ تفصیل زیادہ ہے اس لیے اس جگہ اس کا ذکر کرنا مناسب نظر نہیں

[1] المسند للامام احمد: ج ۲، ص ۲٦٤ .　[2] السنن الکبریٰ: ج ۲، ص ٥۲ .

آتا اگر کسی اہل علم کو اس کے متعلق شرح صدر کے ساتھ تحقیق مطلوب ہو تو وہ میری کتاب "تحصیل المعلاۃ" عربی کی طرف مراجعت فرمالے۔ ان شاء اللہ العزیز ان کے سب شکوک رفع ہو جائیں گے۔

⑩: امام طبرانی اپنی معجم کبیر میں فرماتے ہیں:

((حدثنا عبداللہ بن وھیب الغزی ثنا محمد ابن السری ثنا معتمر بن سلیمان عن ابیہ عن الحسن عن انس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ کان یُسر بسم اللہ الرحمن الرحیم وابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما .))

علامہ ہیثمی مجمع الزوائد: ج ۲، ص ۱۰۸ میں فرماتے ہیں (رجالہ موثقون) اس روایت کے سب رجال موثق ہیں اور یہ سند حسن ہے۔ اس حدیث میں بھی صراحت ہے کہ آنحضرت ﷺ اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سراً پڑھا کرتے تھے۔

⑪: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((وقال لی محمد بن المثنی نا عبدالوھاب (ھو ابن عبدالمجید الثقفی) سمع ابا نعامۃ (ھو قیس بن عبایۃ) عن قیس بن عباد عن عبداللہ(ھو ابن المغفل رضی اللہ عنہ) بمثلہ(ای بمثل حدیث عبد اللہ بن المغفل المتقدم ولفظہ " صلیت خلف رسول اللہ ﷺ وخلف ابی بکر وعمر فلم اسمع احدامنھم یقرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ وقال البخاری ایضا وقال لی محمد نا عبداللہ عن قیس بن عبایۃ الزمانی سمع عبداللہ)) (یعنی ابن المغفل رضی اللہ عنہ) . [1]

اس روایت کی سند بھی صحیح ہے اس حدیث سے معلوم ہوا حضرت عبداللہ بن المغفل رضی اللہ عنہ

[1] تاریخ کبیر: ج ٤، ق٢، ص٤٤١، ٤٤٢ .

بھی آنحضرت ﷺ اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے عدم الجہر بسم اللہ نقل کر رہا ہے۔

۱۲: حافظ ابن حجر اپنی کتاب "النکت" میں فرماتے ہیں کہ امام اسماعیلی "مسند زید بن ابی انیسة" میں اس تک (یعنی زید بن ابی انیسہ تک) صحیح سند سے روایت بیان کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ:

((عن عمرو بن مرة عن نافع بن جبير ابن مطعم عن ابيه قال صلينا مع رسول الله ﷺ صلوٰة يجهر فيها بالقرأة فلما صف الناس كبر رسول الله ﷺ ثم قال اللهم انى اعوذبك من الشيطان الرجيم من همزه ونفخه ونفثه ثم قرأ بفاتحة الكتاب ولم يجهر بسم الله الرحمن الرحيم .))

اس حدیث کی سند بھی صحیح ہے اور اس میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً نہیں پڑھی۔

۱۳: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث یہ حدیث صحیح مسلم، موطا مالک، امام بخاری جزء القرأۃ، ابوداود، نسائی، امام احمد مسند میں، امام ابن خزیمہ اپنی صحیح میں ابوعوانہ وغیرہم نے روایت کی ہے۔ اس جگہ ہم یہ روایت امام نسائی کی مجتبیٰ سے نقل کر رہے ہیں۔ اس پر امام نسائی اس طرح باب باندھتے ہیں:

((ترك قرأة بسم الله الرحمن الرحيم فى فاتحة الكتاب" اخبرنا قتيبة عن مالك عن العلاء ابن عبدالرحمن انه سمع ابا السائب مولىٰ هشام بن زهرة يقول سمعت اباهريرة رضي الله عنه يقول قال رسول الله ﷺ من صلى صلوٰة لم يقرأ فيها بام القرآن فهى خداج هى خداج هى خداج غير تمام فقلت يا اباهريرة انى احيانا اكون وراء الامام فغمز ذراعى فقال اقرأ بها يا فارسى فى نفسك فانى سمعت رسول الله ﷺ يقول

یقول الله عزوجل قسمت الصلوٰة بینی وبین عبدی نصفین فنصفها لی ونصفها لعبدی ولعبدی ما سأل قال رسول الله ﷺ اقرؤا یقول العبد الحمد لله رب العالمین یقول الله عزوجل حمدنی عبدی یقول العبد الرحمن الرحیم یقول الله عزوجل اثنی علی عبدی یقول عبدی مالك یوم الدین یقول الله عزوجل مجدنی عبدی یقول العبد ایاك نعبدوایاك نستعین ، فهذه الآیة بینی وبین عبدی ولعبدی ما سأل یقول العبد اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولا الضآلین فهؤلاء لعبدی ولعبدی ما سأل .))

پس یہ حدیث صحیح اس بات میں صریح ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۃ فاتحہ کی آیت نہیں ہے ورنہ آپ ﷺ سورۃ فاتحہ کی تقسیم میں اولاً ضرور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ذکر کرتے اوراس پر اتفاق ہے کہ فاتحہ کی سات آیات ہیں اور آپ ﷺ نے " ایاك نعبد وایاك نستعین" کو آیت قرار دیا جیسا کہ متن حدیث میں مذکور ہے اور اخیر میں فرمایا "فهٰؤلاءِ" جواسم اشارہ کے جمع کا صیغہ ہے اور اسے قطعاً ویقیناً آیات ہی مراد ہیں یعنی " اهدنا الصراط المستقیم" سے لے کر اخیر تک تین آیتیں ہیں ایک "اهدنا الصراط المستقیم" دوسری "صراط الذین انعمت علیهم" اور تیسری "غیر المغضوب علیهم ولا الضآلین" اور میرے پاس لائبریری میں چند قرآن کریم کے نسخے ہیں مخطوط بھی مطبوع بھی جن میں "صراط الذین انعمت علیهم" پر آیت کا نشان لگا ہوا ہے اگر "اهدنا الصراط المستقیم" سے لے کر آخر تک دو آیتیں ہوتیں جیسا کہ جہراً بسملہ کے قائلین کا خیال ہے تو آپ ﷺ "هٰؤلاء" نہ فرماتے بلکہ ہاتان یا اس کے مثل کوئی لفظ فرماتے یعنی جمع کا صیغہ ہرگز استعمال نہ کرتے اور پھر ان حضرات کے موقف پر یہ سوال بھی

پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح تو اللہ اور بندے کے درمیان آیات نصفاً نصفاً نہیں بنتیں حالانکہ حدیث کا متن اس پر گواہ عدل ہے کہ یہ تنصیف آیات کے لحاظ سے ہے۔

لہٰذا ان حضرات کے مؤقف کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے لیے تو تین آیتیں ہوئیں الحمد لله رب العالمين، الرحمن الرحيم، مالك يوم الدين بلکہ ان حضرات کے مسلک کے مطابق بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ملا کر چار آیتیں بنتی ہیں اور ایک آیت اياك نعبدو اياك نستعين مشترک ہوئی اور بندہ کے لیے صرف دو آیتیں رہ گئیں۔تو یہ نصف کیسے ہوا پھر اس کے ساتھ یہ سوال بھی بجا طور پر سامنے آتا ہے کہ جب بسم اللہ فاتحہ کی آیت ہی تھی تو آپ ﷺ نے اس کو آخر چھوڑا کیوں؟ کیا اس سے آپ کی ذات پر الزام نہیں آتا؟

پھر جب خود اللہ کے رسول علیہ السلام نے بھی بسملہ کو فاتحہ کی آیت شمار نہیں کیا تو آپ کون ہوتے ہیں اس میں اس کا اضافہ کرنے والے؟

شاید کوئی علم حدیث سے ناواقف یہ کہے کہ سنن کبریٰ دارقطنی وغیرہ میں اس حدیث میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ذکر ہے تو اس کے بارہ میں یہ گذارش ہے کہ اس کی سند میں ابن سمعان متروک ومتہم راوی ہے لہٰذا یہ روایت قطعاً مقبول نہیں خود امام دارقطنی وغیرہ نے یہ تصریح فرما دی ہے کہ یہ زیادتی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی ابن سمعان کی کارستانی ہے اور وہ متروک ومتہم ہے اس کے سوائے اور سب روایات صحیحہ میں اس زیادتی کا ذکر نہیں ہے۔

بہرحال جب صحیح حدیث کے بموجب بسملہ فاتحہ کی آیت نہیں ہے تو فاتحہ کو جہراً پڑھتے ہوئے بسملہ کا جہراً پڑھنا بھی ضروری نہیں رہا یہ بسملہ استعاذہ وغیرہ کی طرح ہے جو سراً پڑھے جاتے ہیں کیونکہ یہ فاتحہ کی آیات نہیں ہیں۔اس میں شک نہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن کریم کی آیت مستقلہ ضرور اور یقینی وحتمی ہے لیکن کسی سورت کی بھی جز نہیں ہے یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے دو سورتوں میں فصل کے لیے اور سورت کی ابتدا میں تیمن وتبرک کے لیے نازل ہوئی تھی۔صحیح حدیث میں آتا ہے کہ ایک سورۃ جس میں تیس ۳۰ آیتیں ہیں یعنی سورت

الملک'' پارہ ۲۹ اس نے ایک آدمی کے لیے سفارش کی اور وہ بخش دیا گیا اور وہ عذاب قبر سے روکنے والی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہر سورت کا جز ہے تو سورت ملک کی آیتیں اکتیس ۳۱ بنتی ہیں۔ پھر اللہ کے رسول ﷺ نے تیس آیتیں کیسے قرار دیں۔

باقی رہا سورت توبہ میں اس کا نہ لکھا جانا وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی ایسا ہوا ہے اس کی حکمتیں علماء نے بیان کی ہیں لیکن اس تفصیل کی یہاں جگہ گنجائش نہیں شائقین کو میری کتاب ''تحصیل المعلاۃ'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس صحیح حدیث پر جو کہ صحیح مسلم کی بھی ہے۔ بعض علماء نے کچھ اعتراضات کئے ہیں یا اس میں کوئی علت نکالی ہے لیکن کوئی بھی ان میں سے علت قادحہ پیش نہیں کرسکا تفصیل ''تحصیل المعلاۃ'' میں ملے گی۔ بڑے سے بڑے ناقدین فن جیسے امام ابوزرعہ رازی وغیرہ نے بھی اس کی تصحیح فرمائی ہے۔ (کما ذکرہ الترمذی فی علل الکبیر) اس حدیث سے بھی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ بسملہ جہراً نہیں پڑھنی چاہیے۔

◆ ۱۲: حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی حدیث امام احمد رحمۃ اللہ علیہ المسند میں فرماتے ہیں:

((حدثنا عبداللہ حدثنی ابنی ثنا وکیع عن نافع ابن عمرو ابو عامر ثنا نافع عن ابی ملیکۃ عن بعض ازواج النبی ﷺ قال ابو عامر قال نافع اراھا حفصۃ انھا سئلت عن قرأۃ رسول اللہ ﷺ فقالت انکم لا تستطیعونھا قال فقیل لھا اخبرینا بھا قال فقرأت قرأۃ ترسلت فیھا قال ابو عامر قال نافع فحکی لنا ابن ابی ملیکۃ الحمد للہ رب العالمین ثم قطع الرحمن الرحیم، ثم قطع مالک یوم الدین .))[1]

اس حدیث کے رجال بھی سب کے سب ثقات ہیں اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ''النکت'' میں فرماتے ہیں کہ یہ اسناد صحیح ہے اس صحیح حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ بسم اللہ

---

[1] المسند: ج ٦، ص ٢٨٨ .

الرحمٰن الرحیم جہراً نہیں پڑھا کرتے۔ اگر کہا جائے کہ اس کے معارض وہ حدیث ہے جو امام احمد وغیرہ نے حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

((انها(ای ام سلمة رضي الله عنها) سئلت عن قرأة رسول الله ﷺ فقالت: كان يقطع قرأنه آية آيةبسم الله الرحمن الرحيم، الحمد لله رب العالمين، الرحمن الرحيم، مالك يوم الدين.))

اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت کی سند میں ابن جریج) جو تیسرے مرتبہ کا مدلس ہے (كما فی طبقات المدلس لابن حجر رحمہ اللہ) اور امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن جریج کی تدلیس شر التدلیس ہے۔ ایسے رواۃ کی جب تک سماع یا تحدیث کی تصریح نہ کریں ان کی روایت مقبول نہیں ہوتی۔ یہ روایت ایک یا دو کتابوں میں نہیں بلکہ حدیث کی بہت سی کتب میں موجود لیکن ایک جگہ پر بھی ابن جریج نے سماع کی تصریح نہیں کی لہٰذا یہ سند ضعیف ہوئی اور جب سند ضعیف ہوئی تو حدیث بھی ضعیف ہوگئی لہٰذا مستر دونا مقبول ہوئی۔

پھر لطف کی بات یہ ہے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی اسی حدیث کو امام حاکم مستدرک میں ایک دوسرے طریق سے ابن جریج سے روایت کرتے ہیں لیکن اس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ذکر نہیں۔ امام حاکم فرماتے ہیں:

((حدثنا ابو الوليد الفقيه وابوبكر بن قريش وابو عمرو بن عبدوس المقرئ قالوا ثنا الحسن ابن سفيان ثنا على بن حجر بن اياس السعدى ثنا يحى بن سعيد القرشى عن ابن جريج عن عبدالله بن ابى مليكة عن ام سلمة رضي الله عنها قالت ان النبى ﷺ كان يقطع قرأته آيت آيت الحمد لله رب العالمين ثم يقف الرحمن الرحيم ثم يقف وكانت ام سلمة تقرأها ملك يوم الدين.))

دیکھئے اس حدیث میں بھی ابن جریج کی تدلیس کے سوائے اور کوئی علت نہیں لیکن اس

میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ذکر نہیں۔ اب اگر انصاف مطلوب ہے تو اس روایت کو ترجیح ہونی چاہیے گو اس میں بھی تدلیس ابن جریج ہے لیکن یہ روایت اس سند سے اس صحیح حدیث حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا والی سے متفق ہو جاتی ہے اور دوسری احادیث صحیحہ جن میں عدم جہر بسملہ کی تصریح ہے ان سے بھی متفق ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہی راجح ہونی چاہیے اگر آپ ابن جریج کی تدلیس کی وجہ سے اس روایت کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو پھر بتائیے پہلی روایت کے قبول پر اصرار کیوں؟ اس میں بھی تو ابن جریج کی تدلیس ہے اور اس پر طرہ یہ کہ وہ دوسری احادیث صحیحہ کے بھی قطعی طور پر مخالف ہے۔

بہر کیف یہ روایت سنداً ضعیف ہے لہٰذا اس کو معرض استدلال میں پیش کرنے اور اس کو مذکورہ صحیح حدیث کے معارض بنانے کی کوئی اہل علم بالحدیث ہرگز جرأت نہیں کرسکتا اِلّا یہ کہ تجاہل عارفانہ کرے یا بے جا ضد پر مصر ہو۔ ان دلائل واضحہ اور صحیحہ سے روز روشن کی طرح ظاہر ہو گیا کہ نماز میں اللہ کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مستمرہ اور خلفاء راشدین مہدیین ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی سنت مستمرہ یہی تھی کہ وہ نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً نہیں پڑھا کرتے تھے۔

یہ دلائل صرف ایک صحابی انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نہیں بلکہ ان کے علاوہ عبداللہ بن مغفل، جبیر بن مطعم، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اور ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہیں اور سب کی سب مرفوع اور صحیح ہیں لہٰذا ان احادیث صحیحہ سے اعراض کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت صحیحہ اور مستمرہ کو ترک کر کے علی الدوام بسملہ جہر سے پڑھنا اہل حدیث جماعت کو قطعاً زیب نہیں دیتا۔

لیکن یہ بحث نامکمل رہے گی جب تک کہ قائلین بجہر البسملۃ کے دلائل کا جائزہ نہ لیا جائے۔ اس لیے اب ان کے دلائل کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان کا انصاف وتحقیق سے جائزہ پیش کیا جاتا ہے اجمالاً یہ گذارش ہے کہ مخالفین جو دلائل احادیث سے پیش کرتے ہیں ان میں سے جو مسئلہ زیر بحث پر صریح دلالت کرتی ہیں ان میں سے ایک حدیث بھی سنداً صحیح نہیں ہے

بلکہ موضوع ومنکر اور کچھ شدید ضعیف اور جو ایک یا دو صحیح السند ہیں وہ مسئلہ زیر بحث پر نہ نص ہیں نہ صریح شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی فتاویٰ: جلد ۲۲، صفحہ ۴۱۶ میں اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ الدرایۃ فی تخریج احادیث الهدایۃ میں فرماتے ہیں کہ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ جب مصر میں تشریف لائے تو انہیں الجہر بالبسملہ کی روایات جمع کرنے کی گذارش کی گئی۔

تو امام موصوف نے یہ روایات جمع کر دیں تب ان سے کہا گیا کہ کیا اس مجموعہ میں کوئی صحیح چیز بھی ہے؟ تو امام والا مقام نے جواب میں فرمایا:

((امّا عن النبی ﷺ فلا واما عن الصحابة فمنه صحیح ومنه ضعیف.))

''یعنی آنحضرت ﷺ سے اس سلسلہ میں کوئی صحیح حدیث نہیں، البتہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے بعض آثار صحیحہ ہیں اور بعض ضعیف آپ نے دیکھا کہ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ جیسا چوٹی کا محدث جن کے علم حدیث کا اندازہ لگانا ہو تو ان کی کتاب ''العلل'' مطالعہ فرمائیں وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ اللہ کے رسول ﷺ سے جہراً بالبسملۃ کی کوئی حدیث صحیح نہیں۔ اب ایسے امام کی شہادت کو آپ مسترد فرمادیں تو آپ کی مرضی۔

اس کے بعد یہ گذارش ہے کہ بہت سی ضعاف ومنکرات وموضوعہ روایات کا حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے الدرایہ میں اور علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے ''التعلیق المغنی علی السنن للدارقطنی'' میں اچھی طرح پوسٹ مارٹم کیا ہے اوران کے ضعف نکارت ووضع کی توضیح فرمادی ہے۔

لہٰذا ان کا ذکر بے فائدہ تطویل کا باعث ہوگا اس لیے ان کے ذکر سے اعراض کرتا ہوں تھوڑی سی منکر روایتیں ان سے بھی رہ گئیں ہیں جو میں نے ''تحصیل المعلاۃ'' میں ذکر کی ہیں اور ان کی اسنادی حیثیت کو بحمد اللہ واضح کر دیا ہے اس جگہ میں صرف وہ روایتیں لکھوں گا جن سے عام طور پر ہمارے علماء وفضلاء عصریہ استدلال کرتے ہیں۔

①:...... امام نسائی، ابن خزیمہ الدارقطنی وغیرہم نے نعیم المجمر کی طریق سے حضرت

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

((قال (ای نعیم المجمر) صلیت وراء ابی هريرة رضی اللہ عنہ فقرأ بسم الله الرحمن الرحيم ثم قرأ بام القرآن حتى بلغ غير المغضوب عليهم ولا الضالين فقال آمين! فقال الناس آمين ويقول كلما سجد الله اكبر فاذا قام من الجلوس فى الاثنتين قال الله اكبر واذا سلم قال والذى نفسى بيده انى لأشبهكم صلوٰة برسول الله ﷺ .))

اس حدیث کی سند بلاشبہ صحیح ہے لیکن اس کے سیاق میں اتنے احتمالات ہیں کہ اس کو زیر بحث مسئلہ پر ہرگز ہرگز نص نہیں لیکن ان تفصیلات کی جگہ تحصیل المعلاۃ ہے نہ کہ یہ مختصر کتابچہ پھر روایت میں ہے کہ "ثم قرأ بام القرآن" اور یہ وضاحتاً بتا رہا ہے کہ راوی نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو فاتحہ کی آیت قرار نہیں دیا ورنہ اس طرح فرماتے کہ:

((ثم قرأ بام القرآن فاستفتح ببسم الله الرحمن الرحيم .))

غور فرمایئے اور یہ بات آپ کے مسلک کے خلاف ہے کیونکہ آپ بسملہ کو ام القرآن کی جز یا آیت ہی قرار دے رہے ہیں۔ پھر یہ روایت موقوف ہے مرفوع نہیں آپ سے مرفوع محض اس لیے بنا رہے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

((انى لا شبهكم صلوٰة برسول الله ﷺ .))

لیکن اولاً تو یہ الفاظ ضروری نہیں کہ نماز کے ہر جز کے متعلق فرمایا ہو بلکہ اکثر کے متعلق اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس سے ہر جز میں مشابہت مراد ہے تب بھی اسے اس روایت کا رفع بطور اشارہ کنایہ اور ایماء کے باب سے ہے۔ اور ہم نے جو روایات ذکر کی ہیں وہ سب کی سب صریح طور پر مرفوع بھی ہیں اور عدم جہر پر نص صریح ہیں اور یہ شرعاً، عرفاً، اصولاً بالکل غلط ہے کہ ایک بات جو اشارۃً وکنایۃً معلوم ہو اس کو اس بات پر مقدم کیا جائے جو نصاً وصراحتاً صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو چکی ہے پھر یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

کا یہ کہنا کہ:

((انی لا شبهكم صلوٰة برسول الله ﷺ.))

سے مراد نماز میں انتقالات کی تکبیریں ہوں کیوں کہ اسی عہد میں بعض ائمہ نے نماز میں رفع وخفض میں تکبیرات کہنی چھوڑ دی تھیں۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ مطرف بن عبداللہ فرماتے ہیں میں نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سجدہ میں جاتے تب بھی تکبیر کہتے اور اس سے سر اٹھاتے تو بھی تکبیر کہتے اور جب دو رکعتوں سے اٹھتے تب بھی تکبیر کہتے جب نماز پوری کی تو حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا کہ اس نے (حضرت علی رضی اللہ عنہ نے) مجھے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نماز یاد دلا دی۔

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز میں ہر خفض ورفع میں تکبیرات کہتے تھے۔

وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ملا اور اس کے متعلق تعجب سے دریافت کیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

((اوليس تلك صلوٰة النبى ﷺ لا ام لك.))

اگر اس عہد کے لوگوں نے ان انتقالات میں تکبیریں کہنی چھوڑ نہ دی ہوتیں تو عکرمہ تعجب سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کیوں دریافت کرتے۔ جو چیز عام ہوتی ہے اس کے متعلق پوچھنا تو کجا اس پر تعجب بھی نہیں ہوسکتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی اسی بات کی طرف ((انی لا شبهكم صلوٰة برسول الله ﷺ.)) میں اشارہ فرمایا ہو اور اس احتمال کو یہ روایت بھی تقویت دیتی ہے جو امام عبدالرزاق اپنے مصنف میں لائے ہیں:

((قال عبدالرزاق عن ابن جريج قال اخبرنا ابن شهاب عن ابى بكر بن عبدالرحمن ابن الحارث بن هشام انه سمع ابا هريرة رضي الله عنه يقول كان رسول الله ﷺ اذا قام الى الصلوٰة يكبر

حین یقوم ویکبر حین یرکع ثم یقول سمع الله لمن حمده حین یرفع صلبه من الرکعة ثم یقول وهو قائم ربنا لك الحمد ثم یکبر حین یهوی ساجدا ثم یکبر حین یرفع رأسه ثم یفعل ذلك فی الصلوٰة کلها حتی یقضیها ویکبر حین یقوم من المثنی بعد الجلوس ثم یقول ابوهریرة رضی الله عنه انی لا شبهکم صلوٰة برسول الله ﷺ.))

اور اس روایت کی اسناد صحیح ہے لہٰذا اس احتمال قوی کی موجودگی میں (خصوصاً جب خود حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث اس کی مؤید بھی ہو) تو بلا وجہ اس پر اصرار کرنا کہ ان کے ان الفاظ ((انی لا شبهکم صلوٰة برسول الله ﷺ.)) سے مراد مشابہت من کل الوجوہ ہے۔ محض بے جا ضد و مسلکی حمیت نہیں تو اور کیا ہے۔

بہرصورت ان احتمالات کے قطع نظر یہ روایت اشارۃً وایماءً مرفوع ہے اور اس لیے بسملہ کا جہر بھی اشارہ وکنایہ یا ایماء پرمبنی ہے۔ لہٰذا یہ کتنا ظلم عظیم ہے کہ ان سب احادیث مبارکہ جو سب کی سب صحیح بھی ہیں۔ حقیقتاً مرفوع بھی اور عدم جہر بسملہ پر نص صریح بھی ہیں ان پر ایسی روایت کو مقدم کیا جائے جو نہ تو صراحتاً مرفوع ہے۔ اور نہ ہی مسئلہ زیر بحث پر صراحتاً دلالت کرتی ہے یہ تو کسی مکتب فکر و کسی مسلک کا اصول نہیں ہے کہ نص صریح کو چھوڑ کر ایک محتمل و اشارہ یا ایماء سے مسئلہ بتانے والی روایت کو مقدم کیا جائے۔ اگر اس قسم کی جرأت مقلدین حضرات کرتے ہیں تو اہل حدیث حضرات ان پر تنقیدات کی بارش کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر خود اپنے مسلک کا پاس ولحاظ ہو تو ان سب مسلمہ اصول کو بالائے طاق رکھ کر وہی کچھ کیا جا رہا ہے جس پر انہیں اغیار پر اعتراض ہے۔

((فیاللعحب خود رافضیحت دیگراں رانصیحت فانا لله وانا الیه راجعون.))

④:...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اثر بھی پیش کیا جاتا ہے جس میں ہے کہ ایک مرتبہ

انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً پڑھی اس اثر کی سند بھی صحیح ہے۔ لیکن اس کے سیاق میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو استمرار پر دلالت کرتا ہو بلکہ یہ ایک واقعتاً عین ہے جو کبھی ایک مرتبہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے تعلیم کے لیے جہراً بسملہ پڑھی۔ جیسا کہ صحیح سند سے سنن دار قطنی وغیرہ میں حضرت عمر وحضرت عثمان رضی اللہ عنہما "سبحانك اللهم وبحمدك ......الخ (دعاء استفتاح) پڑھی تھی اور روایت کے اخیر میں یہ الفاظ ہیں۔ "يسمعنا ذالك ويعلمنا ." [1]

یعنی حضرت فاروق رضی اللہ عنہ یہ دعائے استفتاح ہمیں سناتے تھے اور اس سے مقصد ہمیں تعلیم دینا تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ حضرات دعائے استفتاح کو جہراً پڑھنا اپنا مستمر معمول نہیں بناتے؟ اسی طرح ایک صحیح حدیث حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا صفحات میں گذر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ قرأۃ سے قبل ((اللهم انی اعوذبك من الشيطان الرجيم .)) الخ جہراً پڑھا۔

حالانکہ استعاذہ قرأۃ سے قبل جہراً پڑھنا کسی کا مسلک نہیں، لیکن آپ اہلحدیث حضرات سے بجا طور پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے استعاذہ جہراً پڑھا ہے تو آپ اتباع سنت کی مدعیان حضرات کیوں ہمیشہ استعاذہ جہراً نہیں پڑھتے؟ یہ عجیب تماشہ ہے کہ اپ خود تو غیر صریح روایت سے بھی جہراً بسملہ وہ بھی علی الدوام ثابت فرما رہے ہیں اور اسی پر عمل پیرا ہیں۔ حالانکہ اس میں اصل مسئلہ کی صراحت تک نہیں چہ جائیکہ اس سے دوام ثابت کیا جائے۔ ازراہ عنایت آں محترم ہمیں بھی مستفید فرمائیں کہ اس روایت سے عربیت کے کس قانون سے آپ دوام ثابت فرما رہے ہیں؟ لیکن حدیث میں صراحتاً موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرأت سے قبل استعاذہ پڑھا اور بسملہ کے متعلق متعدد احادیث صحیحہ صریحہ میں استمرار کے صیغوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم بسملہ جہراً نہیں پڑھا کرتے تھے مگر آپ حضرات ان صحیحہ صریحہ اور منصوصہ احادیث کو ایسا نظر انداز کئے بیٹھے ہیں کہ گویا احادیث صحیحہ کا وجود ہی نہیں۔

---

[1] السنن للدارقطنی مع التعلیق المغنی طبع مدینہ منورہ: ج ۱، ص ۳۰۱۔

اس طرزِ عمل کا نام آپ ہی تجویز فرمائیں۔ ہم اگر کہیں گے تو شکایت ہوگی۔ بہرصورت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اثر صحیح السند ہونے کے باوصف ایک واقعہ عین ہے جو تعلیم کے لیے پیش آیا تھا نہ کہ ان کی یہ سنت مستمرہ تھی ان کی اور دو خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت مستمرہ تو وہ تھی جو احادیث صحیحہ میں بیان ہو چکی۔ واللہ اعلم!

③:...... حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مدینہ منورہ آئے اور نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں پڑھی اس پر مہاجرین وانصار ہر طرف سے اس پر معترض ہوئے، لہٰذا بعد میں جب نماز پڑھائی تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو جہراً پڑھا۔ یہ روایت سنن دارقطنی، سنن کبریٰ، بیہقی اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الام وغیرہ میں مروی ہے اور میں نے اس سے بے تحاشا استدلال کرتے ہوئے اہلحدیث خطیبوں کو بھی اپنے کانوں سے سنا ہے۔ اور انتہائی افسوس ہوتا ہے کہ آج کل کے علماء اہلحدیث حدیث کے علوم سے اس قدر بے پرواہ ہو گئے ہیں کہ وہ اتنی زحمت اٹھانے پر بھی تیار نہیں کہ کسی روایت کے متعلق اس سے دلیل لینے سے قبل اس کی سنداً ومتناً روایۃً ودرایۃً تحقیق تو کرلیں یہ روایت صحیح بھی ہے یا نہیں اور دلیل لینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے یا نہیں۔

جب ہمارے اہلحدیث خطباء کی یہ حالت ہے تو پھر عوام کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اس روایت کے متعلق تفصیل تو میری کتاب تحصیل المعلاۃ میں ہے اس جگہ صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ یہ روایت سنداً بھی ضعیف ہے تو متناً بھی مضطرب اور اضطراب بھی ایسا کہ کوئی محدث اس کے اضطراب کو رفع نہیں کر سکتا سند میں رواۃ ضعیف ہیں اور متن پر کافی اعتراضات وخدشات وارد ہیں شائقین تفصیل کو تحصیل المعلاۃ کا مطالعہ کرنا چاہیے تعجب تو یہ ہے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ پڑھنے پر تو مہاجرین وانصار کے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوگئی، لیکن یہ مہاجرین وانصار کہاں گئے تھے جب خلفاء ثلاثہ راشدین کو رات ودن میں کم از کم تین مرتبہ نماز میں بسملہ کے عدم جہر کا مشاہدہ کرتے رہتے تھے لیکن ان پر نکیر نہ کی اور نہ ان کو اس نقصان پر ٹوکا کیا یہ سب مہاجرین وانصار ان سے ڈرتے تھے،

اس لیے کلمہ حق کہہ نہ سکے؟ حالانکہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو تو ایک عورت بھی حق کا کلمہ کہہ دیتی تھی۔ یہ سب باتیں ادل دلیل نہیں اس بات پر یہ واقعہ منکرہ وموضوعہ ہے۔ یہ تھے وہ مشہور دلائل جو آج کل کے اہلحدیث پیش کرتے رہتے ہیں اس لیے اس جگہ صرف ان کے ذکر پر اکتفا کی ہے ورنہ روایات اور بھی ہیں جو سب کی سب اپنی کتاب تحصیل المعلاۃ میں ذکر کی ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل وتوفیق سے ان پر بالاستیفا. کلام کیا ہے، ایک منصف مزاج کے لیے ان شاء اللہ اس کا مطالعہ شرح صدر کا باعث ہوگا۔

رکوع کی رکعت

سوال: کوئی آدمی نماز میں اس وقت شامل ہوتا ہے جب امام رکوع میں جا چکا ہوتا ہے تو اب اس مقتدی کے رکوع میں آنے سے وہ رکعت ہوئی یا نہیں؟ جماعت غرباء اہلحدیث والے اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ رکوع میں شامل ہونے سے رکعت ہو جاتی ہے اس طرح دوسرے علماء اہلحدیث بھی مثلاً مولانا محمد صاحب جونا گڑھی، مولانا محمد بن عبداللہ غزنوی رحمہم اللہ قائل ہیں لہٰذا تحقیق مطلوب ہے کہ اس مسئلہ میں اصل تحقیق کیا ہے؟ بینوا توجروا!

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہئے کہ اس مسئلہ میں سلف سے لے کر خلف تک اختلاف رہا ہے مگر اس مسئلہ میں صحیح بات جس میں کوئی غبار نہیں اور جس کی تردید کا کوئی خوف وخطرہ نہیں وہ یہ ہے کہ رکوع میں شامل ہونے سے رکعت نہ ہوئی، یعنی وہ رکعت دوبارہ پڑھنی پڑے گی اس سے پہلے کہ میں اس مسئلہ کے بارے میں تحقیق پیش کروں عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ کسی بھی بات یا مسئلہ کے حق سمجھنے کا معیار صرف دلیل ہی ہے جو کتاب اللہ وسنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہو حق کو شخصیتوں سے یا مخصوص لوگوں سے نہیں سمجھا جاتا یعنی یہ بات صحیح نہیں کہ چونکہ اس مسئلہ میں ایسے ایسے علماء کی یہ رائے ہے یا وہ اس پر عامل ہیں اس لیے بس یہ مسئلہ ایسا ہی ہے کیونکہ یہ قصہ ہی الٹا ہوا۔

یعنی حق کو شخصیتوں سے دیکھا جاتا ہے، حالانکہ اصل بات اس طرح ہے کہ خود شخصیتوں

کوحق سے دیکھا جائے یعنی جو بات قرآن وسنت سے معلوم ہو اس کے ایسی شخصیتوں کو پرکھا جائے کہ ان کا قول وفعل حق سے موافق ہے تو ان کا عمل صحیح ہے ورنہ غلط اور رد و باطل ہے لہٰذا یہ کہنا کوئی حیثیت نہیں رکھتا کہ علامہ شوکانی نے یہ فتویٰ لکھا ہے یا فلاں فلاں علماء اس کے قائل ہیں کیونکہ یہ علماء (مثلاً) رکوع میں شامل ہونے سے رکعت ہونے کے قائل ہیں تو دوسری طرف اس سے بڑے علماء ہیں۔

امام محدثین امام بخاری حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ اور شیخ الکل سید نذیر حسین وغیرہم بلکہ امام بخاری نے اپنے رسالے جزء القراءۃ میں نقل کیا ہے کہ جو بھی علماء مقتدی کو الحمد پڑھنے کا حکم دیتے ہیں اور اس پر قراءۃ فرض جانتے ہیں ان سب کا مسلک یہ ہے کہ رکوع میں شامل ہونے والا اپنی رکعت دوہرائے گا اب دیکھیں کہ آپ نے جس کے نام لکھے ہیں ان سب کا شیخ سید نذیر حسین ہے ان کا مسلک بھی یہی ہے کہ مدرک رکوع مدرک رکعت نہیں ہے بلکہ صرف ایک امیر المؤمنین فی الحدیث حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا نام ہی اس کے لیے کافی ہے کہ صحیح مسلک کونسا ہے۔

یعنی اگر حق یہ ہے کہ اس پر بڑے علماء عامل ہوں تو ظاہر ہے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سارے محدثین کے سرتاج ہیں۔ لہٰذا اس کا مسلک سب سے معتبر ہونا چاہئے لیکن میں نے عرض کیا کہ اصل یہ بات ہی صحیح نہیں ہے۔ ایک مسئلے میں اگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جیسا آدمی کسی ایک بات کو صحیح سمجھتا ہو مگر ہم کو کتاب وسنت سے معلوم ہو جائے کہ ان کی بات صحیح نہیں ہے تو ہم ان کے مقلد نہیں ہیں، اس لیے اس کو چھوڑنا پڑے گا اور تابعداری حق کی کرنی ہوگی۔ یعنی کتاب وسنت کی نہ کہ کسی خاص فرد کی۔

بہرحال اس بیان سے آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ اگر غرباء اہلحدیث والے یا دوسرے علماء کرام اس بات کے قائل ہیں کہ رکوع میں شامل ہونے سے رکعت ہو جاتی ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ یہی بات واقعی اور فی نفس الامر صحیح ہے۔ بلکہ ہم کو براہ راست کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنا ہے اور دیکھنا ہے کہ ہمیں وہاں سے کیا رہنمائی ملتی ہے پھر جیسے ان

دونوں چشموں سے ہمیں معلومات ملے ہم ان کو حق سمجھیں دوسری بات چھوڑ دیں پھر چاہے کسی کی بھی ہو۔

اس کے بعد میں پہلے وہ دلیل ذکر کرتا ہوں جس کو رکوع میں رکعت ہونے کے قائل پیش کرتے ہیں اور اس پر کلام کرنے کے بعد پھر صحیح مسلک کے دلائل پیش کیے جائیں گے۔

وما توفیقی الا باللہ!

دلیل اوّل:...... ابوداؤد کی سنن میں یہ حدیث اس سند سے منقول ہے:

((حدثنا محمد بن سلیمان عن زید بن ابی العتاب وابن المقبری عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا جئتم الی الصلاۃ ونحن سجود فاسجدوا ولا تعدّوھا شیئا من ادرک رکعۃ فقد ادرک الصلاۃ.))

''مطلب اس حدیث کا یہ خلاصہ ہے کہ جب نماز کے طرف آؤ اور ہم سجدے کی حالت میں ہوں تو تم بھی سجدے میں شامل ہو جاؤ مگر ان کو شمار نہ کرنا یعنی اس لیے تمہیں رکعت نہیں ملی اور جو رکعت میں پہنچ گیا وہ نماز میں پہنچ گیا۔''

رکوع کی رکعت کے قائل حضرات فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جو رکعت کا لفظ ہے اس سے مراد رکوع ہے، لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ جو رکوع میں حاضر ہوا وہ نماز میں یعنی پوری رکعت میں حاضر ہوگیا۔ یہ ہے ان کی دلیل کا خلاصہ اب ہمارے کلام کو انصاف سے سننا۔

(حدیث کی سند) اس حدیث کی سند میں ایک راوی یحییٰ بن ابی سلیمان ہے اس کے متعلق امام محدثین امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں (جزء القرأۃ میں) ''ویحییٰ ھذا منکر الحدیث'' یعنی اس سند میں جو راوی یحییٰ ہے وہ منکر الحدیث ہے۔ اصول حدیث کے ماہر اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ امام بخاری کا کسی راوی کے بارے میں منکر الحدیث کے الفاظ استعمال کرنا اس کا اطلاق شدید جرح کی تقاضا کرتا ہے۔

اس کے علاوہ امام بخاری آگے فرماتے ہیں کہ:

((لم یتبین سماعه عن زید ولا من ابن المقبری ولا تقوم به الحجة.))

یعنی اس راوی ''یحییٰ'' کا زید اور ابن مقبری (سعید بن ابی السعید مقبری) سے سماع بھی واضح نہیں ہے۔ (اس لیے کہ یحییٰ حدثنا کے الفاظ نہیں کہتا بلکہ عن کا لفظ استعمال کرتا ہے جو سماع کے لیے مضبوط لفظ نہیں ہے بلکہ محتمل ہے) اور اس راوی سے دلیل اور حجت نہیں لی جا سکتی، یعنی یہ راوی حجت لینے کے قابل نہیں ہے۔

اور امام بیہقی کتاب المعرفۃ میں فرماتے ہیں کہ "تفرد به یحییٰ بن ابی سلیمان هذا ولیس بالقوی" یعنی یہ الفاظ اس حدیث میں صرف یحییٰ نے نقل کیے ہیں اور وہ قوی راوی نہیں ہے اس طرح تہذیب التہذیب میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اور میزان الاعتدال میں حافظ ذہبی نے نقل کیا ہے کہ حافظ ابو حاتم فرماتے ہیں کہ "یکتب حدیثه ولیس بالقوی" یعنی اس راوی (یحییٰ) کی روایتیں لکھی تو جا سکتی ہیں مگر یہ قوی راوی نہیں ہے۔

مطلب کہ یہ راوی ضعیف ہے اس طرح حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ تقریب التہذیب میں فرماتے ہیں کہ ''لین الحدیث'' یعنی حدیث کا یہ راوی کمزور ہے۔ البتہ ابن حبان اور حاکم اس کی توثیق کرتے ہیں مگر اول یہ کہ ابن حبان اور حاکم کا تساہل مشہور ہے مگر ان کے ہوتے بھی جب ان کی توثیق کے مقابلے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے منکر الحدیث کے الفاظ موجود ہیں جس طرح اصول حدیث کے ماہر کو معلوم ہے کہ یہ الفاظ جرح مفسر ہیں اور جرح شدید ہیں اس لیے اس جگہ جرح کو تعدیل پر مقدم کیا جائے گا "کما تقرر فی اصول الحدیث" لہٰذا یہ راوی ضعیف ہوا جب اس حدیث کی سند میں ایک راوی ضعیف ہے تو یہ حدیث صحیح کیسے ہوگی جب حدیث ہی صحیح نہ رہی تو اس سے اس مسئلے پر دلیل کیسے لی جائے گی۔

دوسری دلیل:...... دارقطنی کی سنن میں ان الفاظ سے مرفوع حدیث آئی ہے کہ:

((من ادرك ركعة من الصلاة فقد ادركها قبل ان يقيم الامام صلبه.))

یعنی جو نماز میں امام کی پیٹھ سیدھی کرنے سے پہلے رکوع میں پہنچ گیا تو وہ نماز میں پہنچ گیا یعنی رکعت ہوگئی۔"

اس حدیث کی سند میں ایک راوی یحییٰ بن حمید ہے جس کے بارے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "لا یتابع فی حدیثہ" یعنی یہ راوی ایسی احادیث لاتا ہے جن کی متابعت نہیں ہوتی اور خود امام دارقطنی نے بھی اس راوی کی تضعیف کی ہے اس طرح اس کی سند میں دوسرا راوی قرۃ بن عبدالرحمٰن ہے اس کے بارے میں جوزجانی فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد سے سنا کہ یہ راوی "منکر الحدیث جداً" یعنی سخت منکر الحدیث ہے اور یحییٰ بن معین نے فرمایا کہ "ضعیف الحدیث" یعنی یہ راوی حدیث میں ضعیف ہے۔ اور ابو حاتم فرماتے ہیں کہ "لیس بالقوی" یعنی یہ راوی قوی نہیں ہے۔ (کذا فی التعلیق المغنی علی الدارقطنی) جب اس حدیث کی سند میں دو راوی ضعیف ہیں تو یہ حدیث حجت لینے کے قابل کیسے ہوگی۔

(متن الحدیث الاول) اب پھر پہلی حدیث کے متن پر غور کریں کہ اس میں الفاظ یہ ہیں کہ جو رکعت میں پہنچا وہ نماز میں پہنچ گیا اور رکعت کے لفظ کی حقیقی معنی پوری رکعت ہے صرف رکوع ان کی مجازی معنی ہے اور مجازی معنی پر عمل تب ہی کیا جاسکتا ہے جب حقیقی معنی وہاں نہ بن سکے اور کوئی قرینہ ہو جو حقیقی معنی کو بدلنے متقاضی ہو۔

مگر یہاں ایسا نہیں کیونکہ یہاں حقیقی معنی بھی درست ہوسکتی ہے، پھر اس کی مجازی معنی کی طرف جانے کی کیا ضرورت ہے یعنی اس قطعہ کا مطلب یہ ہوا کہ باجماعت نماز مکمل ثواب وہ حاصل کرسکتا ہے جو کم از کم پوری ایک رکعت میں پہنچ جائے جیسا کہ دوسری احادیث اس طرح کی آتی ہیں جن میں صراحتاً رکعت، کا ہی بیان ہے یعنی پوری رکعت ملنے سے نماز مل گئی باقی سجدہ وغیرہ کے ملنے سے رکعت نہیں ہوگی اور نہ ہی پوری نماز باجماعت کو پہنچ سکے گا۔

اب بتایا جائے کہ آخر اس معنی میں کون سی خرابی ہے جو خوامخواہ لفظ کو اپنی حقیقی معنی سے نکال کر مجازی معنی پر محمول کیا جاتا ہے؟ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو بات یا امر یا حقیقت طے

شدہ ہو ان کو محض احتمالات سے گرایا نہیں جا سکتا اور یہ بات بھی اہل علم سے مخفی نہ ہو گی کہ ((اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال .)) یعنی احتمال آ گیا تو دلیل لینا باطل ہو جائے گا۔

مطلب کہ جب نماز میں قیام (کھڑا ہونا) اور الحمد کا پڑھنا (اہلحدیث کے پاس) فرض ہے اور نماز کا رکن ہے اور یہ بات ایک طے شدہ اور فیصل حقیقت ہے تو ان فرائض کو اس حدیث سے کیسے گرایا جاتا ہے؟ اور گرانا بھی ایسی حدیث سے جس کی سند بھی صحیح نہیں اور متن میں ایک دوسرا احتمال ہے (یعنی حقیقی معنی پر حمل) جس سبب کے بناء پر یہ حدیث اپنے مفروضے اور دعویٰ کی ہوئی معنی میں بھی نص نہ رہی (بلکہ خود حقیقی معنی والا احتمال اور بھی زیادہ قوی ہے جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔) تو پھر اس محتمل عبارت سے ایک بھی نہیں دو فرضوں کو گرایا جاتا ہے یہ بے انصافی ہے ایک فرض اور رکن کو ساقط کرنے کے لیے دلیل بھی ایسی ہی مضبوط اور نصاً ہو نہ کہ ایک محتمل عبارت کا حامل اور وہ بھی ایسے احتمال کا حامل جو کافی بعید احتمال ہے۔ (کیونکہ مجازی معنی کا حامل ہے) اور اس طرح کا طرز عمل قواعد علمیہ کے خلاف ہے اگر اس طرح عام راستے نکالیں گے تو پھر ہر کوئی کسی نہ کسی محتمل عبارت سے دلیل لے کر اللہ کے فرائض سے جان چھڑا لے گا۔ پھر فرائض کی کیا اہمیت رہی بہرحال حدیث سند کے اعتبار سے تو قابل حجت نہیں ہے مگر متن بھی مزعومہ دعویٰ پر قطعی دلیل یا نص نہیں ہے۔

تیسری دلیل: ...... حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث پیش کی جاتی ہے اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں تھے تو حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ آئے تو آتے ہی صف میں شامل ہونے سے پہلے رکوع کیا پھر آگے بڑھے (رکوع کی حالت میں ہی) اور جا کر صف میں شامل ہوئے سلام کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ یہ کس نے کیا ہے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ کے رسول میں نے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ آپ کے حرص کو (دینی کاموں میں) بڑھائے پھر ایسے نہ کرنا۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ یہ صحابی رکوع میں شامل ہوا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس رکعات لوٹانے کا حکم نہ دیا کہا جائے گا وہ رکعت ہو گئی۔

یہ حدیث اگرچہ صحیح ہے اور بخاری میں موجود ہے لیکن اس میں ان کے دعویٰ کا ثبوت ملنا مشکل ہے۔ کیونکہ جس طرح اس حدیث میں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو اس رکعت کے دہرانے کا حکم دیا اس طرح اس حدیث میں یہ بھی بیان نہیں ہے کہ اس صحابی نے اس رکعت کو نہیں دہرایا مطلب کہ دونوں باتیں ہیں تو جس طرح یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ اس نے رکعت نہ پڑھی ہو۔ یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ اس نے دہرائی ہو اس لیے کہ صحابہ کو یہ بات معلوم تھی کہ قیام فاتحہ کا نماز میں پڑھنا فرض ہے، چونکہ یہ بات پہلے ہی متحقق تھی اس لیے راوی نے یہ ذکر ہی نہیں کیا کہ کیونکہ دستور ہوتا ہے کہ جو بات پہلے ہی معلوم ہوتی اس کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی البتہ جو بات نئی پیش آتی ہے اس کو ذکر کیا جاتا ہے لہٰذا یہ ہوسکتا ہے کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے یہ رکعت دہرا کر پڑھی ہو پھر چونکہ یہ بات (یعنی قیام اور سورۃ فاتحہ کے سبب رکعت کا دہرانا) تو پہلے ہی معلوم تھا اس لیے اوپر والے راوی نے اس بات کا ذکر ہی نہ کیا البتہ یہ بات جو نئی تھی۔ یعنی حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کا صف میں شامل ہونے سے پہلے رکوع کرنا پھر رکوع ہی کی حالت میں چلتے ہوئے صف میں شامل ہونا اور حضور اکرم ﷺ کا اس طرح کرنے سے منع کرنا ذکر کیا جب اس رکعت کے متعلق یہ دونوں احتمال ہوسکتے ہیں۔

(کیونکہ ذکر کسی بات کا نہیں اور عدم ذکر عدم وجود کو لازم نہیں ہے) تو پھر یہ بتایا جائے کہ یہ حضرات یہ یقین سے کیسے کہتے ہیں کہ اس صحابی نے اس رکعت کو نہیں دہرایا بلکہ صرف کسی بھی مزید بات کا ذکر نہیں ہے پھر کیا یہ عالم الغیب ہیں جو ان کو معلوم ہوگیا کہ واقعی اس صحابی نے رکعت نہیں دہرائی اور اگر یہ عالم الغیب نہیں ہیں اور یقیناً نہیں ہیں تو پھر یہ قطعی حکم لگاتا کہ اس صحابی نے رکعت نہیں دہرائی اور آپ ﷺ نے اس کو دہرانے کا حکم بھی نہ دیا اور اس بنائے ہوئے مفروضے پر پھر یہ متفرع کرنا کہ بس اس سے ثابت ہوا کہ رکوع سے رکعت ہوگئی یہ کتنی ہی عجیب بات ہے۔ اصل بنیاد ہی ثابت نہیں تو پھر جو ان پر تفریع کی جاتی ہے وہ کہاں سے ثابت ہوگی۔ کیا کتاب وسنت سے جو باتیں فرض معلوم ہوتی ہیں وہ صرف کچھ

موہوم احتمالات کی بناء پر ساقط کر دی جائیں گی؟

اس کے علاوہ اس حدیث میں یہ بیان ہے کہ وہ صحابی صف سے باہر رکوع کرتا ہوا آیا پھر آ کر صف میں شامل ہوا کیا یہ حضرات اس فعل کو جائز کریں گے یعنی دوسرا کوئی اس طرح کرے کہ امام رکوع میں جائے پھر مسبوق مسجد میں داخل ہوتے ہی دور سے رکوع کرتا ہوا آئے، اور صف میں شامل ہو جائے کیا اس طرح جائز کہیں گے؟

بالکل نہیں کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے ان کو منع کر دیا کہ ایسا نہیں کرنا یعنی آپ ﷺ نے فرمایا کہ "زادك الله حرصاً ولا تعد" اللہ آپ کے حرص کو (دینی کاموں میں) بڑھائے آئندہ ایسے نہ کرنا اب جب ایک بات سے آپ ﷺ نے منع فرمایا (یعنی اس نے کیسے پھر کیا لیکن آپ ﷺ نے اس طرح کرنے سے آئندہ کے لیے روک دیا تو پھر روکے ہوئے کام کو کیسے جائز کیا جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ اس صحابی کی روایت میں اس طرح پھر آتا ہے کہ حضور اکرم کے سوال کرنے پر اس نے جواب دیا کہ:

((نعم جعلني الله فداك خشيت اما تفوتين ركعة معك فاسرعت المشي .))

"یعنی ہاں اللہ کے رسول ﷺ اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر قربان کرے مجھے خوف ہوا کہ کہیں مجھ سے رکعت فوت نہ ہو جائے اس لیے چلنے میں جلدی کی۔"

یہ حضرات کہتے ہیں کہ اس صحابی کا مطلب تھا کہ اگر میں رکوع میں شامل ہو گیا تو رکعت فوت نہیں ہو گی، اس لیے چلنے میں جلدی کی کہا جائے گا کہ یہ صحابی رکوع میں شامل ہونے سے رکعت ملنے کا قائل تھا۔ آپ ﷺ نے اس پر رد نہ کیا۔ یہ ہے ان کی دلیل کا خلاصہ۔

لیکن اول تو سوچنے کی یہ بات ہے کہ حدیث کا یہ ٹکڑا جو اپنے دلیل میں پیش کیا جاتا ہے، ان کی سند کہاں ہے یہ عجیب انصاف ہے کہ ایسے زبردست مسئلے میں جس میں دو فرض گرتے ہیں اس بے سند روایتیں لا کر معرض استدلال میں پیش کرتے ہیں کیا یہ افسوسناک حقیقت نہیں ہے؟

اگر اہل حدیث حضرات بھی اپنے مسائل کو ثابت کرنے کے لیے یہ طرز عمل اختیار کریں گے اور اس قسم کے بے سند دلیل اور روایتیں پیش کریں گے تو پھر بیچارے مقلدین کے لیے بجا ہے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کتنی جگہوں پر حنفی حضرات کچھ احادیث پیش کرتے ہیں تو اہلحدیث علماء ان کو کہتے ہیں کہ ان احادیث کی سند نہیں ہے یا تو سند پیش کرو یا پھر یہ دلیل معرض احتجاج میں پیش نہ کرو اور یہ بات واقعی کے اعتبار سے بھی صحیح ہے، پر اس مسئلے میں وہ اپنے اس مسلک اور صحیح اصول کو کیوں بھول جاتے ہیں، کیا یہ نمونہ ''خود را فضیحت دیگرآں را نصیحت'' کے مصداق نہیں ہے مجھے تو یہ ٹکڑا کسی بھی ایسی حدیث کی کتاب سے نہیں ملا جس میں اس کی سند بھی شامل ہو اور ظاہر ہے کہ اسناد کے سوا روایت بیکار ہے ورنہ اگر اسناد کی پابندی نہ ہوتی تو ہر کوئی اللہ کے رسول ﷺ کی طرف جو چاہتا وہ نسبت کرتا اور دین کی صورت کیا سے کیا ہو جاتی۔

بہرحال جو بھی اس قطعہ سے استدلال کرتا ہے اول تو اس کو اس قطعہ پر مشتمل حدیث کو کسی مستند کتاب سے یا اسناد نقل کرنی چاہیے، پھر استدلال میدان میں آ کر پیش کرے پھر دیکھیں کہ اس کی سند قابل حجت ہے یا نہیں لیکن اگر اس کی سند پیش نہ کر سکے تو پھر ان سے استدلال کرنا اپنی جہالت ظاہر کرنا ہے یا تجاہل عارفانہ کر کے محض فتویٰ کو ثابت کرنے کی کوشش اور یہ دونوں باتیں مذموم ہیں اور کوئی بھی ان کو اچھا یا صحیح نہیں کہے گا۔

دوسری بات یہ کہ یہ ٹکڑا آپ ﷺ کے صحابی نے سوال کے جواب میں پیش کیا سوال یہ تھا۔ (جو اس حدیث میں مذکور ہے) کہ

((انت احب هذا النفس .))

''کیا تو نہیں تھا جو اس طرح سانس لے رہا تھا۔''

یعنی صحابی نے جلدی کی تھی اس لیے سانس لے رہا تھا لہٰذا آپ ﷺ نے اس کے سانس لینے کی آواز سنی اور پوچھا کہ تو ہی سانس لے رہا تھا) مطلب کہ صحابی سے دو غلطیاں صادر ہوئی تھیں ایک تو نماز کے طرف چلنے میں جلدی کر رہا تھا حالانکہ اس کو حکم تھا کہ نماز کی

طرف آؤ تو آرام اور وقار سے، جلدی نہ کرو پھر جو نماز ملے وہ پڑھو اور جو فوت ہو جائے وہ پوری کرو اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

((صل ماادركت واقض ما سبقك .))

''یعنی جلدی نہ کر چلنے میں تیزی نہ کر باقی جو نماز ملے وہ ادا کر جو فوت ہوگئی وہ پوری کر۔''

دوسری غلطی یہ تھی کہ صف میں شامل ہونے سے پہلے رکوع کرتے ہوئے آ کر صف میں شامل ہوا اس لیے یہ ارشاد فرمایا کہ:

((زادك الله حرصاً ولا تعد .))

اللہ تعالیٰ آپ کے حرص کو بڑھائے آئندہ ایسے نہ کرنا۔''

اب ان حقیقتوں کو ذہن میں رکھ کر غور کریں کہ اصل معاملہ کیا تھا، یعنی اصل معاملہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابی مسجد میں داخل ہوا تو آپ ﷺ ابھی تک قیام میں تھے لہٰذا صحابی نے دوڑ لگائی تا کہ رکعت فوت نہ ہو لیکن وہ صف سے دور تھے کہ آپ ﷺ رکوع میں چلے گئے یہ تھا ان کا بیان جو آپ ﷺ نے جلدی کرنے کے سبب اور سانس لینے کے بارے میں دریافت کیا۔ مگر جب صحابی نے دیکھا کہ رکعت تو گئی تو پھر ارادہ کیا کہ رکوع تو نہ جائے کیونکہ اگر چہ رکعت تو پوری نہ ہوئی مگر امام کے ساتھ کسی بھی رکن میں شامل ہونے پر کم از کم ثواب تو ملے گا اس لیے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے جس حالت میں دیکھو اس میں شامل ہو جاؤ قیام کی حالت میں یا رکوع کی حالت میں یا سجدہ کی حالت میں جس حالت میں ہوں تم بھی ان میں شامل ہو جاؤ۔

مطلب کہ امام جس حالت میں ہو مسبوق کو اس میں شامل ہونا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ سجدے میں شامل ہونے والا رکعت کو بالاتفاق نہ پہنچ سکا، لیکن حکم یہی ہے کہ اس حالت میں امام کے ساتھ شامل ہو جاؤ تا کہ سجدے میں شمولیت کا ثواب تو نہ جائے گو رکعت دہرانی پڑے اس لیے اس صحابی نے بھی یہ خیال کیا کہ رکعت تو گئی اب آپ ﷺ کے ساتھ رکوع میں

شامل ہو جاؤں تاکہ اس کا تو ثواب حاصل ہو، یہ سبب تھا دوسری غلطی کا یعنی صف میں شامل ہونے سے پہلے رکوع کرتے دوڑ لگانا۔

دوسرا یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ صحابی کا یہ مطلب تھا کہ حضور سمجھے یہ خوف ہوا کہ کہیں مجھ سے رکوع نہ نکل جائے کیونکہ ان کے ملنے سے اگرچہ رکعت تو نہیں ملی لیکن اس میں شامل ہونے سے کم ازکم ان کا تو ثواب ملے گا۔ تب جلدی کی اس احتمال کے مطابق اس قطعہ میں جو لفظ رکعت کا ہے اس کی معنی رکوع ہوگی اور یہ معنی اس کی حقیقی نہیں ہے بلکہ مجازی ہے مگر یہاں ان کے لیے قرینہ ہے وہ یہ ہے کہ آپ رکوع میں جا چکے تھے لہٰذا خطرہ بھی اس کی فوت ہونے کا ہوسکتا تھا نہ کہ رکعت بمعنی حقیقی معنی کے، کیونکہ یہ تو رکوع میں جانے سے فوت ہو چکی تھی پھر اس کے فوت ہونے کے خوف کی کیا معنی اس پر خوب غور کرو، اس کے علاوہ ان ساری باتوں یا احتمالات سے قطع نظر بھی کیا جائے تو بھی اس قطعہ کے آخر میں (جسے دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے) یہ الفاظ ہیں کہ "واقض ما سبقك" یعنی جو فوت ہو چکا رکعت وغیرہ اس کو پوری کرو۔ یہ الفاظ تو خود ہمارے مسلک کی واضح تائید کرتے ہیں۔

یعنی آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اپنی فوت شدہ یا رہی ہوئی رکعتوں وغیرہ کو پوری کرو اس سے یہ تو ہرگز معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس کی رکعت ہوگئی۔ اس طرح الحمدللہ سارا اشکال اور اعتراض رفع دفع ہوگیا۔

خلاصہ کلام: ......اس قطعہ والی روایت جو پیش کی جاتی ہے اول تو اس کی سند نہیں ہے۔ لہٰذا حدیث قابل استدلال نہیں ہے۔ اس کے بعد اس کے متن میں دوسرے بھی احتمال موجود ہیں (ان کے پیش کیے ہوئے احتمال کے علاوہ) اور جب تک ان احتمالات کو غلط ثابت نہ کیا جائے تب تک ان کا استدلال صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ ایک تو ہمارے احتمال قواعد شرعیہ اور ثابت شدہ اصول سے بالکل موافق ہیں اور دوسرا "اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال" اس کے علاوہ اس کے آخر میں جو الفاظ ہیں وہ ہمارے مسلک کی تائید کرتے ہیں۔ جیسے اوپر تفصیلاً گذر چکا ہے۔

مطلب کہ یہ ٹکڑا تو قابل استدلال نہیں ہے رہی بات اصل حدیث حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ والی کی تو وہ اگرچہ صحیح ہے لیکن اس سے مزعومہ اور مفروضہ دعویٰ پر دلیل تب ہی لی جاسکتی ہے جب اس حدیث سے یہ ثبوت بھی ملے کہ واقعی حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے یہ رکعت نہیں دہرائی اور دوسری حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کو اس بات کا پتہ بھی چلا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اعادہ کا حکم نہیں دیا۔ جب تک ان دونوں باتوں کو صحیح حدیث یا سند سے ثبوت مہیا نہیں کیا جاتا تب تک یہ دلیل ناتمام ہے اور حجت کے قابل ہی نہیں ہے کہ ان کو استدلال کے میدان میں لایا جائے۔ یہاں مخالفین کے دلائل پر کلام مکمل ہوا۔ واللہ اعلم!

اس کے بعد ہمارے دلائل پر غور کریں اگرچہ ضمناً اوپر والے کلام میں ہی آپ کو اصل حقیقت کا کماحقہ ادراک ہو چکا ہوگا، پھر بھی بات کو تقویت دینے کے لیے دو مزید دلائل پیش کرتے ہیں اور حدیث بھی صحیح ہے۔ (بخاری کی روایت ہے) کہ

((اذا اتیتم الصلاۃ فما ادرکتم فصلوا وما فاتکم فاتموا))

''یعنی جب نماز کی طرف آؤ تو جتنی نماز ملے وہ پڑھو (جماعت وامام کے ساتھ) اور جتنی فوت ہو جائے اس کو پورا کرو۔''

اس سے دلیل اس طرح لی جاتی ہے کہ جو رکوع میں آکر ملتا ہے اس سے قیام اور سورۂ فاتحہ دونوں فوت ہو گئے لہٰذا ان کو امر موجب (اور امر وجوب کے لیے ہی ہوتا ہے الا مع قرینہ) ان فوت شدہ کا (قیام وفاتحہ) کو پورا کرنا ہے یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب رکعت دہرائی جائے یہ حدیث بالکل صحیح ہے اس کے اوپر کوئی بھی غبار و کلام نہیں ہے اور اس کے مقابل دوسری کوئی بھی دلیل نہیں ہے جس کے لیے اس سے تحقیق کر کے اسے (رکوع کو) باہر نکالا جائے۔

دوسری دلیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لا صلاۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب)) (بخاری و مسلم)

''یعنی جس نے الحمد نہ پڑھی ان کی نماز ہی نہ ہوئی۔''

یہ بھی حدیث صحیح ہے صحاح ستہ میں موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس رکعت میں

الحمد نہ پڑھی جائے وہ نہیں ہوئی اور رکوع میں ملنے والے سے الحمد فوت ہوگئی لہٰذا ان کی رکعت بھی نہ ہوئی جب نہ ہوئی تو دہرائے گا۔

چوتھی دلیل:...... الحمد اور قیام فرض اور نماز کے اہم رکن ہیں قیام کے متعلق تو احناف حضرات بھی فرضیت کے قائل ہیں لیکن فاتحہ کے متعلق وہ فرضیت کے قائل نہیں ہیں۔ اہلحدیث دونوں کی فرضیت کے قائل ہیں اب ایک چیز جو صحیح حدیث سے فرض ثابت ہو چکی ہے اس کی فرضیت کچھ حالتوں میں ساقط ہونے کے لیے دلیل بھی ایسی ہی قوی ہونی چاہئے جیسے فرضیت کے لیے موجود ہیں صرف احتمالی باتوں سے یا کمزور اور بے سند دلائل سے ان کی فرضیت گرانا نہ جائز ہے اور نہ مناسب بلکہ انتہا درجے کی جرأت ہے جسے اہل علم وعقل کبھی بھی جائز نہ رکھیں گے اور اوپر تفصیل سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ اول تو کوئی صحیح دلیل کسی صحیح حدیث سے ہی ملتی ہے لیکن اگر حدیث صحیح ہے تو اس میں ان کی مزعوم دعویٰ کا ثبوت ملنا مشکل نہ پر محال ہے پھر ایسے احتمالی دلائل یا ناتمام حجتوں اور بے ثبوت حدیثوں سے ان ارکان کی فرضیت ساقط کرنے کے لیے ہمارے اہل حدیث آمادہ ہیں تو اس سے تو بہتر ہے کہ ان ارکان کی فرضیت کا (نماز میں) ہی انکار کر دیں باقی ان کو فرض بھی کہنا پھر ان کی فرضیت ایسے کمزور دلائل سے گرانا ایسا طرز عمل ہے جسے کم از کم میں تو نہیں سمجھ سکتا باقی غرباء اہل حدیث والے کہتے ہیں کہ جس ہستی (حضور اکرم ﷺ) نے ان کی فرضیت بیان کی ہے اس نے رکوع میں ملنے والے کے لیے پوری رکعت ملنے کا حکم کیا ہے یہ بات انتہائی عجیب ہے کیونکہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں ظاہر ظہور اور وضاحت سے آیا ہے کہ آپ ﷺ نے مدرک الرکوع کو مدرک الصلاۃ قرار دے دیا۔

حالانکہ ایسی قولی دلیل مضبوط تو کوئی بھی نہیں رہی حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ والی پہلی حدیث اس میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ انھوں نے یہ رکعت دہرائی یا نہیں جب تک یہ باتیں ثابت نہ ہوں تب تک دعویٰ ثابت نہ ہوگا، پھر یہ حضرات حضور اکرم ﷺ کی طرف یہ بات کیسے منسوب کرتے ہیں جس کی نسبت کرنا یقینی نہیں کاش ہمیں صحیح علم ہو بس اس پر میں اکتفا کرتا ہوں۔

جواب کافی طویل ہوگیا ہے لیکن کیا کریں اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت بھی نہیں تھی امید ہے کہ آپ اس کو غور اور انصاف سے پڑھیں گے تو حق بات آسانی سے آپ کو معلوم ہو جائے گی۔ والله اعلم بالصواب.

ارسال الیدین یا قبض الیدین

سوال: رکوع کے بعد ہاتھ باندھنے چاہئیں یا نہیں، جیسا کہ اہل علم باندھتے ہیں اور اگر نہیں تو پھر حدیث تحریر فرمائیں؟ اور اس کے متعلق اگر آپ نے کوئی کتاب لکھی ہو تو بھیج دیں تاکہ تسلی ہو سکے؟

الجواب بعون الوهاب: میری تحقیق یہی ہے کہ رکوع کے بعد قیام میں ہاتھوں کو چھوڑ دینا چاہیے باندھنا نہیں چاہیے۔ اس مسئلہ میں راقم الحروف نے ایک سندھی زبان میں ضخیم کتاب لکھی تھی بعد میں چند احباب کے کہنے پر اردو زبان میں بھی ایک رسالہ مختصر بنام "نیل الامانی وحصول الآمال" لکھا اس پر بھائی صاحب جناب سید بدیع الدین شاہ رحمہ اللہ نے تنقید فرمائی میں نے پھر اس کا جواب لکھا جو حال ہی میں کراچی سے طبع ہوا ہے، میں یہ دونوں کتابیں ارسال کر رہا ہوں، آپ گہری نظر سے مطالعہ کر کے ان کے متعلق اپنے چند تاثرات ضرور لکھ بھیجیں۔

ربنا ولک الحمد بلند آواز سے یا آہستہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو مقتدیوں کو "ربنا ولك الحمد حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه" بآواز بلند کہنا مستحب وافضل ہے یا آہستہ کہنا بہتر ہے؟ عام طور پر اہلحدیث اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں ایک صحابی نے سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد آنحضرت ﷺ کے پیچھے بلند آواز سے مذکورہ الفاظ کہے تو نماز کے بعد آنحضرت ﷺ

کے پوچھنے پر جس صحابی رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ کہے تھے بتایا کہ انہوں نے یہ الفاظ کہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے ۳۰ سے بھی زائد ملائکہ علیہم السلام کو دیکھا کہ وہ جلدی کر رہے تھے کہ کون ان میں سے ان کلمات کا اجروثواب اوّل لکھے۔'' اس سے جو یہ دلیل پکڑتے ہیں کہ یہ کلمات بلند آواز سے کہنا افضل ہے کیا یہ دلیل لینا صحیح ہے؟ بینوا توجروا!!

الجواب بعون الوهاب: اگر انصاف کے دامن کو تھام لیا جائے تو صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلمات مقتدیوں کو آہستہ کہنے چاہئیں البتہ اگر کسی نے کبھی بلند آواز سے بھی کہہ بھی دیا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں دلیل یہ ہے کہ عام طور پر صحابہ کرام سب کے سب ربنا ولک الحمد الخ آہستہ کہا کرتے تھے جیسا کہ سوال میں مذکور حدیث کا سیاق اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس صحابی کے ان کلمات کو بلند آواز سے کہنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد پوچھا تھا کہ:

((من المتكلم انفاً؟))

یہ کلمات کس نے کہے ہیں؟ اگر پہلے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سب کے سب یا اکثر کوئی ایک بھی یہ کلمات بلند آواز سے کہتا رہتا ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیوں دریافت فرماتے؟ جو بات عام ہوتی ہے اس کے متعلق تو یہ پوچھا نہیں جاتا کہ آپ میں سے کس نے یہ کلمات کہے ہیں بہرحال اس سے صاف طور پر معلوم ہوا ہے کہ عام طور پر کوئی بھی یہ کلمات بلند آواز سے نہیں کہتا تھا اس لیے جب کسی نے یہ کلمات بلند آواز سے کہے تو آپ نے دریافت فرمایا: اس طرح اس واقعہ کے بعد بھی پورے دفاتر احادیث میں ایک حدیث میں بھی ایسی وارد نہیں ہے کہ اس واقعہ کے بعد سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا اکثر یہ کلمات بلند آواز سے کہنا شروع کر دیا تھا بلکہ اس ایک واقعہ کے سوا سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد ان کلمات کو بلند آواز سے کہنا ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت نہیں ہے۔

ورنہ اگر ایسا ہوا ہوتا یعنی اس واقعہ کے بعد کس ایک صحابی نے بھی یہ کلمات بلند آواز سے کہنا شروع کر دیئے تھے اور کرتا رہتا تھا تو ضرور صحیح یا حسن سند سے ہم تک یہ روایت

منقول ہوتی روایات میں یہ تو آیا ہے بلکہ تابعین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ جب امام سورۃ فاتحہ ختم کرتا تھا تو پیچھے مقتدی آمین اس زور سے کہتے تھے کہ مسجد گونج جاتی لیکن کسی تابعی نے یہ روایت بیان نہیں کی کہ ''ربنا ولك الحمد'' کے کلمات کہنے سے مسجد گونج جاتی تھی بلکہ کسی ایک صحابی سے بھی یہ روایت نہیں ہے کہ وہ امام کے پیچھے بلند آواز سے کہتا تھا کیا اس سے ایک منصف مزاج آدمی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ الفاظ بلند آواز سے کہنا نہ مستحب ہیں اور نہ ہی افضل کیونکہ جو بات افضل ہوگی اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جیسی ہستیاں کیسے پیچھے رہ سکتی ہے تھی؟ اس حدیث سے جو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ ان کلمات کا ثواب واجر بہت ارفع واعلیٰ تھا، اور صحابی نے کچھ ایسے جذبہ سے یہ کلمات کہے تھے کہ اتنے سارے ملائکہ علیہم السلام اس کے اجروثواب لکھنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے خواہاں ہوئے، باقی اس اجروثواب کا تعلق جہراً یا سراً کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ورنہ اگر یہ ثواب واجر بلند آواز کے کہنے کی وجہ سے ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ضرور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو ارشاد فرماتے کہ آئندہ تم بھی یہ کلمات بلند آواز سے کہا کرو یا وہ خود ہی جہراً کہنے پر عمل پیرا ہو جاتے، کیا یہ دلیل اظہر من الشمس نہیں؟ ہاں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی کبھی جہراً کہہ بھی دے تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس جہراً سے منع نہ فرمایا۔ بہرحال مندوب وافضل یہ کلمات آہستہ کہنے ہیں ہاں اگر کوئی کبھی کبھار بلند آواز سے کہہ دے تو کوئی حرج نہیں، اگر کوئی صاحب اس واضح برہان کے بعد بھی اس پر مصر ہے کہ یہ کلمات بلند آواز سے کہنے مستحب وافضل ہیں تو پھر میں گذارش کروں گا کہ صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث مروی ہے کہ:

> آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے ایک آدمی آیا، اس کا سانس پھولا ہوا تھا وہ صف میں داخل ہوا اور اللہ اکبر کہا اور استفتاح والی دعا کی جگہ یہ الفاظ بلند آواز سے کہے:
>
> ((الحمد لله حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فيه .))
>
> پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو تین بار دریافت فرمایا کہ یہ کلمات

کس نے کہے تھے تیسری بار جس نے یہ الفاظ کہے تھے بتایا کہ اس نے یہ کلمات کہے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: بیشک میں نے بارہ ملائکہ علیہم السلام کو دیکھا کہ وہ جلدی کر رہے تھے کہ کون ان کلمات کو لے کر اوپر جائے، اب جو آدمی ان کلمات کو ان کے اس اجر وثواب یا فضیلت سے ان کے جہراً کہنے کا فتویٰ دیتا ہے تو انہیں یہ بھی چاہئے کہ وہ یہ فتویٰ بھی دے کہ نماز میں یہ دعا استفتاح بھی بلند آواز سے کہنا مستحب وافضل ہے۔ حالانکہ ایک اہلحدیث نے بھی آج تک یہ فتویٰ نہیں دیا۔ فتدبروا!!

اسی طرح ترمذی، ابوداؤد اور سنن نسائی میں صحیح سند سے حضرت رفاعہ بن رافع سے روایت ہے کہ میں نے حضرت رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی پھر مجھے چھینک آئی تو میں نے یہ کلمات کہے

((الحمد لله حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه مباركاً عليه كما يحب ربنا ويرضى .))

پھر جب آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو دریافت فرمایا کہ یہ کلمات کس نے کہے تو سب خاموش پھر دوسری مرتبہ دریافت فرمایا پھر بھی کوئی نہ بولا پھر جب تیسری بار پوچھا تو رفاعہ رضی اللہ عنہ نے فرماتے ہیں میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ میں ہی ہوں یہ کلمات کہنے والا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس ذات پاک کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تیس سے بھی اوپر ملائکہ علیہم السلام ان کلمات کو لینے میں جلدی کر رہے تھے کہ کون ان کلمات کو لے کر اوپر چڑھ جائے آسمان کی طرف۔

اس صحیح حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ ایک صحابی نے چھینک آنے پر یہ کلمات کہے اور ان کا اجر وثواب اور فضیلت وبھلائی اللہ تعالیٰ کے رسول اکرم ﷺ نے یہ فرمائی کہ تیس سے بھی اوپر ملائکہ علیہم السلام ان کلمات کے اوپر لے جانے میں ایک دوسرے سے سبقت کر رہے تھے تو کیا یہ اہلحدیث صاحبان یہ فتویٰ بھی دیں گے کہ آئندہ جس کو نماز میں چھینک آئے تو وہ یہ کلمات اونچی آواز سے کہے کیونکہ ان کا اونچا کہنا مندوب وافضل ہے؟ اب تک کسی حضرت

نے یہ فتویٰ نہیں دیا۔

یہ تین مختلف واقعات ہیں جن میں چند کلمات کو بلند آواز سے کہنے کا ایک ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے ثبوت ملتا ہے لیکن جہاں تک میرا مبلغ علم ہے تو مجھے تو متقدمین، محدثین اور شارحین حدیث میں سے کسی ایک کا بھی قول دیکھنے میں نہیں آیا کہ انہوں نے اس حدیث کے تحت یہ فرمایا ہو کہ ان الفاظ کو بلند آواز سے کہنا مستحب وافضل ہے۔ صرف آج کل کے اہلحدیثوں نے اس پر بلاوجہ زور دیا ہے حالانکہ جیسا اوپر گذارش کر آیا ہوں کہ ان احادیث سے صرف ان کلمات کے کہنے کی بھلائی اور فضیلت معلوم ہوتی ہے باقی سراً یا جہراً کا ان میں کوئی پتہ نہیں نہ ہی اس کی طرف نفس حدیث میں کوئی اشارہ ہے ورنہ اس بھلائی کے حصول کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اولین حقدار تھے۔

هٰذا ما عندی والعلم عندالله العلی العظیم وهو اعلم بالصواب والیه المرجع والمآب وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین وصلی الله علی سیدنا ونبینا وشفیعنا محمد واله واصحابه وبارك وسلم.

سوال: رکوع کے بعد سر اٹھا کر بلند آواز سے "ربنا ولك الحمد حمداً کثیراً طیبا مبارکا فیه" کہنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: صحیح بخاری میں حضرت رفاعہ بن رافع سے مروی ہے کہ:

((سمع الله لمن حمده قال رجل وراءه ربنا ولك الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیه فلما انصرف قال من المتکلم قال انا قال رأیت بضعة وثلاثین ملکا یتبدرونها الیهم من یکتبها اول.))

''حضرت رفاعہ بن رافع فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم حضرت نبی اکرم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے جب آنحضرت ﷺ نے رکوع سے سر مبارک اٹھایا

"سمع الله لمن حمده" کہا تو ایک آدمی نے جو آپ کے پیچھے تھا اس نے کہا "ربنا ولك الحمد حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه" پھر جب آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو پوچھا کہ یہ کلمات (ربنا ولك الحمد ......الخ) کس نے کہے تو اس آدمی نے جواب دیا کہ میں نے تو آپ نے فرمایا کہ میں نے تیس سے اوپر چند ملائکہ کو دیکھا کہ وہ جلدی کر رہے تھے کہ کون ان میں سے یہ کلمات پہلے لکھ لے۔"

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

①:...... صحابی رضی اللہ عنہ نے یہ کلمات بلند آواز سے کہے ورنہ وہ صحابہ تک کو سننے میں نہ آتے اور حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ نے بھی یہ کلمات سنے تھے (اس پر سیاق واضح طور پر دلالت کرتا ہے۔)

②:...... آنحضرت ﷺ نے اس صحابی کے اس فعل کو ناپسند نہیں فرمایا ورنہ بلند آواز کہنے سے منع فرماتے بلکہ آپ نے اس کا یہ فعل بحال رکھا اور آپ نے جس قول یا فعل کو بحال رکھا اس سے منع نہ فرمایا وہ بھی مشروع ہوا اور اس کو تقریر کہتے ہیں۔

بہرکیف ان کلمات کو بلند آواز سے کہنا منع نہیں ہے بلکہ جائز ہے اور بلند آواز سے کہنے والے پر نکیر نہیں کرنا چاہیے، لیکن حدیث کے سیاق سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ایسے اور کلمات بلند آواز سے کہا نہیں کرتے تھے ورنہ اگر یہ عام روش ہوتی تو آنحضرت ﷺ اس طرح دریافت نہ فرماتے کہ یہ کلمات کس نے کہے ہیں۔"كما هو الظاهر"

باقی جو فضیلت وارد ہوئی ہے (اس حدیث میں) وہ ان کلمات کی وجہ سے ہے اس میں آواز بلند ہونے کی کوئی دخل نہیں۔ یعنی یہ کلمات صحابی نے ایسے خلوص سے ادا کیے کہ اللہ کے ان فرشتوں میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ وہ ان کلمات کو پہلے لکھے۔

بہرصورت یہ کلمات رکوع سے سر اٹھانے کے بعد کہنا بڑے ثواب کا کام ہے پھر وہ

آہستہ کہے یا بلند آواز سے ادا کرے دونوں طرح جائز ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب!

آگ کے آگے نماز

سوال: نمازیوں کے آگے جلتی ہوئی بتی (لالٹن) یا لکڑی کھڑی کرنے کا حدیث میں کوئی ذکر ہے؟

الجواب بعون الوھاب: لکڑی وغیرہ کا عمداً (خاص طور پر کھلے میدان میں) کھڑی کرنے کا حکم آتا ہے تاکہ سترے کا کام دے اور کسی دوسرے کو نمازی کے آگے گذرنے میں رکاوٹ نہ رہے اس لیے لکڑی وغیرہ آگے کھڑی کرنا قطعاً ممنوع نہیں ہے باقی جلتی ہوئی لالٹن اس بارے نہ قرآن میں منع آئی ہے نہ حدیث میں کہ نمازی کے آگے جلتی ہوئی لالٹن نہ رکھو۔ لہٰذا ان کے آگے رکھنے میں نہ کچھ قباحت ہے اور نہ ہی ممانعت ہے کیونکہ اعمال ممنوع وہ ہو سکتے ہیں جن کے بارے قرآن وسنت میں منع آئی ہو باقی دوسرے کام اپنی اصلی اباحت پر قائم رہیں گے۔

البتہ تنور جس میں آگ جل رہی ہو ان کے سامنے نماز پڑھنے سے کچھ علماء منع کرتے تھے یا ان کو مکروہ اور ناپسند سمجھتے تھے کیونکہ مجوسین سے مشابہت نہ ہو باقی جلتی ہوئی لالٹن کے بارے کوئی بھی معتبر یہ قول دیکھنے میں نہیں آیا۔

بہرحال جب قرآن وسنت ان کے منع سے خالی ہیں تو یہ بات بھی ممنوع نہ رہی۔

واللہ اعلم بالصواب

مساجد کا منتقل کرنا

سوال: ایک گاؤں میں مسجد تھی اب اس گاؤں کے لوگ کسی مجبوری کے تحت وہاں سے چل کر کسی دوسری جگہ پر آباد ہو گئے ہیں اور وہ مسجد آباد نہیں رہی اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ لوگ جو اس گاؤں کو چھوڑ کر گئے ہیں اس مسجد کو گرا کر اسی کے سامان سے جہاں پر اب آباد

ہوئے ہیں دوسری مسجد بنا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب بعون الوھاب: اگر اس گاؤں میں یعنی جس سے لوگ چلے گئے ہیں کوئی اور باشندہ نہیں رہا اور گاؤں بالکل خالی ہو گیا ہے اور کوئی دوسرا بھی وہاں آ کر اس کو آباد نہیں کر سکتا اور دوسرے گاؤں (جہاں لوگ اب آباد ہو چکے ہیں) سے بھی یہ بہت دور ہے اتنا دور کہ وہاں آ کر پنج گانہ نماز ادا نہیں کر سکتے تو پھر اس مسجد کو گرا کر وہاں پر نئی مسجد بنا سکتے ہیں۔ کیونکہ اسی طرح چھوڑ دینے سے مسجد کا برباد ہونا لازم آتا اور اس کا سامان وغیرہ جو چھت وغیرہ میں لگا ہوگا وہ ضائع ہو جائے گا۔ لہٰذا جب کہ حدیث میں اپنے مال کی اضاعت سے بھی منع فرمایا گیا ہے تو مسجد کے سامان کو اضاعت سے بچانا تو بطریق اولیٰ ضروری ہوگا اور انسان کو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا جب وہ لوگ بوجہ اشد ضرورت اور مجبوری کے سبب سے وہاں سے چلے گئے ہیں اور وہاں مسجد کی آبادی کے لیے بھی کوئی نہیں رہا اس لیے ان کے لیے یہ اضطراری حالت کی وجہ سے جائز ہے کہ اس مسجد کو شہید کر کے دوسری جگہ پر جہاں اب وہ آباد ہو چکے ہیں وہاں پر نئی مسجد بنا لیں۔ اور ویسے بھی مسجد کو ویران کرنا بڑا جرم ہے اس لیے اس مسجد کو وہاں چھوڑ دینا جہاں وہ خراب و ویران ہو جائے اس سے یہ اچھا و بہتر ہے کہ اس کو دوسری جگہ پر از سر نو بنایا جائے۔

هٰذا ما عندي والعلم عند ربي وهو اعلم بالصواب

فاسد العقیدہ امام کے پیچھے نماز کا حکم

سوال: فاسد عقیدہ رکھنے والے اور خلاف سنت نماز پڑھنے والے کے پیچھے یا زانی فاسق امام کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوھاب: فاسد عقیدہ رکھنے والے سے مراد غالباً ایسا آدمی ہے جو ان باتوں پر صحیح اعتقاد نہیں رکھتا جن پر ایمان کا مدار ہے، اگر یہی سائل کی مراد ہے تو ایسے آدمی کے پیچھے قطعاً نماز نہیں ہوتی کیونکہ جس کا عقیدہ صحیح نہیں ہے وہ اسلام کے دائرہ سے خارج

ہے، کیونکہ قرآن حکیم فرماتا ہے کہ:

﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا﴾ (النساء: ١٢٤)

اس آیت سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ اعمال کی مقبولیت مشروط ہے ایمان صحیح کے موجود ہونے سے یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس نے بھی نیک اعمال کیے مرد ہو خواہ عورت بشرطیکہ وہ مؤمن ہو تو وہ جنت میں داخل کیا جائے گا۔ اور اس سے ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ اب اگر ایمان ہی صحیح نہیں ہے تو اس کے اعمال صالحہ کب مقبول ہوں گے؟

اور نماز یقیناً اعمال صالحہ میں سے ہے، لہٰذا جس کا ایمان صحیح نہیں ہے اس کی نماز بھی مقبول نہ ہوگی۔ جب اس کی نماز مقبول نہ ہوئی تو اس کے پیچھے اقتدا کرنا سراسر فضول ہوگا باقی رہا فاسق وفاجر اور خلاف سنت نماز پڑھنے والا سوان کے متعلق بھی احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو امام نہیں بنانا چاہیے۔ علاوہ ازیں جو خلاف سنت نماز پڑھتا ہے وہ بدعتی ہے اور بدعتی کو امام بنانا اس کی بدعت کو فروغ دینا ہے اور بدعتی کا احترام (بلاکسی مجبوری کے) بھی گناہ ہے ذیل کی احادیث ملاحظہ کی جائیں۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اپنی جامع میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

((قال رسول الله ﷺ ثلاثة لا تجاوز صلواتهم آذانهم العبد الآبق حتىٰ يرجع وامرأة باتت وزوجها عليها ساخطٌ وامام قوم وهم له كارهون)) قال ابو عيسىٰ هٰذا حديث حسن. [1]

"یعنی جناب حضرت رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں تین آدمی ہیں ان کی نماز ان کے کانوں سے اوپر نہیں جاتی (یعنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کا شرف حاصل نہیں کرتی) ①: ایک بھاگا ہوا غلام حتیٰ کہ اپنے مالک کی طرف لوٹ آئے۔ ②: وہ عورت جو رات گزارے اس حال میں کہ اس کا شوہر اس پر ناراض ہو۔

---

[1] الترمذی، کتاب الصلوٰة، باب ما جاء فی من ام قومًا وهم له كارهون، رقم الحديث: ٣٦٠.

③: وہ امام جس کی اقتدا کو قوم ناپسند کرتی ہو۔"

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

اسی طرح ابن ماجہ میں بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے لیکن اس میں مذکورہ آدمیوں کے ساتھ تیسرے آدمی کے لیے "وآخر ان یتصارمان" کے الفاظ آئے ہیں یعنی تیسرے وہ دو آدمی جنہوں نے محض دنیاوی معاملات کی وجہ سے ایک دوسرے سے قطع تعلقی کی ہے۔ (حافظ عراقی فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جو امام اس حالت میں نماز پڑھاتا ہے کہ مقتدی اس سے ناراض ہیں تو اس کی نماز مقبول نہیں ہوتی اور ظاہر ہے کہ جو فاسق وفاجر ہو یا فاسد عقیدہ کا حامل ہو یا سنت کے خلاف نماز پڑھتا ہو اس کے پیچھے مقتدی برضا ورغبت قطعاً نماز نہیں پڑھ سکتے الا یہ کہ مقتدی بھی ان ہی جیسے فاسق ومبتدع ہوں۔

اب چونکہ ایسے آدمی کی اقتدا کرتے ضرور ہوں گے لیکن دل میں وہ ان سے ضرور ناراض ہوں گے اور اس کو سخت ناپسند کرتے ہوں گے اس لیے اس کی نماز قبولیت کا شرف حاصل نہیں کرے گی۔ جب خود امام کی نماز ہی مقبول نہیں تو اس کے پیچھے نماز پڑھ کر کیا فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا ایسے امام کے پیچھے ہرگز نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔ علاوہ ازیں امام حاکم حضرت مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کے ترجمہ میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ:

((ان سركم ان تقبل صلاتكم فليؤمكم خياركم فانهم وفدكم فيما بينكم وبين ربكم عزوجل.)) ❶

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر تم کو یہ بات خوش لگتی ہے یا اگر تم پسند کرتے ہو کہ تمہاری نماز مقبول ہو تو تمہاری امامت بھی وہ لوگ کرائیں جو تم میں سے اچھے ہوں۔"

---

❶ المستدرك للحاكم، جلد٣، صفحه ٢٢٢.

اس حدیث نے تو وضاحت کردی کہ امام اس کو بنانا چاہیے جو اچھا ہو ورنہ پھر مقتدیوں کی نماز بھی مقبول نہ ہوگی اور اس کی وجہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ایسے مبتدع وفاسق کو امام بنانا اس کی بدعت کو فروغ دینا ہے اور اس سے فسق وفجور کا احترام ظاہر ہوتا ہے اور یہ چیز انتہائی بری ہے لہٰذا چونکہ مقتدیوں نے بھی ایسے امام کا احترام کیا ہے اور اس کی بدعت کے فروغ میں ممدومعاون ہوئے ہیں لہٰذا ان کی نماز بھی مقبولیت کے شرف سے محروم ہو جائے گی۔ واللہ اعلم بالصواب!

بریلوی کی اقتدا کرنا

سوال: بریلوی یا دیوبندی کے پیچھے نماز پڑھ لینے سے نماز ہو جائے گی یا نہیں' اور اس صورت میں جہاں ہوں ہی بریلوی اور دیوبندی جبکہ حکم یہ ہے کہ جب اذان کی آواز سن لو تو مسجد میں جماعت کے لیے حاضر ہونا ضروری ہے سوائے شرعی عذر کے؟

الجواب بعون الوھاب: دیوبندی اگر پکا موحد ہو اور جو مسنون طریقہ پر نماز پڑھنے والے سے نفرت نہ کرتا ہو لیکن اس کو بھی صحیح سمجھتا ہو تو میرے نزدیک اور دوسرے محققین اہل حدیث کے نزدیک ان کے پیچھے نماز ہو جائے گی البتہ اگر متعصب اور سنت سے نفرت کرنے والا ہو تو ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔

باقی بریلوی ہو تو ان کا عقیدہ ہی صحیح نہیں اور وہ شرک تک میں مبتلا ہیں اس لیے ان کی اقتدا میں نماز پڑھنا قطعی ناجائز ہے کیونکہ ان کی نماز خود بھی نہیں ہوتی قرآن کریم مشرکین کے متعلق فرماتا ہے:

﴿اُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُھُمۡ وَ فِی النَّارِ ھُمۡ خٰلِدُوۡنَ﴾ (التوبۃ: ۱۷)

یعنی مشرکین کے سب اعمال برباد ہیں اور وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔ جب خود ان کے اعمال بھی نامقبول وبرباد ہیں۔ تو دوسروں کو ان کی اقتدا سے کیا حاصل ہوگا؟

لہٰذا جہاں بریلویوں کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں تو یہ بھی شرعی عذر ہے گویا یہاں کوئی

جماعت یا امام وغیرہ ہے ہی نہیں اس صورت میں ان موحدین کو اپنی جگہ نماز پڑھنی چاہیے اگر ہو سکے تو سب ہم خیال موحدین جمع ہو کر اپنی چھوٹی سے مسجد بنا دیں اس میں جماعت کریں اور جب تک ایسی مسجد تیار ہو گھر یا کسی اور مکان میں اوقات نماز پر ان موحدین کو جمع ہو کر نماز باجماعت ادا کرنی چاہیے۔ باقی ان بریلویوں کے پیچھے ہرگز نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔

تنخواہ پر نماز پڑھانا

سوال: کیا امامت کرانے والا شخص تنخواہ لے سکتا ہے؟ ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ ابن حبان میں امامت کی تنخواہ سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے کیا یہ حدیث واقعتاً ہے اگر ہے تو سند سے آگاہ فرمائیں؟

الجواب بعون الوهاب: اس مسئلہ کے متعلق مجھے تو یہی بات سمجھ میں آئی ہے کہ امامت کروانے والا شخص تنخواہ لے سکتا ہے۔ غالباً حافظ عبداللہ روپڑی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بھی یہی تھا یا کسی اور اہلحدیث کے فتویٰ میں میں نے یہ دیکھا ہے اب پوری طرح یاد نہیں۔ یہ اس لیے کہ مسلمان پر نماز پڑھنا فرض ہے پڑھانا فرض نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنا کام کاج چھوڑ کر جماعت کی مرضی کے مطابق باقاعدہ امامت کے فرائض سرانجام دے تو آخر اس کے گذر سفر کا انتظام کیسے ہوگا کیونکہ ویسے تو وہ اپنے کام کاج میں مصروف ہوگا اور کہیں بھی کسی بھی مسجد میں نماز فرض ادا کر سکے گا لیکن امامت والی صورت میں اسے پانچوں اوقات پابند بننا پڑے گا اس کا اثر لازمی طور پر اس کے کاروبار پر پڑے گا لہٰذا اگر کوئی اپنا کام کاج چھوڑ کر اپنے آپ کو پابند بناتا ہے تو اس کی ضروریات کا بندوبست ہونا چاہیے لہٰذا تنخواہ لینے میں اس پر کوئی گناہ نہیں۔ باقی مولوی صاحب نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ مجھے نہیں ملی میں نے اس حدیث کو موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان میں متعلقہ مقامات پر دیکھا ہے لیکن مجھے نظر نہیں آئی۔ واللہ اعلم۔

اگر مولوی صاحب اس کتاب کے باب وغیرہ کا حوالہ پیش کرے پھر اگر مل گئی تو اس

کے متعلق اپنی گذارش پیش کی جائے گی۔ان شاء اللہ! واللہ اعلم بالصواب!

تسبیح (دانوں) پر تسبیح کرنا

سوال: تسبیح کے دانوں پر ذکر اذکار کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب بعون الوهاب: الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين والصلوٰة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين محمد واله واصحابه اجمعين...... اما بعد!

تسبیح کے ساتھ اذکار و اوراد کو گننے کے متعلق مجھے ہمارے دوست کرم فرما علامہ ابومحمود اللہ بخش صاحبؒ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ کے تنقیدی مضموں کی طرف توجہ دلائی۔جیسا کہ علامہ البانی نے اسی مضمون (جوسلسلہ احادیث صحیحہ) میں لکھا ہے جس میں انھوں نے تحقیق سے کام نہیں لیا ہے بلکہ بیجا تنقید سے کام لے کر تسبیح سے اذکار گننے کو بدعت قرار دیا ہے اس لیے اپنے دوست عزیز ترین حضرت مولانا موصوف کے ایماء پر چند اوراق اس کے قلمبند کر رہا ہوں بعد میں اصل مسئلہ کے متعلق مزید عرض رکھوں گا۔بعون العلام وهو يهدى لتحقيق الكلام وهو حسبى ونعم الوكيل!

"فاقوله وله استعين(اخطا العلامه (الألبانى) فى الكتاب المذكور."

❶:......علامہ صاحب مذکورہ کتاب کے صفحہ نمبر۱۱۲ رقم الحدیث نمبر۸۳ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک اثر نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ(وسندهٗ الى الصلة صحيحٌ)وهو ثقة من اتباع التابعين (سطر نمبر۵) تعجب تو یہ ہے کہ جب صلت بن بہرام اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے جیسا کہ خود علامہ صاحب نے لکھا ہے کہ وہ اتبع التابعین میں سے ہیں لہٰذا ان کا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ملنا ناممکن ہے لہٰذا یہ روایت منقطع ہوئی اور منقطع روایت بھی ضعیف روایات کی اقسام میں سے ہے پھر ایسی ضعیف

روایات کو میدان استدلال میں لانا علامہ جیسے محقق کو قطعاً مناسب نہیں ہے تعجب تو اس بات پر ہے کہ اس واضح ضعف کے باوجود علامہ صاحب اس کو جزماً ویقیناً حجت ودلیل لینے کے قابل تصور کرتے ہیں۔

اس کے دو صفحے آگے لکھتے ہیں:

((ولو كان ذالك مما اقره النبی ﷺ لما خفی علی ابن مسعود رضی اللہ عنہ .))

یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اثر کو صحیح تصور کر رہے ہیں حالانکہ یہ اثر ضعیف ہے لہٰذا اس سے دلیل لینا کس طرح درست ہوگا؟

◆ ۲:...... حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث روایت ہے کہ وہ صحابی حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ایک عورت کے گھر گئے جس کے آگے گٹھلیاں یا چھوٹی کنکریاں رکھی ہوئیں تھی الحدیث۔

اس حدیث کو بھی لا کر علامہ البانیؒ نے علتیں پیش کی ہیں ایک تو اس کی سند میں خزیمہ راوی غیر معروف ہے اس کے متعلق اولاً یہ گذارش ہے کہ مستدرک حاکم میں سعید بن ابی ہلال اور عائشہ بنت سعد کے درمیان خزیمہ کا واسطہ نہیں ہے۔ (دیکھئے مستدرک الحاکم: ج۱،ص۵۴۸)

جبکہ حاکم کی روایت میں غیر معروف راوی ہے ہی نہیں تو پھر حاکم کا اس کو صحیح کہنا اور حافظ ذہبی کی موافقت بالکل صحیح ہے علامہ صاحب کا اس پر اعتراض کرنا بالکل بے جا ہے۔

ملحوظہ:...... سعید بن ابی ہلال مدلس بھی نہیں ہیں کہ کہا جائے کہ حاکم کی روایت میں اس نے تدلیس کی ہے اور خزیمہ کا واسطہ گرایا ہے مطلب کہ یہ راوی ثقہ ہے مدلس بھی نہیں ہے۔ عائشہ بنت سعد سے اس کا سماع ممکن ہے، لہٰذا یہ روایت صحیح ہے۔

ثانیاً علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

((سعد بن ابی هلال مع ثقة حكى الساجی عن احمد انه اختلط فانّی للحديث الصحة او الحسن .))

یہ بات علامہ صاحب نے عجیب لکھی ہے سعید بن ابی ہلال ثقہ ہے اور جماعت نے ان سے حجت لی ہے۔ بخاری، مسلم وجمیع صحاح ستہ وغیرہا کے مصنّفین نے ان سے احتجاج کیا ہے۔ ایسے راوی کے نام ساجی کی حکایت نقل کر کے اس کی تضعیف کا اظہار انتہائی تہتک و تصرف ہے سب کو پتہ ہے کہ امام بخاری جس راوی سے حجت لیں، یعنی اس راوی کی روایت کو اصولاً واحتجاجاً نہ کہ تبعاً واستشہاداً ذکر کریں وہ راوی بالکل ثقہ ہوتا ہے اور سعید بن ابی ہلال بھی ایسے راویوں میں سے ہے۔

لہٰذا علامہ صاحب کا یہ قول ساقط ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ہدی الساری مقدمہ فتح الباری مع تحقیق ابن باز رحمۃ اللہ علیہ ص ۴۰۶ میں تحریر فرماتے ہیں:

((سعید بن ابی هلال اللیثی ابو العلاء المصری اصله من المدینة ونشأبها ثم سکن مصر وثقه ابن سعد والعقیلی وابو حاتم وابن خزیمة والدارقطنی وآخرون وشذ البانی فذکره فی الضعفاء ونقل عن احمد بن حنبل انه قال ما ادری ای شیئٍ حدیثه یخلط فی الاحادیث وکیع ابو محمد بن حزم البانی وضعف سعید بن ابی هلال مطلقاً ولم یصب فی ذالك والله اعلم احتج لهٗ الجماعة .))

اس اقتباس میں دیکھو معلوم ہوگا کہ ابو حاتم جیسے متشدد نے بھی اس کی توثیق بیان کی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ التہذیب میں فرماتے ہیں کہ ''صدوق لم ار لابن حزم فی تضعیفه سلفًا الا ان الساجی مکی عن احمد انه اختلط .''[1]

لیکن ساجی کے نقل وحکایت میں نظر ہے، کیونکہ ساجی نے اس نقل کے ناقل اور حکایت کے حاکی کا نام نہیں لیا ہے۔ لہٰذا یہ معلوم نہیں ہے کہ امام احمد سے یہ کس نے سنا ہے۔ لہٰذا ایسی غیر معتمد جرح کا کیا اعتبار ہوسکتا ہے جب کہ اس کو ماہر فن موثق قرار دے چکے ہیں۔

[1] تهذیب التهذیب، جلد٤، صفحه ٨٣.

خصوصاً اس صورت میں کہ امام محدثین بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے احتجاج کیا ہے۔لہٰذا یہ راوی (جاوز القنطرة) کے مصداق ہے۔

علاوہ ازیں علامہ صاحب کی ترمذی کی تحسین پر اعتراض بھی منظور کیا ہے اس لیے کہ خزیمہ کے متعلق حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے (لا یعرف) لکھا ہے لہٰذا یہ مجہول الحال ہوا نہ کہ مجہول ہے اس صورت میں جو روایت حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے ہے جس کی سند میں ہاشم بن سعید ہے اس سے قوت حاصل کر کے حسن لغیرہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔کیونکہ ہاشم کے متعلق حافظ صاحب نے (ضعیف) لکھا ہے یہ لفظ جرح شدید میں سے نہیں ہے۔لہٰذا یہ اس روایت میں تقویت کا باعث بن سکتا ہے، لہٰذا ترمذی اگرچہ متساہلین میں لکھے جاتے ہیں لیکن یہاں پر ان کی تحسین صحیح ہے حسن لغیرہ حدیث کو اگرچہ کچھ محدثین مطلق حجت سمجھتے ہیں۔(بشرط ہے کہ وہ بھی صحیح یا حسن لذاتہ کی مخالف نہ ہو) لیکن مجھے ان محدثین کی بات ٹھیک نظر آتی ہے جو کہتے ہیں کہ یہ حسن لغیرہ روایت عقائد یا احکام مثلاً حلال وحرام فرائض وواجبات کے باب سے نہ ہو تو وہ بیشک (صحیح سے مخالف نہ ہونے کی صورت میں) معتبر ہے۔(کما ذکرہُ الحافظ فی النکت)

اور یہ حدیث جو حصیٰ وغیرہ سے گننے کے بارے میں ہے وہ بھی فرائض وواجبات یا حلال وحرام یا عقائد کے باب سے نہیں ہے بلکہ یہ محض کسی ثابت شدہ بات کے حصول کا وسیلہ وذریعہ ہے ایسی باتوں کے اثبات کے لیے حسن لغیرہ بالکل کافی ہے ورنہ دوسری صورت میں حسن لغیرہ روایت کو اصول حدیث سے بالکل خارج کر دینا چاہیے۔بہرحال یہ حدیث حسن لغیرہ ہے لہٰذا امام ترمذی کی تحسین محل نہیں بلکہ علامہ صاحب کا مؤاخذہ بھی محل نظر ہے۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی روایت نقل کرتے ہوئے اس پر کلام کرتے ہوئے علامہ صاحب نے ایک تو ہاشم بن سعید پر کلام کیا ہے جس کے متعلق پہلے عرض کر چکے ہیں دوسرا راوی کنانہ ہے جس کے متعلق فرماتے ہیں کہ "مجهول الحال یوثق غیر ابن حبان" حالانکہ اس طرح نہیں ہے بلکہ نیچے خود علامہ صاحب نوٹ میں لکھتے ہیں کہ حافظ ذہبی اس کے متعلق

فرماتے ہیں کہ (وثق) باقی اس کو تضعیف کی طرف اشارہ کہنا یہ علامہ صاحب کا بے جا تشدد ہے اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بھی علامہ صاحب کا لکھنا کہ اس کی تقریب میں اس کے (لین الحدیث) ہونے کا اشارہ کیا گیا ہے یہ قطعاً صحیح نہیں ہے۔ حافظ صاحب نے ان کے متعلق مطلقاً (لین الحدیث) نہیں لکھا ہے تقریب موجود ہے ملاحظہ کریں۔

((کنانه مولیٰ صفیه مقبول ضعفه الازدی بلاحجة .)) [1]

اس سے ظاہر ہوا کہ اس راوی کی صرف ازدی نے بلا حجت تضعیف کی ہے ورنہ واقعتاً وہ مقبول ہے اور لفظ مقبول کے متعلق حافظ صاحب نے مقدمہ میں وضاحت کی ہے کہ ایسا راوی جس کے متعلق مقبول کہوں اور اس کی کہیں پر مطابقت نہ ہو تو وہ لین الحدیث ہے۔ لیکن یہاں پر تو اس کی پہلی روایت کے ساتھ مطابقت بھی ہے لہٰذا وہ صحیح معنی میں مقبول ہے نہ کہ لین الحدیث۔

بہر حال علامہ صاحب کا ان کے متعلق یہ کہنا کہ حافظ صاحب نے اس کے لین الحدیث ہونے پر اشارہ کیا ہے وہ اس وقت صحیح ہوتا جب اس کی مطابعت نہ ہوتی لیکن جب مطابعت موجود ہے تو وہ مقبول ہے اور حافظ ذہبی نے بھی اس کے متعلق (وثقه) کہا ہے، اس لیے صرف ابن حبان کی توثیق نہیں رہی بلکہ حافظ ذہبی نے بھی اس کی تائید کی ہے، لہٰذا وہ مجہول الحال نہیں رہا۔

❷:...... حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کی صحیح روایت لکھنے کے بعد علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

"قول هذا الحديث الصحيح على امرين الاول ان صاحبة القصة هى جويرية لا صفية، كما فى الحديث الثانى."

یہ بھی نہایت ہی عجیب ہے کیوں کہ اس کی سند دوسری اور اس کی سند دوسری یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے اور وہ کنانہ عن صفیۃ ہے اور دونوں کو ایک بنا کر یہ کہنا کہ صاحب القصۃ جویریہ رضی اللہ عنہا ہے نہ کہ صفیۃ یہ تو سینہ زوری ہوئی۔ یہ بات محدثین کرام اس وقت قبول

[1] تقریب التهذیب: ص٤٣١ طبع نشر السنة لاهور.

کریں گے جب مخرج ایک ہو یہاں مخرج ایک نہیں ہے۔ لہٰذا دونوں کو ایک بنا کر پھر صحیح روایت کی سند لے کر یہ کہنا کہ صاحبۃ القصہ جویریہ ہیں نہ کہ صفیہ یہ تو ایک نئے اصول کی ایجاد ہوئی جس کا مسلم اصول الحدیث میں کوئی پتہ نہیں ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ:

((الثانی انه ذکر الحصی فی القصة منکر.))

مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کیوں علامہ صاحب جیسا محقق اتنی بڑی تکلیف وتعسیف بلکہ تعصب کا ارتکاب کر رہے ہیں جب کہ دونوں حدیثیں ایک بھی نہیں ہیں دونوں کے مخرج الگ الگ ہیں تو پھر اگر ایک حدیث میں کسی بات کا ذکر نہیں ہے تو پھر اس سے یہ کس طرح لازم آتا ہے کہ جس بات یا امر کا ذکر دوسری حدیث میں ہے وہ بھی ذکر ہے؟

علاوہ ازیں حصی کے ذکر کے لیے صرف حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی ہی روایت نہیں ہے بلکہ دوسری روایت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ والی بھی ہے جو امام ترمذی کے طرق سے حسن لغیرہٖ اور حاکم کی روایت سے صحیح ہے جس کا بیان اوپر گذر چکا ہے۔ بہرحال ان دونوں حدیثوں میں سے (جن میں سے ایک صحیح ہے) میں حصی کا موجود ہونا معلوم ہوا لہٰذا اگر دوسری روایت میں جو دوسری صحابیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اس میں اس کا ذکر نہیں ہے تو اس کا ان حدیثوں پر کیسے اثر ہوگا؟

⑤:...... آگے علامہ فرماتے ہیں کہ:

((ولو کان ذالك مما اقره النبی ﷺ.))

خفی علی ابن مسعود ان شاء اللہ یہ بھی عجیب العجب ہے۔ افسوس! علامہ صاحب کے ذہن سے وہ ساری حقیقتیں غائب ہو چکی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی جلالت قدر کے باوجود کتنی ہی باتیں مخفی رہیں اور ان سے نسیان ہو گیا۔ دیکھئے رکوع میں تطبیق وغیرہ یہ حدیث صحاح وغیرہ میں موجود ہے۔ جب ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے رکوع کی ہیئت جیسا مسئلہ مخفی رہ سکتا ہے۔ حالانکہ رکوع کا تعلق نماز سے ہے جو کم از کم پانچ دفعہ تو دن و رات میں ہر مسلمان ادا کرتا ہے۔ کیا ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہمیشہ باجماعت نماز ادا نہیں کرتے تھے، اس کا جواب ایک ہی

ہوسکتا ہے۔یعنی یقیناً نبی ﷺ کے ساتھ باجماعت ہی نماز پڑھتے ہوں گے تو پھر جب پانچ وقت کی نماز باجماعت ادا کرنے کے باوجود ان سے رکوع کی ہیئت مخفی رہی حتی کہ نبی ﷺ کی وفات حسرت آیات کے بعد بھی وہ اس تطبیق پر عامل رہا۔ تو کیا ان سے وہ معاملہ جو صحابیات رضی اللہ عنہا یا کسی محرمات مطہرات سے پیش آیا ہو اور وہ اس وقت (برعکس نماز کے) وہاں حاضر بھی نہ ہو کیا یہ معاملہ نماز سے بھی اہم ہے جو ان سے مخفی ان شاء اللہ نہ رہتا، یالعجب وضیۃ الادب۔

◆:...... اسی سلسلہ میں علامہ صاحب آخر میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ اذکار وغیرہ کا اندازہ مقرر کرنا بھی بدعات میں سے ہے حالانکہ حضرت سعد بن ابی وقاص کی صحیح روایت سے معلوم ہوتا ہے یہ صحابیہ رضی اللہ عنہا کنکریوں وغیرہ پر کچھ اذکار پڑھ رہی تھی ظاہر ہے کہ یہ خود ایک اندازہ مقرر کیا ہوگا، پھر کیا آپ نے ان پر اذکار نہیں کیا اور ان پر پڑھنے سے منع کیوں نہیں فرمایا۔

علاوہ ازیں بالکل صحیح روایت میں وارد ہے صحابی رسول جس نے ڈسے ہوئے آدمی پر سورت فاتحہ کا دم کیا تھا آپ ﷺ کے پوچھنے پر بتایا کہ میں نے سات بار سورت فاتحہ پڑھ کر دم کیا جس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ آپ کو کس نے کہا کہ سورت فاتحہ رقیہ ہے تو اس نے کہا کہ (شی القی فی روحی) جس پر آپ ﷺ نے کوئی انکار نہیں کیا۔

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ اگر انسان کے دل میں یہ بات آجائے کہ کس طرح فلاں سورت میرے درد یا مرض کے لیے مفید ثابت ہوسکتی ہے تو بلاشبہ پڑھ سکتا ہے اور دل میں آیا ہوا اندازہ بھی قبول کرسکتا ہے کیونکہ آپ نے جس طرح فاتحہ کو رقیہ سمجھ کر دم کرنے والے صحابی رضی اللہ عنہ کے فعل کو بحال رکھا اسی طرح ان کے درست اندازے کو بھی برقرار رکھا اور آپ ﷺ کا سکوت (غیر نفی) بھی حجت شرعیہ ہے بہرکیف اس طرح کے دوسرے ثبوت تتبع کرنے سے مل جائیں گے جن سے معلوم ہوگا کہ اپنی آسانی یا مصروفیت یا کسی بھی سبب اندازاً کیا ہوا ورد یا ذکر یا کسی قرآنی سورت کا اندازہ قدر کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔لہٰذا

اس کو بدعت کہنا میرے خیال میں صحیح نہیں ہے۔

◆:...... علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس طرح (یعنی تسبیح کو مستعمل کرنے سے) انگلیوں پر گننے والی سنت متروک ہو جاتی ہے حالانکہ اس طرح قطعاً نہیں ہے ہم سارے ہر وقت، ہرنماز کے بعد دوسرے اوقات میں انگلیوں پر بھی پڑھتے ہیں اور اس کے ساتھ تسبیح کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ باقی علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ اندازہ ایک سو تک ثابت ہے زیادہ نہیں اس لیے وہ انگلیوں پر آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اس لیے ایک سو کے اندازے تک محدود ہونے کے ثبوت کا قائل ہونا بھی اگرچہ ایک سو کے اندازہ پر بولا جاتا ہے تو یہ ایک ہاتھ سے قطعاً ادا نہیں ہو سکتی بلکہ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے مدد لینی پڑے گی۔

حالانکہ علامہ صاحب اسی مضمون میں ایک صحیح حدیث بھی ابوداؤد سے ذکر کی ہے جو کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جس میں ہے کہ

((رأيت رسول الله ﷺ بعض التسبيح بيمينه.)) [1]

پھر اگر دوسرے ہاتھ سے مدد لی جائے گی تو علامہ صاحب کے طریقہ کے مطابق دائیں ہاتھ والی سنت متروک ہو جائے گی یا اگر صرف دائیں ہاتھ پر اکتفا کیا جاتا ہے تو ایک سو پڑھی نہیں جا سکیں گی اس سو کو کس طرح پورا کریں۔ رہی یہ بات کہ علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ تسبیح کے عادی لوگ ساتھ باتیں بھی کرتے رہتے ہیں تو یہ جس کی عادت ہے ہی جانے اس کا کام جانے پوری دنیا کو ایک ہی (لاٹھی) عصا سے مت ہانکو ایسے بے خیالے لوگ تو انگلیوں کو ہلاتے ہوئے بھی باتیں کرتے رہتے ہیں تو کیا ایسے لوگوں کو دیکھ کر انگلیوں پر تسبیح پڑھنا بھی چھوڑ دیں۔

احادیث میں درود شریف کو کثرت کے ساتھ پڑھنے کی بہت زیادہ فضیلت وارد ہے پھر اگر کوئی آدمی دن یا رات میں کوئی وقت مقرر کرتا ہے مثلاً ایک ہزار یا اس سے زائدہ جتنی میسر وقت کی تقاضا ہے یا وہ اپنی آسانی خاطر اندازہ مقرر کرتا ہے اور روزانہ مقررہ صلوٰۃ وسلام

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الوتر، باب التسبیح بالحصٰی. رقم الحدیث: ۱۵۰۲.

پڑھتا ہے تو آخر وہ تسبیح کے بغیر کس طرح اندازہ مقرر کر سکتا ہے۔

بہر حال تسبیح کو بدعت قرار دینا دلائل کے مطابق صحیح نہیں ہے ہاں اگر کوئی اس کو فرض واجب یا سنت سمجھ کر کام کرتا ہے تو یقیناً وہ مذموم کام کرتا ہے لیکن اگر کوئی صرف گننے کے لیے کام میں لاتا ہے تو اس میں کون سی قباحت ہے۔ آگے اس سلسلہ میں وسائل وذرائع کی بدعت اور مباح ہونے کی بحث شروع کر رہا ہوں۔

یہاں پر ایک اصولی بحث کو چھیڑنا نہایت ہی موزوں ومناسب ہوگا کہ آیا وسائل وذرائع اگر کسی ثابت شدشرعی امر کے لیے اختیار کیے جائیں تو کیا ان کے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بھی قرآن وحدیث میں نص وارد ہوں۔ یا ان وسائل کا قرآن وحدیث میں نص ہونا ضروری نہیں ہے؟ البتہ یہ ضروری ہے کہ اس وسیلہ یا ذریعہ کے بارے میں کتاب وسنت میں منع وارد ہو۔ میرے خیال میں دوسرا قول ہی صحیح ہے۔

یعنی شرعی امور کے اختیار کے لیے وسائل کا ثبوت کتاب وسنت میں نص وارد ہونا ضروری نہیں ہے۔ ذیل میں چند مثالیں رکھتا ہوں جو تمام امت محمدیہ میں رائج ہیں۔ حالانکہ ان کا ثبوت بطور نص کتاب وسنت میں نہیں ہے، مقلد، غیر مقلد، اصحاب الحدیث، اصحاب الرائے نے ان کے متبادل وسائل عمل میں لائے ہیں مگر کوئی بھی ان کو بدعت قرار نہیں دیتا۔ مگر سبب صرف یہ ہے کہ یہ وسائل ہیں، وسائل وذرائع زمانہ کے موافق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

﴿۱﴾:...... کتاب وسنت کی تعلیم کا ثبوت ملتا ہے مگر موجودہ ہیئت میں مدارس کے قیام کا ثبوت نہیں مل سکتا۔ حالانکہ مدارس کی جو حیثیت ہے وہ ہر کسی کو معلوم ہے یہی وجہ ہے مسلمان ان اداروں کو (فی سبیل اللہ) کی مد میں شامل سمجھ کر، خیرات، صدقات، زکوٰۃ وغیرہ کے ساتھ مدد کرتے رہتے ہیں پھر کیوں نہ ان کو بدعت قرار دیا جائے؟ یا تو ان کا خصوصی ثبوت کتاب وسنت سے پیش کیا جاتا تو ان کو کتاب وسنت تک پہنچنے کے ذرائع میں شامل کیا جائے کیوں کہ کتاب وسنت تک پہنچنا تمام مسلمانوں پر لازم ہے کیوں کہ یہی ادارے دینی سرچشمہ تک پہنچنے کے ذرائع ہیں لہٰذا ان کو صحیح کہا جائے گا نہ بدعت اگرچہ موجودہ ہیئت خیر القرون کے زمانے

میں ان کا وجود ہی نہیں تھا۔

(۲):...... اُصول حدیث ومتعلقاتہا فن الرجال العلل والتاریخ وغیرہا تمام اصولوں کے ثبوت (یعنی جو حدیث شریف کی صحت وسقم صحیح وضعیف موضوع وغیرہا کے متعلق وضع کیے گئے ہیں وہ سارے بعد میں محدثین کرام نے وضع کیے ہیں) قرآن وحدیث میں نہیں ہیں لیکن پوری امت ان اصولوں کو صحیح مانتی ہے اور حدیث کے متعلق ان کو مستند تصور کرتی ہے پھر کیوں نہیں ان کو بدعت قرار دیا جاتا۔ خود علامہ البانی صاحب ان اصولوں سے جابجا کام لیتے رہتے ہیں۔

حالانکہ اول تو ان پر لازم ہے کہ اپنے طریقہ کے مطابق ان کا ثبوت قرآن وحدیث سے پیش کریں پھر ان کا استعمال کریں مگر ہمارے ہاں تو وہ بدعات ہرگز نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب کے ذرائع ہیں کیونکہ ان ہی کی وجہ سے ہم جناب رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ اور ان کی اسوہ حسنہ تک علی وجہ البصیرہ پہنچ سکتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے آپ ﷺ پر جھوٹ اور افتراء سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جاتا ہے۔ وضاعین اور مبتدعین کا مکر وفریب پاش پاش ہو جاتا ہے، بہرحال چونکہ ذرائع دین خالص تک پہنچنے کے وسائل ہیں لہٰذا ہمارے ہاں وہ دین ہیں نہ کہ بدعت کیونکہ دین تک پہنچانے والا ذریعہ بھی دین ہے اگرچہ مخصوص علیہ نہ ہو۔

(۳):...... علم النحو والصرف وغيرها من العلوم:

یہ علوم بھی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں حالانکہ یہ علوم بھی محدث (نئے) ہیں۔ کتاب وسنت میں کہاں ہے کہ کتاب وسنت کے حصول کے لیے نحو وصرف پڑھو؟ پھر ان کو دینی مدارس میں کیوں پڑھایا جاتا ہے؟ جب کہ ان ہی اداروں پر باقی صدقات وخیرات تو چھوڑو زکوٰۃ بھی صرف کی جاتی ہے۔ کیا یہ جائز ہوگا کہ ایک بدعت پر زکوٰۃ کا پیسہ خرچ کیا جائے۔ اگر کہا جائے کہ یہ علوم بھی کتاب وسنت کو سمجھنے کے ذرائع ہیں جن کے بغیر ان کو نہیں سمجھ سکتے تو پھر ذرائع کے مخصوص ہونے کا قول بالکل فضول ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ یا اس کے

رسول ﷺ کو پتہ نہیں تھا کہ عرب کے علاوہ عجمی لوگ بھی اسلام پر آئیں گے جن کی عربی زبان نہ ہونے کی وجہ سے اسلام کے سرچشمہ تک پہنچنے کے لیے بہرحال کچھ ذرائع کی ضرورت پڑے گی۔ پھر کیوں نہیں اللہ تعالیٰ نے اس کے پیغمبر ﷺ نے ان کی طرف رہنمائی فرمائی۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ما كان ربك نسيا﴾ ان حضرات کے خیال کے مطابق لازمی تھا کہ اس کی طرف کوئی اشارہ کر دیا جاتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان علموں کی طرف تصریح تو کیا اشارہ بھی نہیں ہے۔ لیکن ہمارے لیے کوئی مشکلات نہیں ہے کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو پتہ تھا کہ انسان کو یہ ضروریات پیش آئیں گی اور یہ بھی پتہ تھا کہ وہ وسائل وذرائع زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ نے انسان میں ایسا مادہ یا ایسی قدرت رکھی ہے کہ وہ بوقت ضرورت کسی چیز کے حصول کے لیے وسائل بھی تلاش کر لیتا ہے جس طرح کہا جاتا ہے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، لہٰذا ایسا زمانہ ہی نہیں آیا ہے کہ انسان کو کوئی ضرورت پیش ہوئی ہو وہ اس کے حصول کے لیے وسائل ڈھونڈنے میں ناکام رہا ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ہمیں کتاب وسنت کے ساتھ چمٹ جانے کا حکم فرمایا ہے۔ باقی ان تک پہنچنے کے وسائل کے بارے میں بھی علم تھا کہ جب ان کو ضرورت پڑے گی تو انسان خود ان وسائل کو تلاش کرے گا اور وقت کے موافق اس کی تقاضا کو پورا کر سکے گا۔ لہٰذا ان وسائل کے لیے نص کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی یہ چیز انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ ضروری وسائل کو خود بخود حاصل کر لیتا ہے۔

اور میری سمجھ کے مطابق یہ حقائق بھی۔ ﴿علم ادم الاسماء كلها﴾ اور ﴿انى اعلم ما لا تعلمون﴾ میں داخل ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو ازل سے ہی یہ علم دے دیا تھا کہ جب بھی اس کو کوئی ضرورت پیش آئے تو اس کے حصول کے لیے کس طرح راستہ ڈھونڈے "فتدبروا وتفكروا" کچھ حضرات یہ کہتے ہیں کہ علم النحو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے لہٰذا بموجب فرمان:

((عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين .))

یہ علم بھی بدعت نہیں ہوا۔ اول تو اس کا ثبوت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صریحاً ملنا بہت مشکل ہے اگرچہ نحو کی کتابوں میں اس علم کی تاریخ کرتے ہوئے یہ اقوال نقل کیے جاتے ہیں مگر ان کی سند کا ملنا نہایت مشکل ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ حضرات یہ بات کہتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ وہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی جمعہ کے دن کی پہلی اذان کو بدعت کہتے ہیں کیا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ خلفائے راشدین میں سے نہیں تھے؟

اور اس سے بڑھ کر یہ بات کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ فعل تمام کتب احادیث میں باسند موجود ہے اور خود صحیح بخاری میں اس روایت کے آخر میں ''وثبت الامر علی ذالك.'' کے الفاظ موجود ہیں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ فعل پورے عالم اسلام میں متفقہ طور پر ثابت رہا اور سبھی اس پر عامل بھی رہے، جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں سے بھی کسی نے اس کام کو نہ بند کیا اور نہ ہی اس کو تبدیل کیا تو دیکھیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا کتنا اتفاق ہے خلفائے راشدین میں سے ایک جلیل القدر صحابی ذوالنورین ذوالحجر مین عشرہ مبشرہ میں سے ایک اگر کوئی کام کرتا ہے تو صحابہ اور عالم اسلام اس پر متفق ہے لیکن آج کل یہ مفتی اس پر فتویٰ جاری کرتے ہیں کہ یہ کام بدعت ہے۔

پھر علم النحو کو اگر تسلیم کیا جائے گا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے تو وہ کس طرح بدعت سے بچ سکتا ہے کیا دونوں میں تمہیں کوئی تفاوت نظر نہیں آتا ایسے لوگوں کو سمجھانا مشکل بلکہ محال ہے۔ کچھ حضرات یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ علم النحو وغیرہ جیسے علوم صرف عربی زبان سیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے یہ (فی امرنا) میں داخل نہیں ہیں لہٰذا بدعت نہیں کہلائیں گے۔ ان لوگوں کے لیے یہ مثال ہے کہ اگر اس طرح ہے تو پھر ان کو مدارس میں کیوں پڑھایا جاتا ہے؟ محض کسی زبان کے سیکھنے کے لیے اس کی ضرورت تھی تو پھر اسکولز اور کالجز میں اس کو پڑھایا جاتا جس طرح پاکستان یا دوسرے یورپی ممالک میں کچھ عربی کتب پڑھائی جاتیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کو مذہبی زبان سمجھ کر نہیں پڑھاتے بلکہ وہ اس زبان کو سیکھنے اور سمجھنے کے طور پر پڑھاتے ہیں کہ یہ ایک عالمگیر

زبان ہے دنیا والوں کے کتنے ہی کام اس سے وابستہ ہیں۔لہٰذا وہ محض دنیاوی امور کی خاطر اس زبان کی تعلیم دیتے ہیں۔

لہٰذا ہم پاکستانیوں کو دینی مدارس میں اس زبان کی کیا ضرورت ہے۔حالانکہ محض دنیاوی نقطہ نظر سے ہمارے لیے عربی سے زیادہ انگریزی زبان سیکھنے کی ضرورت ہے جو دفتری زبان ہونے کے ساتھ ساتھ حکومت کا پورا کاروبار اسی زبان میں ہے۔پھر کیوں ہم اس طرح آٹھ سال مدارس میں ایسے علوم کے حصول کے لیے فضول ضائع کریں جب کہ ہماری دنیاوی ضرورتیں اس سے وابستہ بھی نہیں ہیں، حالانکہ ہم سب ان علوم کو حاصل کرنے میں ثواب سمجھتے ہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے تقرب کا ذریعہ اور ان کی خوشنودی تصور کرتے ہیں کیونکہ یہ علوم ہمیں کتاب وسنت تک پہنچاتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ پوری امت ان مدارس پر صدقات وخیرات کی بارش برساتی رہتی ہے اگر ان امداد کرنے والوں کو یہ بتایا جائے کہ یہاں پر جو کچھ ہم پڑھاتے ہیں وہ محض زبان دانی کے لیے ہے دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر کوئی ایک دانہ دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہوگا۔کیونکہ اس صورت میں ان کو اپنی امداد سے ثواب کی کوئی امید باقی نہیں رہتی باقی فضول پیسہ کا زیاں کوئی دیوانہ ہی کرسکتا ہے۔صاحب عقل اور حواس قائم رکھنے والا کبھی بھی یہ کام نہیں کرے گا بلکہ کہے گا کہ اس سے، تو بہتر ہے اسکول وکالج میں دوں تاکہ کم ازکم میری مشہوری تو ہو یا حکومت سے کوئی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے کیا یہ سچ نہیں ہے؟

بہرحال یہ علوم اس دین ہی کی خاطر پڑھا جاتے ہیں اور دین ہی کی خاطر ان کو ضروری سمجھا جاتا ہے اور اسی لیے ہم مدارس کو قائم رکھنے کے لیے اپنی طاقت کے مطابق کوئی کسر نہیں چھوڑتے بہرحال مختصر کلام یہ کہ یہ علوم ان لوگوں کے ہاں ضرورت کی بنا پر یا وسائل کی بنا پر بدعت نہیں ہیں بلکہ ضروری ہیں۔

(۴):...... لاؤڈ اسپیکر کو اس وقت مقلد خواہ غیر مقلد سارے اپنی مساجد میں اذان ونماز اور اجتماعات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔حالانکہ اسی آلہ کی بنا پر آپ ﷺ کے زمانے کی

ایک سنت متروک ہو چکی ہے کیونکہ آپ ﷺ کے زمانے میں مؤذن اوپر چڑھ کر اذان دیتا تھا یہی سبب ہے کہ صحیح حدیث میں ابن ام مکتوم اور بلال رضی اللہ عنہما کی اذان کے متعلق اس طرح ہے کہ:

((وما کان بین اذان کل منهم الا ان یرقٰی هذا وینزل هذا.))

(او کما قال مسند احمد)

یہ الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اذان اوپر چڑھ کر دی جاتی تھی، اس لیے عالم اسلام میں اذان کے لیے (اونچی جگہ) بنائی جاتی تھی مگر آج کل چند جگہوں کے علاوہ ہر مسجد میں اسپیکر کے سامنے اذان دی جاتی ہے۔لیکن اس پر تو علامہ صاحب بھی اعتراض نہیں اٹھاتا کہ اس کام کی وجہ سے مبارک زمانہ کی سنت متروک ہوگئی ہے۔لہٰذا یہ بدعت ہے تسبیح کے لیے تو فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ سے سیدھے ہاتھ پر پڑھنے والی سنت متروک ہو جائے گی لیکن حقیقت قطعاً ایسے نہیں ہے۔ بلکہ تسبیح پر پڑھنے والے بھی کافی ذکر اذکار ہاتھوں کی انگلیوں پر بھی پڑھتے ہیں لیکن زیادہ وظائف پڑھتے وقت تسبیح کو استعمال کیا جاتا ہے۔لہٰذا یہ سنت بالکلیہ متروک نہیں ہوئی۔

لیکن آلہ مکبر الصوت نے تو اس مشہور سنت کا بالکل خاتمہ کر دیا ہے، پھر اس کے خلاف کیوں آواز نہیں اٹھائی جاتی۔ اسی طرح تبلیغی اجتماعات کو بھی دینی حیثیت حاصل ہے اس میں آلہ مکبر الصوت کو استعمال میں نہیں لانا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع کے موقع پر اتنے صحابہ تھے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق ذوالحلیفہ میں جب آپ نے دیکھا تو لوگ ہی لوگ نظر آئے لوگوں کے اتنے جم غفیر کو آپ نے وعظ ونصیحت بھی کیا اوراس کے سننے کا کوئی نہ کوئی انتظام ضرور کیا ہوگا اور ظاہر ہے اس وقت آپ ﷺ کے اتنے صحابہ ہوں گے کہ جتنے ہمارے آج کل کے اجتماعات میں قطعاً نہیں ہوتے ہوں گے۔ مگر آپ ﷺ نے آلہ مکبر الصوت استعمال نہیں کیا۔ پھر کیا ہم بھی ایسے موقع پر وہ طریقہ اختیار کریں۔۔خواہ مخواہ لاؤڈ اسپیکر کی بدعت کو اختیار کر رہے ہیں۔

کیا تبلیغی اجتماعات دنیاوی امور ہیں؟ اگر ہیں تو ان میں کون ایسا ہے جو یہ کہے کہ اس سے آپ ﷺ کی وہ سنت متروک ہوگئی۔ ہم یہ منطق سمجھنے سے قاصر ہیں۔

⑤:......نماز اور اذان کے ٹائم کے لیے چھوٹی بڑی گھڑیاں استعمال کی جاتی ہیں، پھر ان گھڑیوں کے ٹائم پر ہی نمازوں وغیرہ کے اوقات تبدیل کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ آپ ﷺ کے زمانے میں تو دو سایوں اور طلوع آفتاب وغروب آفتاب اور غروب شفق سے کام لیا جاتا تھا پھر سوچیں کہ ان مصنوعی چیزوں نے آپ ﷺ کی سنت پر جگہ نہیں لے لی ہے؟ اہلحدیث وغیر اہلحدیث سارے کے سارے گھڑیوں کو دیکھتے ہیں اور اذانیں دیتے ہیں اور سایہ وغیرہ کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا مگر اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا کہ آپ ﷺ کی سنت متروک ہوگئی ہے۔

لہٰذا ان کو بھی بدعت کہا جائے لیکن کیا کریں یہ چیزیں ان کے خیالات اور دل سے مناسبت رکھتی ہیں، اس لیے بدعت نہیں باقی جو چیز ان کے خیالات کے موافق نہیں ہوگی وہ ایک دم بدعت کی بدگوئی کا شکار ہو جائے گی کچھ دوست کہتے ہیں کہ یہ لاؤڈ اسپیکر اور گھڑیاں وغیرہ دنیاوی امور سے تعلق رکھتی ہیں۔ جناب عالی! ان چیزوں کو بیشک آپ رکھیں ان سے مدد لیں بے دھڑک ان کو اپنی استعمال میں لائیں مگر دنیاوی امور میں۔ لیکن دینی امور میں اور دینی کاموں میں ان کو استعمال میں کیوں لاتے ہو۔ خصوصاً اس صورت میں جب وہ سنت کے متبادل کے طور پر استعمال ہو رہی ہیں اور وہ سنتیں ان کی وجہ سے متروک ہو رہی ہیں۔ لہٰذا آپ کے اصول اور طریقہ کے مطابق یہ بدعت ہیں لیکن تمہارے پاس سوائے تکلف وتعصب علمی یا سینہ زوری کے اور کوئی جواب نہیں ہے۔ ورنہ اگر تسبیح کے ساتھ کوئی آدمی دنیاوی باتیں مثلاً رقوم وغیرہ کی گنتی کرتا تو آپ بھی اس کو بدعت نہ کہتے اور آپ اس کو بدعت اس لیے کہتے ہیں کہ ہم اس کے ذریعے ذکر واذکار کرتے ہیں جن کا دین سے تعلق ہے آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ اسکولوں اور اسٹیشنری کی دکانوں پر بچوں کے پہاڑے یاد کرانے کے لیے (سلیٹین) ہوتی ہیں جن میں لوہے کی میخوں کے اندر منکے پروئے ہوتے ہیں جن پر بچوں کو

پہاڑے یاد کرائے جاتے ہیں کیا یہ بھی بدعت ہے؟ ہرگز نہیں یعنی مقصد یہ ہوا کہ تسبیح کے منکو کو کوئی اگر اس طرح استعمال میں لائے تو یہ بدعت نہیں ہوگی۔

بلکہ بدعت قرار دینے والوں کے ہاں بدعت تب ہوگی جب اس سے وظائف واذکار شمار کیے جائیں۔لہٰذا اگر ان کے اصول کے مطابق لاؤڈ اسپیکر وغیرہ کو اگر دینی کاموں میں لایا جائے تو یہ بدعت ہوں گے اور ان کو لامحالہ بدعت کہا جائے گا۔ بہرحال اس قسم کی کئی اور بھی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ سنت کی جگہ متبادل چیزیں لائی گئی ہیں مگر اس وقت یہ حضرات خاموش رہیں گے ہم تو اس بات کو کوئی خاص وزن اس لیے نہیں دیتے کہ یہ وسائل کے باب سے ہیں۔اور وسائل کے باب میں شریعت نے کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔

کیونکہ یہ زمانے کے انقلابات اور تبدیلیوں کی وجہ سے بدلتے رہتے ہیں۔ ہاں ان وسائل میں سے کسی وسیلے کے متعلق منع ونہی مخصوص ہے تو پھر تو قصہ ہی ختم !ورنہ وسائل میں تنگی کرنا صحیح نہیں ہے مگر جو لوگ وسائل کے متعلق بھی اتنے تنگ ظرف ہیں کہ ان کے متعلق بھی نص صریح کے مطالبہ کے لیے مقید ہیں ان کے ہاں یہ امور اور اس طرح کے دوسرے وسائل وذرائع زبردست باعث اعتراض ہیں اور ان کے ہاں اس کا کوئی جواب بھی نہیں ہے۔ہم تسبیح کو کوئی فرض یا واجب یا سنت یا لازم نہیں کہتے۔ ہاں اس کو گننے کا ایک ذریعہ یا وسیلہ شمار کرتے ہیں۔

لہٰذا اس وجہ سے یہ ذرائع مباحات کے اصول کے ماتحت ہیں؟ چونکہ اذکار کے گننے کے ذرائع ہیں لہٰذا ان کو مباح بھی کہا جائے تو کیوں نہیں! اور اس کے ساتھ سنت بھی متروک نہیں ہے۔لہٰذا اس کو بدعت کہنا تعصب کا مظاہرہ ہے۔ باقی علمی دلائل تو یہ حضرات آج تک قائم نہیں کر سکے ہیں۔

علامہ صاحب اپنی کتاب میں "کتاب البدع والنھی عنھا" کا حوالہ دیا ہے وہ کتاب ہمارے پاس موجود ہے اس کے اندر میں نے خود نے دیکھا ہے کہ تسبیح وغیرہ کے ساتھ اذکار پڑھنے کی ممانعت یا اس کی بدعت کے بارے میں جو دو روایتیں یا آثار پیش کیے

گئے ہیں (عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے آثار) وہ سب کے سب سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں۔ ان میں کوئی بھی صحیح نہیں ہے۔ دونوں ضعیف ہیں مگر علامہ صاحب فرماتے ہیں (جس طرح اوپر گذرا) کہ اگر ان کا اقرار صحیح ہوتا تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مخفی نہ رہتا۔ یا للعجب جب کوئی اثر ان سے صحیح سند کے ساتھ ہے ہی نہیں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پھر ہمارے ہاں ہماری تحقیق کے مطابق امام ترمذی کی روایت حسن لغیرہ نہیں ہے، پھر بھی ایک روایت جو مستدرک حاکم میں ہے وہ صحیح ہے۔ (کما مر مفصلاً) لہٰذا ہمارے پاس تو کم از کم ایک ثبوت تو ہے لیکن علامہ صاحب کی دعویٰ کے لیے تو کوئی ثبوت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ....﴾ (المائدة: ٨)

هٰذا ما عندي والعلم عند العلام وهو أعلم بالصواب وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين وصلى الله على سيدنا محمد وآله وازواجه وذرياته واهل بيته واصحابه اجمعين وبارك وسلم آمين يا رب اللعالمين .

اجتماعی دعا کا حکم

سوال: فرض نمازوں کے بعد اجتماعی، انفرادی دعا کرنا سنت سے ثابت ہے یا بدعت ہے؟

الجواب بعون الوهاب: جامع ترمذی میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کون سی دعا زیادہ سنی جاتی ہے (مقبول ہوتی ہے) آپ ﷺ نے فرمایا رات کا آخری حصہ اور فرائض (پانچوں وقتوں کی نمازوں) کے پیچھے امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے، اس سے معلوم ہوا کہ فرضی نمازوں کے بعد بھی دعا

کی قبولیت کا زیادہ امکان ہوتا ہے اور دعا بغیر ہاتھ اٹھائے بھی کی جا سکتی ہے اور ہاتھ اٹھا کر بھی کی جا سکتی ہے، کیونکہ دعا میں ہاتھوں کے اٹھانے کا ذکر بہت سی احادیث قولیہ وفعلیہ میں وارد ہے اور ہاتھ اٹھانا دعا کے خاص آداب میں سے ہے۔

❶ ...... سنن الکبریٰ للامام البیہقی: ۲/ ۱۳۳ میں ایک حدیث ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((وھذ الدعاء فرفع یدیه حذو منکبیه......الخ))

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کندھوں کے برابر اپنے ہاتھ مبارکہ اٹھائے اور فرمایا کہ یہ ہے دعا یعنی دعا اس طرح مانگنی چاہیے کہ ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھانا چاہیے۔

معلوم ہوا کہ دعا میں ہاتھ اٹھانا دعا کے آداب میں سے ہے۔ اسی طرح صحیح ابن حبان وغیرہ میں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے جب میرا بندہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے تو مجھے حیا آتی ہے کہ میں اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹاؤں۔ بہرحال ہاتھ اٹھانا دعا میں دعا کے آداب میں سے ہے اور وہ مندوب و مستحب ہے اور چند وقائع بھی احادیث صحیحہ میں مروی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء میں ہاتھ اٹھائے اور صحیح مسلم میں صلوٰۃ الخوف کے بعد بھی ہاتھ اٹھانے مذکور ہیں۔ (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھائے) جب دعا میں ہاتھ اٹھانے مسنون ومستحب ہیں تو فرض نماز کے بعد اگر کوئی دعا کرنا چاہے تو وہ کیوں ہاتھ نہ اٹھائے، حالانکہ ترمذی والی حدیث سے معلوم ہوا کہ فرض نماز کے بعد بھی دعاء کی قبولیت کا زیادہ موقع ہے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے تو ابن ابی شیبہ کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ یہ روایت ابن ابی شیبہ کے مصنف میں تو دیکھنے میں نہیں آئی ہوسکتا ہے کہ ان کے ''المسند'' میں ہو لیکن وہ اس وقت ہمارے پاس نہیں۔

بہرحال مذکورہ قولیہ احادیث سے اتنا تو ثابت ہوگیا کہ نماز فرض کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے مستحب ہیں لہٰذا انفراداً تو دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا جائز ہوا باقی رہا اجتماعی طور پر تو

صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جمعہ کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے کہ ایک آدمی آیا اور قحط سالی کا شکوہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ مبارک دعا کے لیے اٹھائے اور لوگوں نے بھی اپنے ہاتھ اٹھائے۔ الخ

اس حدیث میں یہ نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کہا کہ تم بھی ہاتھ اٹھاؤ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اٹھاتے ہی انہوں نے بھی ہاتھ اٹھا لیے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کا معمول تھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے تو وہ بھی ساتھ ہی اپنے ہاتھوں کو اٹھا لیتے تھے۔

اس حدیث میں گو فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کرنے کا بیان نہیں لیکن اس سے فی الجملہ اجتماعی دعا کرنا اظہر من الشمس ہے۔

❷ ...... ایک حدیث بھی ملاحظہ فرمایئے جو قولی ہے۔ یہ روایت امام حاکم رحمہ اللہ نے اپنے مستدرک ۳/ ۳۴۷ میں وارد کی ہے۔ اس میں یہ ہے کہ حضرت حبیب بن مسلمہ الفہری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ فرماتے تھے:

((لا يجتمع ملأ فيدعوا بعضهم ويؤمن البعض الا اجابهم الله .))

''یعنی کوئی جماعت بھی ایک جگہ جمع ہو کر دعا کرے ایک ان میں سے دعا مانگے اور دوسرے اس پر آمین کہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشتا ہے۔''

اس حدیث کی سند حسن ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے مستدرک کی تلخیص میں اس روایت کو بحال رکھا اس پر کوئی جرح نہ فرمائی اس کے سب رواۃ ثقہ وصدوق ہیں۔ ابن لہیعہ میں کلام ہے لیکن جب ان سے عبداللہ بن المبارک، ابوعبدالرحمٰن المقری جیسے تلامذہ روایت کریں تو وہ مقبول ہوتی ہے یہاں بھی ان سے ابوعبدالرحمٰن المقری (عبداللہ بن یزید) راوی ہے، لہٰذا یہ روایت ان کی صحیح ہے۔

ابن لہیعہ مدلس بھی ہے لیکن اس روایت میں انہوں نے "حدثنی" کہہ کر سماع کی صراحت

کردی لہٰذا یہ روایت قوی وجید ہے اسی لیے حافظ ذہبی بھی اس پر خاموش رہے۔ واللہ اعلم

اس حدیث سے اجتماعی طور پر دعا کرنا مندوب معلوم ہوتا ہے۔ اور حدیث میں "ملأ" کا لفظ ہے جس سے ہر جماعت مراد لی جاسکتی ہے خواہ وہ نماز فرض کی جماعت ہو یا علم وتبلیغ کے لیے اجتماع ہو یا کسی جلسہ کا اجتماع ہو یا فوجی جماعت ہو ان سب کو یہ لفظ شامل ہے کیونکہ جو لفظ عام ہو اس کو بلا قرینہ یا بلا خاص دلیل کے کسی ایک فرد کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جاسکتا اور چونکہ کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے معلوم ہو کہ فرض نماز کی جماعت اس سے مستثنیٰ ہے، لہٰذا یہ بھی اس میں یعنی اس لفظ کے عموم میں شامل رہے گا۔ اور کسی حدیث میں اب تک یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ آپ نے فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے سے منع فرمایا یا خود کبھی فرض نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ نہیں اٹھائے۔ یعنی نہ یہ وارد ہے (جتنا کچھ اب تک معلوم ہوا ہے) کہ آپ نے فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھائے اور نہ یہ ہے کہ ہاتھ نہیں اٹھائے۔ اور عدم ذکر عدم وجود کو مستلزم نہیں ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ فرض نماز بعد اجتماعی طور پر دعا کرنا نبی کریم ﷺ کی قولی حدیث کے بموجب مندوب ومستحسن ہے اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ہاتھ اٹھانا احادیث کی رو سے دعا کے آداب میں سے ہے اور مستحسن ومندوب ہے بہرحال ان دلائل سے راقم الحروف کے نزدیک فرض نماز کے بعد اجتماعی طور پر دعا کرنا جائز ہے۔ بلکہ اس کو مندوب بھی کہہ سکتے ہیں البتہ اس کو نماز کے لوازمات سے سمجھنا اور یہ تصور کرلینا کہ اس کے سوا نماز پوری ہی نہیں ہوتی یا جو اس طرح دعا نہ کرے بلکہ اٹھ کر چلا جائے اس کو برا بھلا کہنا یا اس پر طعن وتشنیع کرنا یہ ناجائز ہے اگر ایسا تصور کرلیا جائے تو یہ بدعت ہوگی اور ناجائز ہوگی۔

حضرت مولانا عبدالرحمن مبارک پوری رحمہ اللہ نے "تحفۃ الاحوذی شرح الترمذی" میں بھی تقریباً اسی طرح لکھا ہے یعنی اگر اس کو نماز کے لوازمات میں سے تصور نہ کیا جائے اور نہ کرنے والے پر نکیر بھی نہ ہو تو یہ ان شاء اللہ جائز ہے۔ ھذا ما عندنا والعلم عند اللہ

دعا میں طرز لگانا

(سوال): اکثر طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ نہ صرف عوام بلکہ کچھ علماء دین بھی دعا نظم میں مانگتے ہیں اور کچھ ایسی ادعیہ مطبوع بازار میں بھی ملتی ہیں۔ یہ کس حد تک درست ہے۔ میرے خیال میں ایسی دعا مانگنا اعتداء فی الدعا ہے اور درست نہیں نیز احادیث میں دعا میں تک بندی سے منع کیا گیا ہے۔ جب محض تک بندی دعا میں اختیار کرنا درست نہیں تو پھر پوری دعا نظم میں مانگنا کہاں تک درست ہوگی۔ کیونکہ نظم میں تک بندی اور قافیہ بندی دونوں سمائی ہوئی ہوتی ہیں کیا سلف صالحین میں سے کسی نے دعا بشکل نظم مانگی ہے، اگر اس طرح کا ثبوت موجود ہے تو حوالہ اور صحت سند سے آگاہ فرمائیں اور اگر اس طرح نہیں تو متبعین کتاب وسنت کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح کی پوری پوری کوشش کریں تاکہ "من رأى منكم منكراً فليغيره بيده......... الخ اور "ما من نبى بعثه الله فى امته قبلى الا كان فى امته حواريون واصحاب يأخذون بسنته......... فمن جاهدهم بيده......... وليس وراء ذالك من الايمان حبة خردل" (مسلم) جیسی احادیث پر عمل پیرا ہوسکیں۔ بینوا توجروا!

الجواب بعون الوهاب: راقم الحروف اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ سائل محترم نے فرمایا ہے اس سے متفق نہیں بشرطیکہ اسے عمومی معمول نہ بنایا جائے اور ماثورہ عربی دعاؤں کو ترک نہ کیا جائے۔ ہاں اکثر طور پر کسی مرض میں یا کسی مشکل میں انسان کے اندرونی جذبات اور دلی احساسات منظوم صورت میں زبان سے ادا ہو جاتے ہیں اور یہ اعتداء فی الدعا کے زمرہ میں داخل نہیں۔ تک بندی مطلق یا فی الدعاء بالکلیہ ممنوع نہیں۔ قرآن کریم میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعا اس طرح منقول ہے:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ○ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ○ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ○ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ○ هٰرُوْنَ اَخِي ○

اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ○ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ○ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ○ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ○ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ○﴾ (طٰہٰ: ۲۵ تا ۳۵)

یہ دعا تک بندی کا بہترین نمونہ ہے۔ اگر ہم یہ دعا ''یفقھوا قولی'' تک پڑھیں تو کیا آن محترم اسے ناجائز قرار دیں گے؟

سیدنا نوح علیہ السلام کی دعا بھی قرآن مجید میں مذکور ہے:

﴿وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ○ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ○ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا﴾ (نوح: ۲۶ تا ۲۸)

سیدنا نوح علیہ السلام کی یہ دعا بھی تک بندی ہے قرآن عزیز کے بعد احادیث کو دیکھا جائے تو وہاں بھی اسی طرح تک بند کے ساتھ ادعیہ بھی وارد ہوئی ہیں ذیل میں میں صرف تین پر اکتفا کرتا ہوں۔

❶ :......سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

((اللھم انی اعوذبك من جھد البلاء ودرك الشقاء وسوء القضاء وشماتة الاعداء .))

کیا یہ صحیحین کی دعا تک بندی کا بہترین نمونہ نہیں ہے؟

❷ :...... نسائی، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم میں معتبر سند کے ساتھ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ آپ دعا مانگیں آپ کو دیا جائے گا میں نے یہ دعا مانگی:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْئَلُكَ اِيْمَانًا لَا يَرْتَدُّ وَنَعِيْمًا لَا يَنْفَدُ وَمُرَافَقَةَ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ ﷺ فِيْ اَعْلٰى دَرَجَةِ الْجَنَّةِ جَنَّةِ الْخُلْدِ .))

یہ دعا بھی اعلیٰ درجہ کی تک بندی کا مرقع ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ثابت رکھا

ہے اور نقد نہیں فرمایا، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کوئی شخص خود ہی صحیح الفاظ کے ذریعے جو شریعت مطہرہ کے مخالف نہ ہوں اگرچہ مأثور نہ بھی ہوں پھر بھی دعا مانگ سکتا ہے، کیونکہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ دعا رسول اکرم ﷺ سے سن کر نہیں مانگی تھی بلکہ اپنی طرف سے یہ دعائیہ الفاظ کہے تھے اور اس کا مفہوم ومعنی ومطلب آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کے عین مطابق تھا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اسے ثابت رکھا۔ (یعنی اسے برقرار رکھا)

اور صحیح مسلم میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نماز میں سجدہ کی حالت میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

((اللهم اغفرلی ذنبی کله دقه وجله واوله وآخره وعلانیة وسره.))

کیا یہ دعا جو نماز میں بحالت سجدہ پڑھی گئی ہے کیا یہ تک بندی نہیں ہے؟

بہرحال تک بندی مطلقاً ممنوع نہیں خواہ وہ دعائیہ کلمات میں ہی ہو۔

ہاں وہ تک بندی ممنوع ہے جس میں بے جا تکلف ہو اور وہ کسی حق بات کے معارض ومخالف ہو، چنانچہ صحیح بخاری، ابوداؤد وغیرہ میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ دو عورتیں آپس میں لڑ پڑیں ایک نے دوسری کو پتھر اٹھا کر دے مارا جس کی وجہ سے اس کا حمل ضائع ہو گیا تو رسول اکرم ﷺ نے اس ضائع شدہ حمل (بچہ) کی دیت ایک غلام یا ایک لونڈی کا فیصلہ فرمایا تو مارنے والی عورت کے ولی نے کہا:

((کیف اغرم یا رسول الله من لا شرب ولا اکل ولا نطق ولا استهل فمثل ذالك بطل.))

تو اس پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

((انما هذا من اخوان الکهان.))

اور ابوداؤد میں اسی واقعہ کے متعلق سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس شخص کی تک بندی کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

((اسجع کسجع الاعراب.))

اور ابوداود ہی میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ مروی ہیں:

((اسجع الجاھلیة وکھا نتھا.)) (الحدیث)

الغرض ان الفاظ مبارکہ سے محترم بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ کیسی تک بندی ممنوع ومعیوب ہے۔

دعائیہ کلمات اشعار میں بھی وارد ہوئے ہیں مثلاً:

سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اصحاب الرجیع کا مرثیہ پڑھتے ہوئے یہ دعائیہ کلمات فرماتے ہیں:

((صلی الآله علی الذین تتابعوا یوم الرجیع فاکرموا واثیبوا.)) ❶

اس شعر میں ''صلی اللہ علیہ وسلم'' دعائیہ کلمہ جس طرح ہم کہا کرتے ہیں، غفر اللہ لہ، ورحمتہ اللہ علیہ، وغیرہ۔

لیجئے جناب! صحیح بخاری میں ''کتاب المغازی باب غزوة الخندق الاحزاب'' میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ حدیث لائے ہیں:

((عن البراء رضی اللہ عنہ قال: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ینقل التراب یوم الخندق حتیٰ اغمر بطنه او اغبر بطنه، یقول: واللہ لو لا اللہ ما اهتدینا، ولا تصدقنا ولا صلینا فانزل سکینة علینا، وثبت الاقدام ان لاقینا ان ...... قد بغوا علینا، اذا ارادو فتنة ابینا ویرفع بھا صوته ابینا ابینا.))

اس کے ساتھ متصل براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رجز عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے کہے ہوئے تھے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان مبارکہ سے ادا فرمارہے تھے۔ عروض کا علم رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ ''رجز'' یہ شعر کی ایک قسم اور

❶ دیوان حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، ص ۱۸۔

اس کے ابحور میں سے ایک بحر ہے۔اور ان رجز یہ اشعار میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توحید کے ساتھ ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے انزال سکینت اور تثبیت اقدام کی دعا بھی ہے۔

یہ کلمات اگرچہ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے ہیں، لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کلمات کو اپنی زبان مبارکہ سے ادا کرنا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان اشعار کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اشعار میں دعا مانگنے کا ثبوت مل گیا تو پھر ان کی صحت میں کوئی شک نہ رہا۔ بلکہ اس صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ اشعار میں دعا مانگنا یا اللہ تعالیٰ سے مناجات کرنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ ہے۔لہٰذا اس کے مندوب ومستحب ہونے میں کوئی کلام وشک نہ رہا اور یہ بھی بالکل واضح ہے کہ سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وتعریف میں جو اشعار پڑھے تھے ان میں دو شعر یہ بھی تھے۔

یــا رب فـاجـمـعـنـا مـعـاونبيـنـا
فــي جـنـة تـثـفــي عيـون الـحـمـد
فـي جـنـة الـفـردوس واكتبهـا لـنـا
يــا ذالــجـلال وذا الـعـلاو السؤدد

(ديوان حسان بن ثابت : ص ٥٨)

بہرحال اس سوال کے جواب میں میرے خیال میں کافی لکھا جاچکا ہے۔لہٰذا اسے اب ختم کرتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

نماز میں فرق

سوال: مرد اور عورت کی نماز میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک ہے کہ:

((انما النسآء شقائق الرجال .)) [1]

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الطهارة، باب المرأة ترىٰ ما يرى الرجل، رقم الحديث:٢٣٦ .

''عورتیں شرعی احکامات میں مردوں کی ہم پلہ ہیں۔''

یعنی ان باتوں یا امور کے علاوہ جن میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے مردوں اور عورتوں کے احکامات میں فرق کیا ہے۔ باقی تمام باتوں اور معمول میں عورتیں بھی اس طرح عمل کریں گی جس طرح مرد کرتے ہیں۔ دوران حیض اور نفاس کے علاوہ میں عورتوں پر بھی اس طرح نمازیں فرض ہیں جس طرح مردوں پر فرض ہیں اور عورتیں بھی عین اسی طرح نمازیں پڑھیں گی جس طرح مرد پڑھتے ہیں۔ جب کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مرد اور عورت کی نماز میں کوئی فرق بیان نہیں کیا ہے، اس لیے اپنی رائے اور خیال سے اس میں ہرگز فرق کرنا جائز نہیں ہے۔

یعنی عورتوں کو بھی بعینہٖ اسی طرح نماز پڑھنی ہے۔ جس طرح مرد پڑھتے ہیں تفریق کے لیے کوئی بھی دلیل نہیں ہے۔

احناف حضرات پر تو کوئی حیرت وتعجب نہیں ہے وہ تو بیچارے مقلد ہیں لیکن نہایت تعجب کی بات ہے کہ اہل حدیث عورتیں بھی اس طرح کی نماز پڑھتی ہیں جس کا ثبوت کتاب وسنت میں ہرگز نہیں ہے۔ کتاب وسنت سے یہی ثابت ہے کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح نمازیں پڑھیں۔ باقی تفریق ایجاد بندہ ہے۔ واللہ اعلم!

جمعہ کے دن زوال

سوال: خطبہ جمعہ زوال سے پہلے شروع کرنا اور سورج ڈھلتے ہی جماعت کھڑی کر دینا سنت طریقہ ہے یا نہیں؟ اور جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے اور دوران خطبہ آنے پر جو دو رکعت پڑھی جاتی ہیں وہ سنت کہلاتی ہیں یا نفل؟ صحیح حدیث کی روشنی میں جواب دیں؟

1 ...... صحیح بخاری، فتح الباری وغیرہما سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ زوال سے پیشتر نہیں، بلکہ زوال ہوتے ہی آجاتے اور خطبہ شروع کرتے اور خطبہ میں زیادہ وقت نہ لیتے تھے اور پھر نماز شروع فرما دیتے اور صحیح حدیث میں آپ کا ارشاد بھی موجود ہے کہ خطبہ کا چھوٹا

کرنا اور نماز کو لمبا کرنا یہ آدمی کی فقاہت (دین کی سمجھ) کی علامت ہے، بہرحال صحیح حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ اور نماز سب زوال کے بعد ہوا کرتے البتہ زوال ہوتے ہی تشریف لاتے البتہ جمعہ کے دن زوال سے قبل اور استواء سراج کے وقت بھی نوافل پڑھنے کی اجازت ہے جیسا کہ احادیث سے نمایاں طور پر معلوم ہوتا ہے۔

❷...... جمعہ کے دن نبی کریم ﷺ نے خطبہ ونماز سے کافی پہلے مسجد میں آنے کی ترغیب دلائی ہے اور بڑے اجر وثواب کی خبر دی ہے اور فرمایا کہ آدمی کو مسجد میں سویرے آنا چاہیے اور نوافل پڑھتا رہے، پھر جب امام آئے تو چھوڑ کر توجہ سے خطبہ سنے لہٰذا خطبہ سے قبل جتنے کچھ نوافل پڑھے گئے وہ آپ ﷺ کی قولی سنت ہوئے اور خطبہ کے دوران بھی آپ ﷺ کا ہی حکم وارشاد ہے کہ آپ میں سے جب کوئی مسجد میں آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو اس کو بھی بیٹھنے سے پہلے دو رکعت پڑھنی چاہئیں اور ان کو لمبا نہ کرے بلکہ تخفیف کرے لہٰذا یہ بھی قولی سنت ہی ہوئی ہے۔ واللہ اعلم

جمعہ میں دو اذانیں

سوال: کیا جمعہ کے دن خطبہ کے وقت جو اذان دی جاتی ہے اس سے پہلے اذان دینا جائز ہے یا نہیں تاکہ لوگوں کو کچھ جلدی اطلاع ہو جائے تاکہ جمعہ کے خطبہ ونماز کے لیے تیار ہو جائیں؟

الجواب بعون الوهاب: خطبہ کے وقت (جمعہ کے دن) جو اذان دی جاتی ہے اس سے پہلے بھی اذان دینا جائز ہے۔ دلیل اس کی وہ حدیث ہے جو بخاری شریف میں "باب الأذان عند الخطبه" کے تحت میں مذکور ہے۔ ملاحظہ فرمائیے!

((عن الزهری قال سمعت السائب بن يزيد يقول ان الاذان يوم الجمعة كان اوله حين يجلس الامام يوم الجمعة على المنبر فی عهد رسول الله ﷺ وابی بكر وعمر رضی اللہ عنہما كان فی

خلافته عثمان رضي الله عنه وكثرها امر عثمان يوم الجمعة بالاذان الثالث فاذن على الزوراء فثبت الامر على ذلك .))

''امام زہری فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سائب بن یزید (یہ صغیر صحابی ہیں) سے سنا جو فرما رہے تھے کہ جمعہ کے دن اذان حضرت رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے زمانے تک اس وقت دی جاتی جب امام منبر پر آ کر (خطبہ کے لیے) بیٹھتا تھا، پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ آیا اور آدمی بھی بہت ہو گئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تیسری اذان (یعنی خطبہ کے وقت اذان اور اقامت کے علاوہ) کا امر فرمایا: پھر وہ اذان زوراء کے مقام پر دی گئی۔''

پھر یہ بات اور حکم اسی پر ثابت رہا اور بیہقی کی سنن کبریٰ میں یہ الفاظ زائد ہیں۔ ''حتى الساعة'' یعنی اس وقت تک یہ حکم ثابت ہے۔اس حدیث سے مسئلہ مبحوث فیہا پر استدلال بایں طور ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ اذان (خطبہ کے وقت سے پہلی اذان) بڑھا دی اور وہ خلفائے راشدین نے اس میں کوئی شک نہیں کیا اور دوسرے سب صحابہ نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا بلکہ اس بات پر اپنی رضا مندی کا اظہار فرمایا جس پر ''فثبت الامر على ذلك حتى الساعة'' کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اس حکم کو نہیں بدلا اور ان کے دور خلافت میں بھی اس پر قائم رہا۔ بلکہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی یہی بات بحال رہی اور یہی آخری صحابی ہیں جو خلافت پر متمکن ہوئے۔ یہ بات کیونکہ معلوم ہوئی؟ اس کے لیے یہ گذارش ہے کہ امام زہری سنہ ۵۰ پچاس ہجری کے بعد تولد ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سنہ ۴۰ چالیس ہجری میں وفات پا چکے تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ۶۰ ساٹھ ہجری میں وفات پا چکے تھے گویا اس وقت امام زہری آٹھ نو برس کے بچے ہوں گے یعنی ان خلفاء رضی اللہ عنہم کا زمانہ کما حقہ انہوں نے نہیں پایا لیکن جب حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے (زہری) حدیث بیان

فرماتے ہیں اس وقت یہ غالباً سن شباب کو یا کھولت کو پہنچ چکے ہوں گے اور اسی وقت صحابی مذکورہ نے ان سے روایت بیان کی اور صحابی یہ فرما رہے ہیں کہ یہ بات یعنی اذان ثانی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بڑھادی تھی، ثابت ہوئی۔ (اس صحابی نے سنہ ۹۱ ہجری میں وفات کی)

خلاصہ کلام: ...... یہ کہ ان خلفاء راشدین کا زمانہ گذر چکا لیکن انہوں نے اس کام کو تغیر نہیں دیا اور اس کو بند کیا۔ لہٰذا سب صحابہ کا اس پر اجماع ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا اجماع حجت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

میری ساری کی ساری امت گمراہی پر اتفاق نہیں کرے گی، اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ فعل صحیح نہ ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر ضرور معترض ہوتے اور اس پر اتفاق قطعاً نہ کرتے ہمیں صحابہ رضی اللہ عنہم کے حال کو اپنے حال پر قیاس نہیں کرنا چاہیے ان کا حال امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں وہ تھا کہ ہمارے تصور سے بھی بالاتر ہے وہ اس بات میں کسی لومۃ لائم یا کسی حاکم (خواہ کتنا ظالم ہو) سے خوف نہیں کھاتے تھے اور بغیر کسی پس وپیش کے حق کو ادا فرماتے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے:

((فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين .)) [1]

''یعنی تم میری سنت اور خلفاء راشدین مہدیین کی سنت کو لازم پکڑلو۔''

لہٰذا یہ ثابت ہو گیا کہ یہ سنت دو راشد خلیفوں کی سنت ہے (یعنی حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما) تو ہمیں آپ کے ارشاد گرامی کے مطابق اس کو پکڑ لینا چاہیے، البتہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ اذان نہیں دی جاتی تھی لہٰذا اگر کوئی نہیں دیتا تو اس پر بھی طعن وتشنیع نہیں کرنی چاہیے یعنی جو مسجد والے یہ اذان ثانی دیتے ہیں وہ بھی اچھا کرتے ہیں اور جو نہیں دیا کرتے بلکہ صرف خطبہ کے وقت والی اذان دیتے ہیں وہ بھی کوئی برا نہیں کرتے لہٰذا دونوں پر طعن وتشنیع کرنا انصاف سے بعید ہے، باقی یہ جو حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے امر فرمایا کہ زوراء پر اذان ثانی دی جائے وہ لوگوں کی سہولیات کی وجہ سے تھا

---

[1] ابوداؤد، کتاب السنة، باب في لزوم السنة، رقم الحديث: ٤٦٠٧.

تا کہ سب لوگوں کو جمعہ کی نماز وخطبہ وغیرہ کے وقت قریب ہونے کا علم ہو جائے اس لیے یہ ضروری نہیں کہ اس اذان کو خواہ مخواہ باہر جا کر کسی مقام پر دینا چاہیے بلکہ جہاں سے بھی آواز لوگوں تک پہنچ جائے صحیح ہے۔

مثلاً مسجد کے مینار پر یا مسجد میں ہی کسی بلند جگہ پر کھڑے ہو کر اذان دی جائے یا آج کل مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر لگائے جا رہے ہیں، پھر وہیں لاؤڈ اسپیکر کے قریب ہی کھڑے ہو کر اذان دینی چاہیے یعنی مقصد آواز پہنچانا ہے اور یہی محققین کا مسلک ہے۔ ھٰذا ماعندی والعلم عند الله العليم الخبير وهو اعلم بالصواب!

مسجد کو منتقل کرنا

سوال: کسی گاؤں میں ایک مسجد ہے وہاں کے باسی اسی مسجد میں نماز ادا کرتے ہیں جبکہ اب صورتحال یہ ہے کہ اس گاؤں کے لوگ کسی مجبوری کی بناء پر اس گاؤں کو ترک کر کے کسی اور جگہ منتقل ہونا چاہتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس مسجد کے سامان سے جہاں پر وہ منتقل ہونا چاہتے ہیں نئی مسجد بنا سکتے ہیں واضح ہوا کہ اگر اس مسجد کو اسی حالت میں چھوڑ دیتے ہیں تو وہ بالکل غیر آباد ہو کر رہ جائے گی اس کا پورا سامان ضائع ہو جائے گا؟

الجواب بعون الوهاب: مساجد تمام مسلمانوں کے لیے وقف ہوا کرتی ہیں اور وقف فی سبیل اللہ کا یہ حکم ہوتا ہے کہ اس میں بلا وجہ تغییر وتبدیلی نہ کی جائے اسے ضائع نہ کیا جائے، اس سے وہی کام لیا جائے جس کے لیے اسے وقف کیا گیا ہے لہٰذا بلا وجہ مسجد میں نامناسب تبدیلی کرنا یا اسے ضائع کرنا یا اسے ختم کرنا اسے غیر آباد کرنا ناجائز ہے، اس کے متعلق (جہاں وہ مسجد ہے) وہاں کے تمام باسی مسلمانوں پر ایک جتنا حق ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اگر کوئی اضطراری صورت پیش آ جائے تو بھی اس میں تغیر وتبدل یا اسے ترک کرنا یا اسے نئی صورت میں تعمیر کرنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں بلکہ اس کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ نے راہنما اصول عطا فرمائے ہیں جن سے مذکورہ تمام باتیں جائز

ہوسکتی ہیں۔

❶: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرہ: ۲۸۶)
''ہر کسی بھی شخص کو اللہ تعالیٰ اس کی طاقت وقدرت سے زیادہ احکام لاگو نہیں کرتا۔'' ❷:
﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن: ۱٦) ''لہٰذا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اوراس کے اوامر کی انحرافی سے اپنی وسعت وطاقت کے مطابق بچیں۔'' ❸: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ (البقرہ: ۲۱۹) ''آپ سے شراب اور جوے کے متعلق پوچھتے ہیں آپ فرمائیں کہ ان دونوں میں نقصان بھی ہے تو لوگوں کے لیے کچھ فوائد بھی ہیں تاہم ان کے نقصانات فوائد سے زیادہ ہیں۔''

اس مقام پر ''اثـم'' بمعنی نقصان ہے تفصیل کی یہاں پر گنجائش نہیں۔ اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اضافی فائدے اور نقصان سے کوئی چیز بھی خالی نہیں، حتیٰ کہ محرمات میں بے شمار نقصانات کے ساتھ ساتھ کچھ فوائد بھی ہیں، لہٰذا اس آیت سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ جب کہ کوئی بھی چیز اضافی نفع ونقصان سے خالی نہیں ہے تو پھر ہر چیز کے متعلق حکم معلوم کرنے کے لیے یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس کا نفع زیادہ ہے یا نقصان، اگر نقصان زیادہ ہے تو پھر تو تھوڑی منفعت کو کچھ وزن نہیں دیا جائے گا بلکہ نقصان کو مدنظر رکھتے ہوئے اس چیز سے اجتناب وپرہیز لازمی ہے۔

❹: ﴿وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ﴾ (الانعام: ۱۱۹) اللہ تعالیٰ نے محرمات (حرام کردہ چیزوں) کو تفصیل سے بیان کیا ہے مگر یہ کہ تم مجبور ہوجاؤ کہ تمھیں محرم چیز سے کسی طرح بھی مخرج نظر نہ آئے۔ اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ہر محرم وممنوع چیز نہایت اضطراری اور انتہائی مجبوری کی حالت میں جائز ہوجاتی ہے لیکن وہاں یہ خیال رہے کہ اس کام یا چیز یا امر کے ارتکاب کے علاوہ کوئی دوسری متبادل صورت نہ ہو اگر کوئی متبادل صورت موجود ہے تو پھر ہرگز ہرگز اس ممنوع چیز کا

ارتکاب نہ کیا جائے۔

❺: اللہ تعالیٰ نے صلاح و درستگی (معاشرہ) کا امر فرمایا ہے اور اس کے مدمقابل فساد سے منع فرمایا ہے اور اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی اس لیے مبعوث فرمایا کہ انسانوں کے اصلاح احوال کی تحصیل و تکمیل کریں اور مفاسد کو بالکل ختم و نابود کردیں اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل آیت کریمہ کو ملاحظہ کریں۔

﴿وَ قَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ﴾ (الاعراف: ۱۴۲)

اور شعیب علیہ السلام نے فرمایا:

﴿اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ﴾ (ھود: ۸۸)

اور فرمایا:

﴿فَمَنِ اتَّقٰی وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾

(الاعراف: ۳۵)

نیز ارشاد ہے:

﴿وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ﴾

(البقرہ: ۱۱)

مذکورہ آیات میں واضح طور پر مصالح کو اختیار کرنے کا امر و ترغیب دی گئی ہے اور فساد و بگاڑ سے روکا گیا ہے۔ یعنی جو بات بگاڑ فساد اور تخریب و ضیاع کا سبب بنتی ہو اسے ترک کرکے وہ کام یا عمل و صورت اختیار کی جائے جس میں ہر طرح سے مصلحت اور بہتری ہو۔

❻: ﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰی فِیْ خَرَابِهَا﴾ (البقرہ: ۱۱۴) ''اس سے بڑھ کر کوئی بھی ظالم نہیں جو مساجد کی تخریب وضیاع کا سبب بنے کہ وہ ان میں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے روکتا رہے۔''

❼: ﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ یُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ﴾ (النور: ۳۶)

مؤمنوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوران گھروں (مسجدوں) میں حاصل ہوگا جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ ان کی رفعت و بلندی، تعظیم وتکریم کی جائے اور ان میں اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر ہوتا رہے۔ الخ

سیّدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ما نهيت عنه فاجتنبوه وما امرتكم به فاتو منه ما استطعتم......الحديث)) (متفق عليه)

''یعنی میں تمھیں جس چیز سے روکوں اس سے کلی طور پر اجتناب کرو اور جس چیز کا حکم دوں تو اس کی تعمیل اپنی وسعت و استطاعت کے مطابق کرو۔''

یعنی نواہی میں استطاعت وغیرہ کی گنجائش نہیں مگر اوامر میں شریعت نے قدرت اور وسعت کی گنجائش رکھی ہے۔ چوری مت کریں اس میں یہ گنجائش نہیں کہ اگر قدرت نہ ہوتو پھر چوری کرلیا کرو لیکن حکم ہے کہ نماز کھڑے ہوکر پڑھو اگر قدرت نہیں تو پھر لیٹ کر اشاروں کے ساتھ۔ وضو کے لیے پانی نہیں یا کسی سبب وضو کرنا صحیح نہیں تو تیمّم کرلے۔ روزے فرض ہیں لیکن بیمار کے لیے ترک کرنے کی اجازت ہے علیٰ ہذا القیاس۔ دیگر اوامر کو بھی اسی طرح سمجھنا چاہیے۔ ان اصولی باتوں کو پوری طرح ذہن میں بڑھانے کے بعد اب آیئے اصل مسئلہ کی طرف کتنے ہی مواقع پر بعض ایسے ناگزیر حالات پیدا ہوجاتے ہیں جن کی وجہ سے وہاں کے باسی اس گاؤں کو ترک کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں مثلاً وہاں بہت زیادہ زمینی سیلاب پھوٹ پڑے جس کی وجہ سے وہاں کے باسی مجبور ہوکر اس جگہ کو ترک کرکے چلے جائیں اس صورت میں اگر اس گاؤں کے باسیوں کو اس کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ اس مسجد کو شہید کرکے جاکر وہاں مسجد بنائیں جہاں پر وہ رہنے لگے ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ اس طریقے سے تو یہ بنی ہوئی مسجد غیر آباد ہوکر رہ جائے گی یا تو کتے اور بلیاں آکر وہاں گند پھیلاتے رہیں گے یا شیاطین یا کوئی اور مخلوق وہاں آکر اپنا آستانہ بنائے گی یا بالآخر وہ اس سیلاب کی وجہ سے گر کر نیست و نابود ہوجائے گی۔ اس طرح مسجد کی تعظیم میں فرق آجاتا ہے

ہاں اگر اس کی متبادل صورت کی اجازت ہوگی تو لوگ باآسانی اپنی مرضی کے مطابق کسی اور جگہ وہ مسجد بنوادیں گے۔

سوال: نماز تراویح سنت گیارہ رکعت ہیں لیکن اگر کوئی گیارہ سے زیادہ پڑھنا چاہے تو کیا یہ جائز ہے؟

الجواب بعون الوهاب: نفلی عبادات میں اللہ رب العزت نے کوئی تعداد یا قید مقرر نہیں فرمائی ہے، فرمان الٰہی ہے: ﴿وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ﴾ (البقرة: ١٥٨)

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ان الله قال من عادى لى وليا فقد آذنته بالحرب وما تقرب إلى عبدى بشىء احب الى مما افترضت عليه وما يزال عبدى يتقرب الى بالنوافل حتى احبه فاذا احببته كنت سمعه الذى يسمع به وبصره الذى يبصر به ويده التى يبطش بها ورجله التى يمشى بها وان سالنى لاعطينه ولئن استعاذنى لاعيذنه وما ترددت عن شىء انا فاعله ترددى عن نفس المومن يكره الموت وانا اكره مسائته)) (بخارى: ٦٥٠٢)

"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جو میرے کسی ولی کو تکلیف دے تو میں اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں، اور نہیں قرب حاصل کرتا ہے میرا بندہ میری طرف مگر میرے فرض کیے ہوئے پر عمل کر کے، اور جو بندہ نوافل کے ذریعے میری قربت کے حصول کی کوشش کرتا رہتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، تو میں اس کا کان، آنکھ اور ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں کہ جن سے وہ سنتا ہے دیکھتا ہے پکڑتا ہے اور چلتا ہے اگر وہ مجھ سے کچھ مانگے تو میں اسے ضرور دوں اگر پناہ

مانگے تو پناہ دوں۔“

نبی کریم ﷺ نے نوافل کی کوئی حد بیان نہیں فرمائی، صحیح حدیث میں ہے:

((خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَصِيَامُ رَمَضَانَ قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُ قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ وَذَكَرَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الزَّكَاةَ قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ فَأَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُولُ وَاللَّهِ لَا أَزِيدُ عَلَى هَذَا وَلَا أَنْقُصُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَفْلَحَ إِنْ صَدَقَ)) (بخاری: ٤٧)

”ایک شخص نے نبی ﷺ سے سوال کیا اسلام کے بارے میں تو آپ ﷺ نے اسے بتایا کہ دن اور رات میں پانچ نمازیں ہیں، پوچھا: کیا اور بھی کچھ ہے؟ فرمایا نہیں اگر تو نفلی پڑھے، پھر آپ نے فرمایا رمضان کے روزے فرض ہیں تو پھر وہ پوچھنے لگا ان کے علاوہ اور بھی ہیں؟ فرمایا نہیں لیکن اگر نفلی رکھے تو تیری مرضی۔ پھر آپ نے زکوٰۃ کے بارہ میں بتایا تو پھر اس نے پوچھا کہ کیا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے فرمایا نہیں، مگر تو نفلی ادا کرے تو تیری مرضی۔ تو وہ آدمی جانے لگا اور کہنے لگا کہ اللہ کی قسم! نہ میں اس سے زیادہ کروں گا اور نہ اس سے کم تو آپ ﷺ نے فرمایا: کامیاب ہوگیا اگر اس نے سچ کہا۔“

اس حدیث میں بھی آپ ﷺ نے نفلی عبادت کی کوئی حد بیان نہیں فرمائی، یہ تو عبادت کرنے والے پر منحصر ہے کہ وہ کتنی نفلی عبادت کر سکتا ہے اور کئی دفعہ انسان کوشش کرتا ہے کہ میں خوش نفس کی رغبت اور للّٰہیت اور مناجات الٰہیہ کے لیے نفلی عبادت کروں اور اس کا مطمع نظر صرف تقرب الٰہی ہوتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ نفلی عبادت کرے لیکن اس میں اتنے افراط سے کام نہ لے کہ سستی تھکاوٹ، کج روی اس کا مقدر بن جائے اور فرائض سے بھی وہ غافل ہو جائے۔

جب نفلی عبادت کرنے والا ان شروط کا خیال رکھے تو پھر وہ جتنی چاہے نفلی عبادت کرے کوئی قباحت نہیں، ہاں جب خاص نماز تراویح کی بات ہو تو بلا شک یہ مسنون ثابت شدہ صرف گیارہ رکعت ہیں، ان کے اوپر اضافہ کرنا محض نفلی عبادت میں اضافہ کرنا ہے، تراویح گیارہ رکعت ہی ہیں اور نفلی نماز کا حکم بیان ہو چکا ہے، اگر نفل کی نیت سے مسنون رکعات پر اضافہ کیا جائے تو ہمارے نزدیک یہ اس صورت میں جائز ہے کہ ان زوائد کو فرائض واجبات لوازم یا سنن موکدات نہ سمجھے اور جو ان زوائد کو ادا نہ کرے تو انہیں برا یا مجروح نہ سمجھے اور جو ان زوائد کو فرائض وواجبات یا سنن موکدات سے سمجھے اور ان کے تارک کو مجروح سمجھے گا تو وہ اللہ کی حدود سے تجاوز کرنے والا ہوگا اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے وہی ظالم ہیں، اس صورت میں اس کی یہ نفل عبادت قرب الٰہی کا ذریعہ نہیں ہوگی بلکہ یہ بدعت سیئہ ہوگی جو کسی بھی حال میں مستحسن نہیں ہے۔ اور یہ بھی ٹھیک کہ جو لوگ ۲۰ رکعات ادا کرتے تھے، عہد عمر رضی اللہ عنہ میں جیسا کہ سنن الکبریٰ بیہقی میں ہے جس کی سند بھی جید ہے، بلکہ بعض تو ۲۰ سے بھی زیادہ ادا کرتے تھے، اگرچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گیارہ رکعات باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا تھا لیکن ان پر مستزاد سے منع بھی نہیں کیا تو ہمارے نزدیک حق بات یہی ہے کہ سنت مسنونہ ثابتہ سے نماز تراویح گیارہ رکعت ہی ہیں لیکن اگر نفل کی نیت سے زیادہ پڑھ لی جائیں تو جائز ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

سنت نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا

سوال: کیا نماز تہجد اور نماز تسبیح کو رمضان یا غیر رمضان میں باجماعت ادا کیا جا سکتا ہے؟

الجواب بعون الوھاب: نفلی نماز باجماعت جائز ہے چاہے وہ نماز تہجد ہو یا نماز تسبیح یا کوئی اور نماز نفل، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گھر باجماعت نماز ادا فرمائی، آپ کے پیچھے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ایک بچہ اور ان کے پیچھے ام سلیم والدہ انس رضی اللہ عنہا کھڑی

ہوئیں تو آپ نے انہیں دو رکعت نفل با جماعت پڑھائی، جیسا کہ کتب احادیث سے ثابت ہے۔ اور صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے کہ ایک دفعہ یہ اپنی خالہ اور ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر رات کو ٹھہرے، جب نبی کریم ﷺ تہجد کے لیے اٹھے تو ابن عباس بھی ساتھ اٹھ کر وضو کر کے آپ کے بائیں طرف کھڑے ہوگئے تو آپ ﷺ نے ان کو اپنے دائیں طرف کھڑا کرلیا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آپ کی اقتدا میں مکمل نماز تہجد ادا کی۔ صلاۃ التسبیح بھی چونکہ نوافل سے ہے تو انہیں بھی با جماعت ادا کیا جا سکتا ہے، چاہے رمضان ہو یا غیر رمضان، ہاں! ایک بات کا خیال رکھے کہ کوئی خاص مہینہ یا جگہ مقرر نہ کرے یا خاص دن مقرر نہ کرے۔ کہ اگر اس میں نفلی عبادت کروں گا تو زیادہ ثواب ہوگا علاوہ اس دن یا مہینے کے کہ جو شریعت میں بیان کر دیے گئے، تو ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم شرعی حدود کا خیال رکھیں ان سے تجاوز نہ کریں۔ واللہ اعلم بالصواب

دعائے قنوت قبل رکوع یا بعد الرکوع

سوال: وتروں میں دعائے قنوت رکوع کے بعد پڑھنی چاہیے یا رکوع سے پہلے ہاتھ اٹھا کر یا ہاتھ باندھ کر یا کھلے چھوڑ کر اور تین رکعت وتر کی دو سلام سے پڑھتے وقت نیت کس طرح ہو؟ صرف قرآن وحدیث کے عین مطابق جواب دیں؟

الجواب بعون الوهاب: ❶...... وتر میں قنوت رکوع سے پہلے بھی آئی ہے رکوع کے بعد بھی آئی ہے جیسا کہ نسائی شریف وغیرہ کتب حدیث سے صحیح طور پر معلوم ہوتا ہے یعنی یہ دونوں امر جائز ہیں۔

البتہ میری تحقیق بخاری وغیرہ کی حدیث سے یہی ہے کہ اکثر طور پر وتر میں قنوت رکوع سے قبل پڑھنی چاہیے اور فرض نماز میں رکوع کے بعد۔ لیکن حدیث کی رو سے دونوں باتیں وارد ہیں باقی اگر رکوع سے قبل قنوت پڑھے تو ہاتھ باندھ کر اور اگر رکوع کے بعد تو ہاتھ چھوڑ کر۔

❷...... خاص طور پر وتر میں دعائے قنوت کے لیے نبی کریم ﷺ سے کوئی حدیث

تا حال ایسی دیکھنے میں نہیں آئی جس میں یہ وارد ہو کہ اس میں آپ ہاتھ اٹھا کر پڑھا کرتے تھے یا ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، البتہ فرض نماز میں قنوت پڑھنے کے لیے ہاتھوں کے اٹھانے کی حدیث صحیح۔ امام احمد کے مسند وغیرہ میں وارد ہے۔ لہٰذا مجھ سے جو پوچھتا ہے کہ وتر کی دعا قنوت میں ہاتھ اٹھانے چاہئیں یا نہیں تو میں ان کو یہ جواب دیتا ہوں کہ جو کام فرض نماز میں جائز ہے وہ نوافل میں بھی جائز ہے جب فرض نماز میں قنوت نازلہ میں ہاتھ اٹھانے ثابت ہیں تو وتر جو صحیح مسلک قرآن وحدیث کے مطابق فرض نہیں ہے بلکہ نفل ہے تو اس میں بھی ہاتھ اٹھانے جائز ہوتے ہیں یعنی اگر کوئی اٹھائے تو اس کو بھی جائز کہنا چاہیے البتہ اس کو ضروری یا نبی ﷺ کی واردہ سنت تصور نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے وتر میں ہاتھ اٹھانے کے آثار ہیں لہٰذا میں تو اس کو صرف جائز سمجھتا ہوں اور ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ رکوع کے بعد قنوت پڑھتا ہوں اور ہاتھ بھی اٹھالیتا ہوں۔ واللہ اعلم

❸...... وتر کا طریقہ اکثر طور پر دو سلام سے ہی صحیح حدیثوں میں میں وارد ہے البتہ ایک سلام سے بھی حدیث میں آیا ہے لیکن اس صورت میں دوسری رکعت پر بھی تشہد کے لیے بیٹھنا نہیں ہے بلکہ تیسری اور آخری رکعت میں بیٹھ کر تشہد وغیرہ پڑھ کر سلام پھیر دینا چاہیے جیسا کہ احادیث میں وارد ہے اور حدیث میں (سنن دار قطنی) وغیرہ میں یہ بھی آیا ہے کہ وتر کو مغرب نماز کے مشابہہ نہ بناؤ۔ لہٰذا اگر وتر ایک سلام سے پڑھے تو بیچ میں قعدہ نہ کرے، کیونکہ اس صورت میں وتر مغرب نماز سے مشابہہ ہوگا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وتر قنوت سے مغرب نماز سے ممتاز ہو جائے گا۔ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ قنوت نازلہ نبی کریم ﷺ سے صحیح حدیثوں میں پانچوں فرائض ''جن میں مغرب بھی آجاتی ہے'' میں وارد ہے، لہٰذا قنوت سے وتر کی مغرب سے مشابہت ختم نہیں ہوگی یہ مشابہت صرف اس صورت میں ختم ہوگی کہ بیچ میں قعدہ نہ کیا جائے یا احناف جو دعا قنوت پڑھتے وقت ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہہ کر پھر ہاتھ باندھ کر قنوت پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح مغرب سے مشابہت ختم ہوگئی یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ یہ طریقہ محدثہ ہے، نبی کریم ﷺ سے اس طرح ثابت نہیں۔ باقی رہی نیت تو یہ

ابتداء ہی میں پہلی رکعت کے شروع کرتے وقت تین رکعات ہی کی جائے گی رہا بیچ میں سلام کا تخلل تو یہ اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کی وجہ سے ہے اور ہم یہ کرتے بھی سنت کی وجہ سے ہی ہیں۔ہمیں حکم بھی سنت کے اتباع کا ہے۔ واللہ اعلم

وتروں کے بعد دو رکعات پڑھنا

سوال: کیا وتروں کے بعد بیٹھ کر دو رکعت پڑھنا بدعت ہے؟

الجواب بعون الوهاب: اخبار الاعتصام کے ۱۵ دسمبر ۱۹۶۷ء کے پرچے میں صفحہ ۹ پر ''فتاویٰ'' کے تحت عنوان ''کیا وتروں کے بعد دو نفل پڑھنا ثابت ہیں؟'' نظر سے گذرا اس عنوان کے تحت مولانا محترم عبدالقادر صاحب حصاروی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وتروں کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنا ثابت نہیں ہیں اور ان کو مشروع سمجھ کر پڑھنا بدعت کے حدود میں داخل ہوتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محترم نے اس مضمون کے تحریر کرنے میں عجلت سے کام لیا ہے اور حد تو یہ ہے کہ مولانا نے ان اہلحدیثوں پر بھی ''نام نہاد اہلحدیث'' کا لیبل لگا دیا ہے جو وتروں کے بعد دوگانہ بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ یہ کتنی زبردستی ہے کہ جو بھی ان کے اختیار کردہ مسلک کا پیروکار نہ ہو اس کو نام نہاد اہلحدیث قرار دیا جائے۔ کیا صحیح معنی میں وہی اہلحدیث ہے جو مولانا حصاروی صاحب کا اختیار کردہ مسلک اختیار کرے اور جو اختلاف کرے وہ نام نہاد اہلحدیث ہے؟ اگر کوئی دلیل کی وجہ سے آپ سے اختلاف کرتا ہے تو یقیناً یہ حق آپ کو نہیں پہنچتا کہ اس کو آپ مورد طعن بنائیں یا اس کو نام نہاد اہلحدیث سمجھیں، اور یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ وتروں کے بعد دوگانہ بیٹھ کر پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

غالباً مولانا نے صحاح ستہ کو بھی اچھی طرح نہیں دیکھا ورنہ انہیں سنن ابن ماجہ میں ہی حدیث نظر آجاتی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جناب حضرت رسول اللہ ﷺ نے جو دو رکعتیں وتروں کے بعد بیٹھ کر پڑھی ہیں وہ تہجد کے وقت کے ساتھ خاص ہیں اور اس کے علاوہ وہ

آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ خصوصیت کا جواب تو آگے آئے گا لیکن دلیل میں ہم چند احادیث نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ وتروں کے بعد (مطلقاً نہ کہ تہجد کے وقت) دو رکعتیں نفل بیٹھ کر پڑھنا آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے۔

①:......سنن ابن ماجہ میں ہے:

((حدثنا محمد بن بشارٍ ثنا حماد بن مسعدة ثنا ميمون بن موسىٰ المرئى عن الحسن عن امه عن ام سلمة رضی اللہ عنہا ان النبى ﷺ كان يصلى بعد الوتر ركعتين خفيفتين وهو جالس.)) [1]

''اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ وتر کے بعد ہلکی دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے۔''

اس حدیث کی سند کے سب رواۃ ثقہ ہیں۔ میمون بن موسیٰ المرئی بھی صدوق ہے لیکن وہ مدلس ہیں، اس لیے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہاں تدلیس سے کام لیا ہو لیکن اولاً تو مولانا حصاروی صاحب اپنے مضامین میں بہت سی احادیث ایسی تحریر فرماتے ہیں جن کی اسانید میں مدلسین موجود ہوتے ہیں اور سماع کی تصریح بھی نہیں کرتے۔ لیکن مولانا محترم صاحب اس حدیث کی یہ علت پیش کر کے اس کا کوئی جواب نہیں دیتے اس لیے کم از کم انہیں تو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

آگے ایسی حدیثیں آرہی ہیں جن سے اس روایت کی تائید ہو جائے گی۔ اور اس حدیث کی سند میں جو حسن اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں ان کا نام خیرۃ ہے اور وہ بھی مقبولۃ ہے اور ابن حبان ان کو اپنی ثقات میں لائے ہیں كذا فى التقريب والتهذيب اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے اس حدیث کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان دوگانہ سے مراد وہ دو رکعتیں ہیں جو تہجد کے

---

[1] سنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلوٰة والسنة فيها، باب ما جاء فى الركعتين بعد الوتر جالسًا، رقم الحديث: ١١٩٥.

وقت وتروں کے بعد پڑھا کرتے تھے۔ کیونکہ اس میں قطعاً مطلق بعد الوتر کا بیان ہے اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ عشاء کے بعد رات کے اول حصہ میں رات کے درمیانی حصہ میں اور آخر رات میں وتر پڑھا کرتے تھے یعنی آپ سے تینوں وقتوں میں رات کے اول، اوسط اور آخر میں وتر پڑھنا ثابت ہے۔

اور "کان یصلی" کا یہی متقاضی ہے کہ ہمیشہ ورنہ کم از کم اکثر تو ضرور ایسا کرتے تھے۔ مقصد یہ کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب بھی وتر پڑھتے تھے (خواہ اول رات میں یا اس کے آخری حصہ میں تو دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے۔)

علاوہ ازیں خود مولانا صاحب نے ان دو رکعت کے متعلق لکھا ہے کہ بیٹھ کر ان نفلوں کو شروع کرتے جب قرأۃ ختم ہو جاتی تو کھڑے ہو جاتے اور رکوع کرتے اور سجدہ کرتے اس سے معلوم ہوا کہ وہ دو رکعتیں طویل ہوتی تھیں اور اس کی وضاحت مسلم وغیرہ کی روایت میں ہے لیکن اس حدیث میں ہے کہ وہ دو رکعتیں ہلکی (خفیفتین) ہوتی تھیں (اسی کی وضاحت اگلی حدیثوں میں آرہی ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ وہ دو رکعتیں نہیں تھیں جو تہجد کے وقت اس مخصوص طریقہ سے پڑھتے تھے اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ پھر تو یہ حدیث مسلم شریف والی حدیث کے متعارض ہو جائے گی کیونکہ مسلم شریف والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دو رکعتیں لمبی ہوتی تھیں اور اس حدیث کا مفاد یہ ہے کہ وہ ہلکی ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے کہ مقصود یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ وتر کے بعد ہمیشہ دو رکعت بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے اب کبھی تو وہ دو رکعتیں ہلکی ہوتی تھیں اور کبھی لمبی اس مخصوص طریقہ پر جو مسلم شریف کی حدیث میں وارد ہے اس میں تعارض کی کونسی بات ہے؟

اور دونوں جگہوں پر کان کا لفظ وارد ہے اس سے بھی کوئی خرابی لازم نہیں آتی کیونکہ دونوں طریقے آپ سے دوام کے ساتھ ثابت ہیں اور دو فعلوں کا اکثری (یعنی کثرت کے ساتھ) ہونا کوئی اچھنبے کی بات بھی نہیں ہے کیونکہ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ

بعض مرتبہ اتنے روزے رکھا کرتے تھے کہ خیال ہوتا کہ اب افطار ہی نہیں کریں گے اور بعض مرتبہ اتنے دن افطار کرتے تھے کہ خیال ہوتا تھا کہ اب روزہ نہیں رکھیں گے۔

اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ روزے بھی بہت دن تک رکھا کرتے تھے اور پھر افطار بھی کافی عرصہ تک ہوا کرتے تھے یعنی دونوں فعل مبارک اکثری ہو گئے۔اسی طرح کبھی آپ کافی عرصہ تک ہلکی رکعتیں ہی پڑھتے رہتے جس میں سورۃ ﴿اذا زلزلت الارض﴾ اور ﴿قل یا ایھا الکفرون﴾ پڑھا کرتے اور کبھی بہت دن تک وہ دو رکعتیں لمبی بھی کرتے رہتے تھے۔اس میں کوئی تعارض وتخالف نہیں ہے۔اور مولانا صاحب نے یہ بھی عجیب بات تحریر فرمائی ہے کہ ''جیسے یہ ترکیب آنحضور ﷺ سے مخصوص ہے'' کیونکہ مسلم وغیرہ میں یہ وضاحت ہے کہ اس طرح آپ اس زمانے میں کرتے تھے جب آپ بڑی عمر کے ہو گئے۔

((فلما اسن وغیرھا .))

کے الفاظ آتے ہیں۔لہٰذا یہ ترکیب آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے ''من یدعی فعلیه البیان بالبرھان'' جو بڑی عمر والا ہو جائے یا بیماری وغیرہ کی وجہ سے چاہتا ہے کہ میں رات کے نوافل میں قرأت بھی لمبی کروں اور نوافل کو بھی ترک نہ کروں وہ اسی ترکیب پر عمل کرسکتا ہے۔

یعنی شروع تو قرأۃ بیٹھ کر کرے لیکن جب قرأۃ ختم ہونے کو آئے تو اٹھ کر رکوع کرے آخر اس میں آپ کے اتباع سے کونسی چیز مانع ہے؟ اور اس ترکیب کا آپ کے ساتھ مخصوص ہونا کس دلیل کی بناء پر ہے؟ خیر یہ تو ضمنی چیز تھی اصل مقصد یہ تھا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ وتر کے بعد بیٹھ کر رکعتیں خفیفتین پڑھتے تھے،لہٰذا وتر کے بعد دوگانہ بیٹھ کر پڑھنا مسنون ہوا اور جو مسنون ومشروع سمجھ کر پڑھتا ہے وہ نام نہاد اہلحدیث یا بدعتی وغیرہ نہیں ہے بلکہ متبع سنت ہے رہا خصوصیت کا تو اس کے متعلق بعد میں عرض کروں گا۔

④:......مسند احمد میں یہ حدیث ہے:

((حدثنا عبداللّٰه حدثنی ابی ثنا عبدالصمد حدثنی ثنا

عبدالعزیز یعنی ابن صهیب عن ابی غالب عن ابی امامة ان النبی ﷺ کان یصلیهما بعدالوتر وهو جالس یقرأ فیهما اذا زلزلت الارض وقل یایها الکفرون .))

''ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ وتر کے بعد بیٹھ کر دو رکعتیں پڑھتے جن میں سورۃ زلزال اور کافرون کی تلاوت کرتے۔''

اس حدیث کی سند بالکل بے غبار ہے اس میں پہلے حضرت عبداللہ ہے وہ حضرت امام احمد کا فرزند ہے وہ ثقہ ہے پھران کا والد حضرت امام احمد ہے پھر عبدالصمد جو ہے وہ عبدالصمد بن عبدالوارث ہے جیسا کہ رجال کی کتب سے پتہ چل جاتا ہے اور جیسا کہ بیہقی کی روایت سے جوانہوں نے سنن میں نقل کی ہے معلوم ہوتا ہے۔ وہ روایت یہ ہے۔

((قال البیهقی فی سننه الکبری اخبرنا ابو عبدالله الحافظ وابوبکر احمد بن الحسن القاضی ابو صادق محمد بن احمد الصیدلانی قالو اثنا ابو العباس محمد بن یعقوب ثنا ابو قلابة ثنا عبدالصمد ابن عبدلوارث ثنا ابی عند عبدالعزیز بن صهیب عن ابی غالب عن ابی امامة ان النبی ﷺ یصلی رکعتین بعدالوتر وهو جالس یقرأ فیهما اذا زلزلت ، وقل یا ایها الکفرون .))

''ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ آنحضرت ﷺ وتر کے بعد بیٹھ کر دو رکعتیں پڑھتے جن میں سورۃ زلزال اور کافرون کی تلاوت کرتے۔''

مقصد یہ کہ امام احمد والی سند میں جو عبدالصمد ہے وہ ابن عبدالوارث ہے اور وہ ثقہ ہے اسی طرح ان کے عبدالوارث بن سعید وہ بھی ثقہ ہے اس کے بعد پھر عبدالعزیز بن صہیب ہیں وہ بھی ثقہ ہیں، پھر ابو غالب ہیں یہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کے صاحب ہیں ان کے نام میں اختلاف ہے لیکن وہ کنیت سے مشہور ہیں۔ ان کے متعلق صاحب التقریب حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر

فرماتے ہیں کہ ''صدوق یخطئی ''یعنی وہ سچے ہیں اور خطا بھی کر جاتے ہیں۔

یخطی کا لفظ راوی کی عدالت میں قادح نہیں ہے اور نہ اس کو احتجاج کے رتبے سے گرا دیتا ہے کیونکہ خطا اور وہم سے کوئی راوی معصوم نہیں ہے الا ماشاء اللہ یہی وجہ ہے کہ رجال کی کتب میں بہت سے ایسے رواۃ ملتے ہیں جن کے متعلق ان کی کتب میں یہی لکھا ہوتا ہے کہ '' صدوق یخطئی '' یا''صدوق یھم'' یا''صدوق له اوھام'' حالانکہ وہ صحیحین کے رواۃ میں سے ہوتے ہیں۔

مثلاً حسن بن ذکوان بخاری کے رجال میں سے ہیں لیکن تقریب میں لکھا ہے کہ ''صدوق یخطئی'' اسی طرح حرمی بن عمارہ بن ابی حفصہ جو بخاری اور مسلم کے رواۃ میں سے ہے ان کے متعلق حافظ ابن حجرؒ تقریب میں تحریر فرماتے ہیں ''صدوق یھم'' اسی طرح سعید بن یحییٰ بن سعید بن ابان الاموی یہ راوی بھی شیخین کے رواۃ میں سے ہیں اس کے متعلق حافظ صاحب تقریب میں فرماتے ہیں کہ ثقہ ''ربما اخطا'' بہرکیف ایسے اور بھی رواۃ ہیں جو اگرچہ شیخین کے رواۃ میں سے ہیں لیکن ان کے متعلق رجال کی کتب میں یہی لکھا ہوتا ہے کہ یخطئی لهٗ اوھام اور ربما اخطألیکن ان الفاظ سے وہ حجیت سے گر نہیں جاتے کیونکہ جہاں ان سے کچھ وہم ہوا ہے یا خطا ہوگئی ہے وہاں ائمہ حدیث اور حفاظ فن نے تنبیہ کر دی ہے لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ جہاں پر بھی وہ راوی دیکھیں تو کہیں کہ یہاں بھی اس نے خطا کی ہوگی۔

مقصد یہ ہے کہ چونکہ اس حدیث کے متعلق ائمہ حدیث میں سے کسی نے چونکہ یہ نہیں فرمایا کہ اس نے یہاں بھی خطا کی ہے۔ اس لیے اس کی روایت مقبول ہوگی۔ پھر آخر میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ ہیں جو صحابی ہیں۔ خلاصہ کلام کہ اس حدیث کی سند کے سب رواۃ ثقات ہیں اور ان میں کوئی راوی مدلس بھی نہیں ہے۔

لہٰذا یہ علت بھی نہیں ہے بلکہ یہ روایت دوسری حدیث سے جو آگے آرہی ہے تقویت پکڑ کر صحیح لغیرہٖ بن جائے گی:

((کما لا یخفی علی ماھر الاصول.))

اور امام احمد کی مسند احادیث کے ان کتب میں سے ہے جن کی احادیث سے اصلاً احتجاج کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ طبقہ ثانیہ میں سے ہیں "کما یشیر الیه کلام المحدث الدھلوی فی حجة اللہ البالغه" خلاصہ کلام کہ سنداً یہ حدیث بالکل بے غبار ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے اور ان دو رکعتوں میں سورۃ اذا زلزلت اور قل یا ایہا الکفرون پڑھا کرتے تھے اور یہ حدیث ابن ماجہ والی حدیث کی مؤید بھی ہے کیونکہ اس میں بھی رکعتین خفیفتین پڑھنے کا ذکر ہے۔

اور اس حدیث میں بھی "کان یصلی" کے الفاظ ہیں جو دوام یا کثرت پر دال ہیں دوسری بات یہ ہے کہ یہ روایت حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے ہے جس سے ظن غالب یہی ہوتا ہے کہ یہ دو رکعتیں عشاء کے بعد وتر کے بعد آپ پڑھا کرتے تھے، کیونکہ تہجد تو آپ اپنے گھر میں ہی پڑھا کرتے تھے "فتأمل"۔

علاوہ ازیں حدیث کے الفاظ میں "کان یصلی رکعتین بعد الوتر" اور یہ الفاظ عام ہیں لہٰذا ان کو بلا دلیل صرف تہجد کے وقت کے ساتھ مخصوص کرنا صحیح نہیں، کیونکہ جب احادیث صحیحہ سے آنحضرت ﷺ کا رات کے تینوں وقتوں اول، اوسط، آخر میں وتر پڑھنا ثابت ہے اور اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہمیشہ وتر کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے تھے تو ان دو رکعتوں کا آپ سے پڑھنے کا ثبوت مل گیا اور وہ بھی دواماً لہٰذا یہ کہنا کہ ان دو رکعتوں کا وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھنا بے ثبوت ہے قطعاً صحیح نہیں۔

③:...... امام بیہقی سنن کبریٰ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث لائے ہیں:

((حدثنا ابو الحسن محمد بن الحسین بن داؤد العلوی املاء ثنا ابو نصر محمد بن حمدویه بن سھل المروزی ثنا عبداللہ بن حماد الآملی ثنا یزید بن عبد ربه ثنا بقیة بن الولید عن عتبة بن ابی حکیم عن قتادة عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان

النبی ﷺ کان یصلی بعدالوتر الرکعتین وھو جالس یقرأ فی الرکعة الاولیٰ بام القرآن واذا زلزلت وفی الثانیه قل یا ایھا الکفرون .))❶

اس حدیث کی سند میں اور سب راوی ثقہ ہیں لیکن بقیہ سخت مدلس ہیں اور سماع کی تصریح نہیں کی اور عتبہ بن ابی حکیم کو صدوق ہے لیکن کثیر الخطاء ہے اور قتادہ بھی ثقہ ہے لیکن وہ بھی مدلس ہے لیکن ان وجوہ سے سند میں خفیف ضعف پیدا ہوتا ہے، اس لیے اعتبار واستشہاد میں کوئی قباحت نہیں یعنی جب کہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے صحیح یا حسن لذاتہ سند سے حدیث ثابت ہوگئی تو یہ حدیث جو کہ تھوڑی ضعیف ہے اس کی مؤید بن جائے گی اور اس کو شواہد کی حیثیت سے ذکر کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

بہرکیف اس حدیث سے بھی بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ وتر کے بعد ہمیشہ بیٹھ کر دگانہ ادا فرماتے تھے پہلی رکعت میں اذا زلزلت اور دوسری میں قل یا ایھا الکفرون پڑھا کرتے تھے، جب ایک فعل جناب حضرت رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے ثابت ہوگیا تو اس کے اتباع کی بدعت کہنا اور اس کے متبع کو نام نہاد اہلحدیث کہنا زبردستی اور سینہ زوری ہے یہ بھی صحیح نہیں کہ سلف میں سے کوئی وتر کے بعد دو رکعت نہیں پڑھا کرتے تھے بلکہ امام محمد بن نصر نے قیام اللیل میں لکھا ہے کہ:

((وکان سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ یوتر ثم یصلی علی اثرالوتر مکانه .))

یعنی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ وتر کے بعد اسی جگہ پر نماز پڑھا کرتے تھے اسی طرح لکھا ہے کہ "وکان الحسن یامر بسجدتین بعدالوتر" یعنی حضرت حسن بصری وتر کے بعد دو رکعت پڑھنے کا امر فرمایا کرتے تھے اور لکھتے ہیں:

((وقال کثیر بن مرة وخالد بن معدان لا تدعهما وانت

❶ البیهقی، کتاب الصلوٰة، باب فی الرکعتین بعد الوتر، جلد۳، صفحه ۳۳.

تستطیع یعنی الرکعتین بعد الوتر .))

کثیر بن مرہ اور خالد بن معدان دونوں تابعی ہیں نے فرمایا کہ جب تک قدرت ہو وتر کے بعد دو رکعتوں کو نہ چھوڑا کرو۔ پھر فرماتے ہیں:

((وقال عبداللہ بن مساحق کل وتر لیس بعدہ رکعتان فھو ابتر .))

(عبداللہ بن مساحق فرماتے ہیں کہ جس وتر کے بعد دو رکعتیں نہیں وہ دم کٹا ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ دو رکعتیں کچھ الگ نہیں کہیں بلکہ وتر کے ساتھ ہی ہیں۔ اس لیے یہ دو رکعتیں وتر کو قیام اللیل کے آخر میں رکھنے کے منافی بھی نہیں ہیں، آگے پھر امام محمد بن نصر فرماتے ہیں:

((وقال عیاض بن عبداللہ رایت أبا سلمة بن عبدالرحمان اوتر ثم صلی رکعتین فی المسجد .))

(عیاض بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کو دیکھا کہ وتر کے بعد مسجد میں ہی دو رکعت ادا کیں (یہ ابوسلمہ وہی بزرگ ہیں جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام اللیل کی گیارہ رکعات کے راوی ہیں۔)

بہرکیف خیر القرون میں اور خود صحابہ میں سے بھی وتر کے بعد دو رکعت پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ لہٰذا اس کو بدعت کے حدود میں داخل کرنا خصوصاً جب کہ ان کا یہ فعل حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہو۔

حضرت مولانا حصاروی صاحب کی ہی جرأت ہے باقی مولانا کا یہ فرمانا کہ "یہ فعل مبارک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص ہے کیونکہ اگر آپ امت کو ایک امر فرمائیں اور خود اس سے مخالف کوئی عمل کریں تو یہ آپ کی ذات مبارک سے مخصوص ہوگا تو یہ کلیتہً صحیح نہیں ہے بلکہ اس میں تفصیل ہے۔

مثلاً حدیث میں کھڑا ہو کر پینے سے منع آیا ہے اور ایسی کوئی حدیث نظر سے نہیں گزری

جس میں یہ ہو کہ آپ نے کھڑا ہو کر امت کو اجازت دی ہے حالانکہ صحیح حدیثوں میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کھڑے ہو کر بھی پیا کرتے تھے اسی وجہ سے محققین نے یہی کہا ہے کہ کھڑے ہو کر پینا بھی جائز ہے گو بیٹھ کر پینا بہتر ہے ایسی اور بھی امثلہ دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ جہاں بھی آپ کا فعل اس امر کے خلاف ہو جو آپ نے امت کو دیا ہے تو وہ آپ کی ذات مبارک سے مخصوص ہوگا صحیح نہیں ہے۔ پھر مولانا نے امام شوکانی کا تو قول نقل کر دیا لیکن اس سلسلہ میں اور ائمہ حدیث کے اقوال نقل نہیں کیے۔ اور یہ انصاف سے بعید ہے دیکھیے، امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

((قلت الصوات ان هاتين الركعتين فصلهما ﷺ بعد الوتر جالسا بيان جواز الصلوٰة بعدالوتر وبيان جواز التنفل جالسا ولم يواظب على ذالك .))

''یعنی صحیح بات یہ ہے کہ آپ نے وتر کے بعد بیٹھ کر نماز پڑھی ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ وتر کے بعد بھی نفل پڑھنا جائز ہے اور بیٹھ کر پڑھنا بھی جائز ہے اور آپ نے اس پر ہمیشگی نہیں کی۔''

بہرحال اگر امام شوکانی نے تخصیص کا کہا ہے تو امام نووی نے اس کے جواز التنفل بعدالوتر کا اثبات کیا ہے اب انصاف سے بتائیں کہ کس کی بات درست ہے؟ اور جو امام نووی نے کہا کہ آپ نے اس پر ''یعنی دوگانہ وتر کے بعد ہی ہمیشگی نہیں کی وہ غالباً اس لیے کہ ان کے سامنے حضرت امام احمد کے مسند اور امام بیہقی کی سنن کبریٰ والی احادیث ذہن میں نہیں تھیں۔

ان کے سامنے صرف وہی حدیث یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا والی حدیث جس کے شرح میں یہ عبارت لکھی ہے، اس لیے یہ فرمایا کہ اس پر ہمیشگی نہیں کی اور یہ امام نووی نے اس لیے فرمایا کہ ان کو یہ فعل بظاہر اس حدیث کے متعارض نظر آیا جس میں آپ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ وتر کو صلوٰۃ اللیل کے آخر میں رکھا کرو، حالانکہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا کہ یہ

چیز وارد نہیں ہوتی کیونکہ یہ دو رکعت کوئی مستقل اور الگ نماز نہیں کہ جس کی وجہ سے یہ اس حکم کے متعارض ہو جائے، ورنہ اگر اس کو وتر کے بعد اس کے ساتھ کی نماز قرار دیا جائے جس طرح کہ عبداللہ بن مساحق نے کہا ہے۔ (ان کا قول گذشتہ صفحات میں آچکا ہے) یعنی یہ دو رکعتیں وتروں کے لیے ایک قسم کی تتمیم کا کام دیتی ہیں تو پھر یہ اعتراض وارد نہیں ہوگا اور جو حدیثیں ہم نے اوپر لکھی ہیں ان سے آنحضرت ﷺ کی ان دو رکعتوں پر مواظبت معلوم ہوتی ہے۔

لہٰذا یہ دوگانہ وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھنا مشروع و مسنون ہوا نہ کہ بدعت و نام نہاد اہلحدیثوں کا فعل باقی رہا مولانا کا یہ فرمانا کہ بیٹھ کر پڑھنے سے آدھا ثواب ملتا ہے تو اس کے متعلق میری یہ گذارش ہے کہ اہلحدیث کرائے کے اجیر نہیں ہیں کہ جہاں مزدوری زیادہ ملے ادھر چلے گئے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اہلحدیث کا مطمع نظر، منتہی بصر اور ان کی نسب آرزوؤں کی تکمیل اسی میں ہے کہ ان کو سرور کونین سید البشر جناب حضرت رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع حاصل ہو جائے اگر ان کے نامۂ اعمال میں یہ ثبت ہو جائے کہ انہوں نے حبیب خدا احمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت کی پیروی کی تو بس ان کے لیے یہی کافی ہے باقی رہا آدھا ثواب تو یہ تو آدھا ہے لیکن اگر ان کو کچھ بھی نہ ملے تب بھی ان کے لیے یہی کافی ہے کہ انہوں نے اس ذات اقدس کی سنت کا اتباع کیا جس کے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (آل عمران: ٣١)

اہلحدیث کو تو سنت الرسول ﷺ سے شغف ہے۔ آخر میں میں حضرت مولانا محترم حصاروی صاحب کی خدمت میں باادب یہ گذارش کرتا ہوں کہ ہر ایک کے لیے تحقیق کا میدان وسیع کھلا ہوا ہے، اس لیے جو تحقیق بھی آں محترم کو صحیح نظر آئے بلا خوف لومۃ لائم پیش فرما دیا کریں لیکن اسی کو ہی حرف آخر سمجھ کر جو اس کے مخالف ہو اس کو بدعتی بنا دیں یا اس کو نام نہاد اہلحدیث قرار دیں، یہ چیز اچھی نہیں ہے کسی کو بدعت کی طرف منسوب کرنے سے

پہلے اس بات پر غور وفکر فرمالیا کریں تو یہ نہایت بہتر رہے گا کیونکہ اگر کسی کو اہلحدیث سمجھنے میں غلطی کی تو اس کا نقصان اتنا نہیں ہوگا جتنا کسی کو بدعتی سمجھنے میں غلطی کرنے سے ہوگا اس لیے جس کو ہم غلطی سے اہلحدیث سمجھ رہے ہیں اگر وہ واقعتاً اہلحدیث نہیں ہے تو اس میں ہمارا کچھ بھی نہیں بگڑتا لیکن اگر کسی کو ہم غلطی سے بدعتی سمجھ لیں اور پھر اس پر عجلت سے بدعتی ہونے کی فتویٰ کا لیبل لگادیں تو خود ہی سوچ لیں اس سے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ ہر معاملہ میں احتیاط بہتر ہے۔

وما علينا الا البلاغ المبين وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين وانا العبد الا واه ابو الروح محب اللّٰہ شاه عفى الله عنه

کافی عرصہ پہلے وتر کے بعد دوگانہ نفل بیٹھ کر پڑھنے کے متعلق مولانا عبدالقادر صاحب حصاروی کا فتویٰ شائع ہوا تھا جس میں مولانا موصوف نے وتر کے بعد دوگانہ بیٹھ کر ادا کرنے کو بدعت قرار دیا تھا بعد میں بندہ حقیر پر تقصیر راقم الحروف نے اس پر تعاقب کیا جو کہ بفضلہ تعالیٰ انصاف پسند حلقوں میں نہایت ہی پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا۔ بعد میں تنظیم اہلحدیث میں مولانا حصاروی صاحب نے اس تعاقب پر ''سندھی تعاقب پر ایک نظر'' کے عنوان سے تنقید فرمائی۔ ہمہ دان کی دعویٰ تو نہ بندہ نے پہلے کیا ہے اور نہ اب ہے اور کسی کی غلطی پر اس کو متنبہ کرنا یا اس کی لغزش کو ظاہر کرنا بھی معیوب نہیں بلکہ عین مرغوب ومطلوب امر ہے لیکن جب تعاقب محض برائے تعاقب ہو تو اس سے بجائے مفید نتیجہ نکلنے کے کدورتیں بڑھتی ہیں اور وقت کا ضیاع اس کے علاوہ ہوتا ہے۔

اس تعاقب پر تعاقب میں بھی حضرت مولانا حصاروی صاحب نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے اول تو بہت سی غیر متعلق باتیں درمیان میں لے آئے ہیں جن سے قطعاً بحث نہیں تھی اور نہ ہی وہ اہلحدیثوں میں مختلف فیہا ہی تھیں ان کو تحریر میں لانے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی پھر مولانا موصوف نے اصل مسئلہ پر جو تنقید کی ہے اس کے متعلق غیر متعصب اور ہر حال میں عدل سے متمسک متوازن اہل علم یہی رائے قائم کرے گا کہ یہ میرے تعاقب پر تعاقب ہے

ہی نہیں اور واللہ میں اس کے اوپر قلم ہرگز ہرگز نہ اٹھاتا لیکن چند احباب کی غلط فہمیوں کے دور کرنے کے لیے مجھے مجبوراً اس پر کچھ لکھنا پڑ رہا ہے کیونکہ جو حدیث کا علم کچھ زیادہ نہیں رکھتے وہ شاید مولانا صاحب کے مضمون ہذا سے اور میری دانستہ خاموشی سے یہی اندازہ فرمائیں گے کہ غالباً میں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی ہے اور مولانا صاحب کی تنقید واقعی صحیح اور وقیع ہے یہی وجہ ہے کہ میں اس پر خامہ فرسائی کرنے کے لیے مجبور ہوا ہوں۔

ویسے اس مضمون کی تیسری قسط مولانا صاحب کی تنقید سے بھی پہلے میں دفتر الاعتصام کو ارسال کر چکا تھا لیکن حضرت علامہ احسان الٰہی صاحب ایڈیٹر الاعتصام کے مشورہ سے اس قسط کو اشاعت سے باز رکھا لیکن جب مولانا کی یہ تنقید دیکھی تو مجبوراً اس کی اشاعت کے لیے ایڈیٹر صاحب موصوف کو لکھا اور انہوں نے وعدہ فرما دیا کہ جونہی مولانا صاحب کا مضمون پورا ہوگا تو اس کو شائع کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ میں مولانا حصاروی کا بہت معتقد تھا اور ان کے علمی نکات اور معقول ابحاث کا دل سے قدر کرتا تھا لیکن ان کے اس مضمون کی تیسری قسط کے چند سطور نے میری سب خوش فہمیوں کو ریزہ ریزہ کر دیا میں نے یہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ مولانا محترم صاحب بلا وجہ ذاتیات پر بھی حملہ آور ہوتے ہیں اور دوسروں پر غلط الزمات جوڑنے کے بھی عادی ہیں۔ ذیل میں ان کے مضمون کی تیسری قسط سے ''جو تنظیم اہلحدیث ۱۶ محرم کے صفحہ ۶ پر شائع ہوئی ہے'' ایک اقتباس نقل کرتا ہوں وہ ملاحظہ فرما کر مولانا کے انداز طبع کا داد دیں۔ مضمون کے تیسرے کالم میں یہ عبارت ہے:

''پیر جھنڈا موجودہ پیروں کی طرح آل رسول کہلا کر یہ فخر کرتے ہیں کہ ہم کو ثواب پورا ملتا ہے۔''

ایں خیال است ومحال است وجنون

اس سے آگے بھی بہت کچھ گل افشانی فرمائی ہے لیکن اس سے تعرض کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، کیونکہ ان کا ہر لفظ اور تحریر کی ہر سطر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں محفوظ ہے ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ اور وہی رب العالمین اور مالک یوم الدین ان سے

حساب لے گا۔

سردست میں باادب ان سے یہ پوچھنے کی جسارت کرنے سے قطعاً حق بجانب ہوں کہ جناب نے جو یہ اتہام اخبار میں درج فرمایا ہے کیا یہ اتہام جناب نے مجھ سے میرے بھائی صاحب سے یا پھر ہمارے دوسرے اقرباء جھنڈے والوں سے سنا ہے۔اور اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر ان کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ وہ ہم پر ایسے بے جا الزامات لگائیں؟

کیا ان کے ذہن مبارک سے یہ آیت کریمہ اوجھل ہوگئی ہے کہ:

﴿وَ مَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا﴾ (النساء: ۱۱۲)

”جو شخص کوئی خطا یا گناہ کرکے کسی ناکردہ گناہ کے ذمہ تھوپ دے اس نے بڑا بہتان اٹھایا اور کھلم کھلا گناہ کیا۔“

اور اسی طرح:

﴿وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا﴾ (الاحزاب: ۵۸)

”جو لوگ مؤمن مرد اور مؤمن عورتوں کو ایذاء دیں، بغیر کسی جرم کے جو ان سے سرزد ہوا ہو، وہ بڑے ہی بہتان باز اور کھلم کھلا گنہگار ہیں۔“

انہوں نے یقیناً ہم سے تو یہ بیجاء فخر اور ڈینگ والی بات سنی نہیں بلکہ مولانا سے تو میں بالمشافہ ملاقات تک نہیں لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے کسی بدخواہ اور مفتری سے ایسی باتیں سنی ہوں لیکن اس صورت میں بھی کیا ان کے لیے کتاب وسنت میں رہنمائی نہیں ملتی؟

اللہ تعالیٰ فرماتے ہے کہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ﴾ (الحجرات: ٦)

”اے ایمان والو! اگر تمھیں کوئی فاسق خبر دے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کرلیا

کرو، ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذاء پہنچا دو پھر اپنے کیے پر پشیمانی اٹھاو۔"

اور پھر حضرت رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی کہ:

((كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ .))

ان کے نظروں سے نہیں گذرا؟ اور سنی سنائی بات پر اعتماد کر کے دوسروں کو متہم کرنا یہ اہلحدیث جماعت میں سے صرف مولانا حصاروی صاحب "ہمارے مبلغ علم کی حد تک" کے حصہ میں آیا ہے۔

جی مولانا! ہم نے یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ ہم آل رسول ہیں، لہٰذا ہم کو ثواب پورا ملتا ہے بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ میدان حشر میں اگر ہمیں جناب حضرت رسول اللہ ﷺ کی امت کے ادنیٰ درجہ کے مومنوں میں شامل فرما دے تو یہ ہمارے لیے انتہائی خوش نصیبی ہوگی، ہم جناب حضرت رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کے سوا کسی کو بھی یقینی طور پر ناجی نہیں کہتے، صرف حسن ظن ہی ہوتا ہے جو ایک مسلم کے لیے رکھنا پڑھتا ہے۔

اب آپ نے جو بلا وجہ یہ افتراء پردازی کی ہے تو یاد رکھئے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے میرا ہاتھ ہوگا اور جناب کی دامن اور میں رب العالمین کی عدالت میں یہ مقدمہ دائر کروں گا کہ حضرت مولانا سے دریافت فرمایئے کہ کیونکر ہم پر ایسا الزام تھوپا تھا۔بس پھر وہیں جواب دہ ہونا اس سے زائد میں نہیں لکھ سکتا، باقی رہا ثواب تو میں نے یہ بات اپنے مضمون میں بھی نہیں لکھی تھی کہ یقیناً وتر کے بعد دوگانہ بیٹھ کر پڑھنے والے کو پورا ثواب ملے گا بلکہ اس کے برعکس آخر میں میں نے یہ لکھا تھا کہ یہ تو بیٹھ کر دوگانہ ادا کرنے سے آدھا ثواب ملتا ہے، لیکن اگر کچھ بھی نہ ملتا تب بھی ہمارے لیے یہی کافی وافی ہے کہ ہم نے جناب حضرت رسول ﷺ کی سنت ادا کی، اب ثواب کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے وہ جو چاہے دے، ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ یہ کام آنحضرت ﷺ کی سنت ہے اور ہر اہلحدیث سنت پر عمل کرنا اپنا ایمان سمجھتا ہے۔

ایک اور مثال مولانا کے افتراء پردازی اور بیجا اتہامات کا ملاحظہ فرمایئے! تنظیم اہلحدیث

مجریہ کے صفر کے صفحہ ۱۰ کالم ہے تیسرے پر رقمطراز ہیں:

''لیکن پیر صاحب اور ان کے مریدوں کا اس کے خلاف عمل ہے کہ وہ ہمیشہ مغرب کی سنتیں مسجد ہی میں پڑھتے ہیں اور یہ بدعت ہے۔''

مولانا! معلوم ہوتا ہے کہ جناب نے دوسروں پر بلاوجہ اتہامات لگانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور شاید جناب کو یہ خوف بھی نہیں آیا کہ ایک دن جناب کو اللہ تعالیٰ کی عدالت عالیہ میں پیش ہونا ہے اور وہاں کسی کا بس نہیں چلے گی۔ کیا آپ یہ آیات کریمہ نہیں پڑھتے:

﴿أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (مطففین: ٤ تا ٦)

''کیا انھیں اپنے مرنے کے بعد جی اٹھنے کا یقین نہیں، اس بڑے بھاری دن کے جس دن سب لوگ اللہ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔''

اور کیا جناب حضرت رسول ﷺ کا یہ ارشاد کہ:

''میری امت کا مفلس وہ ہے جو آئے گا تو نمازوں اور روزوں اور صدقات وغیرہ کے ساتھ لیکن ''جاء شتم هذا واكل مال هذا'' الحدیث۔''

تو کیا جناب کو اس بات کا ڈر ہی نہیں کہ دوسروں پر بلاوجہ اور بلا کسی قصور کے ایسے ایسے اتہامات باندھتے ہیں اور ایسی افتراء پردازیوں کا ارتکاب کرتے ہیں میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ الزام جھوٹا اور اللہ جانتا ہے کہ بالکل جھوٹا ہے، آخر کس گناہ کی پاداش میں مجھ پر تھوپا ہے آپ نے مجھے دیکھا کب ہے اور کیسے معلوم ہوا جناب کو کہ میں ہمیشہ مغرب کے بعد سنتیں مسجد میں ہی پڑھتا ہوں۔

حالانکہ جو میرے ساتھ رہتے ہیں یا جن کا مجھ سے واسطہ ہے یا جو مجھے جانتے ہیں ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں مولانا کی افتراء پردازی کے بالکل برعکس مغرب کے بعد سنتیں گھر میں یا اپنی جگہ پر ہی آ کر پڑھتا ہوں، الا کبھی کسی ضرورت کی وجہ سے مسجد میں ہی پڑھ لیں تو خیر ورنہ یہ سنتیں ہمیشہ گھر آ کر ہی پڑھا کرتا ہوں، پھر آپ نے یہ بدعت کا الزام جھوٹا

مجھ پر کیوں لگا دیا ہے۔

پھر جناب نے جو ننگے پاؤں نماز پڑھنے کے متعلق لکھا ہے تو اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ میں ننگے پاؤں نماز پڑھتا ضرور ہوں لیکن جوتی پہن کر پڑھنے کو ناجائز نہیں کہتا بلکہ اس عمل کو مسنون جانتا ہوں یعنی حضرت رسول ﷺ کی سنت سمجھتا ہوں اور ایسے مواقع بھی گزرے ہیں کہ میں نے جوتی کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کو بہتر جانتا ہے اور وہ اس پر گواہ ہے باقی رہا اس پر ہمیشگی نہ کرنا تو اس کے لیے اور دلائل ہیں جن کے تذکرہ کا یہ موقع نہیں اور نہ ہی یہ زیر بحث ہے۔ اسی طرح مولانا کا یہ الزام بھی درست نہیں کہ ہم ہمیشہ ننگے سر نماز پڑھتے ہیں مولانا کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں۔

بالآخر ان چیزوں کے ذکر سے جناب کا کیا مطلب ہے معلوم ہوتا ہے کہ جناب دوسروں کی توجہ اصل مسئلہ سے ہٹا کر دوسری باتوں میں الجھانا چاہتے ہیں تاکہ ان باتوں میں کھو کر اصلی بات جو زیر بحث ہے وہ ختم ہو جائے، لیکن اہل علم وانصاف یقیناً آپ کی باتوں کو سمجھ جائیں گے۔ واللہ! میں تو سمجھتا بھی نہیں ہوں کہ آخر مجھ سے مولانا کے جناب میں کیا گستاخی ہوگئی ہے جس کی وجہ سے ایسے ایسے الزام لگانے سے بھی پرہیز نہیں کرتے ہاں یہ قصور ضرور ہوا کہ میں نے ان کے مضمون پر تعاقب کیا تھا لیکن اس تعاقب میں ”واللہ علی ما اقول شہید“ کوئی بری نیت نہیں تھی اور نہ ہی مولانا کی شان کو کم کرنا مقصود تھا بلکہ محض جو بات سمجھ میں آئی اس کا اظہار مطلوب تھا۔

آگے اگر مولانا کو اس میں غلطیاں نظر آگئیں تو ان کا اظہار وہ شائستہ الفاظ میں بھی کر سکتے تھے اور میرے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ مولانا جیسی ہستی ایسی زبان استعمال کرنے پر آمادہ ہوگی اور ان جیسا عالم ایسے الزام لگائے، یہ میں نے خواب میں بھی نہیں خیال کیا تھا شاید مولانا اسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ جو وہ تحریر فرماتے ہیں بس اسی کو ہی حرف آخر تسلیم کرلیا جائے اور اس کے مالہ وماعلیہ کے اظہار کی جرأت بھی نہ کی جائے۔

خیر ان سب باتوں کا فیصلہ خالق السموات والارض کی عدالت عالیہ میں ہوگا پھر جو انہوں نے مجھ پر الزامات لگائے ہیں اگر وہ واقعی صحیح ہوں گے تو میں ہی وہاں ماخوذ بصورت دیگر وہ اپنی فکر کریں ہمیں حضرت رسول ﷺ کا یہ فرمان مبارک یاد ہے کہ:

((المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده .))

(بخاری و مسلم)

''کامل مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔''

باقی مولانا کا یہ فرمانا کہ:

''میں'' ''راقم الحروف'' نے ان پر الزام لگایا ہے کہ وہ مدلسین کی روایات کو استدلال میں پیش کرتے ہیں جو صحیح نہیں اگر میں کوئی مثال پیش کرتا تو جواب دیا جائے گا۔ سو اس کے بارہ میں یہ گذارش ہے کہ لیجئے دو مثالیں تو حاضر خدمت کر رہا ہوں ان کو دیکھ کر مولانا بھی انصاف کریں اور دوسرے اہل علم بھی فیصلہ کریں کہ واقعی مولانا نے مدلسین کی روایات سے استدلال کیا ہے یا نہیں۔

ان مثالوں کے پیش کرنے سے پہلے یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان مثالوں سے میرا مقصد محض ان حدیثوں پر سندی کلام ہے نہ نفس مسئلہ کیونکہ وہ مسئلہ دوسرے دلائل سے ثابت ہے یعنی گو نفس مسئلہ تو دوسرے دلائل سے ثابت ہے لیکن یہ مخصوص دلائل جو ہیں وہ مخدوش ہیں کیونکہ ان میں مدلسین ہیں اور روایت عن سے کرتے ہیں اور ہمارا مدعا ثابت ہو جائے گا کہ مولانا بھی مدلسین کی روایات دلائل کے طور پر ذکر کرتے ہیں اور میں نے بھی ان مدلسین کی روایتوں کو اصالۃ ذکر نہیں کیا تھا محض صحیح حدیثوں کی تائید میں جن میں سے ایک حدیث حسن یا صحیح پھر تو ابوامامہ والی ہے جس کو مولانا نے بیجا تعقب اور زبردستی ضعیف قرار دینے کی کوشش کی ہے اور صحیح حدیثیں آگے مزید تحقیق کے ضمن میں آرہی ہیں۔

لہٰذا خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اگر مولانا ذکر کردہ امثلہ کے متعلق یہ فرمائیں گے کہ یہ روایتیں انہوں نے محض صحیح احادیث کی تائید کے لیے ذکر کی ہیں تو مجھ سے بھی یہی قصور ہوا ہے لہٰذا

مجھ پر ان روایتوں (جن میں کوئی مدلس راوی ہے) کی وجہ سے اعتراض بالکلیہ فضول ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مبادا ان حدیثوں پر میرے کلام کو بہانہ بنا کر مولانا مجھے نفس مسئلہ کا مخالف قرار دے کر مجھ پر اعتراضات کی بوچھاڑ نہ کر دیں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ مدلسین کی روایات دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ لیجیے

مثال نمبر 1:

((عن بريدة قال قال رسول الله ﷺ بكروا بالصلوة في يوم الغيم فانه من ترك الصلوة فقد كفر.)) (رواه ابن حبان كتاب الصلوٰة، باب الوعيد علىٰ من ترك الصلوٰة، رقم الحديث:١٤٦٣)

(تنظیم اہلحدیث مجریہ ۱۶ شعبان ۱۳۸۸ صفحہ ۸ کالم ۳)

"پر زیر عنوان اعمال صالحہ ایمان میں داخل ہیں"

ابن حبان کی اس حدیث کی سند میں یحییٰ بن ابی کثیر ہے جو مدلس ہے۔ دیکھیے طبقات المدلسین للحافظ ابن حجر و فتح الباری اور وہ ابو قلابہ سے عن کے ساتھ روایت کرتے ہیں کیا یہاں مدلس کی روایت سے استدلال نہیں کیا گیا؟

مثال نمبر 2:

((لا تزوج المرأة المرأة ولا تزوج المرأة نفسها)) (رواه ابن ماجه والدارقطني ورجاله ثقات بلوغ المرام، تنظیم اہلحدیث مجریہ ۲۶ ذوالقعدہ ۱۳۸۸ صفحہ ۵ کالم ۳ تحت عنوان "الاعتصام" کے ایک فتویٰ پر تبصرہ)

اس حدیث کو ابن ماجہ نے ذکر کیا ہے لیکن اس کی سند میں ہشام بن حسان ہیں جو مدلس ہیں اور اس کی تدلیس مرتبہ ثالثہ میں سے ہے اور ایسے مدلسین کی روایات جب تک سماع کی تصریح نہ کریں محدثین قبول نہیں کرتے۔ (انظر الطبقات للحافظ ابن حجر رحمہ اللہ)

اور وہ "ہشام" محمد بن سیرین سے عن کے ساتھ روایت کرتے ہیں، اس طرح اس حدیث کو دارقطنی بھی اپنے سنن میں لائے ہیں اور اس کی چند سندیں ذکر فرمائی ہیں لیکن سب

میں یہی ہشام بن حسان ہیں اور محمد بن سیرین سے عن کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔

مولانا نے یہ تو لکھ دیا کہ ورجالہ ثقات لیکن یہ دیکھنا گوارا نہیں کیا کہ رجال کے ثقہ ہونے کے باوجود بھی کوئی علت ہوسکتی ہے جو حدیث کو ضعیف کر دیتی ہے۔ بہرحال اس حدیث کی سند میں مدلس ہے اور سماع کی تصریح نہیں کی، تاہم مولانا اس کو دلیل میں پیش کرتے ہیں، پھر بھی فرماتے ہیں کہ یہ میں نے ان پر الزام لگایا ہے۔ مولانا اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس بندہ حقیر کو ایسی بدخصلت سے اپنے فضل وکرم سے محفوظ رکھا ہے یہ جناب والا کی یہ بابرکت عادت ہے کہ دوسروں پر بلاوجہ خرافات فرماتے ہیں۔

یہ یاد رہے کہ میں نے جو یہ مثالیں پیش کی ہیں ان سے مراد وہ حدیثیں ہیں جو ان کتابوں میں مذکور ہیں جن کا نام مولانا نے تحریر فرمایا ہے۔ مثلاً مثال اول میں ابن حبان کی صحیح اور دوسرے میں ابن ماجہ ودارقطنی اس لیے یہ قطعاً مناسب نہ ہوگا اگر وہ کسی دوسرے کتاب سے ایسی ہی حدیث نکال کر بیجا طول کلام پر آمادہ ہوجائیں۔ مولانا میں نے تو اپنی بات کا ثبوت دے دیا اب وہ محض الزام نہیں رہی۔

اب آپ اپنے چھوٹے الزامات کا ثبوت پیش کریں۔ میرے دلائل میں سے دوسری دلیل پر بحث کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

> ''اس کے علاوہ وہ مجہول العدالت ہے اس کی ثقات کتب اسماء الرجال میں پائی نہیں گئی۔'' (تنظیم اہلحدیث مجریہ ۷ صفر کالم ۲)

میں حیران ہوں کہ مولانا جیسا متبحر عالم ایسی بات کیسے تحریر کر گیا جہاں تک میرا خیال ہے میں تو یقیناً مولانا کو ایسا تصور نہیں کرتا کہ وہ علم اسماء الرجال سے ایسے ناواقف ہوں گے پس اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو مولانا کو جانتے ہوئے بھی ایسی عبارت لکھ دینا قطعاً مناسب نہیں لیکن اگر خوانخواستہ وہ اس علم سے پوری طرح واقف نہیں ہیں تو اس صورت میں انہیں اس پر قلم اٹھانے کا بھی یقیناً حق نہیں تھا۔

اولاً تو گذارش یہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے تقریب التہذیب میں ابو غالب کے

متعلق لکھا ہے کہ:

"صدوق یخطئی"

اور حافظ صاحب نے تقریب کے ابتدا میں رواۃ کے مراتب ذکر کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے کہ:

((الخامسة من وصرعن درجة الرابعة قليلا واليه الاشارة لصدوق سئی الحفظ او صدوق يهم اوله اوهام اويخطئی......! الخ)) (تقریب التهذیب، ص: ۳)

اس عبارت سے ہر اہل علم جان سکتا ہے کہ یہ روای (ابو غالب) ثقہ ہے نہ کہ مجہول العدالت اسی لیے حافظ صاحب نے اس کو صدوق لکھا ہے اگر مجہول العدالت ہوتا تو اس کو حافظ صاحب صدوق قطعاً نہ لکھتے بلکہ مستور او مجہول الحال وغیرہما کے الفاظ سے یاد فرماتے جیسا کہ ابتدا میں تحریر فرماتے ہیں۔

((السابعه من روی عنه اكثر من واحد ولم يوثق و اليه الاشارة بلفظ مستور او مجهول الحال.)) (تقریب التهذیب، ص: ۳)

لیکن حافظ صاحب نے ان کو صدوق لکھا ہے لہٰذا وہ ثقہ ہیں۔

ثانیاً: ذیل میں تہذیب التہذیب سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے اس کو ملاحظہ فرما کر پھر اندازہ کریں کہ مولانا کا یہ ارشاد کہ وہ مجہول العدالت ہے اس کی ثقاہت کتب اسماء الرجال میں پائی نہیں گئی کہاں تک درست ہے۔

حافظ صاحب تہذیب التہذیب ج ۱۲ میں ابو غالب کے نام کے متعلق اختلاف ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

((قال اسحاق بن منصور عن ابن معين صالح الحديث وقال ابو حاتم ليس بالقوی وقال النسائی ضعيف وقال الدارقطنی ثقه وقال ابن عدی قد روی عن ابی غالب حديث الخوارج

بطوله وهو معروف به ولم ارىٰ احاديثه حديثا منكر او ارجو انه لاباس به وحسنه الترمذى بعض احاديثه وصح بعضها قلت وقال ابن حبان لايجوز الاحتجاج به الافيما وافق الثقات وقال ابن سعد كان ضعيفاً وقال البرقانى عن الدارقطنى ابو غالب حزور بصرى يعتبر به ووثقه موسىٰ بن هارون كما مضىٰ فى الذى قبله انتهىٰ .)) (تهذيب ج ۱۲، ص: ۲۱٦)

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوا کہ اس راوی ''ابو غالب'' کو امام یحییٰ بن معین، دارقطنی، ابن عدی، موسیٰ بن ہارون اور ترمذی نے ثقہ قرار دیا ہے۔

اور ابو حاتم ، نسائی ، ابن حبان اور ابن سعد نے غیر قوی اور ضعیف قرار دیا ہے لیکن نسائی، ابو حاتم اور ابن سعد کی تضعیف اس لیے قابل قبول نہیں کہ ان کی جرح غیر مفسر ہے اور اصول حدیث میں یہ بات مقرر ہو چکی ہے کہ جرح مبہم غیر مفسر اس راوی کے متعلق مقبول نہیں ہو گی جس کی عدالت وثقات دوسرے ماہر فن سے ثابت ہو چکی ہو اور یہی معاملہ اس جگہ پر ہے کیونکہ ابو غالب کی ثقاہت اس فن کے امام یحییٰ بن معین سے منقول ہے اس کے علاوہ امام دارقطنی اور ابن عدی وغیرہما سے بھی عدالت ثابت ہو چکی ہے۔

لہٰذا ان کے مقابلہ میں ابو حاتم یا نسائی کی تضعیف تب ہی قابل قبول ہوتی جب وہ مفسر ہوتی۔ باقی رہی ابن حبان کی تضعیف تو اول تو وہ بھی غیر مفسر ہے، لہٰذا قابل قبول نہیں۔ ثانیاً اس نے لکھا ہے کہ ''لايجوز الاحتجاج به الافيما وافق الثقات'' کا مفاد یہی نکلتا ہے جو حافظ صاحب نے تقریب میں لکھا ہے کہ ''صدوق يخطئى'' اور حافظ صاحب نے تقریب کے ابتدا میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ:

((انى احكم على كل شخص منهم بحكم يشمل اصح ما قيل فيه واعدل ماوصف به بالخص عبارة واخلص اشارة .))

علاوہ ازیں ابن حبان کا تساہل توثیق میں اور تشدد تجریح میں مشہور و معروف ہے، اگر کسی کو اعتبار نہ آئے تو لسان المیزان، میزان الاعتدال، تہذیب التہذیب اور فتح الباری کے مختلف مقامات کو ملاحظہ کر لے تو میری بات اس کو صحیح نظر آئے گی، لہٰذا ان کی تجریح ان نقاد جیاد و جہابذ فن خصوصا امام ابن معین اور دارقطنی جیسے ماہرین کے مقابلہ میں اگر مفسر بھی ہو تب بھی قبول نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ جہاں مبہم ہو۔ اس جگہ پر ہم دو تین امثلہ نقل کرتے ہیں جس سے اہل انصاف کو میری بات صحیح نظر آئے گی۔

❶:...... حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں سوید بن عمرو الکلبی (جو کہ صحیح مسلم کے رجال میں سے ہے) کے ترجمہ کے تحت امام ابن معین وغیرہ سے اس کی توثیق نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

((اما ابن حبان فاسرف واجترأ فقال كان يقلب الاسانيد ويضع على الاسانيد الصحاح المتون الواهية .))

(میزان الاعتدال جلد۲، صفحہ : ۲۵۳)

اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ تقریب میں اس کے ترجمے میں فرماتے ہیں کہ:

((افحش ابن حبان القول فيه ولم يات بدليل .))

❷:...... حافظ ذہبی اپنے میزان میں عثمان بن عبدالرحمٰن الطرائفی کے ترجمہ میں رقمطراز ہیں:

((واما ابن حبان فانه يتقعقع كعادته فقال فيه يروى عن الضعفاء اشياء ويدلسها عن الثقات فلما كثر ذالك فى اخباره فلا يجوز عندى الاحتجاج بروايته بكل حال .))

❸:...... حافظ ذہبی اپنے میزان میں محمد بن الفضل السدوسی عارم امام بخاری کے شیخ کے ترجمہ میں دارقطنی سے اس کی توثیق نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

((قلت فهذا قول حافظ العصر الذى لم يات بعد النسائى

مثلہ، فاین هذا القول من قول ابن حبان الحساف المتهور فی عارم فقال اختلط فی آخر عمره و تغير حتى كان لايدرى مايحدث به فوقع فی حدیثه المناكير الكثيرة فيهنب التنكب عن حديثه فيما رواه المتأخرون فاذا لم يعلم هذا من هذا ترك الكل ولا يحتج بشئى منها (قلت) ولم يقدر ابن حبان ان يسوق له حديثا منكراً فاين ما زعم؟))

(میزان الاعتدال جلد ٤، صفحه ٨، ط: مکتبه الاثریه)

ان عبارات سے آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ ابن حبان صحیحین کے رواۃ پر بھی بسا اوقات ایسی جرح کر جاتے ہیں جو قطعاً صحیح نہیں اسی وجہ سے نقادفن نے ان کی جرح پر رد کی اور اس کی تضعیف کو دوسرے جہابذ فن کی توثیق کے مقابلہ میں کوئی وزن نہیں دیا۔

یہ تو میں نے تین مثالیں ذکر کی ہیں اگر اور بھی مثالیں دیکھنی ہوں تو فن رجال کی کتب کو مطالعہ فرمائیں بہت سی مثالیں اور بھی مل جائیں گی۔

لہٰذا چونکہ زیر بحث راوی (ابو غالب) کو دارقطنی ابن معین وغیرہما جیسے نقاد جیاد نے ثقہ قرار دیا ہے، لہٰذا ابن حبان جو کہ مسرف ہے اس کی جرح مقبول نہیں ہوگی کیونکہ یہ اصول حدیث کے معیاری کتب میں طے ہو چکا ہے کہ جس راوی کی توثیق ائمہ فن کے لیے ثابت ہو چکی ہو اس پر اس جارح کی جرح مقبول نہیں ہوگی جو رجال کی جرح میں متعنت ہو جیسا کہ ابن حبان خصوصا کوئی دلیل بھی اپنی جرح میں پیش نہ کی ہو، جیسا کہ اس مسئلہ میں ہے اب آپ انصاف سے کہیں کہ مولانا حصاروی کا یہ تحریر فرمانا کہ اس کی ثقاہت کتب اسماء رجال میں نہیں پائی جاتی کہاں تک صحیح ہے؟ کیا مولانا کی نظروں سے یہ اسماء الرجال کی کتب گذری؟

((فان كنت لا تدرى فتلك مصيبة . ان كنت تدرى فالمصيبة اعظم .))

آگے پھر مولانا لکھتے ہیں:

"کیونکہ جس کے نام کا کوئی مستقل پتہ نہیں تو اس کے حالات سے کیا آگاہی ہو سکتی ہے۔"

یہ مولانا کی عجیب منطق ہے کہ جس راوی کے نام میں اختلاف ہو اس کے حالات بھی معلوم نہیں ہو سکتے۔ کیا مولانا اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ صحیحین میں بھی ایسے رواۃ پائے جاتے ہیں جن کے ناموں میں کثیر اختلاف ہے لیکن وہ اپنی کنیتوں سے مشہور ہیں تو کیا اس وجہ سے مولانا صحیحین کے رواۃ کے متعلق بھی یہی ارشاد فرمائیں گے کہ چونکہ ان کے نام کا بھی پتہ نہیں لہٰذا ان کے حالات کیسے معلوم ہو سکتے ہیں اور نتیجہ یہ کہ یہ رواۃ مجہول العدالت ٹھہرے علی زعم مولانا الحصاروی کیا مجھے ان رواۃ کے ذکر کرنے کی بھی ضرورت ہے؟

درحقیقت بہت رواۃ کسی نہ کسی وجہ سے اپنی کنیت سے مشہور ہو جاتے ہیں بعد میں رفتہ رفتہ ان کا اصل نام لوگوں کے ذہنوں سے بالکل نکل جاتا ہے اس وجہ سے ان کے ناموں میں اختلاف پڑ جاتا ہے دیکھیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سب کے سب عدول ہیں لیکن بعض صحابہ اپنی کنیتوں سے مشہور ہو گئے تھے بعد میں ان کے ناموں میں شدید اختلاف ہو گیا۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ تہذیب التہذیب میں سیدنا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ترجمہ کی ابتدا میں تحریر فرماتے ہیں:

((واختلف فی اسمه واسم ابیه اختلافا کثیراً۔))

(تهذيب التهذيب: ج ١٢)

کم از کم میری نظر سے تو متقدمین خواہ متاخرین میں سے کسی کا بھی ایسا قول نہیں گزرا کہ جس راوی کے نام میں اختلاف ہو وہ مجہول العدالت بن جاتا ہے۔ یہ مولانا کی ہی طبع زاد ایجاد ہے۔ واللہ الموفق

باقی مولانا نے جو یہ لکھا ہے کہ:

"اب اگر دو رکعت بیٹھ کر پڑھی جائیں "وتر نماز کے آخر میں نہیں ہو سکتے۔"

(تنظیم اہلحدیث مجریہ ۱۴ صفر ۱۳۸۹ھ، صفحہ ۸ کالم ۱)

تو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ یہ دو رکعتیں وتر کے ساتھ نہیں، اس لیے یہ ساری رکعات وتر ہو گئیں ملاحظہ فرمائیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث جو مسلم کی جلد اول میں مذکور ہے یہ طویل حدیث ہے جو سعد بن ہشام سے مروی ہے جس میں ہے کہ:

((قال قلت یا ام المؤمنین انبئنی عن وتر رسول الله ﷺ فقالت کنا نعدله سواکه وطهوره فیبعثه الله ما یشاء ان یبعثه من اللیل فیتسوك یتوضا ویصلی تسع رکعات لا یجلس فیها الافی الثامنه: فیذکر الله ویحمده ویدعوه ثم ینهض ولا یسلم ثم یقول فیصلی التاسعه ثم یقعد فیذکر الله ویحمده ویدعوه ثم یسلم تسلیما یسمعنا ثم یصلی رکعتین بعد مایسلم وهو قاعد فتلك احدی عشرة رکعة یا بنی فلما اسنّ نبی الله ﷺ واخذه اللحم اوتر بسبع وصنع فی الرکعتین مثل ضیعه الاول ا فتلك تسع رکعات.)) [1]

اس صحیح حدیث سے واضح ہو گیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان دو رکعتوں کو وتر کے ساتھ ہی معلق سمجھا اور قرار دیا اس لیے تو فرمایا کہ ((فتلك احدی عشرة رکعت)) اور ((فتلك تسع)) اور یہ بالکل واضح ہے اب ہم حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے فہم پر اعتبار کریں یا مولانا حصاروی کے فہم پر؟ یہ اہل انصاف خود فیصلہ کریں۔

پھر مولانا حصاروی صاحب قسط ۹ تنظیم اہلحدیث مجریہ ۶ ربیع الاول صفحہ ۶ کالم اول میں لکھتے ہیں۔

"(حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت) ابوداوٗد طیالسی جلد اول ص ۱۹ میں حدیث ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔"

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الصلوٰة، باب جامع صلوٰة اللیل ومن ناح عنه او مرض، رقم الحدیث: ۱۷٤۹.

((كان يوتر عند الاذان ويصلي ركعتين عند الاقامة .))❶

''پھر ترجمہ لکھا ہے اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں ((كان يوتر))

دوام پر دلالت کرتا ہے جس سے پیر جھنڈا صاحب کو کوئی سبیل انکار نہیں ہے۔''

میں حیران ہوں کہ مولانا جیسے علماء جن کو محقق شہیر جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے آخر ایسے واہی دلائل پیش کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہیں۔ پھر مولانا کو غالباً یہ یاد نہیں رہا کہ وہ پہلے تحریر فرما چکے ہیں کہ میں نے کوئی ایسی مثال پیش نہیں کی جس میں مولانا نے مدلسین کی روایات سے استدلال کیا ہو۔ حالانکہ اس پیش کردہ روایت میں ابواسحٰق سبیعی ہیں جو مدلسین میں سے ہیں اور ان کی تدلیس مرتبہ ثالثہ میں سے ہے اور روایت بھی عن سے کرتے ہیں گویا جس مضمون میں مجھ پر اعتراض کیا اور میرے لکھنے کو محض الزام قرار دیا:

''فسبحان من لا يضل ولا ينسى .''

اور پھر اس کی سند میں ابواسحاق کا شیخ حارث اعور ہے جو ضعیف بلکہ کذاب ہے اگرچہ طبع میں حارث کی جگہ پر ابوالحارث چھا گیا ہے جو غلط ہے ابواسحاق کی روایت حارث اعور سے ہی مشہور ہے ورنہ مولانا بتادیں کہ یہ ابوالحارث کون ہے؟ بہر حال نتیجہ صاف ہے اگر یہ حارث ہے تو یہ ضعیف ہے۔ لہٰذا سند ضعیف ہوگئی اور اگر ابوالحارث ہے جیسا کہ مطبوع میں موجود ہے تو پھر یہ کوئی مجہول راوی ہیں پھر بھی یہ روایت ضعیف اور نا قابل استدلال بن جاتی ہے، لہٰذا اس روایت کو لے کر معرض استدلال میں آنا مولانا کی فقاہت اور ان کی محققیت کا ہی حصہ ہے۔

ادھر خود تو اسی ضعاف احادیث پیش فرما دیتے ہیں اور وہ بھی بے دھڑک لیکن ہم اگر کوئی حدیث صحیح یا حسن بھی پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں جو ان کے مسلک کے خلاف ہو تو فوراً اس کی تضعیف پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

---

❶ مسند ابوداؤد طیالسی جلد۱ ، صفحہ ۷۸، رقم الحدیث: ۱۲۸ ، ط: بیروت .

پھر اس کے متن سے دوام کی دلیل لینا اور بھی عجیب بات ہے گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ہمیشہ ہی وتر فجر کی اذان کے وقت پڑھا کرتے تھے جو قطعاً غلط ہے اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ وتر ہمیشہ دن میں پڑھتے تھے رات کو نہیں پڑھتے تھے کیونکہ فجر کے بعد شرعی رات نہیں ہے ہاں اگر مطلب یہ ہو کہ آپ جب کبھی رات کو کسی وجہ سے وتر پڑھ نہیں لیتے تھے اور صبح ہو جاتی تھی تو اذان کے وقت بھی پڑھ لیتے تھے تو صحیح ہے جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے پتہ چلتا ہے لیکن اس صورت میں مولانا کا یہ الزام جو انہوں نے ہمیں کان کی وجہ سے دیا ہے ھباءً منثوراً بن جائے گا، غور فرمائیں!

پھر آگے اسی پرچہ تنظیم اہلحدیث میں کالم ۲ میں رقمطراز ہیں:

"ابوداؤد الطیالسی کے اسی صفحہ میں ہے:

((عن ابی سعید قال قال رسول اللہ ﷺ اوتروا واقبل

الفجر...........)) ❶

یہ حدیث قولی ہے جس میں صبح سے پہلے وتر پڑھنے کا ارشاد ہے جس میں وتروں کے بعد دگانہ پڑھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

اس کے متعلق اولاً تو یہ گذارش ہے کہ یہ حدیث ابوسعید کی ابوداؤد طیالسی میں اسی صفحہ میں تو نہیں ہے اور نہ ہی اس صفحہ کے پہلے صفحہ میں اور نہ اس سے بعد کے صفحہ میں موجود ہے اور مولانا نے یہ خیال نہیں فرمایا کہ اس صفحہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مسانید ذکر ہو رہی ہیں۔ لہٰذا وہاں حضرت ابوسعید کی روایت کا آخر کون سا موقع تھا غالباً یہ عجلت میں لکھ گئے ہیں اور چونکہ اپنے تحریر کئے ہوئے سطور کو حرف آخر ہی سمجھتے ہیں لہٰذا اس پر نظر ثانی کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

ثانیاً: اس حدیث میں وہ بات تو ہے ہی نہیں جو مولانا نے اس میں حاشیہ کے طور پر لگا دی ہے۔ اس میں تو محض آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ فجر سے پہلے وتر پڑھ لیا

❶ مسند ابوداؤد طیالسی جلد۲، صفحہ ۵۵۸، رقم الحدیث:۲۲۷۷، ط: بیروت.

کرو آپ نے "قبل الفجر" کے الفاظ فرمائے ہیں" قبیل الفجر" نہیں فرمایا پھر اس سے یہ بات کہاں سے نکلتی ہے کہ اب وتروں کے بعد دوگانہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ کیا قبل الفجر اس بات کو مستلزم ہے کہ وتر بالکل ہی فجر سے تین یا چار منٹ ہی پہلے پڑھ لیا جائے آخر یہ مطلب دلالت ثلاثہ میں سے کس دلالت پر مبنی ہے؟

اس ارشاد گرامی کا واضح مطلب یہی ہے کہ وتر کو فجر سے پہلے پڑھ لیا جائے تاکہ وتروں کو نہ پڑھنا پڑے ہاں اگر نیند یا کسی اور وجہ سے صبح ہو جائے تو پھر بھی پڑھ لینا چاہئے لیکن اس صورت میں پھر وتر کے بعد دو رکعت نہ پڑھنا اس وجہ سے ہے کہ اب رات تو رہی ہی نہیں اور فجر کے بعد آنحضرت ﷺ دو رکعت (سنت الفجر) کے سوائے کچھ نہیں پڑھتے تھے اس لیے وہ دو رکعتیں نہیں پڑھی جائیں گی صرف وتر ہی پڑھا جائے گا کیونکہ اس کی اجازت دوسری احادیث سے آ چکی ہے لیکن اس سے یہ بات کہاں نکلتی ہے کہ وتر صبح سے بہت پہلے بھی اگر پڑھ لیا جائے تو اس صورت میں بھی اس کے بعد دوگانہ ادا نہ کرے اس قسم کا استدلال مولانا کی فہم مبارک کا ایجاد ہے۔

آگے پھر اسی کالم میں لکھتے ہیں:

((عن زید بن اسلم قال قال رسول اللہ ﷺ من نام عن وترہ فلیصل اذا اصبح .)) (رواہ الترمذی)

مولانا زید بن اسلم تو تبع تابعی ہیں ان کا یہ کہنا کہ قال رسول اللہ ﷺ کیسے درست ہو سکتا ہے یہ تو تابعی بھی نہیں کہ یہ حدیث مرسل ہوتی (گو وہ بھی محققین کے نزدیک ضعیف ہے) لیکن یہ تو منقطع ہے ایسے منقطعات کو معرض استدلال میں لانا آپ کو مبارک ہو تاہم اس سے بھی ان کا مزعومہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ یعنی ایک آدمی رات کو نیند کی وجہ سے وتر پڑھ نہیں سکا اس لیے صبح کو پڑھ لے آخر اس سے یہ نتیجہ کیسے نکلتا ہے کہ اگر وہ رات کو پڑھے تو اس کے بعد دوگانہ ادا نہ کرے۔ کیا مولانا وتر کو ہمیشہ صبح کے بعد ادا کرنے کے قائل ہیں؟ اگر نہیں تو پھر ان جیسے دلائل کو پیش کرنے کی زحمت آخر کیوں اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح مولانا نے

جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مسند احمد کی روایت نقل فرمائی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

((فانتهیٰ وتره الی السحر .))

اس سے بھی ان کی مزعومہ دعویٰ کا ثبوت نہیں ملتا اس کا واضح اور صاف مطلب یہ ہے کہ گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے اول حصہ اور اوسط حصہ میں بھی وتر پڑھا ہے لیکن آخر الامر آپ کا وتر رات کے آخری حصہ میں منتہیٰ ہو گیا کیونکہ سحر کے معنی آخر اللیل ہے نہ کہ فجر کے بعد والا وقت پھر اس سے یہ نتیجہ کیسے نکلا کہ سحر کے وقت وتر کے بعد آپ دوگانہ نہیں پڑھتے تھے؟ یہ دو رکعتیں وتر کے ساتھ ہی کہیں اسی وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہ فرمایا تھا کہ:

((فتلك تسع وتلك احدی عشرة .))

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں مسلم شریف سے یہ روایت نقل کی جا چکی ہے تو اب مطلب یہ ہوا کہ اخیر عمر میں آپ وتر کو رات کے آخری حصہ میں ادا فرماتے تھے اور یہ دو رکعتیں بھی ان کے ساتھ ہوتی تھیں۔ لہٰذا ہم یہ سمجھنے سے قطعی قاصر ہیں کہ یہ حدیث ان کے مفروضہ پر کیسے دلیل بن سکتی ہے۔ پھر مولانا نے جو احادیث پیش کی ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند بار وتر کے بعد دوگانہ رکعت بیٹھ کر نہیں پڑھیں اس سے ان کی مواظبت اور مداومت پر حرف نہیں آتا کیونکہ نوافل و مندوبات میں مداومت عرفی ہوتی ہے جو اکثریت کے مترادف ہے ورنہ اگر کسی فعل سے چند بار کو مستثنیٰ کرنے سے مواظبت بالکل نہیں رہتی تو پھر مولانا سوائے فرائض کے دوسرے اکثر افعال میں مواظبت ثابت نہیں کر سکتے اور اس طرح سلف سے خلف تک جو کسی فعل میں مواظبت و مداومت کا ذکر کرتے آئے ہیں وہ سراسر بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

ایسا دعویٰ (ان دو رکعتوں کے متعلق) نہ تو ہم نے کیا ہے اور نہ ہی کر سکتے ہیں ہمارا دعویٰ تو اکثریت کے بارہ میں ہے اور اس کو ہم مواظبت یا ہمیشگی سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ ہر کام میں کتنی مداومت بھی کی جائے لیکن پھر بھی اس سے چند مستثنیات ہو ہی جاتے ہیں۔ اور مولانا نے اس (اکثریت) کی نفی پر کوئی دلیل ٹھوس و معقول ابھی تک پیش نہیں فرمائی باقی

مولانا نے جو آخری قسط میں تحریر فرمایا ہے کہ:

اور ان (دوگانہ) کو نبی ﷺ ہمیشہ پڑھتے تھے یہ آنحضور ﷺ پر جھوٹ باندھنا ہے جس کی سزا بڑی سخت ہے۔"

اس عبارت میں انہوں نے اشارۃً گویا مجھے اس کا متہم بنایا ہے کہ میں نے ذات اقدس حضرت سرور کائنات ﷺ پر جھوٹ باندھا ہے اس کے متعلق میں کیا عرض کروں دوسروں پر بیجا الزامات تھوپنا اور ان کی طرف ناکردہ گناہ منسوب کرنا یہ مولانا کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔

چنانچہ گذشتہ صفحات میں مولانا کی گل افشانیاں ذکر کر چکا ہوں، اللہ تعالیٰ تبارک وتعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ پر قطعاً جھوٹ نہیں باندھا محض ایک بات صحیح سمجھ میں آ گئی تھی (اور اب بھی اس کو صحیح سمجھ رہا ہوں) وہ عرض کر دی تھی اور اس کے باوجود بھی اگر وہ مجھے ایسے عظیم گناہ کا مرتکب سمجھ رہے ہوں گے تو اس کا فیصلہ ان شاء اللہ رب العالمین، مالک یوم الدین کی عدالت میں ہو گا پھر وہاں ان کو جواب دہ ہونا پڑے گا، میں اس سے مزید اس پر کچھ بھی لکھنا نہیں چاہتا۔

آگے مولانا فرماتے ہیں کہ:

"میں کہتا ہوں کہ پھر وتروں کے بعد یہ دو رکعتیں چھوڑ دی گئیں صرف وتر پر نماز کو ختم کیا گیا۔"

میں پوچھتا ہوں کہ ایسی حدیث کس کتاب میں ہے کہ پھر آپ نے ان دو رکعتوں کو چھوڑ دیا تھا؟ ایسی حدیث ابھی تک تو آپ نے پیش فرمائی ہی نہیں صرف ایسی احادیث پیش فرمائی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چند بار آپ نے ان کو نہیں پڑھا تھا لیکن یہ ترک بعد میں تھا یا ابتدا میں اور اس کے بعد پھر ہمیشہ دو رکعت پڑھتے رہتے تھے، اس کے متعلق ان احادیث میں کوئی تعرض نہیں یہ "پھر وتروں کے بعد الخ" مولانا کی ہی حاشیہ آرائی ہے وہ دوسروں کو تو ایسا الزام دینے سے بھی نہیں گھبراتے کہ وہ حضور اکرم ﷺ پر جھوٹ باندھتے ہیں لیکن خود ایسی حاشیہ آرائیاں اپنی طرف سے احادیث میں کر دیتے ہیں اور ان کو کوئی کہنے

والا نہیں۔لہٰذا ان پر یہ فرض ہے کہ اپنے اس اضافے کو صراحتاً حدیث سے ثابت کریں ورنہ وہ خود فیصلہ کریں کہ انہوں نے کس چیز کا ارتکاب کیا ہے۔

دراصل ان احادیث میں یہ بات ہے ہی نہیں کہ یہ ترک (دوگانہ کا) پہلے تھا اب صاف بات تو (محدثین کے تطبیق کے طریقہ پر) یہ ہے کہ دونوں احادیث کو اپنی جگہ پر رکھا جائے جن جن احادیث سے آپ کی ان دو رکعتوں پر مداومت معلوم ہوتی ہے اس کو اغلب احوال پر محمول کیا جائے اور ترک والی حدیثوں کو جواز کے لیے گاہے گاہے چھوڑنے پر محمول کیا جائے آخر اس میں کون سی خرابی ہے؟ آگے مولانا فرماتے ہیں:

''یہ سنت بالکل نہیں ہے اس کی تین وجوہات ہیں۔ یہ کہ یہ خاصہ نبوی ہے اور خاصہ نبوی امت کے لیے سنت نہیں۔''

مولانا صاحب خاصہ نبوی احتمالات سے ثابت نہیں ہوتا اس کے لیے ٹھوس دلیل چاہیے ورنہ بہت سی باتوں کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے اور پھر اس سے بہت سے کاہل اور سنت سے تغافل کرنے والوں کو ایک بہانہ ہاتھ آ جائے گا اور یہی کہیں گے کہ جناب یہ تو خاصہ نبوی ہے ہم کو اس پر عمل کرنا نہیں ہے۔ باقی آگے چل کر جو مولانا نے اس کی دلیل یہ دی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ:

((لست كاحد منكم .))

تو اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ یہ فرمان نبوی ﷺ تو ثواب کے متعلق تھا یعنی ثواب کے سلسلہ میں آپ جیسا نہیں ہوں بلکہ مجھے بیٹھ کر نماز پڑھنے میں بھی پورا ثواب ملتا ہے اور یہ بات مختلف فیہ ہے ہی نہیں بلکہ ہم بھی یہ مانتے ہیں کہ بیٹھ کر پڑھنے کا ثواب آدھا ہی ہے لیکن آدھے ثواب کو اختیار صرف اس لیے کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی سنت ہے لہٰذا یہ دلیل صحیح نہیں رہی۔ آگے پھر رقمطراز ہیں رہی یہ کہ یہ دو تین دفعہ کا فعل ہے پھر اس کے خلاف عمل ہوتا رہا ہے کیونکہ آنحضور ﷺ آخر میں وتر پڑھتے رہے ہیں جس کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھی۔''

اس وجہ پر بھی دلیل معقول تو کوئی پیش نہیں فرمائی آخر سے مراد اگر وہ حدیث ہے جس میں یہ الفاظ ہیں کہ:

((فانتهیٰ وتره الى الفجر .))

تو اس کے متعلق پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس سے ان دو رکعتوں کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ رات کے آخری حصہ میں ہو کر رہ گیا تھا یعنی آپ ﷺ رات کے ابتدائی حصہ میں بھی وتر پڑھتے رہے اور وسطیٰ حصہ میں بھی لیکن آخیر عمر میں آپ کا وتر رات کے اخیر حصہ میں ہوتا تھا، اب کوئی اہل علم انصاف سے بتائے کہ اس سے آخر ان دو رکعتوں کی نفی کیسے ہوتی ہے؟ اور اگر اس وجہ سے مولانا کی مراد یہ ہے کہ جن حدیثوں سے ترک معلوم ہوتا ہے وہ آخری فعل ہے تو اس کے لیے دلیل کا مطالبہ ہے کہ یہ حدیثیں بعد کی ہیں۔

حالانکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث جو مسلم شریف میں وارد ہے جس میں انہوں نے آپ کی آخر عمر میں رات کی نماز کا جو ذکر کیا ہے (حدیث کے الفاظ بالکل واضح ہیں کہ یہ اخیر عمر کا فعل ہے) اس میں ان دو رکعتوں کا بھی ذکر ہے اور ان سب کو ملا کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس کو نو شمار کیا ہے "فتلك تسع" اب آپ ہی فرمائیں کہ آپ کے احتمال کو صحیح سمجھیں یا سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کو اور دوسرے کسی مرد صحابی کی بات زیادہ وزنی نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ نماز (اکثر آپ گھر پر ہی پڑھتے تھے۔ لہٰذا یہ وجہ بھی معقول نہیں ہے آگے بیان کرتے ہیں۔

٣:...... تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ نفل تہجد کے وقت پڑھے گئے ہیں، عشاء کے وقت پڑھنے کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے صرف ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت میں ذکر ہے تو وہ مسافر کے بیان میں ہے الخ مولانا آپ جیسے محقق شہیر سے وثوق کل ذی علم علیم والا ربانی ارشاد مبارک قطعاً اوجھل نہیں ہونا چاہئے تھا اگر جناب کو ایسی حدیث نہیں ملی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ فی الواقع ایسی حدیث ہی موجود نہیں ہے بلکہ ایسی صریح حدیث بھی ہے جو مزید تحقیق میں آرہی ہے لہٰذا یہ تیسری وجہ بھی "لا يسمن ولا يغنى من جوع" ہے۔

پھر آگے چل کر مولانا اس طرح گوہرافشانی کرتے ہیں:

''پانچواں امر تنقیح طلب یہ تھا کہ ان نفلوں کو اگر کوئی تہجد کے وقت وتروں کے بعد پڑھے تو اس طرح پڑھنے چاہئیں کہ بیٹھ کر شروع کرے جب قرأۃ پوری ہو جائے تو کھڑا ہو جائے پھر رکوع کرے اور سجدہ کر کے رکعت پوری کرے اسی طرح دوسری رکعت پڑھے اس طرح پڑھنے کا پورا ثواب ملے گا۔''

مولانا عجیب بات فرماتے ہیں پہلے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وتر کے بعد دوسری نماز بالکل نہ پڑھی جائے کیونکہ یہ فرمان نبوی:

((اجعلوا اٰخر صلوٰتکم باللیل وتراً.)) اوکما قال

کے خلاف ہے اور وتر کے بعد دو رکعت جو آپ نے پڑھی ہیں وہ آپ کا خاصہ تھا اور خاصہ امت کے لیے سنت نہیں ہے۔اور پھر اس جگہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی تہجد کے وقت پڑھے تو اس طریقہ پڑھے تو پورا ثواب ملے گا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تہجد کے وقت وتروں کے بعد وہ بھی دو رکعت پڑھنے کے جواز کے قائل ہیں لیکن ان کے تحریر کردہ طریقہ پر لہٰذا بجا طور پر یہ ان سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ امت کے لیے سنت سے ہی نہیں تہجد پڑھی ہی کیوں جائیں اور پھر ان کا ثواب کیسے پورا ملے گا۔کیا سنت کی مخالفت میں بھی ثواب ملتا ہے؟ بہرحال اس تناقض کو وہ خود ہی رفع کر سکتے ہیں ہم جیسے ہیچ مدان تو اس کے رفع کرنے سے قاصر ہیں۔

بہرصورت اگر وہ تہجد کے وقت وتر کے بعد دو رکعتوں کے پڑھنے کو جائز اور کار ثواب سمجھتے ہیں تو باقی رہا عشاء کے بعد وتروں کے بعد کے پیچھے دو رکعتوں کا اثبات سو ہمارے ذمہ ہے ہم ان کو حضرت رسول اللہ ﷺ کی حدیث دکھا دیتے ہیں پھر دیکھیں گے کہ وہ حق کو تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔

باقی ان دو رکعتوں کے پڑھنے کی کیفیت کو جو مولانا نے بس ایک ہی طریقہ میں بند کر دیا ہے وہ صحیح نہیں کیونکہ یہ کیفیت (یعنی مولانا کی بیان کردہ کیفیت) ان دو رکعتوں کی اس

صورت میں ہے کہ یہ دو رکعتیں آپ ﷺ بھی کر کے پڑھتے تھے جیسا کہ خود حدیث کا سیاق اس پر شاہد عدل ہے ورنہ ساری نماز دونوں رکعتیں پوری کی پوری بیٹھ کر پڑھنا اسی حدیث سے معلوم ہوتا ہے جس میں یہ بیان ہے کہ ان دو رکعتوں کو خفیف کرتے تھے اور ان میں سورت ﴿اذا زلزلت﴾ اور ﴿قل یا ایھا الکفرون﴾ پڑھا کرتے تھے اور ہر ذوانصاف اس کو تسلیم کرے گا اور وہ حدیث حسن یا صحیح لغیرہ ہے، اسی طرح جو آگے ہم عشاء کے بعد وتر کے پیچھے دو رکعتوں کو بیٹھ کر ادا کرنے والی حدیث پیش کریں گے تو اس سے بھی اہل علم وانصاف یہی سمجھیں گے کہ یہ دونوں رکعتیں پوری کی پوری آپ نے بیٹھ کر ادا کیں۔

آخر میں مولانا نے جو حدیث حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے نقل فرمائی ہے اس کے متعلق اولاً تو یہ گذارش ہے کہ مولانا دوسروں کے دلائل پر فوراً بیجا اعتراضات کر دیتے ہیں اور ان حدیثوں کی سندوں پر زبردستی جہالت اور ضعف کا حکم صادر فرما دیتے ہیں لیکن خود جو بھی دلیل پیش کرتے ہیں اس کے متعلق اتنی کاوش بھی نہیں کرتے کہ یہ تو معلوم کریں کہ اس کے رواۃ کا کیا حال ہے۔

اس حدیث کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن ابی الموالی ہے جس کے متعلق حافظ صاحب تقریب میں فرماتے ہیں صدوق ربما اخطا۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ مولانا نے میری پیش کردہ حدیث کی سند کے راوی ابو غالب کو ضعیف قرار دیا حالانکہ ضعف کی وجہ کچھ بھی بیان نہ کی اگر ضعف کی وجہ یہ تھی کہ ابو غالب کے ترجمہ میں یخطئی کا لفظ ہے، تو اس راوی عبدالرحمٰن کے ترجمہ میں ربما اخطأ کے الفاظ ہیں جو یخطئی سے زیادہ وزنی ہیں کما لا یخفی اگر عبدالرحمٰن کے متعلق حافظ صاحب یہ فرماتے ہیں کہ صدوق (جو حسن الحدیث ہونے پر دال ہے) تو ابو غالب کے متعلق بھی حافظ صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ صدوق۔ پھر یہ کتنی بے انصافی ہے کہ اپنی پیش کردہ روایات کے رواۃ سے اعراض کرتے ہیں اور اگر دوسرا کوئی ان کے خیال اور رائے کے برخلاف دلیل پیش کرے تو فوراً اس کی تضعیف کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ فی الحقیقت وہ قطعاً ضعیف نہیں ہوتی۔

ثانیاً: اس حدیث میں ان دو رکعتوں کا ذکر نہیں تو کیا عدم ذکر سے عدم وجود لازم آتا ہے بسا اوقات رواۃ اختصار سے کام لیتے ہیں۔

ثالثاً: یہ احتمال ہے کہ یہ ترک پہلے زمانے کا ہو جیسا کہ اس کی دلیل گذشتہ سطور میں پیش کر چکا ہوں۔

رابعاً: یہ ترک وجہ جواز کے لیے بھی کر دیا لیکن اس لیے ان دو رکعتوں کی نسبت کیوں باطل پیش کر رہے ہیں اس طرح آپ کا دعویٰ بھی ھباءً منثورا ہو جاتا ہے۔

امام احمد کے مسند: ج ٦، ص ٢٣٦ پر یہ حدیث ملتی ہے:

((حدثنا عبدالله حدثني ابی ثنا يزيد قال ثنا بهزبن حكيم وقال مرة انا قال سمعت زرارة بن اوفی يقول سألت عائشه عن صلوٰة رسول الله ﷺ فقالت كان يصلی العشاء ثم يصلی بعد ها ركعتين ثم ينام فاذا استيقظ وعنده وضوء ه مغطی وسواكه استاك ثم تو ضأفقام فصلی ثمان ركعات يقرا فيهن بفاتحة الكتاب و ماشاء من القرآن وقال مرة ماشاء الله من القرآن فلا يقعد فی شئی منهن الا فی الثامنة فانه يقعد فيها فيتشهد ثم يقوم ولا يسلم فيصلی ركعة واحدة ثم يجلس فيتشهد ويدعو ثم يسلم تسليمة واحدة السلام عليكم يرفع بها صوته حتی يوقظنا ثم يكبر وهو جالس فيقرأ ثم يركع ويسجد وهو جالس فيصلی جالساً ركعتين فهذه احدی عشرة ركعة فلما كثر لحمه وثقل جعل التسع سبعا لا يقعد الا كما يعقد فی الاولی ويصلی ركعتين قاعدا فكانت هذه صلوة رسول الله ﷺ حتی قبضه الله))

رجال السند:...... امام احمد کا شیخ یزید وہ ابن ہارون الواسطی ہے۔ حافظ صاحب

تقریب میں فرماتے ہیں کہ ثقہ متقن عابد اور یزید کا استاد بہز بن حکیم ہے اور وہ صدوق ہے کما فی التقریب اور بھز نے زرارۃ بن اوفی سے سنا ہے وہ ثقہ ہے کما فی التقریب سند میں کوئی انقطاع وغیرہ کی علت نہیں ہے۔

متن الحدیث:...... اس حدیث میں جناب حضرت رسول اللہ ﷺ کی رات کی نماز تہجد بیان ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آنحضرت ﷺ کو ۹ رکعتیں وتر تہجد قیام اللیل سب ایک ہی چیز کے مختلف اعتبارات کی وجہ سے مختلف نام ہیں۔ پڑھا کرتے تھے اور ان نو رکعات کے بعد آپ بیٹھ کر دوگانہ ادا فرماتے تھے جن میں رکوع اور سجدہ بھی بیٹھ کر کیا کرتے تھے۔ بعد میں پھر سات رکعات وتر اور ان کے بعد دو رکعت بیٹھ کر ادا فرماتے۔

تو اس سے بھی معلوم ہوا کہ آپ وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر ادا فرماتے تھے۔ اس حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ آپ ایک سلام کہتے تھے اس سے حدیث کے متن کی نکارت پر استدلال نہ کیا جائے کیونکہ یہ تسمیہ واحدۃ صرف آواز کی اونچائی کے اعتبار سے ہے یعنی ایک سلام آپ آواز سے کہتے تھے تاکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وتر کے لیے اُٹھ جائیں باقی دوسرے سلام کا ذکر نہیں ہے تو ہوسکتا ہے کہ وہ آپ نے آہستہ کہا ہو اس کا انکار حدیث میں قطعاً نہیں ہے۔ فافہم!

دوسری حدیث بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے جو مسند احمد کے جزء سادس، ص ۱۵۶ میں واقع ہے۔

((حدثنا عبداللہ حدثنی ابی ثنا ابو النضر ثنا محمد یعنی ابن راشد عن یزید بن یعفر عن الحسن عن سعد بن ھشام عن عائشہ رضی اللہ عنہا ان رسول اللہ ﷺ کا اذا صلی العشاء دخل المنزل ثم صلی رکعتین ثم صلی بعدھما رکعتین اطول منھما ثم اوتر بثلاث لا یفعل فیھن ثم صلی رکعتین وھو جالس یرکع وھو جالس ویسجد وھو قاعد جالس.))

رجال السند:...... امام احمد کے بعد ان کا شیخ ابوالنضر ہے ان کا نام ہاشم بن القاسم ہے

جو کہ ابوالنضر کی کنیت ہے زیادہ مشہور ہیں ان کے متعلق تقریب میں لکھا ہے کہ ثقہ ثبت اس کے بعد محمد بن راشد جو شامی نہیں اور وہ صدوق ہیں قالہ فی التقریب) اور وہ یزید بن یعفر سے روایت کرتے ہیں اس کے متعلق حافظ صاحب تعجیل المنفعۃ برجال الاربعہ میں فرماتے ہیں کہ:

((قال الدارقطني يعتبر به.))

یعنی امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ یہ راوی معتبر ہے۔

((وذكره ابن حبان في الثقات.))

اور ابن حبان نے اس راوی کو اپنے "الثقات" میں ذکر کیا ہے، پھر آگے حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ:

((وقال الذهبي في الميزان ليس بحجة.))

اور حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں فرماتے ہیں کہ یہ راوی حجت نہیں ہے۔"

بندہ راقم الحروف کہتا ہے کہ حافظ ذہبی کا یہ فرمانا کہ "یہ راوی حجۃ نہیں ہے" اس راوی کو ثقاہت سے نہیں گراتا کیونکہ یہ جرح غیر مفسر ہے حافظ ذہبی صاحب نے اس جرح کا سبب بیان نہیں کیا حالانکہ اس کی توثیق امام دارقطنی جیسے محقق فن اور معتدل سے موجود ہے اور خود ذہبی صاحب نے میزان میں تصریح کی ہے کہ امام نسائی کے بعد دارقطنی جیسا امام فن اور کوئی نہیں گزرا اور پھر امام دارقطنی اس توثیق میں منفرد بھی نہیں کیونکہ ابن حبان نے بھی ان کی توثیق کی ہے اس لیے اس کو اپنے "الثقات" میں ذکر کیا ہے۔

اور یہ بات اصول حدیث میں طے ہو چکی ہے کہ تعدیل پر جرح صرف وہ مقدم ہوتی ہے جو مفسر ہو۔ لہٰذا امام دارقطنی جیسے ناقد جید کے مقابلہ میں حافظ ذہبی کی یہ جرح غیر مفسر غیر معتبر ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی مسلم نہیں کہ یہ الفاظ "لیس بحجة" جرح پر قطعی دلالت کر رہے ہیں کیونکہ حجت یہ ثقہ، ثبت وغیرہما کے الفاظ سے بہت اونچا ہے اس لیے حجۃ ہونے کی نفی سے ثقاہت کی نفی لازم نہیں آتی۔

اب حافظ ذہبی کا قول بھی ان دو اماموں کے قول کے متعارض نہیں رہا کیونکہ حافظ ذہبی

نے حجت ہونے کی نفی کی ہے نہ کہ مطلق ثقاہت کی لہٰذا یہ راوی ثقہ ہے گو حجۃ نہیں ہے اور ایسا محمل تلاش کرنا جس سے ائمہ حدیث کے اقوال کا آپس میں تعارض رفع ہو جائے حد امکان تک نہایت ضروری ہے۔ ہمارا مذکورہ بالا دعویٰ ہے ایک ہی راوی ثقہ بھی ہو سکتا ہے اور غیر حجت بھی پر ذیل میں ائمہ فن کے اقوال ملاحظہ فرمائیں:

(۱):...... میزان الاعتدال میں محمد بن اسحاق کے ترجمہ میں حافظ ذہبی امام یحییٰ بن معین سے نقل فرماتے ہیں کہ قال ابن معین 'ثقة وليس بحجة" یعنی محمد بن اسحاق ثقہ تو ہیں لیکن حجت نہیں۔ (الميزان: ج ۳، ص ٤٦٩ طبع جديد)

آگے چل کر پھر لکھتے ہیں:

((قال ابو زرعة سألت يحيىٰ بن معين عن ابن اسحاق هو حجة؟ قال هو صدوق الحجة عبيد الله بن عمر والاوزاعى و سعيد بن عبدالعزيز .)) (الميزان: ج ۳، ص ٤٧٢)

(۲):...... یعنی ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام یحییٰ بن معین سے پوچھا کہ کیا ابن اسحاق حجۃ ہیں تو امام ابن معین نے جواب میں فرمایا کہ ابن اسحاق صدوق ہیں حجۃ تو عبید اللہ بن عمر اوزاعی، اور سعید بن عبدالعزیز ہیں۔ اس عبارت نے مزید وضاحت کر دی کہ حجۃ کا لفظ ثقہ صدوق وغیرہما سے کافی ارفع واعلیٰ ہے۔ اس طرح سلیمان بن حیان ابو خالد الاحمر الکوفی کے ترجمۃ کے تحت لکھتے ہیں:

((روى عباس عن ابن معين، صدوق ليس بحجة))

(الميزان: ج ۲، ص ۲۰۰)

یعنی عباس الدوری ابن معین سے روایت کرتے ہیں کہ سلیمان صدوق ہیں اور حجۃ نہیں ہیں۔ اور ابن عدی نے بھی اسی بات کو بحال رکھا ہے جیسا کہ اپنے ''کامل'' میں فرماتے ہیں کہ

((هو كما قال يحيىٰ، صدوق ليس بحجة .))(الميزان: ج ،ص ۲۰۰)

یعنی سلیمان الاحمر جیسا کہ یحییٰ نے فرمایا صدوق ہیں اور حجۃ نہیں ہیں۔

③:...... معاذ بن ہشام بن ابی عبداللہ الدستوائی کے ترجمہ میں نقل فرماتے ہیں:

((صدوق ليس بحجة .)) (الميزان : ج ٤، ص ١٣٣)

یعنی معاذ بن ہشام صدوق ہیں اور حجۃ نہیں۔

ان امثلہ سے یہ اندازہ نہ کیا جائے کہ یہ خاص امام ابن معین کی اصطلاح ہے بلکہ اور ائمہ فن حدیث سے بھی ایسے بہت امثلہ موجود ہیں ایک مثال مزید ملاحظہ فرمائیے۔

④:...... موسیٰ بن عبیدۃ الربذی کے ترجمہ میں حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

((قال ابن سعد ثقه وليس بحجة .)) (الميزان : ج ٦، ص ٢١٣)

ابن سعد نے کہا ہے کہ موسیٰ ثقہ ہیں اور حجت نہیں ہیں۔"

ایسی اور بھی بہت امثلہ مزید رجال کی کتب میں ملتی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے ان کو ذکر نہیں کیا جاتا۔ ہماری پیش کردہ حقیقت کے ثبوت کے لیے یہ امثلہ بھی کافی اور شافی ہیں۔ بہرکیف جب عدم حجیت ثقاہت کے منافی نہیں ہے کیونکہ حجۃ کا لفظ ارفع واعلیٰ ہے لہٰذا ان کی نفی سے اس سے ادنیٰ درجہ کا انتفاء نہیں ہوگا۔ تو پھر زیر بحث راوی یزید بن یعفر کے متعلق حافظ ذہبی کا یہ فرمانا کہ:

((ليس بحجة .))

اس راوی کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا اور نہ اس کو ثقاہت وصداقت کے مرتبہ سے گراتا ہے کیونکہ اس کی توثیق اس شان کے امام دارقطنی سے ثابت ہو چکی ہے۔ اس راوی کے بعد الحسن آتے ہیں کہ یہ حسن بصری ہیں جس کے متعلق تقریب التہذیب میں حافظ صاحب ارقام فرماتے ہیں کہ ثقہ فقیہ فاضل مشہور اس کے بعد سعد بن ہشام ہیں وہ بھی ثقہ نہیں تقریب بالجملہ اس حدیث کی سند حسن لذاتہ کے درجہ سے متنزل نہیں ہے بلکہ اگر اس کو صحیح لغیرہ کہا جائے تو صواب سے بعید نہیں ہے۔

متن الحدیث:...... اس حدیث سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اگر اول رات میں عشاء کی نماز کے بعد بھی وتر پڑھتے تھے تو دو رکعت بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے اب

تو شارع علیہ السلام سے عشاء کے بعد وتر کے پیچھے دوگانہ بیٹھ کر پڑھنا ثابت ہو گیا اور اس سے قبل ایک عام دلیل (حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے پہلے مقالہ میں پیش کر چکا ہوں) اب ان ادلہ واضحہ کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی بدعت کا حکم لگاتا ہے تو جواب میں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ۔

بدم گفتی و شور سندم عفاک اللہ نکو گفتی

اس حدیث کے متن میں کوئی نکارت بھی نہیں ہے۔

①:......اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ نے عشاء کی نماز کے بعد چار رکعتیں پڑھیں یہ کوئی اچھنبے کی بات نہیں کیونکہ گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثری طور پر دو رکعت پڑھا کرتے تھے لیکن بعض اوقات چار رکعتیں بھی پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ عشاء کے بعد ان چار رکعات کا ثبوت صحیح بخاری میں بھی موجود ہے۔ یہ جو کہا کہ:

((ثم اوتر بثلاث لا یفصل فیهن .))

②:......یعنی پھر آپ تین رکعات وتر ادا فرماتے تھے جن میں فصل نہیں کرتے تھے (یعنی اکٹھے پڑھتے تھے اور دو پر سلام نہیں پھیرا کرتے تھے) یہ بات بھی غیر معروف نہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین رکعات وتر کی کیفیتوں میں سے احادیث صحیحہ میں یہ کیفیت بھی وارد ہوئی ہے یعنی تین رکعات، ایک سلام سے پڑھنا اور درمیان میں تشہد کے لیے بھی نہ بیٹھنا بلکہ تیسری رکعت میں بیٹھ کر تشہد وغیرہ پڑھ کر سلام پھرتے تھے۔

③:......آپ کا اول اللیل میں عشاء کی نماز کے بعد وتر پڑھنا بھی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ لہٰذا اس حدیث کے متن میں کوئی نکارت نہیں رہی۔

ایک اور حدیث حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ بھی ملاحظہ فرماتے چلیے!

((حدثنا عبداللہ حدثنی ابی ثنا ازهر بن القاسم ثنا هشام عن قتادة عن زرارة بن اوفیٰ عن سعد بن هشام عن ابیه عن عائشه رضی اللہ عنہا ان نبی صلی اللہ علیہ وسلم كان اذا اوتر صلی ركعتين وهو

جالس .)) (مسند احمد: ج٦،ص ٢٥٥)

رجال السند:...... امام احمد کا شیخ ازہر بن القاسم ہے اور وہ صدوق ہے (تقریب) وہ ہشام سے لینے والے ہیں اور یہ ابن ابی عبداللہ الدستوائی ہیں جن کے متعلق تقریب میں لکھا ہے کہ ثقہ ثبت وقدرمی بالقدر (وہ ثقہ ہیں ضابطہ ہیں اور ان پر قدریہ ہونے کا الزام ہے اس حدیث میں ان کے اس مذہب کی کوئی تقویت نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے روایت میں ضعف آجائے۔ کما لا یخفی .

ہشام کا استاد قتادہ ہے یہ ابن دعامہ السدوسی ہے ؟ ثقہ ثبت ہیں۔ (التقریب) لیکن وہ مدلس ہیں لیکن ان کی تدلیس کے خطرہ سے اس روایت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا کیونکہ اس جیسی اور روایات اور صحابہ سے بغیر اس علت کے موجود ہیں، لہٰذا متابعات وشواہد میں ایسی چیز معتبر ہو جاتی ہیں۔ (کما تقرر فی مقرہ) قتادہ کے بعد زرارہ آتا ہے اس کے متعلق پہلی حدیث کے رجال کے متعلق گذارش کرتے وقت عرض کیا جاچکا ہے اور وہ سعد بن ہشام سے روایت کرتے ہیں اس راوی کا حال بھی دوسری حدیث کی سند پر کلام کرتے وقت گزر چکا اور سعد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں وہ ہشام بن عامر ہیں اور صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس حدیث کی اسناد بھی صالح ہے گو پہلی حدیث سے کچھ نازل ہے کیونکہ اس حدیث کی سند میں زرارۃ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان دو واسطے ہیں اور اس میں کوئی جرح نہیں ہے۔

متن الحدیث:...... اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی وتر پڑھتے تھے اس کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے اور آپ سے وتر رات کے اول، اوسط اور آخر تینوں حصوں میں ثابت ہے لہٰذا اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ وتر کے بعد ہمیشہ آپ کا معمول تھا کہ دو رکعت بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔

((وھذا ھو المراد والمطلوب .))

اور یہ حدیث حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کی مؤید ہے جو پہلے مضمون میں تحریر کی جا

چکی ہے اور جس سے بھی یہ ثابت ہوتا تھا کہ آنحضرت ﷺ جب بھی وتر پڑھتے تھے تو دو رکعت وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھتے تھے اور ان دو رکعتوں میں سورۃ ﴿اذا زلزلت الارض﴾ اور ﴿قل یا ایھا الکفرون﴾ تلاوت فرماتے تھے۔

ان احادیث سے بحمد اللہ یہ اچھی طرح ثابت ہوگیا کہ وتر کے بعد (خواہ رات کے اول حصہ میں عشاء کی نماز کے بعد خواہ رات کے آخری حصہ میں تہجد کے بعد' دو رکعت بیٹھ کر پڑھنا بدعت نہیں ہے بلکہ مندوب ومسنون ہے کیونکہ سرور کائنات حضرت رسول اللہ ﷺ سے پڑھنا علی الدوام ثابت ہے۔ مضمون ہذا سے قبل یہ تحریر کر چکا ہوں کہ نووی نے بھی ان احادیث کو دیکھ کر وتر کے بعد دو رکعتیں پڑھنے کو جائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح حافظ ابن حزم جو بدعتیوں اور مقلدوں کے لیے شہاب ثاقب ہیں اور سنت کے اتباع کا شدید اہتمام کرتے ہیں انہوں نے بھی محلی میں یہ تصریح کی ہے کہ وتر کے بعد نفل پڑھنا جائز ہے اور دلیل حضرت رسول اللہ ﷺ کا وتر کے بعد بیٹھ کر دو رکعت پڑھنے کا فعل پیش کیا ہے۔ حالانکہ آپ کا یہ امر کہ وتر کو رات کی نماز کے آخر میں رکھو انہوں نے بھی نقل کیا ہے۔ قول اور فعل کے تعارض کے متعلق پہلے مضمون میں کھڑے ہو کر پینے سے منع اور آنحضرت ﷺ کا کھڑے ہو کر پینے کا فعل پیش کر چکا ہوں یہاں پر مزید وضاحت کی جاتی ہے۔

1:...... صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((ان النبی ﷺ زجر عن الشرب قائما .))[1]

اور دوسری روایت میں صحیح مسلم یہ الفاظ ہیں:

((ان یشرب الرجل قائما .))

2:...... اسی طرح صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ سے روایت مروی ہے۔

((لا یشربن احدکم قائما فمن نسی فلیستقیء .))[2]

---

1 صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب فی الشرب قائمًا.

2 صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب فی الشرب قائمًا.

اس حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم امت کے لیے ہے اور اس پر لفظ احدکم واضح طور پر دلالت کر رہے ہیں۔ لہٰذا اس امر اور آپ کے فعل کھڑے ہو کر پینا میں تعارض نہ ہوا کیونکہ بظاہر یہ فعل (یعنی الشرب قائما) آپ کی ذات شریف سے مخصوص معلوم ہوتا ہے لیکن پھر بھی محققین علماء دونوں میں جمع کی صورت کو اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہی سے مراد نہی تنزیہی ہے اور آپ کا فعل جواز پر دال ہے اور اسی توجیہ کو حافظ ابن حجر اولیٰ قرار دیتے ہیں جیسا کہ علامہ مبارکپوری تحفۃ الاحوذی: ج ا میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

((ومنهم من قال ان احاديث النهى محمولة على كراهة التنزيه قال الحافظ (اى ابن حجر) هذا احسن المسالك وسلمها وابعد من الاعتراض.))

یعنی حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ توجیہ زیادہ اچھی ہے اور اعتراض وغیرہ سے بھی یہی زیادہ دور ہے۔ بخلاف اس کے وتر کو رات کی نماز کے آخیر میں رکھنے کے متعلق ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم عام ہے (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بھی اس میں داخل ہے) اور وہ حدیث یہ ہے۔

((حدثنا عبدالله حدثنى ابى ثنا محمد بن جعفر وحجاج قالا ثنا شعبة عن ابى التياح عن ابى مجلز عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ان النبى صلی اللہ علیہ وسلم قال الوتر آخر ركعة من الليل.)) [1]

رجال السند:...... امام احمد کے دو شیخ ہیں ایک محمد بن جعفر یہ مدنی بصری ہیں جو غندر کے لقب سے معروف ہیں یہ ثقہ ہیں۔ (تقریب) دوسرا حجاج ہے اور وہ حجاج ابن محمد المصیصی الاعور ابو محمد الترمزی الاصل ہیں۔ اس کے متعلق حافظ صاحب تقریب میں فرماتے ہیں کہ ثقہ ثبت لكنه اختلط فى آخر عمره لما قدم بغداد قبل موته"

مطلب یہ ہے کہ یہ راوی ثقہ ہیں باقی رہا ان کا اختلط تو اس سے آخذ حضرت امام احمد

[1] مسند احمد: ج ۲، ص ۴۳.

ہیں جو آپ نے اختلاط سے قبل اخذ کر چکا تھا۔ لہٰذا اس اختلاط سے حدیث کی سند میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوسکتی۔ امام احمد کے دونوں شیخوں کا استاد شعبہ ہے اور وہ ابن الحجاج ابو بسطام الواسطی ثم البصری ہے اور اس کے متعلق تقریب میں مرقوم ہے۔

((ثقه حافظ متقن كان الثوري يقول هو امير المومنين في الحديث وهو اول من فتش بالعراق عن الرجال وذب عن السنة وكان عابداً.))

اس عبارت پر مزید حاشیہ آرائی کی کوئی ضرورت نہیں۔ امام شعبہ ابو التیاح سے روایت کرتے ہیں (ان کا نام یزید بن حمید ہے، اور یہ ثقہ ہیں) (تقریب) پھر ابومجلز ہے (ان کا نام لاحد بن حمید ہے یہ بھی ثقہ ہیں (تقریب) اس حدیث کی سند انشاء اللہ بے غبار ہے۔

متن الحدیث:...... اس حدیث میں جناب سید المرسلین ﷺ عمومی حکم بیان فرماتے ہیں کہ وتر رات کی نماز کی آخری رکعت ہے۔ سیاق حدیث کا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حکم عام ہے یعنی آپ کی ذات مقدسہ بھی اس میں داخل ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ علماء "لاصلوٰۃ بعد العصر" کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس حکم میں آپ کی ذات مبارکہ بھی داخل ہے اس لیے آپ کا فعل (یعنی عصر کے بعد دو رکعت پڑھنا) اس سے متعارض ہے اس لیے یا تو اس کی نہی یا فعل کو متاخر ہونے کی وجہ سے اس نہی سے مخصوص مانا جاتا ہے۔ ("انظر حصول المامول" پھر نوع جب ایسے قول کہ جس میں آپ کی ذات گرامی داخل نہ ہو (جیسا کہ) نهى عن الشرب قائما میں ہے) اور فعل متعارض میں بھی محققین جمع کا طریقہ ہی اختیار کرتے ہیں تو پھر اس صورت میں کہ قول میں آپ کی ذات والا بھی شامل ہو اور فعل اس سے بظاہر متعارض ہو تو وہاں تو بطریق اولیٰ جمع ہی مناسب ہے باقی رہا جمع تو ایک تو صورت اس کی وہ ہے جو امام نووی وغیرہ نے اختیار کی ہے اور ایک وہ ہے جو یہ بندہ ناچیز راقم الحروف پہلے مضمون میں عرض کر چکا ہے ان میں سے کوئی صورت بھی اختیار کی جا سکتی ہے باقی اس قول کے بدعت قرار دینا یا جوان کو مسنون سمجھ کر پڑھتا ہے اس کو بدعتیوں

کے زمرہ میں شامل کرنا قطعاً ساقط عن الاعتبار ہے۔ هذا ما عندي والعلم! عند الله العلام وهو اعلم بالصواب.

سوال: لیلۃ القدر کے متعلق وضاحت فرمائیں؟

الجواب بعون الوهاب: اس کرۂ ارض کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنایا ہے کہ ہر علاقے خاص طور پر دور دراز کے علاقے ان کا وقت الگ الگ کیا ہے کہیں دن ہے تو کہیں ابھی رات ہے، کہاں پر رات ختم ہونے والی ہوتی ہے، تو کہیں پر رات ابھی شروع ہو رہی ہوتی ہے، بہر حال اسی اوقات کے اختلاف کی وجہ سے اسلامی عبادات وغیرہا کے اوقات ہر ملک میں الگ الگ ہیں، مثلاً ہمارے ملک میں ہم عشاء پڑھ کر فارغ ہوتے ہیں، تو انگلینڈ میں ابھی عصر کا وقت ہوتا ہے کیونکہ وہاں پر سورج ہمارے ملک سے پانچ چھ گھنٹے بعد طلوع غروب ہوتا ہے لہٰذا پوری دنیا کے ملکوں میں ان عبادات کا ایک وقت مقرر کرنا درست نہیں ہے بلکہ ہر ملک عبادت کے اوقات وہاں کے حساب سے مقرر کیے جاتے ہیں، آپ کو معلوم ہوگا کہ عیدالاضحیٰ سال میں صرف ایک مرتبہ ہوتی ہے لیکن سعودی عرب میں ہم سے ایک دو دن پہلے ہوتی ہے کیا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم عیدالاضحیٰ کے اجر وثواب سے محروم رہ جائیں گے؟ ہرگز نہیں، اسی طرح خود رمضان المبارک بھی حجاز سے ایک دو دن بعد ہمارے پاس آتا ہے، تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابتدائی ایک دو روزے ہم سے رہ گئے ہیں یا وہ ہمارے پاس بالکل آتے ہی نہیں ہیں؟ ہرگز اس طرح نہیں ہے۔ اسلام جو کہ عالمگیر مذہب ہے۔ ساری دنیا کے لیے ہے۔ اس لیے رمضان المبارک کی باقی عبادات ہمارے ہاں ہمارے وقت کے مطابق عمل میں لائی جائیں گی۔ صحیح حدیث میں ہے چاند دیکھ کر روزے رکھو اور چاند دیکھ کر روزے ختم کرو، لہٰذا ہمارے ہاں رمضان شروع تب ہوگا جب چاند نظر آئے گا، دوسرے ممالک میں چاہے پہلے نظر آئے یا بعد میں وہ ان ملکوں کے وقت کا مدار ہے، جہاں بھی چاند نظر آئے گا وہاں رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہو جائے گا، لہٰذا ہر قدر کی رات بھی ہر ایک ملک کے لیے اس حساب سے آئے گی، جہاں یہ چاند ہم سے ایک دو دن پہلے نظر آیا ہے وہاں ہر قدر

رات ہم سے ایک دو دن پہلے نظر آئے گی اور جہاں چاند بعد میں نظر آئے گا وہاں قدر کی رات بھی اتنی ہی بعد ہوگی۔ یہ رات قدر کی سال میں ایک ہی رات کے برخلاف ہرگز نہیں ہے، یعنی قدر کی رات سال میں برابر ایک ہی ہوتی ہے لیکن ہر ملک میں اپنے اپنے وقت کے مطابق ہوگی، اگر سعودی عرب کے لیے شب قدر ایک ہے تو ہمارے لیے بھی ایک ہی ہے، اسی طرح پوری دنیا کے لیے سال میں، ایک ہی رات ہے۔ اور ہر سال میں ایک ہی رہے گی۔ لیکن سورج کے طلوع وغروب کے اوقات مختلف ملکوں میں مختلف ہونے کی بنا پر اس کا (شب قدر) کا وقت بھی مختلف ہے، اس طرح ہم تو کیا ساری دنیا کے لوگ لیلۃ القدر کی خیر وبرکت سے محروم نہیں رہیں گے۔ یہ اللہ رب العزت کا فیصلہ ہے۔ آپ سوچیں صرف لیلۃ القدر نہیں باقی عبادات کے اوقات بھی مختلف ملکوں میں مختلف وقت میں ہوتے ہیں۔ مثلاً عیدالفطر، یوم ۹ ذوالحجہ، عیدالاضحیٰ خود رمضان المبارک بلکہ سال کے ۱۲ مہینے بھی ہر جگہ پر ایک ہی دن یا ایک ہی وقت پر نہیں ہوتے۔ مثلاً: سعودیہ میں شروع سال کا ابتدائی مہینہ (محرم) شروع ہو جاتا ہے لیکن ہمارے یہاں ابھی ذوالحجہ ہی چل رہا ہوتا ہے کیا یہ واضح حقیقت نہیں ہے؟ اللہ چونکہ رب العالمین ہے اس نے ہر ملک کے آدمیوں کو اپنی مہربانیوں اور فیضانہ عنایات سے ہرگز محروم نہیں رکھا ہے بلکہ ہر ملک کے باشندے کو اس کو حاصل کرنے کا موقعہ فراہم کیا ہے جو کہ اس کے اپنے اوقات کے ساتھ منحصر ہے۔ اس مہربانی اور خیر وبرکت کو حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدائے عام ہے اگر کوئی اپنی ہی نالائقی کی وجہ سے ان برکات سے محروم ہو جاتا ہے تو وہ اپنے گریبان میں خود جھانکے۔
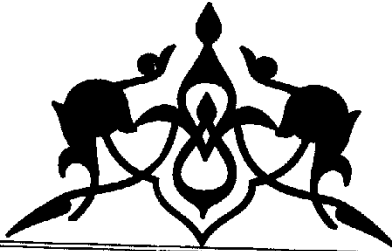
کتاب الجنائز
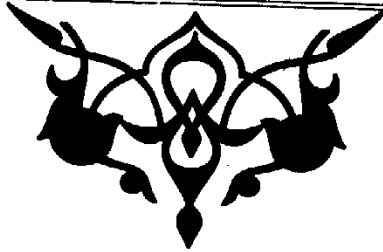
تعزیت پر کھانا

سوال: ہمارے ہاں مروج ہے کہ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے تو اس کے ورثاء اور دوست وغیرہ تعزیت کے لیے آتے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ آہستہ آہستہ کئی ماہ تک چلتا رہتا ہے اس لیے لوگ وقت بچانے کی خاطر تین دنوں کے بعد شادی کی طرح دعوت نامے بھیج دیتے ہیں اور کسی خاص مقررہ وقت کھانے کا انتظام کرتے ہیں اور تعزیت کے لیے آنے والے لوگ اس وقت جمع ہو کر کھانا وغیرہ تناول کرنے کے بعد کچھ رقم بھی انہیں دے دیتے ہیں اس طرح کرنا کیسا ہے؟ اصل میں اس طرح کرنے سے وقت بھی بچ جاتا ہے اور ایک ہی وقت میں میت کے ورثاء فراغت پا لیتے ہیں ایک مولوی صاحب کہتا ہے کہ یہ ناجائز ہے آپ تفصیل سے بیان کریں کہ کیا واقعتاً یہ بات درست ہے؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہئے مرنے والے کے پیچھے طعام وغیرہ پکا کر کھلانا یا گھر گھر اسے تقسیم کرنا جیسا کہ سوال میں مذکور ہے یہ بلاشبہ حرام اور ناجائز ہے۔ اس کے علاوہ اس غم اور پریشانی کے موقع پر شادی کی طرح رسوم ورواج کا انعقاد بھی ناجائز ہے کیونکہ احادیث نبویہ ﷺ یا سلف یا خلف سے ایسا کوئی رواج منقول نہیں۔

اس لیے اسے ضروری ولازمی سمجھنا اور اس کے بعد اس کا انعقاد کرنا بدعت ہے اور اس کی دعوت عام کرنا بھی غیر درست ہے کیونکہ ایسی دعوت شادی اور خوشی کے موقعہ پر مشروع ہے نہ کہ غمی کے موقعہ پر بلکہ غمی کے موقعہ پر اس طرح کے طعام کے تیار کرنے سے رسول اکرم ﷺ نے منع فرمائی ہے۔

((عن عكرمة عن ابن عباس رضي الله عنهما ان النبى ﷺ نهى عن طعام المتباريين ان يؤكل .))[1]

((وعن ابى هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ المتباريان لا

[1] ابو داؤد، كتاب الاطعمة، باب فى طعام المتباريين، رقم الحديث: ٣٧٥٤ .

یجابان طعامهما، قال الامام احمد یعنی المتعارفين بالضیافة فخراً ورياء .))

دونوں حدیثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ فخر وریاء اور نام کمانے کے لیے طعام کھلانے کے لیے دعوت دی جائے تو ایسی شخص کی قبول نہ کی جائے۔

منتقی الاخبار میں ہے:

((عن جرير بن عبدالله البجلی رضی الله عنه قال كنا نعد الاجتماع الى اهل الميت وضعة الطعام بعد دفنه من النياحة .))

(راوه احمد)

"یعنی جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم اہل میت کی طرف لوگوں کو جمع ہونے اور میت کے دفن کرنے کے بعد طعام تیار کرنے نوحہ شمار کرتے تھے۔"

فتح القدیر میں ہے:

((اتخاذ الطعام من اهل الميت بدعة مستقبحة لانه شرع في السرور لافي الشرور .))

"یعنی اہل میت کی طرف سے طعام تیار کرنا بہت قبیح بدعت ہے کیونکہ طعام تیار کر کے لوگوں کو جمع کر کے انہیں کھلانا خوشی کے موقع پر مشروع ہے نہ کہ دکھ اور پریشانی اور غمی کے موقع پر۔"

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اہل میت کے ہاں اس طرح کے طعام تیار کرنے کی استطاعت نہیں ہوتی پھر بھی وہ لوگوں کے طعنوں سے بچنے کے لیے قرضہ لے کر بھی کھانے کا اہتمام کرتے ہیں یا کچھ لوگ یتیموں کا مال (اہل میت کے ورثاء جو ابھی بلوغت کو نہیں پہنچے) ناجائز طریقے سے ضائع کرتے ہیں۔ حالانکہ مال الیتیم ظلم سے کھانا حرام ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ

نَارًا وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا﴾ (النسآء: ١٠)

''یعنی بے شک جولوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں وہ لوگ حقیقت میں اپنے پیٹوں میں جہنم کی آگ ڈالتے ہیں اور وہ عنقریب جہنم میں داخل ہو جائیں گے۔''

حاصل مطلب یہ ہے کہ یہ ایک غلط رسم ہے اور ناجائز ہے۔

مدفون کا علم

سوال: جب کوئی شخص قبر پر زیارت کے لیے آتا ہے تو کیا قبر میں مدفون شخص کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص موجود ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہئے کہ عالم برزخ کے معاملات ایسے ہیں جن کے متعلق محض ظن وقیاس کے ذریعے کچھ کہنا نہایت ہی خطرناک اقدام ہے عالم برزخ کے متعلق اتنا ہی کہا جاسکتا ہے جتنا کتاب وسنت رسول اللہ ﷺ میں وارد ہوا ہے۔

مزید کہنا محض اٹکل کے تیر پھینکنے کے مترادف ہے چونکہ اس مسئلہ کے متعلق کسی صحیح حدیث میں وارد نہیں ہوا لہٰذا اس کے متعلق قیاس آرائی کرنا قطعاً نامناسب اقدام ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حدیث میں ہے کہ میت واقف شخص کو قبر پر آنے پر پہچانتی ہے۔ لیکن ان احادیث کی صحت پایہ ثبوت نہیں تک پہنچتی اور نہ ہی ان کی اسانید کوئی قابل استناد اور لائق اعتماد ہیں۔ لہٰذا ان کی بنیاد پر مسئلہ ہذا کا قائل ہونا مشکل ہے بلکہ سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ میت کو کوئی احساس نہیں ہے اور نہ ہی اس کی روح وہاں موجود ہے۔ اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

﴿وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴾ (المومنون: ١٠٠)

''یعنی فوت ہونے والوں کو دنیا اور اہل دنیا کے درمیان ایک مضبوط اور ناقابل عبور آڑھ آجاتی ہے جو قیامت کے دن تک قائم رہے گی۔''

پھر اگر مرنے والا مرنے کے بعد بھی قبر پر آنے والے کو دیکھتا ہے اور اسے پہچانتا ہے اور اس کی آمد محسوس کرتا ہے یا ان کی آواز سنتا ہے تو پھر اس کا اس دنیا سے تعلق ختم نہیں ہوا اور نہ ہی اس کے اور دنیا کے درمیان کوئی برزخ حائل ہوا ہے۔علاوہ ازیں قرآن کریم میں ہے کہ:

﴿وَ مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ﴾ (فاطر: ۲۲)

''یعنی آپ اہل قبور کو اپنی آواز نہیں سنا سکتے۔''

ان سب آیات کا یہی مطلب ہے کہ ان کا تعلق دنیا سے ختم ہو چکا ہے۔اور حدیث میں آتا ہے کہ جب میت کو قبر میں داخل کیا جاتا ہے تو اس کی روح لوٹائی جاتی ہے اور وہ لوگوں کی جوتیوں کی آہٹ سنتا ہے اور اس وقت اس میت سے فرشتے (منکر ونکیر) سوال و جواب کرتے ہیں اور اس کے بعد مومن کو کہا جاتا ہے کہ نم کنومة العروس یعنی پھر وہ بالکل بے حس ہو کر وہاں سو جاتا ہے یہاں تک کہ قیامت کے دن اُٹھ کھڑا ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اعادہ روح صرف سوال و جواب کے لیے ہوتی ہے نہ کہ ہمیشہ کے لیے حالانکہ اس مسئلہ کا تقاضا ہے کہ'' میت کی روح ہر وقت قبر میں موجود ہوتی ہے اس وجہ سے جب بھی کوئی قبر پر آتا ہے تو اسے پہچان جاتا ہے۔'' اور اسے اس کی موجودگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔لہٰذا یہ مسئلہ ان واضح دلائل کے برخلاف ہے۔

علاوہ ازیں صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص میری قبر پر کھڑا ہو کر سلام کہتا ہے تو:

((رد الله على روحي حتى ارد عليه السلام .)) [1]

''یعنی کہ اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ میری روح کو لوٹاتا ہے تاکہ میں اسے سلام کا جواب دوں۔''

اس صحیح حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی روح مبارک بھی

[1] رواه ابوداؤد والبيهقي و احمد باسناد حسن عن ابي هريرة رضي الله عنه .

آپ ﷺ کے جسم اطہر میں بھی ہر وقت موجود نہیں ہے اور ظاہر ہے احساس اور کسی کی آمد وغیرہ کا علم تب ہی ہوسکتا ہے جب اس کی روح جسم میں موجود ہو کیونکہ حواس روح کے علاوہ کام نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ اس عقیدہ کا یہ مطلب ہوا کہ دیگر لوگوں کا مقام اتنا بلند ہے کہ آپ کی روح مبارک تو ضرورت کے وقت جسم اطہر کی طرف لوٹائی جاتی ہے باقی دیگر لوگوں کو یہ ضرورت نہیں کیونکہ ان کی روح ہر وقت موجود ہے۔ تب ہی وہ محسوس کر لیتے ہیں۔

"فیاللعجب وضعة الأدب."

لیکن اگر کوئی یہ سوال کرے کہ ممکن ہے کہ جس طرح آپ ﷺ کی قبر مبارک پر سلام پڑھنے کے وقت روح مبارک کا اعادہ ہوتا ہے اسی طرح دیگر لوگوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو کہ کوئی واقف کار شخص ان کی قبر پر آئے تو اللہ تعالیٰ ان کے روح کا اعادہ فرما دیں اور وہ آنے والے شخص کا احساس پائیں اس کا جواب ہے کہ اول تو اس کے لیے قرآن وحدیث سے دلیل پیش کی جائے۔

کیونکہ آپ ﷺ کا اعادہ روح کی تو دلیل موجود ہے لیکن دیگر لوگوں کے لیے یہ کہاں وارد ہوا ہے کہ ان کی روح کا اعادہ ہوتا ہے؟ جب دیگر لوگوں کے لیے کوئی خاص دلیل نہیں تو اس بات کا قائل ہونا اللہ تعالیٰ کے دین میں اپنی طرف سے قیاس آرائی نہیں ہوگی؟ کیا رجم بالغیب کا مطلب کچھ اور ہے؟

اور دوسری بات یہ کہ اس میں سوئے ادبی بھی ہے کیونکہ یہ محض آپ ﷺ کی ذات اقدس کے ساتھ خاص ہے اور آپ ہی پر اللہ تعالیٰ کا اکرام ہے۔ پھر اگر دوسروں کو بھی اس میں شامل کیا جائے تو یہ انتہائی بے ادبی ہوگی۔ معاذ اللہ!

لیکن اگر کہا جائے کہ روح کا اعادہ نہ ہی ہوتا ہو لیکن ممکن ہے کہ روح کا جسم کے ساتھ کوئی تعلق قائم ہوسکتا ہے۔ مثلاً ریڈیو اور اس کی آواز کے ساتھ تعلق ہے یعنی مقرر کسی دوسری دور دراز جگہ پر ہے مگر آواز کا ریڈیو کی مشین کے ساتھ ایسا تعلق ہے جو کہ فوراً سنائی دینے میں معاون ہوتا ہے اس طرح کی اور مثالوں کی طرح جسم کے ساتھ روح کا کوئی تعلق ہوسکتا ہے،

گو قبر میں اس کا اعادہ نہ بھی ہو لیکن اس تعلق کے سبب وہ میت قبر پر وارد ہونے والے شخص کا احساس کر لیتی ہو۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس بات کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی پاک اور مبارک روح کا جو تعلق آپ کے جسد اطہر کے ساتھ ہے وہ کسی اور کے لیے نہیں ہوسکتا جب کہ جواب دینے کے لیے آپ کے لیے اعادہ روح کی ضرورت ہے تو دوسروں کی ارواح اس مقام پر کیسے فائز ہوگئیں کہ انہیں اپنے مستقر و مقام میں آنے والے شخص کا احساس ہو جائے۔ وھذا ظاھر البطلان!

بہر حال میت کی قبر پر آنے والے کو پہچاننا یا اس کے آنے کی خبر معلوم ہونا یہ بات قطعاً غلط ہے۔ هٰذا ما سنح فی خاطر هٰذا العبد الحقیر واللّٰہ اعلم بحقیقة الحال

مقبرے کا حکم

سوال: قبروں پر مقبرے وغیرہ تعمیر کرنا کس طرح درست ہے؟ بنیو و توجروا!

الجواب بعون الوھاب: کسی کی بھی قبر کے اوپر خواہ وہ کسی ملک کا بانی ہو یا ولی ہو یا بزرگ ہو یا عام آدمی ہو اس پر کچھ تعمیر کرنا سخت منع اور حرام ہے، کیونکہ احادیث صحیحہ میں اس کی ممانعت وارد ہے بلکہ اس پر تعمیر شدہ چیز کو مٹا دینے کا حکم ہے کیونکہ یہ ساری چیزیں شرع کی مخالف ہیں باقی باہر کے لوگ پہلے آکر ملک کے بانی کی قبر کی زیارت کریں اس پر چادر چڑھائیں۔ یہ سارے کام بدعت سیئہ اور شرک کے ہیں اور ناحق ہیں جن کو قطعاً نہیں کرنا چاہئے۔ ایسے کاموں کا مرتکب اپنے ایمان کی تجدید کرے کیونکہ یہ شرعی نہیں ہیں بلکہ سخت ناجائز اور حرام ہیں۔ اسی طرح ملک میں جو رواج چل رہا ہے وہ سراسر ناجائز و حرام اور بدعت ہے جو قطعاً نہیں کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم بالصواب!

من حمله فليتوضأ

سوال: بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے کہ ((من حمل میتا

فليتوضأ ومن غسل فليغتسل)) یعنی جو میت کو اٹھائے وہ وضو کرے اور جو غسل دے وہ خود غسل کرے۔ کیا یہ حکم وجوبی ہے استحبابی؟

الجواب بعون الوهاب: مندرجہ بالا حدیث سے جو استدلال لیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ مندرجہ بالا مسئلہ میں کوئی بھی حدیث پائے ثبوت تک نہیں پہنچتی کیونکہ سب روایات میں علت قادحہ موجود ہے اس لیے میّت کے اٹھانے سے نہ وضو لازمی ہوتا اور نہ ہی غسل دینے والے پر غسل کیونکہ کہ جو حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((من غسل الميّت فليغتسل ومن حمله فليتوضأ.))

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں (كتاب الجنائز، باب في الغسل من غسل الميت، رقم: ٣١٦١) ذکر کیا ہے عمرو بن عمر کے طریق سے روایت کیا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس روایت میں عمرو بن عمر مجہول راوی ہے۔ "كما في التقريب" اور جہالت شدید جرح ہے۔ كما لا يخفى على ماهر الأصول.

اسی طرح دوسری حدیث جو پیش کی جاتی ہے۔

((عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال من غسله الغسل ومن حمله الوضوء يعني الميت.))

اس روایت کو امام الترمذی نے "الجامع" (كتاب الجنائز، باب في الغسل من غسل الميت، رقم: ٩٩٣) میں ذکر کیا ہے یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ اس لیے کہ اس کی سند میں ایک راوی ہے ابوصالح جس کا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ (كما قال الحافظ في الفتح)

اسی طرح ایک تیسری حدیث جو پیش کی جاتی ہے:

((عن عائشة رضي الله عنها ان النبي صلى الله عليه وسلم كان يغتسل من اربع من الجنابة ويوم الجمعة ومن الحجامة ومن غسل الميت.))

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے اپنی سنن (رقم: ٣١٦٠) میں ذکر کیا ہے لیکن اس کی سند

بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی سند میں مصعب بن شیبہ نامی ایک راوی ہے وہ ''لین الحدیث'' ہے اور اس روایت کو امام ابوزرعہ امام احمد اور امام بخاری رحمہ اللہ نے ضعیف کہا ہے اور امام ابوداؤد اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں: حديث مصعب ضعيف۔

اسی طرح ایک چوتھی روایت پیش کی جاتی ہے:

((عن علی رضی اللہ عنہ قال: قلت للنبی ﷺ ان عمك الشيخ الضال قد مات فمن يواری قال اذهب فوار اباك ثم ولا نحدثن متحدثن حدثنا حتى تاتين فورأيته ثم جئته فأمرنی فاغتسلت ودعالی.))

اس روایت کو ابوداؤد اور امام نسائی نے اپنی ''السنن'' میں ذکر کیا ہے لیکن یہ روایت بھی قابل قبول نہیں ہے کیونکہ ان کی سند میں ایک راوی اسحاق السبیعی ہے وہ مدلس راوی ہے اور روایت کو وہ عن کے ساتھ بیان کر رہے ہیں اور اس کی تدلیس مرتبہ ثالثہ میں آئی ہے اور مرتبہ ثالثہ کے راویوں کی روایت اس وقت تک قابل قبول نہیں ہے جب تک وہ سماع کی تصریح نہ کر دے۔ کما قال الحافظ فی طبقات المدلسين.

اور ہاں اگر ہم اس روایت کو صحیح بھی مان لیں تو ہوسکتا ہے یہ غسل کا امر کافر اور مشرک کے ساتھ مخصوص ہو کیونکہ قرآن پاک کی نص سے وہ نجس ہیں اور یہ حکم ہر میّت کے لیے نہیں ہے اور اگر ہم حدیث کو عام بھی رکھتے ہیں تو بھی امر استحبابی ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس کے مقابلہ میں احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ اسی طرح ایک اور روایت امام ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سہیل بن ابی صالح عن ابیہ عن اسحاق مولیٰ زائدہ کے طریق سے نقل کی ہے اور امام ابوداؤد اس روایت کے بعد فرماتے ہیں: ''قال ابو داؤد ابو صالح بينه وبين ابی هريرة اسحاق مولی زائده.''

امام بیہقی فرماتے ہیں: ''الصحيح أنه موقوف'' اور امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''ار أشبه موقوف'' قال ابو حاتم عن أبيه الصواب عن أبی هريرة موقوف.

اور امام علی بن المدینی اور امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں: "لا یصح فی هذا الباب شئی" یہ ہی قول امام ترمذی نے امام بخاری سے نقل کیا ہے۔

اور امام محمد بن یحییٰ ذہلی فرماتے ہیں: "لا علم من غسل میتًا فلیغتسل حدیثاً ثابتًا ولو ثبت لزمنا استعماله."

امام ابن المنذر فرماتے ہیں: "لیس فی الباب حدیث یثبت."

امام الرافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "لم یصح علماء الحدیث فی هذا الباب شیئًا مرفوعًا."

امام ابن دقیق العید فرماتے ہیں: "احسنها روایة سهیل عن أبیه عن أبیه هریرة وهی معلولة وان صححها ابن حبان وابن حزم."

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی بھی صحیح روایت نہیں ہے اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اس کے طریق جمع کرنے سے حسن لغیرہ کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے لیکن ہر جگہ ضعیف حدیث کثرہ طرق کی وجہ سے حسن لغیرہ تک نہیں پہنچتی جس طرح حدیث "من کان له امام فقرأته له قرأة." اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ حدیث حسن درجہ کی ہے تب بھی یہ حکم وجوبی نہیں ہے صرف استحبابی ہے کیونکہ ایک حسن سند کے ساتھ روایت ہے۔

((عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ لیس علیکم فی میتکم غسل اذا غسلتموه ان میتکم یموت لما هرا ولیس بنجس فحسبکم ان یغسلوا ایدیکم.))

(اخرجه البیهقی فی کتاب الجنائز، ج۳ ص ۳۹۸)

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تمہارے اوپر میت کو غسل دینے سے واجب نہیں ہوتا بے شک تمہاری میت پاک حالت میں انتقال کرتی ہے وہ ناپاک نہیں ہوتی (غسل دینے کے بعد) تمہارا صرف ہاتھ دھونا ہی کافی ہے۔"

اسی طرح دوسری حدیث ہے جس کو سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں نقل کی ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تلخیص الحبیر میں کہا ہے۔ اسناده صحيح .

((كنا نغسل الميت فمنا من يغتسل و منا من لا يغتسل .))

''یعنی ہم میت کو غسل دیتے تھے تو ہم میں سے کوئی غسل کرتا اور کوئی نہیں کرتا تھا۔''

اسی طرح ایک تیسری روایت سے اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

((منها حديث اسماء بنت عميس امرة أبى بكر الصديق رضي الله عنه انها غسلت أبابكر الصديق حين توفى ثم خرجت فسالت: من حضرها من المهاجرين فقالت انى صائمة وان هذا يوم شديد البرد فهل علىّ من غسل قالوا لا .))

(رواه مالك فى المؤطا، ص ١٣٣)

''یعنی اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زوجہ انھوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو غسل دیا جب ان کا انتقال ہوا پھر باہر آئی اور جو مہاجرین موجود تھے ان سے استفسار کیا کہ آج شدید سردی ہے اور میں روزے سے بھی ہوں کیا میرے اوپر غسل واجب ہے تو انھوں نے کہا نہیں۔''

جملہ دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ غسل کرنا مستحب ہے واجب نہیں ہے۔

قرآن خوانی کا حکم

سوال: میت کو ثواب پہنچانے کے لیے قرآن مجید کی تلاوت کروانا کیسا ہے؟

الجواب بعون الوهاب: میت کو ثواب پہنچنے کے بارے میں (ہر میت کے بارے میں خواہ وہ میت باپ ہو ماں ہو یا کوئی اجنبی) علماء حق کا اختلاف ہے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اس طرف گئے ہیں کہ ہر میت کو ثواب پہنچایا جا سکتا ہے اور ہر کوئی پہنچا سکتا ہے یعنی وہ میت کا کوئی عزیز ہو یا اجنبی جیسا کہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''کتاب الروح'' میں واضح

طور پر معلوم ہوتا ہے۔

موجودہ اہلحدیث میں سے بھی بعض کا یہی خیال ہے لیکن راقم الحروم احقر العباد کو دلائل کے لحاظ سے یہ سمجھ میں آیا ہے کہ میت اگر ماں، باپ میں سے ہو تو ان کے لیے ایصال ثواب جائز ہے۔ جیسا کہ صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کسی صحابی نے اپنی والدہ کے متعلق دریافت کیا کہ وہ اس کی طرف سے صدقہ کرے تو کیا اس کا اجر اسے ملے گا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں اور یہ ارشاد قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ:

﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ (النجم: ٣٩)

''ہر انسان کے لیے صرف وہی کچھ ہے جس کی اس نے کوشش کی۔''

کے مخالف نہیں کیونکہ اولاد خود ماں باپ کا کسب ہے اس لیے ولاد کے اعمال کا اجر وثواب والدین کو مل سکتا ہے کیونکہ اولاد کا فعل خود والدین کا فعل ہی ہے کیونکہ وہ انہی کی محنت سے پیدا ہوئی ہے۔ لہٰذا اولاد کا کسب بعینہٖ والدین کا کسب ہی ہے۔ البتہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص فوت ہو جائے اس پر روزہ کی قضا ہو تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے اس طرح کی احادیث میں لفظ ولی زیادہ عموم کا متقاضی ہے اور اس سے کھینچ تان کر کے اگر کسی دوسرے عزیز وقریب کے لیے ایصال کے لیے متدل بنایا جائے تو ایسا ہوسکتا ہے لیکن ہے پھر بھی کھینچ تان لیکن اس سے بھی آگے بڑھ کر اس سے بالکلیہ اجنبی کے لیے ایصال ثواب پر استدلال کرنا محض سینہ زوری کی بات ہے البتہ قیاس کیا جائے تو اور بات ہے لیکن جو لوگ قیاس کے انکاری ہیں تو ان کے لیے تو کوئی حجت نہیں۔

خیر القرون کے دور میں ایسی امثلہ نہیں ملتیں کہ کسی اجنبی کے لیے کسی نے ایصال ثواب کو جائز سمجھا ہو یا اس کے لیے قرآن خوانی کی ہو۔ البتہ اولاد کا والدین کے لیے صدقہ کرنا وغیرہا کسی امثلہ موجود ہیں اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ اجنبی کے لیے ایصال ثواب سے اجتناب کیا جائے اور ان کے لیے صرف دعا مغفرت وترحم وغیرہ پر اکتفا کیا جائے، یعنی جس قدر شریعت میں وارد ہوا ہے اس سے آگے نہ بڑھا جائے۔

تاہم جو لوگ اجنبی کے لیے بھی جواز کے قائل ہیں ان کے نزدیک بھی کئی شروط ہیں جن کی پابندی لازمی طور پر کرنا ہوگی مثلاً کسی دن وغیرہ کو خاص کر دینا جیسا کہ جاہل لوگ گیارویں، بارویں، عرس وغیرہ کرتے ہیں اس طرح کے نمونے ہرگز نہیں ہونے چاہئیں اور ان کاموں میں سے کسی کام کو کسی خاص مقررہ صورت میں ادا کرنا مثلاً چار مولوی منگوا کر قرآن خوانی کروانا اور اس کے بعد ان کی لذت ولطف کا انتظام کرنا ان باتوں اور ان کے علاوہ اس طرح کی دیگر باتوں سے ان مجوزین من اہل الحق کے نزدیک بھی پرہیز کرنا واجب و لازم ہے۔ اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اولاد اپنے والدین کے لیے قرآن خوانی کرواسکتا ہے اس کا جواب یہ ہے۔ (وباللہ تعالیٰ التوفیق)

حدیث میں والدین کے لیے عام صدقہ کرنے کا اثبات ہے اور صحیح حدیث میں جو بخاری ومسلم میں ہے جو وارد ہوئی ہے کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

((الكلمة الطيبة صدقة .)) (الحديث)

''یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پاک اور طیب کلمہ کو بھی صدقہ قرار دیا ہے۔''

اور قرآن حکیم سے بڑھ کر دوسرا کلمہ طیبہ کا مصداق کیا بن سکتا ہے۔ بہرحال راقم الحروف کی سمجھ کے مطابق اولاد اپنے والدین کے لیے قرآن خوانی کرسکتی ہے لیکن اس طرح کہ خود پڑھ کر ثواب ان کے سپرد کر دے اس طرح نہیں کہ پیٹ کے پجاریوں کو بلا کر ان سے پڑھوا کر اور پھر ان کے لیے اکل وشرب کا انتظام کیا جائے بلکہ خود پڑھے اور اس کے لیے کوئی خاص دن یا وقت مقرر نہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ اور مقدس رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح ثابت نہیں۔ هٰذا ما عندي والله اعلم بالصواب!

من حمله فليتوضأ

سوال: حدیث: ((من حمل الميت فعليه الوضوء ومن غسله فليغتسل .)) محققین حضرات اس حدیث کے متعلق کیا فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے یا

ضعیف؟ اور آپ کی رائے کیا ہے؟

الجواب بعون الوهاب: کچھ روایات ایسی وارد ہوئی ہیں کہ جو شخص میت کو غسل دے وہ غسل کرے اور جو اسے اٹھائے وہ وضو کرے۔ لیکن راقم الحروف کے نزدیک یہ سب روایات درجہ ثبوت کو نہیں پہنچیں زیادہ سے زیادہ یہ صحابی کا قول ثابت ہوتا ہے۔ البتہ مرفوع یعنی رسول اکرم ﷺ کا قول ثابت نہیں اس کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب علل کبیر میں یہ عنوان قائم کرتے ہیں:

((ما جاء في الغسل من غسل ميتاً.))

پھر فرماتے ہیں:

((قال ابو عيسىٰ سألت محمداً عن هٰذا الحديث من غسل ميتا فليغتسل فقال روى بعضهم عن سهيل بن ابى صالح عن اسحق مولىٰ زائدة عن ابى هريرة رضي الله عنه موقوفاً.))

''یعنی میں نے محمد (امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ) سے اس حدیث کے متعلق دریافت کیا تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ روایت اسحاق مولیٰ زائدہ جو کہ ثقہ راوی ہے انھوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے موقوفاً نقل کی ہے یعنی یہ روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے نہ کہ مرفوع حدیث۔''

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ ابو صالح نے یہ روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بیان کی ہے لیکن یہ معلول ہے کیونکہ ابو صالح نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نہیں سنی۔

امام ترمذی بحوالہ بالا کتاب میں فرماتے ہیں:

((قال محمد ان احمد بن حنبل وعلى بن عبدالله قالا لا يصح من هٰذا الباب شئى وقال محمد وحديث عائشه رضي الله عنها فى هٰذا الباب ليس بذالك.)) [1]

---

[1] علل کبیر ج ۱ ص ۴۲، ۴۳.

''یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مزید فرمایا کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور علی بن عبداللہ بن المدینی دونوں نے فرمایا کہ اس باب میں کچھ بھی ثابت نہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مزید فرمایا کہ اس سلسلہ میں سیدتنا وامنا عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی روایت مروی ہے۔ (جو کہ ابوداؤد میں ہے) لیکن وہ بھی صحیح نہیں۔''

خود امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام خطابی معالم السنن شرح سنن ابی داؤد میں فرماتے ہیں کہ فی اسناد الحدیث مقال یعنی اس حدیث کی سند میں کلام ہے۔ اسی طرح امام ابن ابی حاتم اپنی کتاب ''العلل: ج ۱صفحہ ۳۵۱) میں اپنے والد امام ابو حاتم رازی سے نقل فرماتے ہیں کہ:

((الصواب عندی عن ابی هريرة رضی اللہ عنہ موقوف .))

''یعنی میرے نزدیک درست بات یہ ہے کہ یہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے، یعنی موقوف ہے نہ کہ مرفوع۔''

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ السنن الکبریٰ جلد ۱صفحہ ۳۰۲ میں لکھتے ہیں:

((الصحيح موقوف على ابى هريره لان الروايات المرفوع فى هٰذا الباب عن ابى هريرة غير قوية لجهالة بعض رواتها وضعف بعضهم .))

''یعنی صحیح بات یہ ہے کہ یہ روایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے کیونکہ اس باب کی مرفوع روایات بعض راویوں کے ضعف اور بعض کے مجہول ہونے کی وجہ سے قوی نہیں ہیں۔''

امام ابن الجوزی (العلل المتناهية جلد ۱ ،صفحہ ۳۷۸) میں اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں:

((هٰذه الاحاديث كلها لا يصح .))

''یہ سب کی سب احادیث صحیح نہیں ہیں۔''

بہرحال ائمہ حدیث کی تصریحات سے معلوم ہوا کہ اس باب میں کوئی بھی مرفوع روایت صحیح ثابت نہیں زیادہ سے زیادہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ثابت ہوگا اور صحابی کا قول حجت نہیں۔

لہٰذا راقم الحروف کی تحقیق یہ ہے کہ نہ تو میت کو غسل دینے والے پر غسل واجب ہے اور نہ ہی اسے اٹھانے والے پر وضو۔ واللہ اعلم بالصواب.

نہری اور برساتی زمین میں فرق

سوال: وہ زمین جو نہر کے پانی سے پلائی جائے اور وہ زمین جسے بارش سے آباد کیا جائے ان کی پیداوار پر کتنی زکوٰۃ فرض ہے۔ بینوا توجروا!

الجواب بعون الوهاب: سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

((عن النبی ﷺ انه قال فيما سقت السماء والعيون وكان عشريا العشر وماسقى بالنضح نصف العشر .)) [1]

''یعنی آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس زمین کو بارش یا چشموں کے ذریعے پانی پلایا جائے یا ایسے درخت ہوں جن کی جڑیں خو بخود زمین سے پانی حاصل کریں (یعنی ان کو اوپر سے پانی پلانے کی ضرورت نہ ہو) تو ان سب کی پیداوار پر عشر (دسواں حصہ) زکوٰۃ لاگو ہوگی۔''

اور فرمایا کہ جس زمین کو جانوروں وغیرہ کی محنت سے سیراب کیا جاتا ہو (یعنی کھینچ کر پانی پلایا جائے) تو اس صورت میں اس کی پیداوار پر نصف العشر یعنی بیسواں حصہ زکوٰۃ لاگو ہوگی۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس زمین کو بارش سیراب کرے اس کی پیداوار پر عشر (دسواں حصہ) زکوٰۃ ہے۔

باقی رہا سوال کا دوسرا حصہ یعنی وہ زمین جسے نہر سے پانی پلایا جائے۔ اس کی پیداوار پر کتنی زکوٰۃ ہے تو ظاہر ہے کہ ایسی زمینیں ان زمینوں سے تعلق رکھتی ہیں، جن کے متعلق حدیث میں ہے کہ ان کو جانوروں کے ذریعے پلایا جائے ان کی پیداوار پر بیسواں حصہ زکوٰۃ لاگو ہوگی۔ کیونکہ شریعت اسلامیہ نے اس مسئلہ میں انسان کی محنت ومشقت کو مدنظر رکھا ہے

---

[1] صحيح البخاری، كتاب الزكوة باب العشر فيما يسقى من ماء السماء و الماء الجاری: رقم الحديث، ١٤٨٣.

یعنی جس زمین کو سیراب کرنے کے لیے پانی لانے میں زیادہ مشقت اور تکلیف درکار رہے اس کی پیداوار پر بیسواں حصہ اور جس زمین کو آباد کرنے کے لیے پانی لانے میں زیادہ مشقت ومحنت نہیں کرنی پڑتی بلکہ پانی از خود اوپر سے اترتا ہے اور زمین کو سیراب کر دیتا ہے مگر اس کے برعکس جس زمین کو سخت محنت جھیل کر انسان سیراب کرتا ہے تو شریعت نے اس کی محنت پر رحم وکرم کرتے ہوئے اس پر زکوٰۃ بھی کم رکھی ہے۔ چونکہ آپ ﷺ کے زمانہ مبارک میں نہروں والے پانی کا سسٹم نہیں تھا بلکہ جانوروں کے ذریعے پانی نکال کر زمینیں سیراب کی جاتی تھیں اس لیے آپ نے ان کے متعلق ارشاد فرمایا مگر علماء حقہ نہروں والے پانی سے سیراب کی گئی زمینوں کو ان کے ساتھ ملحق سمجھا ہے، کیونکہ ان میں بھی سخت محنت کرنی پڑتی ہے جیسا کہ نہر کی کھدائی، صفائی اور آبیانہ دینا جس کا مطلب ہے کہ پانی پیسوں کے ساتھ خریدنا پڑتا ہے لہٰذا اگر اتنی محنت اور خرچ کے بعد بھی اس پر اتنی زکوٰۃ مقرر کی جائے تو پھر آبادگاروں کے لیے تکلیف مالا یطاق بن جائے گی اور شریعت کسی پر بھی اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتی:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرة: ٢٨٦)

''اللہ تعالیٰ کسی پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔''

لہٰذا ایسی زمینوں پر بیسواں حصہ زکوٰۃ لاگو ہوگی کافی عرصہ پہلے مولانا حافظ عبداللہ صاحب روپڑی رحمہ اللہ کے حوالہ سے تنظیم اہلحدیث اخبار میں بھی ایسا فتویٰ دلائل کے ساتھ شائع ہوا تھا وہ مضمون میں نے بھی پڑھا تھا ممکن ہے کہ دفتر تنظیم اہلحدیث سے وہ شمارہ مل جائے۔ بہرحال علماء اہلحدیث کے محققین موجودہ سرشتہ والی زمینوں پر بھی نصف عشر بیسواں حصہ زکوٰۃ سمجھی ہے اور دلائل سے بھی یہ مسلک صحیح سمجھ میں آتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

زکوٰۃ کے مال سے لائبریری بنانا

سوال: کیا زکوٰۃ کی رقم کسی ایسے ادارہ یا لائبریری میں دی جاسکتی ہے جہاں سے

خود بھی استفادہ کرتا ہے؟

الجواب بعون الوهاب: زکوٰۃ کے مصارف (جن پر زکوٰۃ خرچ کی جائے) قرآن کریم نے خود بھی بیان کر دیئے ہیں۔ لائبریری ان میں داخل نہیں لہٰذا زکوٰۃ کی رقم لائبریری پر خرچ نہیں کی جاسکتی۔ اگرچہ قرآن کریم نے جو آٹھ مصارف بیان کیے ہیں ان میں سے ایک فی سبیل اللہ بھی ہے اور اگر اسے عام رکھا جائے تو دینی لائبریری بھی اس کے اندر داخل ہوسکتی ہے، صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ سبیل اللہ کا لفظ عام نہیں، اس لیے کہ اگر اسے عام رکھا جائے گا تو باقی سات مصارف ذکر کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔

مثلاً فقراء، مساکین، عاملین علیہا، مؤلفۃ قلوبہم، رقاب، ابن سبیل، غارمین یہ سب فی سبیل اللہ کے لفظ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ (غور کریں)

پھر الگ ذکر کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ صرف فی سبیل اللہ کا ذکر ہوتا باقی سب اس میں از خود داخل ہو جاتے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد عام نہیں بلکہ خاص فی سبیل اللہ مراد ہے۔ اس کے بعد یہ معلوم کرنا چاہئے کہ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد کیا ہے؟

قرآن حکیم کی اصطلاح میں جیسا کہ مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر محققین نے لکھا ہے'' وہ سارے کام جو براہ راست دین وملت کی حفاظت اور تقویت کے لیے ہوں وہ فی سبیل اللہ کے کام ہیں اور چونکہ حفظ وصیانت میں امت کا سب سے ضروری کام دفاع ہے، اس لیے اس کا اطلاق زیادہ تر اس پر کیا جاتا ہے پھر اگر دفاع درپیش ہو اور امامِ وقت اس کی ضرورت محسوس کرے تو زکوٰۃ کی مد سے مدد حاصل کی جائے تو اس میں خرچ کی جائے گی ورنہ دین وامت کے عام مصالح میں مثلاً قرآن اور دینی علوم کی ترویج اور اشاعت میں مدارس کے اجراء وقیام میں دعاۃ اور مبلغین کے قیام وترسیل، ہدایت وارشاد امت کے تمام مفید وسائل میں اسے صرف کیا جائے گا اگرچہ کچھ فقہاء اور مفسرین کی جماعت فی سبیل اللہ کے مَد کو اتنا عام رکھا ہے کہ اس میں مساجد کی تعمیر کنوؤں کی کھدائی وغیرہ کو اس میں داخل کیا ہے لیکن ہم عرض کر آئے ہیں کہ اسے اتنا عام رکھنا صحیح معلوم نہیں ہوتا ہم اگر کوئی اسے عام رکھنے پر مصر

ہے تو ٹھیک ہے کیونکہ اہل علم کی ایک جماعت اس کی طرف گئی ہے۔ واللہ اعلم بحقیقة الحال .

ضمیمہ

مختلف مفسرین اور دیگر محققین کے اقوال وعبارات دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوا ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد جہاد اور صرف قتال فی سبیل اللہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے دین کی اشاعت کے لیے یا دین کی مدافعت یا اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی بلندی کے لیے کیے گئے وہ سارے کام جہاد شمار ہوں گے۔

لہٰذا ایسے تمام کاموں کو فی سبیل اللہ کا لفظ شامل ہو گا اس کے متعلق تتبع واستقراء کے بعد یہ سب شقیں داخل سمجھ میں آتی ہیں۔ اللہ کی راہ میں لڑنا اور اس راہ میں لڑائی کرنے کے لیے جن اسباب واسلحہ یا سامان نقل وحرکت کی ضرورت ہو ان پر خرچ کرنا، دین کی اشاعت کے لیے مبلغین بھیجنا اور ان پر خرچ کرنا ان کے لیے سفر وغیرہ کی سہولیات مہیا کرنا دین کی اشاعت کے لیے رسائل وکتب کی اشاعت ، مدارس وغیرہا کیونکہ ان اداروں میں بھی اللہ کے دین مدافعت اور اس کی تبلیغ کے لیے مجاہد تیار کیے جاتے ہیں۔

بہرحال مذکورہ صورتیں اس لفظ میں شامل ہیں چونکہ لائبریری ان صورتوں میں سے کسی میں بھی داخل معلوم نہیں ہوتی، لہٰذا یہ فی سبیل اللہ میں داخل نہیں۔ گو کچھ علماء نے اس لفظ کو نہایت عام رکھا ہے مگر یہ اس لیے صحیح نہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی یہ منشاء ہوتی تو پھر زکوٰۃ کے لیے یہ آٹھ مصارف مقرر ہی نہ فرماتا بلکہ صرف فی سبیل اللہ کا لفظ ہی اس کیے لیے کافی ووافی تھا یہ تمام وجوہ خیر کو شامل اور محیط ہو جاتا مگر نہیں اللہ تعالیٰ نے آٹھ مصارف مقرر فرمائے، لہٰذا ضرور فی سبیل اللہ سے کوئی خاص مد مراد ہو گا اور وہ محققین کے کہنے کے مطابق وہ ہے جو بیان کیا گیا۔ مزید کامل علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب

کپاس کی زکوٰۃ

سوال: احادیث نبوی میں ہر اس چیز کا نام مذکور ہے جس پر زکوٰۃ فرض ہے۔ مگر کپاس (پھٹی یا روئی) کے متعلق بندہ ناچیز کی نظروں سے کچھ بھی نہیں گذرا ہے کیا واقعی ان پر زکوٰۃ نہیں ہے؟

الجواب بعون الوهاب: روئی (پھٹی) وغیرہ پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ یہ میری تحقیق ہے اور اس میں میرے ساتھ کئی دوسرے محدث شامل ہیں۔ مثلاً امام سفیان ثوری رحمہ اللہ علیہ، شعبی، حسن بصری، حسن بن صالح رحمہم اللہ وغیرہم شامل ہیں۔ دلیل یہ ہیں:

1 ......: مسلم شریف کی حدیث ہے:

((ليس في ما دون خمسة اوسق من تمر اوحب صدقة .))[1]

''یعنی پانچ وسق سے کم کھجور خواہ اناج (غلہ) پر زکوٰۃ نہیں ہے۔''

مسلم کی دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((ليس في حب ولا تمر صدقة حتى يبلغ خمسة اوسق .))[2]

''یعنی کھجوریں اور اناج میں زکوٰۃ نہیں ہے جب تک وہ پانچ اوسق تک نہ پہنچ جائیں۔''

معلوم ہوا کہ اناج اور کھجور کے علاوہ میں زکوٰۃ نہیں ہے اس سے بھی بڑھ کر صریح حدیث دوسری ہے جو کہ امام حاکم، دارقطنی، طبرانی اور بیہقی میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ بیہقی رحمہ اللہ علیہ کے مطابق اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ سند متصل ہے کوئی بھی انقطاع نہیں ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو یہ حدیث اس وقت ارشاد فرمائی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو یمن کی طرف وہاں کے لوگوں کو اپنی تعلیم سکھانے کی غرض سے بھیج رہے تھے۔ (بحواله عون المعبود في شرح سنن ابي داؤد)

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب ليس فيما دون خمسه اوسق صدقة، رقم الحديث:٢٢٦٣ .

[2] بحواله فتح الباري، جلد ٣، صفحه ٤٢، رقم الحديث:٢٢٦٨ .

وہ حدیث یہ ہے:

((فقال لا تاخذ الصدقة الا من هذه الاربعة .))

''یعنی آپ ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ نہیں لو مگر ان چار چیزوں سے یعنی ① جو ② کھجوریں ③ منقیٰ ④ اور گندم۔''

مطلب کہ آپ ﷺ نے صراحت کر دی کہ ان چار چیزوں کے علاوہ میں صدقہ (زکوٰۃ) نہیں ہے۔ اگر زیادہ سے زیادہ مسلم شریف کی حدیث کے موجب یا قیاس کے ساتھ دوسرے اناج مثلاً، جوار، باجرہ، مکئی وغیرہ کو شامل کیا جائے تو شامل کیا جا سکتا ہے باقی چیزیں ان میں شامل نہیں ہیں۔ (واللہ اعلم) باقی اشیاء کو فروخت کرنے کے بعد جو رقم ملے اس پر سال بھر گذر جائے تو مذکورہ حساب کے مطابق پیسوں پر زکوٰۃ ہو گی۔ واللہ اعلم بالصواب

گندم کی زکوٰۃ

سوال: کتنی گندم پر زکوٰۃ ہو گی اور وسق کا اندازہ کیا ہے، پوری وضاحت کے ساتھ بیان کریں؟

الجواب بعون الوهاب: جس طرح اوپر ذکر کر کے آیا ہوں کہ گندم وغیرہ پر زکوٰۃ اس وقت لگے گی جب وہ گندم پانچ وسق کے اندازے میں ہو گی۔ پانچ وسق سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ جس طرح مسلم شریف کی حدیث ذکر کی کہ پانچ وسق یا اس سے برابر پر ہی زکوٰۃ کی ادائیگی ہو گی اور کتنی زکوٰۃ نکالی جائے گی اس کے بارے میں بھی اوپر لکھ چکا ہوں کہ ''عشر'' یا ''نصف عشر'' باقی وسق کا اندازہ یا ماپ کیا ہے؟ اس کے لیے گذارش ہے کہ ایک وسق میں ساٹھ صاع ہوتے ہیں، تو پانچ وسق میں تین سو (300) صاع ہوتے ہیں اور ایک صاع کی تول جنس میں الگ الگ ہو گی ہم نے گندم کی تول کر کے دیکھی ہے وہ پونے تین سیر بنتی ہے اور باقی جنسیں بھی تھوڑی تفاوت کے ساتھ گندم کے حساب کے برابر ہوں گی یعنی کم وبیش اس حساب سے ایک وسق میں 165 سیر ہوئے تو پانچ اوسق میں 825 سیر ہوئے اور ان

تمام سیروں کے من ہوئے 20.25 یعنی 20 من اور پچیس سیر۔

حاصل کلام کہ جس آدمی کے پاس اتنی گندم ہے یعنی بیس من 25 سیر تو اس پر زکوٰۃ لگے گی اور اس سے کم مثلاً 16,15 من پر فرضی زکوٰۃ نہیں لگے گی لیکن اگر کوئی خیر نکالنا چاہتا ہے تو نکال سکتا ہے۔ یعنی گندم کا نصاب یہی ہے بیس من پختہ اور پچیس سیر۔ واللہ اعلم بالصواب

سونے کی زکوٰۃ

سوال: سونے کا صحیح نصاب کیا ہے؟ سننے میں آیا ہے کہ مرحوم عبدالستار رحمۃ اللہ علیہ نے 120 روپیہ کا نصاب مقرر کیا ہے؟

الجواب بعون الوهاب: سونے کے نصاب کے متعلق صحیح بات یہ ہے کہ اس کا نصاب 20 دینار یا 20 مثقال ہے باقی جو مرحوم عبدالستار رحمۃ اللہ علیہ نے جو 120 روپیہ جتنے سونے کو نصاب ٹھہرایا ہے اس کی دلیل ہمیں نہیں مل سکی ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ نصاب کس بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ ہمارے لکھے ہوئے نصاب پر یہ دلائل ہیں۔

1 :...... امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب سنن کبریٰ میں یہ حدیث لائے ہیں:

((عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ انه قال هاتوا الی ربع العشور من کل اربعین درهما درهم ولیس علیك شیءٌ حتی یکون لك مائتا درهم وحال علیه الحول ففیها خمس دلاهم ولیس علیك شئی حتی یکون لك عشرون دیناراً فاذا کانت لك وحال علیه الحول ففیها نصف دینار فما زاد فبحساب ذالك، قال ولا ادری أعلی رضی اللہ عنہ یقول بحساب ذالك ام رفعه، الی النبی ﷺ .))[1]

[1] بیهقی، کتاب الزکاة، باب نصاب الذهب وقدر الواجب فیه اذا حال علیه الحول، جلد٤، صفحه ١٣٨، ط: نشر السنه.

اس حدیث میں سونے اور چاندی پر زکوٰۃ کے نصاب کا بیان ہے۔ چاندی کے متعلق بعد میں عرض کیا جائے گا۔ سونے کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ وہ سونا 20 دینار کے اندازے کو پہنچے (یاد رکھنا چاہئے کہ دینار اور مثقال ایک ہی بات ہے اس کا وزن بعد میں عرض رکھا جائے گا۔) پھر جب 20 دینار ہوئے اور ان پر سال گذر گیا تو آدھا دینار ادا کرنا پڑے گا۔ اور 20 دینار سے جتنا بھی زیادہ ہو گا اس کا وہی حساب لگایا جائے گا یعنی چالیسواں حصہ اور راوی کا یہ کہنا کہ پتہ نہیں کہ (فمازاد فبحساب ذالك) کے الفاظ حضور ﷺ کے ہیں یا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہیں۔

ان الفاظ سے کوئی خاص واسطہ نہیں ہے وہ الفاظ آپ ﷺ کے ہیں یا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہیں مطلب کہ سونے کا نصاب ثابت ہو گیا وہ ہے 20 دینار اس سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے، اگرچہ کم میں ایک یا آدھا ہی کیوں نہ ہو۔

نصب الرایہ میں حافظ زیلعی لکھتے ہیں کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شارح (مسلم شریف) فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے یا حسن ہے۔

❷:...... اسی طرح حافظ ابو محمد بن حزم مشہور محدث ظاہری اپنی مشہور کتاب المحلی میں تحریر فرماتے ہیں اس حدیث کا راوی جریر ثقہ راوی ہے۔ انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے جو دو راوی عاصم بن ضمرہ وحارث بن عبداللہ ہیں ان سے مسند ذکر کیا ہے۔ چونکہ جریر ثقہ راوی ہے اس لیے اس کی حدیث کو مسند کر کے ذکر کرنا معتبر ہے، لہٰذا حدیث میں ارسال وغیرہ کی علت پیش نہیں کی جاسکتی اور حافظ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تحسین کی ہے۔

لہٰذا یہ حدیث اس قابل نہیں ہے کہ اس کو ضعیف گردانا جائے۔ اسی طرح اس حدیث کو ترمذی نے بھی مرفوع ذکر کیا ہے جو کہ ابو عوانہ کے طرق سے ہے اور وہ ابو اسحاق سے روایت کرتا ہے وہ عاصم بن ضمرہ سے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں۔

زیادہ سے زیادہ اس حدیث کی یہ علت بیان کی جاسکتی ہے کہ اس کی سند میں ابو اسحاق

ہے اور وہ مدلس راوی ہے اور اس حدیث میں عن کے ساتھ روایت کرتا ہے۔ "حدثنا" یا "سمعت" کے الفاظ نہیں کہتا۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ تدلیس کی وجہ سے سند میں ضعف ضعیف پیدا ہوتا ہے، نہ کہ سخت ضعف اور اتنا ہلکا ضعف کتنی ہی طریقوں سے دور ہو سکتا ہے۔ مثلاً اصول حدیث کے جاننے والوں کو خوب معلوم ہے کہ اگر کسی مرفوع حدیث کی سند میں ایسا خفیف ضعف ہے تو وہ دوسری ایسی حدیث اگرچہ وہ مرفوع نہیں موقوف ہو یعنی صحابی کا قول ہو تو اس سے وہ حدیث قوی ہو جاتی ہے اور اس کا ہلکا ضعف رفع ہو جاتا ہے تو بعینہٖ اسی طرح اس مرفوع حدیث کی سند میں تدلیس کی وجہ سے ہلکا سا ضعف پیدا ہوا ہے۔ جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول موقوف نے جو کہ صحیح سند کے ساتھ ہے اس نے قوی کر دیا ہے۔

لہٰذا وہ ضعف سے نکل کر حسن لغیرہ کے درجہ تک پہنچ جائے گی اور حسن لغیرہ حدیث بھی صحیح حدیث کی طرح قابل حجت ہے۔ (كما لا يخفى على ماهر الاصول)

مگر اس صورت میں ایسی حسن لغیرہ حدیث جو کسی صحیح حدیث کی مخالف ہو تو پھر وہ قابل نہیں ہوتی۔ لیکن اس مسئلہ میں دوسری کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں ہے جو اس کے مخالف ہو اس لیے یہ حدیث امام نووی اور حافظ ابن حزم وغیرہما کے مطابق حسن ہے اور قابل حجت ہے۔

۳:...... ابن ماجہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ابن ماجہ عبید اللہ بن موسیٰ سے روایت کرتا ہے کہ:

((حدثنا ابراهيم بن اسماعيل عن عبدالله بن واقد عن ابن عمر رضی اللہ عنہ وعائشة رضی اللہ عنہا ان النبي ﷺ كان ياخذمن كل عشرين ديناراً فصاعدًا نصف دينار ومن الاربعين ديناراً دينارًا .))[1]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ بے شک نبی کریم ﷺ 20 دینار میں سے نصف دینار اور چالیس دیناروں میں سے ایک دینار بطور زکوٰۃ لیتے تھے۔"

[1] سنن ابن ماجه، كتاب الزكاة، باب زكوٰة الورق والذهب، رقم الحديث ١٧٩١ .

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ سونے کا کم از کم نصاب 20 دینار ہے۔ اس لیے آپ نے 20 دینار میں سے آدھا دینار لیا ہے۔

اس حدیث کی سند میں باقی راوی تو صحیح ہیں لیکن ابراہیم بن اسماعیل ایک ایسا راوی ہے جن کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ضعیف ہے۔ لیکن چونکہ اسی راوی سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں استشہاد کیا ہے۔ (باب بدء الخلق) میں پھر کہا جائے گا کہ یہ راوی اتنا ضعیف نہیں ہے بلکہ معمولی ضعف کا حامل ہے۔ ورنہ شدید ضعف کے حامل راوی کے ساتھ امام محدثین بخاری رحمہ اللہ جیسا آدمی استشہاد ہرگز نہیں لیتا۔ بہر حال یہ ساری حدیثیں مل کر کافی قوت اور مضبوطی حاصل کر لیتی ہیں۔ حسن سے کم درجہ کی بالکل نہیں ہیں۔

لہٰذا یہ قابل حجت ہیں اور جو بات ان سے ثابت ہوتی ہے وہی محقق کا مسلک ہے جس سے معلوم ہوا سونے کا نصاب 20 دینار یا مثقال ہے اب دیکھتے ہیں مثقال کا وزن کیا ہے۔ مثقال کی تول ہے۔ ساڑھے چار ماشہ اس حساب سے 20 مثقال کا وزن ہوگا 90 ماشہ اور 90 ماشہ معنی ساڑھے سات تولے مطلب کہ جس آدمی کے پاس ساڑھے سات تولے سونا ہوگا کسی بھی صورت میں بنے بنائے زیورات یا خالص تو اس پر آدھا مثقال زکوٰۃ لگے گی یعنی سوا دو ماشہ اگر خالص ہے بنا بنایا زیور نہیں ہے تو وہ دے اگر زیورات وغیرہ بنے ہوئے ہیں تو حساب کر کے اس کی قیمت بطور زکوٰۃ ادا کرے گا جو موجودہ ہوگی اور اگر وہ سونا ساڑھے سات تولہ سے اوپر ہے تو بھی اس کے مطابق حساب کر کے اس کی ادائیگی کرے گا۔ اور اس حساب سے جو لکھا گیا ہے وہ بالکل آسان اور قابل فہم ہے۔

هٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

چاندی کی زکوٰۃ

سوال: احادیث صحیحہ سے چاندی کے نصاب سے آگاہ فرمائیں گے؟

الجواب بعون الوهاب: چاندی کا جو نصاب بخاری ومسلم وغیرہما تمام کتب میں مقرر

ہے وہ ہے دوسو درہم اور دوسو درہم مساوی ہیں۔140 مثقال جو ساڑھے باون تولہ بنتے ہیں۔

مطلب کہ اگر کسی کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی ہوگی تو اس پر چالیسواں حصہ زکوٰۃ لگے گی وہ بنے گی ایک تولہ پونے چار ماشہ یا یوں سمجھیں ایک تولہ چار ماشہ زکوٰۃ دی جائے گی۔ اور جو اس سے اوپر ہوگی اس کی اس حساب سے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔ اسی طرح کسی آدمی کے پاس ساڑھے باون روپیہ ہیں تو اس پر بھی ایک روپیہ پانچ آنہ زکوٰۃ لگے گی کیونکہ روپیہ بھی چاندی کی ذات ہے اور ساڑھے باون سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ اگر زیادہ ہے تو اوپر کے طریقہ کے مطابق حساب کر کے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔ هٰذا ما ظهر لهٰذا الحقير الفقير الى الله وهو اعلم بالصواب ...... وصلى الله على خير خلقهٖ سيدنا ومرشدنا محمد وآلهٖ واصحابه اجمعين. (آمين)

اوزان کا وزن

سوال: مد، وسق، درہم، دینار کا انگریزی میزان کے حساب سے کتنا کتنا وزن ہے؟

الجواب بعون الوهاب: مد کا مطلب پائی (یعنی تول کا ایک قسم کا پیمانہ) ہے ہم مد مدنی کے وزن کے متعلق کافی عرصہ سے سرگرداں تھے کہ وزن کے اعتبار سے اس میں کتنی گنجائش ہے، بعد میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے بھائی بدیع الدین شاہ رحمہ اللہ ایک سال حرمین شریفین گئے وہاں سے مولوی عبدالحق صاحب بہاولپوری شیخ الحرم فی مکۃ المکرمۃ سے ایک مد کا پیمانہ لے کر آئے جو آپ ﷺ کے زمانہ کے مد کے پیمانے سے تقابل کر کے بنائی گئی تھی اور اس کی سند بھی انہیں مولانا موصوف سے موصول ہوئی جو سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے پھر بھائی صاحب نے اسی سے تقابل کر کے ایک اور پیمانہ بنوایا اس کے بعد بھائی صاحب سے میں نے وہ پیمانہ لے کر بعینہٖ اسی کے وزن کے مطابق ایک پیمانہ بنوایا اور بھائی صاحب سے اس کی سند بھی حاصل کی۔ فالحمد لله على ذالك!

بہرحال مد کا وزن مختلف چیزوں کا مختلف ہوتا ہے۔ ہم نے وزن کیا تو اس میں پانی کے

66 تولوں کی گنجائش ہوتی ہے اور گندم کا وزن کیا تو اس میں 55 تولے آتے ہیں یعنی آدھا کلو اور مزید 15 تولے اس حساب سے صاع چار مدوں کا مجموعہ ہے ایک صاع گندم کا وزن پونے تین کلو ہوگا اور یہی گندم کی مقدار ہم فطرہ میں ادا کرتے ہیں۔

درہم کا وزن تین ماشے ہوتا ہے۔

دینار اور مثقال ایک ہی بات ہے اور مثقال کا وزن ساڑھے چار ماشہ ہوتا ہے اس حساب سے سونے کا نصاب 20 مثقال ہوا اور ایک مثقال ساڑھے سات تولے کا بنتا ہے یعنی ساڑھے سات تولہ وزن یا اس سے زیادہ سونا ہے تو زکوٰۃ فرض ہوگی۔

وسق: ایک وسق 60 صاع کا ہوتا ہے۔ اور صاع مدنی کا وزن گندم کے اعتبار سے جیسا کہ اوپر ذکر کر آئے ہیں پونے تین کلو ہے تو ساٹھ صاع کا وزن 165 کلو اور منوں کے اعتبار سے 4 من پانچ کلو وزن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ وزن گندم کا ہے البتہ باجرہ ایک مد میں گندم سے زیادہ آتا ہے یعنی ہر جنس کے متعلق صحیح خبر تب ہی پڑے گی جب ہر جنس کو اس مد میں ڈال کر وزن کر کے دیکھا جائے۔ ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

مقروض پر زکوٰۃ

سوال: مقروض پر زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الوهاب: جس آدمی پر قرض ہے اس کے پاس پیسوں میں سے رقم اندازاً ایک ہزار روپیہ ہے تو اس کا 500 مثلاً قرضہ ہے اس کو اتار کر باقی ایک ہزار سے جو بچے اس پر اس وقت سے لے کر اگلے سال آنے تک قرضہ کے علاوہ باقی بچی ہوئی رقم پر زکوٰۃ لگے گی۔ یعنی ساڑھے باون روپیہ پر زکوٰۃ لگے گی جو کہ چالیسواں حصہ ہے۔ اور ساڑھے باون روپیہ کا چالیسواں حصہ 1.8 ڈیڑھ روپیہ ہے اس طرح اوپر جتنے بھی ہوں گے مثلاً ایک ہزار میں سے پانچ سو قرضہ میں چلے گئے تو باقی پانچ سو بچتے ہیں ان کا حساب کر کے چالیسواں

حصہ دیا جائے گا۔(جب ہاتھ میں آنے کے بعد ان پر سال گذر جائے) لیکن اگر وہ ایک ہزار جو اس کے پاس ہے وہ ہے پچاس من گندم کی قیمت یعنی اس پر پانچ سو روپیہ قرضہ تو ہے لیکن آبادی سے اس کو نکلی (گندم) حاصل ہوئی ہے پچاس من جس کی قیمت فی من 20 روپیہ کے حساب سے فقط ایک ہزار ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تو پھر زکوٰۃ اول دے جائے گی اور قرضہ یہ علیحدہ ہے باقی لین دین دو قسموں کا ہوگا۔ ایک وہ جو زمین کے متعلق ہے مثلاً بیج کا خرچہ، بیل کے جوڑے کی محنت اور خرچہ ھاریوں کا خرچہ اور مزدوری اور کھاد وغیرہ کے اخراجات جیسے لین دین اس سے قطعاً الگ نہیں کر سکتے البتہ کھیتی کو پانی پلانے کے بارے میں جو خرچہ ہوتا ہے شریعت مطہرہ نے اس کے بارے میں زکوٰۃ میں کمی وبیشی رکھی ہے یعنی جس زمین کو پلانے میں کم محنت اور کم خرچہ ہے اس کی پیدائش سے ''عشر دسواں حصہ'' دینا ہے اور جو زمین سخت مشقت کے ساتھ سیراب کی جاتی ہے اس کی پیدائش سے ''نصف عشر'' (بیسواں حصہ) ہے۔ مثلاً جن کی زمینیں بارش کے پانی پر آباد ہیں۔

ان کو زمین سیراب کرنے میں کوئی خاص مشقت نہیں اٹھانی پڑتی لہٰذا ان پر ''عشر'' (دسواں حصہ ہے) لیکن وہ زمین جن کو پانی کھینچ کر اور مشقت کے ساتھ پلایا جاتا ہے ان کی پیداوار سے 20 واں حصہ یعنی نصف عشر ہے۔ اپنے ملک میں جو زمینیں چھوٹی نہروں، واٹر کورسوں یا ٹیوب ویل کے ذریعے پلائی جاتی ہیں۔ وہ ساری کی ساری ''نصف عشر'' کی فہرست میں آتی ہیں۔

کیونکہ اس پانی کے حصول میں اگرچہ اتنی مشقت نہیں ہوتی کبھی کبھی کھدائی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اس پر ٹیکس اور آبیانہ وغیرہ لگتا ہے شریعت مطہرہ نے ہمارے لیے یہ سہولت رکھی ہے کہ ایسی صورتوں میں ''نصف عشر'' کی ادائیگی ہوگی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس آدمی کو پچاس من گندم حاصل ہوئی وہ اس کا ''نصف عشر'' جو کہ ڈھائی من بنتا ہے وہ ادا کرے گا باقی جو بھی بچتی ہے۔ مثلاً ساڑھے سینتالیس من وہ چاہے رکھ دے چاہے خرچ کر دے وہ اس کی مرضی ہے۔ مطلب کہ زکوٰۃ اس پر صرف ڈھائی

من ہی ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب!

زکوٰۃ کی تقسیم

سوال: زکوٰۃ کے مصارف کون سے ہیں؟

الجواب بعون الوهاب: زکوٰۃ دینے کی جگہیں یا مصارف اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کریم میں آٹھ بیان کیے ہیں۔

❶ فقراء ❷ مساکین ❸ زکوٰۃ لینے والے (عاملین) ❹ جن کے دلوں میں اسلام کی الفت (محبت) پیدا کرنی ہو۔ مثلاً نومسلم ❺ غلام یا قیدیوں کی آزادی کے لیے۔ ❻ مقروض پر۔ ❼ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے راستے میں مثلاً جہاد، حج، مدارس اور مسجدوں وغیرہ یعنی وہ کام جو خالص دینی نقطہ نظر یا دین کی حفاظت کے لیے کیے جائیں۔ ❽ اور مسافروں کو مثلاً کوئی آدمی اپنے ملک میں تو غنی (دولت مند) ہے لیکن کسی دوسرے ملک میں جائے اور اتفاق سے کنگال ہو جائے تو اس کو بھی زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ لیکن وہ زکوٰۃ بنو ہاشم، بنی مطلب، بنی عباس اور آل رسول سادات کو دینا ہرگز جائز نہیں ہے۔

نوٹ:...... فقیر اور مسکین میں یہ فرق ہے کہ فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ ہو لیکن شرعی نصاب سے کم ہو یا اتنا ہو کہ روزانہ کمائے اور کھائے بچت اس کے پاس نہ ہوتی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

مانع الزکوٰۃ کی نماز

سوال: زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے کی نماز قبول نہیں۔ (حدیث مبارکہ) بے نمازی کا کوئی عمل قبول نہیں۔ (حدیث مبارکہ) کی مکمل وضاحت فرمائیں؟

الجواب بعون الوهاب: سائل کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ سوال کی ابتدا میں حدیث کے نام سے چند الفاظ کا ترجمہ کر کے لکھتا چلا جاتا ہے لیکن اس حدیث کا کوئی حوالہ لکھنے کی

ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا یہ طریقہ کار صحیح نہیں توحید کے متعلق سوال میں بھی موصوف نے یہ طرز عمل اختیار کیا تھا لیکن وہ حدیث چونکہ مشہور تھی اور صحیحین وغیرہما کتب حدیث میں موجود ہے۔ لہٰذا اس کا جواب تو اپنے ناقص علم کے مطابق عرض کر دیا لیکن اس سوال میں حدیث کے جو الفاظ ذکر کیے گئے ہیں ان الفاظ سے مروی احادیث مجھے یاد نہیں کہ کس کتاب میں مروی ہیں۔

اگر کتب احادیث کے دفاتر کی چھان بین کرتے ہیں تو اس کے لیے کافی وقت درکار ہے اور نتیجہ کا یقین نہیں کہ کیا نکلتا ہے۔ لہٰذا سائل پر لازم تھا کہ ان الفاظ سے مروی کے روایات متعلق کسی حدیث کی کتاب کا حوالہ درج کرتا۔ تاہم سائل نے ان احادیث کی بناء پر جو سوال وارد کیا ہے اس کے متعلق میں ذیل میں ذرا تفصیل سے اپنی گذارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس ضروری تفصیل کے بغیر مسئلہ واضح نہیں ہوگا۔ وباللّٰہ التوفیق وھوم منعم الرفیق!

اس بات میں ذرا شک نہیں کہ نماز اور زکوٰۃ ایمان کے اہم اجزاء ہیں اور اسلام کے نہایت عظیم رکن ہیں۔

دلیل نمبر 1:......

﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (التوبة: ٥)

''جب حرمت والے مہینے گذر جائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور انہیں پکڑو اور ان کا گھیراؤ کرو اور ہر گھات میں بیٹھ جاؤ پھر اگر وہ شرک سے توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انہیں چھوڑ دو۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شرک سے توبہ ثابت ہونے کے علاوہ نماز کی اقامت اور زکوٰۃ کی ادائیگی نہایت ضروری ہے تب جا کر مشرکین کی جان بخشی ہوگی اور اس سورۃ میں

آیت نمبر ۱۱ میں یہ الفاظ ہیں:

﴿فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ﴾

(التوبة: ۱۱)

''یعنی اگر یہ مشرکین شرک سے تائب ہو جائیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔''

اس آیت کریمہ نے صاف ظاہر کر دیا کہ شرک سے توبہ کرنے کے بعد جب تک نماز قائم نہ کریں اور زکوٰۃ ادا نہ کریں تب تک اسلامی اخوت میں داخل نہیں ہو سکتے۔

سورۃ النساء ۱۰۲ میں صلاۃ الخوف کی ترتیب سمجھائی گئی ہے، یعنی جنگ اور خوف کی حالت میں بھی نماز ترک نہیں کرنی البتہ اس کا خاص طریقہ وترتیب سمجھایا گیا اور آخر میں ارشاد فرمایا کہ:

﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ (النسآء: ۱۰۳)

''بے شک مومنین پر نماز مقررہ وقت پر ادا کرنا فرض ہے۔''

سورۃ البقرۃ ۲۳۹ میں ارشاد ربانی تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا﴾ (البقرة: ۲۳۹)

''اگر تم حالت خوف میں ہو یا پیدل ہو یا سوار ہو تب بھی نماز ادا کرو۔''

یعنی ایسی تشویشناک حالت میں بھی ترک نماز کی اجازت نہیں۔ سخت بیمار ہے تو بیٹھ کر پڑھے بیٹھ کر نہیں پڑھ سکتا تو لیٹ کر اشاروں سے پڑھے۔ نماز کی اہمیت اس سے بھی معلوم ہوتی ہے کفار کو جہنم کے عذاب کے لیے کفر ہی کافی ہے۔ تاہم انہیں ترک نماز کا عذاب بھی ہوگا۔

جس طرح سورۃ المدثر میں ہے کہ اہل جنت جہنمیوں سے پوچھیں گے کہ تم لوگوں کو جہنم میں کس چیز نے داخل کیا؟ وہ جواباً کہیں گے:

﴿قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ﴾ (المدثر: ٤٣)

''ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے۔''

یقیناً زکوٰۃ بھی نماز کی طرح فرض ہے نماز بدنی عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی عبادت ہے

اس کا منکر بھی کافر و مشرک ہے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ سے قتال کیا قرآن کریم اور صحیح احادیث مبارکہ میں مانعین زکوٰۃ کے متعلق کتنی ہی سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں جن کا ذکر طوالت کا سبب ہے۔ تاہم نماز اور زکوٰۃ میں بہت فرق ہے۔ زکوٰۃ صرف صاحب نصاب پر ہے جو نصاب کا مالک نہیں اس پر نہیں اور فرض بھی سال میں صرف ایک مرتبہ ہے، لیکن نماز ہر ایک پر فرض ہے۔ امیر ہو یا غریب ہوں، بادشاہ ہو، یا رعیت، مرد ہو یا عورت ہو بیمار ہو یا تندرست ہو سفر میں ہو یا حضر میں ہر ایک پر ہر دن و رات پانچ وقت فرض ہے دنیا میں مسلمان کی علامت بھی یہی ہے کیونکہ زکوٰۃ ہر کسی پر فرض نہیں۔

لہٰذا جو باقاعدہ نماز پڑھتا ہو وہ مسلمان و مومن ہے اور جو تارک نماز ہے وہ ہماری اسلامی برادری سے (قرآن کریم کی مذکورہ بالا نص کے مطابق) خارج ہے۔ اس لیے کہ ایمان ایک ایسی چیز ہے جو دل سے تعلق رکھتی ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی دوسری مخلوق اطلاع نہیں پا سکتی۔ لہٰذا ایمان اور سچے اسلام کی ظاہری علامت یہی نماز رکھی گئی ہے۔ اسی طرح اگر نمازی ہوگا تو قبر میں بھی اسے نماز یاد آئے گی اور منکر و نکیر سے کہے گا مجھے چھوڑ دو میں نماز پڑھتا ہوں یعنی یہ ایمان کی علامت قبر میں بھی قائم رہے گی اسی طرح تیسری اور آخری منزل آخرت میں بھی اسی نماز اور وضو کی وجہ سے اس کے اعضاء وضو کے نور سے چمک رہے ہوں گے اور یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کی نشانی ہوگی اور دیگر امتوں میں یہ نشانی نہ ہوگی۔ پھر جو کوئی شخص تارک نماز ہے، اس کے لیے اس طرح کا کوئی امتیاز و علامت نہ ہوگی۔

(جس طرح مسند احمد وغیرہ میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے) اس کا حشر قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن ابی خلف کے ساتھ ہوگا اور یہ بھی صحیح حدیث میں وارد ہے کہ جس نے بھی جان بوجھ کر نماز ترک کی اس نے کفر کیا اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

((من ترك صلاة متعمداً فقد كفر .)) (اتحاف : ٣ـ١٠)

یہ مشہور حدیث ہے تاہم ان سب باتوں کے باوجود اگر کوئی شخص نماز کی فرضیت پر

ایمان رکھتا ہے اس کی فرضیت کا انکار نہیں کرتا اس بارے میں علماء کرام میں اختلاف ہے، تاہم تمام مکتب فکر کے محققین ایسے شخص کے متعلق (جو کفر کا اطلاق ہوا ہے) اس کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ یہ کفر مخرج عن الملۃ نہیں۔ راقم الحروف بھی اسی زمرہ میں شامل ہے۔

①:...... جس طرح اعمال صالحہ ایمان کے اجزاء ہیں اسی طرح اعمال فاسدہ (گناہ) کفر کے اجزاء ہیں، نماز بھی اعمال کے باب میں داخل ہے اور یہ ایمان کا اہم جز ہے اس کا ترک گناہ کبیرہ ہے اور یہ کفر کے اجزاء میں سے ایک سنگین جز ہے بسا اوقات کسی چیز کے اہم جز پر کل کا اطلاق کیا جاتا ہے اور یہ صرف عربی زبان میں نہیں بلکہ ہر زبان میں مستعمل ہے۔ مثلاً کسی انسان، گھوڑے یا گدھے وغیرہ کے صرف سر کو دیکھ کر ہم کہا کرتے ہیں کہ یہ آدمی ہے اور یہ گھوڑا ہے یہ گدھا ہے حالانکہ انسان صرف سر کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ دیگر کئی عضو ہیں جن کے مجموعہ کو انسان کہا جاتا ہے۔ لیکن سر ایک ایسا اہم عضو یا جز ہے جس کے مقابلے میں دیگر عضو وجز اتنے اہم نہیں، اس لیے صرف سر پر کل، انسان، گھوڑے، گدھے کا اطلاق کیا گیا لیکن اگر کسی انسان کی ٹانگ یا بازو دیکھ کر اس طرح نہیں کہا جاتا کہ یہ انسان ہے بلکہ کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کی ٹانگ یا بازو ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک چیز کے نہایت اہم جز پر کل کا اطلاق اہل زبان کے ہاں معروف ہے۔

②:...... اسی طرح کسی شخص وغیرہ میں کسی حیوان وغیرہ کے ساتھ کسی خاص صفت میں مشابہت باتم وجوہ موجود ہوتی ہے تو اس صفت مشابہت کو مدنظر رکھ کر اس پر اس حیوان وغیرہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جائے کہ: "زیدٌ اسدٌ (زید شیر ہے) ظاہر ہے کہ زید شیر کے ساتھ ظاہری جسمانی ساخت وبناوٹ کے لحاظ سے ہرگز مشابہ نہیں لیکن شیر کی شجاعت عام طور پر مشہور ہے اس لیے زید پر اس کی اسی صفت کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے اسد (شیر) کا اطلاق کیا گیا اسی طرح کسی کند ذہن یا بے وقوف شخص کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ تو کوئی گدھا ہے اس میں بھی یہی حقیقت ہے کہ حمار (گدھے) کی صفت کے ساتھ آدمی کو مشابہ قرار دے کر اسے گدھا کہا گیا۔ حالانکہ ان اطلاقات کے باوجود کوئی بھی عقلمند آدمی یہ نہیں کہے گا

کہ واقعتاً وہ آدمی شیر (پھاڑنے والا جانور) یا حقیقی طور پر گدھا ہے۔

③:...... کفر کا اطلاق شریعت میں کفران نعمت (ناشکری) پر بھی ہوا ہے۔مثلاً صحیح بخاری وغیرہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عورتوں سے فرمایا کہ مجھے دیکھنے میں آیا ہے کہ تم اکثر جہنم کی آگ میں ہوانہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ کس بنا پر؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "تکفرن" تم کفر کرتی ہوانہوں نے پھر دریافت کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: شوہروں کی ناشکری کرتی ہو۔شوہر ہمیشہ عورت سے بہتر طریقے سے پیش آئے گا لیکن کبھی اتفاقاً کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف کر بیٹھا یا اس کا کہا نہ مانا تو وہ کہے گی تو نے میرے ساتھ کبھی بھی احسان نہیں کیا۔

بہر حال کفر کا اطلاق ناشکری پر بھی ہوا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں بھی متعدد مقامات پر "کفر یا کفور" وغیرہ الفاظ ناشکری کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔اسی طرح کفر کا اطلاق کفر مخرج عن الملۃ سے کم درجے پر بھی ہوا ہے۔ ایسی احادیث پر امام بخاری رحمہ اللہ علیہ نے "کفر دون کفر" کا باب منعقد فرمایا ہے۔

مثلاً صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ:

((سباب المسلم فسوق وقتاله كفر .)) ❶

"مسلمان کو برا بھلا کہنا فسق ہے اور اس سے قتال کرنا کفر ہے۔"

حالانکہ قرآن کریم سورۃ الحجرات میں ہے کہ:

﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾

(الحجرات : ٩)

"اگر مومنین کی دو جماعتیں آپس میں قتال کریں تو تم ان دونوں میں صلح کرادو۔"

یعنی مسلمان مسلمان کے ساتھ قتال کرنے کے لیے تلوار لے کر نکلا ہے لیکن تب بھی اللہ تعالیٰ اسے مومن کہتا ہے، پھر حدیث شریف میں اس پر جو کفر کا اطلاق ہوا ہے وہ اس لیے کہ

❶ صحيح بخاری، كتاب الايمان، رقم الحديث:٤٨ .

یہ قتال بہت بڑا گناہ ہے اور کفر کے اجزاء میں سے ایک اہم جز ہے کہ اس کی اہمیت وسنگینیت کے لحاظ سے جز پر کل کا اطلاق ہوا۔ یعنی ایک مسلمان کے ساتھ قتال کافر ہی کر سکتا ہے مؤمن کبھی بھی ایسی جرأت نہیں کرے گا۔

لہٰذا جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو مارنے کے لیے تیار ہوا ہے تو اس نے کفار کے ساتھ مشابہت اختیار کی پھر جب کند ذہن انسان کو گدھا کہا گیا اسی طرح کفار کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے والے پر کفر کا اطلاق ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی گدھا بن گیا ہے۔ اس کا مطلب کوئی بھی یہ نہیں اخذ کرتا کہ اس شخص نے واقعتاً گدھے کی شکل اختیار کر لی ہے بلکہ ہر کوئی یہی سمجھتا ہے کہ وہ آدمی بالکل بے وقوف اور کند ذہن بن گیا ہے۔

اسی لیے جو تارک نماز ہے اس نے چونکہ ایک نہایت سنگین جرم میں کفار کے ساتھ مشابہت اختیار کی ہے لہٰذا اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ کافر ہو گیا ہے۔ اس طرح محققین علماء بے نمازی کی نماز جنازہ پڑھنے کے قائل نہیں یہ بھی اسی لیے کہ اس نے نہایت سنگین جرم کیا ہے اس جرم کی پاداش میں بطور سزا اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اور اس طرح کا طرز عمل دیگر لوگوں کے لیے تنبیہ اور عبرت کا باعث ہے، آپ علیہ السلام تو مال غنیمت میں سے کوئی تقسیم سے پہلے کچھ چراتا تھا اس کی نماز جنازہ بھی ادا نہیں فرماتے تھے اور اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقروض کی نماز جنازہ بھی ادا نہیں فرمائی۔ حالانکہ مقروض یا مال غنیمت میں خیانت کرنے والا کافر نہیں ہے۔ ہاں البتہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ضرور ہوا ہے اسی طرح خودکشی کرنے والے پر بھی آپ نے نماز جنازہ ادا نہیں فرمائی۔

حالانکہ صحیح مسلم کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافر نہیں ہوا۔ صحیح مسلم میں ایسا غلام جو اپنے آقا سے بھاگ نکلے اسے بھی کافر کہا گیا لیکن وہاں پر بھی عبد آبق پر کفر کا اطلاق محض مبالغہ کے طور پر ہوا ہے لیکن اس سے مراد کفر مخرج عن الملۃ نہیں بلکہ کفر دون کفر مراد ہے۔

اس طرح کی دیگر امثلہ تلاش کرنے سے مل سکتی ہیں۔ اب ہم ایسے کچھ مثبت دلائل پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ تارک نماز (بشرطیکہ وہ اس کی فرضیت پر ایمان رکھتا ہو)

ایسا کافر نہیں کہ وہ اصلاً دین اسلام سے خارج ہو جائے یا دیگر مشرکین یا کفار کا طرح ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ابوداؤد، نسائی اور ترمذی میں ایک روایت مروی ہے جس کے متعلق محقق العصر علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ (شاہ صاحب کا یہ فتویٰ اس وقت کا تحریر کردہ ہے جس وقت علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ زندہ تھے جب کہ اب تو دونوں بزرگ علامہ البانی اور حضرت شاہ صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے رحمہما اللہ وادخلهما الجنة الفردوس: محمدی) مشکوٰۃ شریف کی تعلیقات میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اسی طرح امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مسند میں اور المستدرک حاکم میں بھی رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے اس کی سند بھی صحیح ہے۔

اس میں ہے کہ صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے سیدنا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن بندے کے اعمال میں سے سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا پھر اگر نماز کا عمل درست نکلا تو وہ کامیاب ہو گیا اور ناجی ہوا۔ اور اگر نماز میں فساد ہوا اور کمی ہوئی تو وہ خائب اور خاسر ہوگا پھر اگر فرض میں کسی کی کمی نکلے گی تو رب تعالیٰ فرمائے گا دیکھو اگر میرے بندے کی کوئی نفلی نماز ہے تو اس کے ذریعے اس کی فرض کی تکمیل کر دو۔ اسی طرح اس بندے کے باقی دیگر اعمال کے ساتھ بھی یہی طرز عمل اختیار کیا جائے گا، یعنی اگر فرائض میں کچھ کمی ہوگی تو وہ نوافل کے ذریعے مکمل کر دیے جائیں گے۔''

کسی روایت میں یہ تصریح ہے کہ نماز کے بعد زکوٰۃ اور پھر دیگر اعمال کے متعلق اسی طرح طرز عمل اختیار کیا جائے گا یہ بات بالکل ظاہر اور عیاں ہے کہ اگر تارک نماز کا کفر مخرج عن الملۃ ہو تو پھر (ایک کافر اور مشرک) جس کے کچھ نیک اعمال ہوں مثلاً سخاوت، یتیموں کا خیال رکھنا، صلہ رحمی وغیرہ وغیرہ تو وہ اس کے شرک وکفر کے نقصان کو پورا کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں پھر اگر تارک نماز کے نقصان کے تکمیل نوافل کے ذریعے کی جائے گی تو پھر معلوم ہوا کہ ترک نماز سے ایسا کافر نہیں ہوا کہ اصلاً ملت اسلامیہ سے خارج ہو جائے بلکہ ایک کبیرہ و سنگین گناہ کا مرتکب ضرور ہوا ہے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے چاہے اسے سزا دے یا پھر معاف کر دے۔ البتہ ایسے بے نماز شخص سے ہم دنیا میں مسلموں کا سا برتاؤ کریں گے کیونکہ اس دنیا میں ایک مسلمان کی یہ بہت بڑی علامت ہے کہ وہ نمازی ہوتا ہے۔ اگر نمازی نہیں ہے تو اسلامی برادری سے (بنص قرآنی) خارج ہے یہ اس لیے کہ وہ آدمی نماز کی فرضیت کا اگرچہ قائل بھی ہو لیکن ہمیں کیسے معلوم ہوگا؟ کیونکہ ایمان و یقین تو دل میں ہوا کرتے ہیں اور دل اور نیت وارادے پر اطلاع تو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں، لہٰذا ہمارے نزدیک اس کے اندرونی ایمان کے متعلق علم کے حصول کی کوئی ضرورت نہیں اس لیے ہم اسے اپنا مسلمان بھائی نہیں سمجھیں گے۔

باقی اللہ سبحانہ وتعالیٰ تو جانتا ہے۔ یہ بندہ نماز کی فرضیت کا منکر ہے اور منکر نہیں لیکن سستی اور غفلت کے سبب اس کے ترک کا مرتکب ہوا ہے، لہٰذا قیامت کے دن اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ اپنے عمل کے مطابق فرمائے گا۔

صحیحین وغیرہ کتب احادیث میں کتنی ہی ایسی احادیث وارد ہوئی ہیں جن کا مطلب ہے کہ بالآخر اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے اشخاص کو بھی جہنم سے نکال دے گا جن کا کوئی بھی نیک عمل نہ ہوگا صرف وہ کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ'' پہ کاربند ہوں گے یعنی وہ موحد ہوں گے اور شرک جیسے بدترین گناہ سے بے زار ہوں گے۔ (توحید وشرک کی مکمل وضاحت سوال نمبر ا کے جواب میں گذر چکی ہے۔) ان احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تارک نماز ترک نماز کی وجہ سے ایسا مشرک یا کافر نہیں بن گیا جو ملت اسلامیہ سے دنیا وآخرت میں خارج ہو گیا ہو۔

اگر یہ بات واقعتاً اسی طرح ہے تو پھر بالآخر اس کا جہنم سے نکلنے کا کیا مطلب ہے؟ کیا حقیقی معنی میں کافر ومشرک بھی بالآخر جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کردیے جائیں گے؟

باقی سائل صاحب نے (اس سوال میں) جن نیک اعمال کا تذکرہ کیا ہے اس کے متعلق گذارش ہے کہ آخرت کے معاملات یا فیصلہ جات یا اعمال کی جزا وسزا کے متعلق ہم دنیاوی معیار وپیمانہ جات وغیرہ سے ہرگز کام نہ لیں وہاں اعمال کا وزن کیسے ہوگا ان کی صحت کا صحیح

معیار کیا ہوگا اس کے متعلق کچھ کہنا نہایت ہی مشکل امر ہے کیونکہ یہ غیب کے معاملات ہیں جن تک ہماری پہنچ نہیں ہوسکتی ان پر صرف ایمان رکھنا ہے ہاں یہ ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی کے ساتھ بھی ذرہ برابر ظلم وزیادتی نہیں فرمائے گا

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِن تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِن لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا﴾ (النسآء: ٤٠)

یعنی اللہ تعالیٰ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِن كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ﴾

(الانبیاء: ٤٧)

''قیامت کے دن ہم انصاف کا میزان قائم کریں گے پھر کسی کے ساتھ ظلم نہیں کیا جائے گا اگر کسی کا عمل رائی کے دانے کے برابر ہوگا وہ بھی لاکر حاضر کردیں گے اور ہم حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔''

﴿فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾ (الزلزل: ٧، ٨)

''جس نے ذرہ برابر بھی نیک کام کیا ہوگا وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔''

لیکن اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ مثلاً ایک شخص کا عمل ایسا بہترین اور اچھا ہے کہ اس کی جزا جنت کے علاوہ ہو ہی نہیں سکتی۔ مثلاً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی راہ میں جہاد کرکے شہید ہو جانا لیکن اگر اس شخص کے قتال وجہاد میں شرکت کرنے اور کفار سے مقابلہ کرنے کی نیت یہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ راضی ہوجائے یا ''لتكون كلمة الله هی العليا'' کے لیے بھی نہ لڑا بلکہ اس کی نیت یہ تھی کہ دنیا میں میری شجاعت، جرأت وبہادری مشہور ہوجائے تو یہ شخص صحیح احادیث کے مطابق شہادت کے باوجود جہنم میں داخل کردیا جائے گا۔

دوسری طرف اگر کسی آدمی کا کوئی نیک عمل ہے لیکن خود اس عامل کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں مگر اس کی نیت میں اخلاص اور سچائی ہے اور وہ کام صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا کی خاطر اور شوق ورغبت کے ساتھ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کو ایسا پسند آجاتا ہے کہ وہ صرف اسی ایک عمل یا زبردست اعتقادی جذبہ کے سبب بہت ہی بلند درجات پر فائز ہو جاتا ہے بلکہ بعض لوگوں کے، تو سارے کے سارے گناہ صرف اس ایک نیکی کی وجہ سے نیست ونابود وختم ہو جاتے ہیں۔

صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا وامامنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ایک شخص تھا جس نے کوئی بھی نیکی کا کام اصلاً نہ کیا تھا، پھر جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ اگر میں فوت ہو جاؤں تو میری لاش کو جلا کر آدھی راکھ دریاؤں میں پھینک دینا اور آدھی کو خشکی پر چھوڑ دینا (کیونکہ) اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھ پر گرفت کی تو اللہ تعالیٰ مجھے ایسا عذاب کرے گا جو عذاب تمام جہانوں میں سے کسی کو بھی نہ کرے گا۔ اور جب وہ مر گیا تو اس کی اولاد نے اس کے ساتھ ویسا ہی کیا جو اس نے انہیں کہا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے دریا کو حکم دیا اس نے اس کی راکھ کا حصہ ایک جگہ جمع کر دیا اور خشکی کو بھی حکم فرمایا اس نے بھی وہ حصہ ایک جگہ اکٹھا کر دیا۔ (پھر اللہ نے اس کو اپنے سامنے کھڑا کر کے ارشاد فرمایا کہ تو نے اپنے ساتھ یہ معاملہ کیوں کروایا تھا، اس نے کہا اے رب تیرے خوف کی وجہ سے جس کو تو ہی بہتر جانتا ہے اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ اگرچہ بظاہر اسے اپنا کوئی نیک عمل نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ وہ اپنے اعمال سے ناامید تھا لیکن اس کے دل میں جو اللہ تعالیٰ کا خوف موجزن تھا جس کا اندازہ اہل دنیا کو اور اس کی اولاد کو بھی نہ تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو مکمل طور پر معلوم تھا کہ اس

میرے بندے کی دل میں میرا کتنا خوف ہے اس لیے اپنے علم کے مطابق اور اپنے خاص فضل وکرم سے اسے معاف کر دیا۔ حالانکہ اس کا کوئی بھی نیک عمل نہ تھا۔

اسی طرح ترمذی شریف اور ابن ماجہ میں صحیح سند کے ساتھ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ بے شک اللہ تعالیٰ تمام امتوں کے سامنے قیامت کے دن میری امت میں سے ایک شخص کو جہنم کی آگ سے بچائے گا اس شخص کے سامنے اس کے اعمال کے ننانوے دفتر جو انسان کی حد نگاہ کے برابر بڑے ہوں گے کھولے جائیں گے۔ (یعنی جن میں اس کی برائیاں ہوں گی اس کی کوئی نیکی موجود نہ ہوگی۔) اسے کہا جائے گا کہ تجھے جو کچھ ان دفاتر میں ہے اس سے انکار ہے؟ کیا میرے لکھنے والوں نے تجھ سے ظلم کیا ہے؟ وہ کہے گا کہ اے میرے رب نہیں، دوبارہ پوچھا جائے گا کہ ان اعمال (برائیوں) کے لیے تیرے پاس کوئی عذر ہے؟ وہ کہے گا اللہ نہیں؟ پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرمائے گا ہاں تیری ایک نیکی ہمارے پاس ہے بے شک آج تیرے ساتھ کوئی ظلم نہ ہوگا، پھر کاغذ کا ایک ٹکڑا ترازو کے ایک طرف رکھا جائے گا اور ننانوے دفتر دوسرے حصے میں پھر ننانوے دفتر ہلکے پڑ جائیں گے اور وہ کاغذ کا ٹکڑا وزنی ہو جائے گا پھر اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک کے مقابلے میں کوئی چیز وزنی نہیں ہوگی۔"

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ وہ آدمی اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر پختہ ایمان ویقین رکھتا تھا اور شہادتیں پر اسے مکمل استقامت تھی اور اس کا اظہار اس نے ایسے اخلاص اور سچائی کے جذبے کے ساتھ کیا کہ صرف یہ ایک ایمانی قوت اس کے نناوے دفاتر پر وزنی ہوگئی اور ان کو لاشئی محض بنا دیا اور اس کی یہ ایمانی قوت ترازو میں وزنی ہوگئی۔

بہر حال قیامت کے دن کا معاملہ اس طرح ہے:

﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ﴾

(الانفطار: ۱۹)

''اس دن (قیامت کے دن) کوئی شخص کسی کے لیے کسی چیز کا مالک نہ ہوگا بلکہ سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہوگا۔''

اور اللہ تعالیٰ اپنے مقرر کیے ہوئے معیار عدل وانصاف اور فضل وکرم کے مطابق فیصلہ فرمائے گا ممکن ہے کہ کسی بندے کے کئی سنگین جرم ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوئی ایسی نیکی بھی ہو جو اس کے تمام جرائم کو ختم کر کے اسے مغفرت سے نواز دے یا اس کی کوئی نیکی نہ ہو لیکن اس کی ایمانی قوت اور اخلاص کا جذبہ اتنا قوی ہو کہ اس کی تمام برائیوں کو محض لاشئی بنا دے۔ لیکن یہ سب کچھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مشیت اور علم کے مطابق ہی ہوگا اس کے برعکس یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے سنگین گناہ مثلاً ترک نماز یا عدم ادائیگی زکوۃ وغیرہما اتنے پر اثر اور غالب ہوں کہ کسی طرح بھی اس کی کچھ عذاب وعتاب سے نجات نہ ہو پائے تو اسے جہنم میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک مقرر وقت تک عذاب بھگتنا پڑے گا۔

پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کی مغفرت کر کے جنت میں داخل فرما دے گا۔ بشرطیکہ وہ ان فرائض یا حرام وغیرہا کا منکر نہ ہو لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل عظیم اور لطف عمیم کے باوجود کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسے وہ لطف وکرم ضرور بالضرور قیامت کے دن حاصل ہوسکتا ہے کہ وہ شخص اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ان بندوں کی لسٹ میں شامل ہی نہ ہو جن کے متعلق ازل سے ہی فیصلہ نجات ہو چکا ہو بلکہ اس کا شمار ان مجرموں کی لسٹ میں ہو جن کی نجات بالکل ہی نہ ہوگی یا کچھ عذاب وعقاب جزا وسزا کے بھگتنے کے بعد نجات حاصل ہوگی۔ ابتداءً وہ اس مہربانی سے محروم رہ جائے۔

لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے خوف سے ہر سچے مؤمن کو ایک لمحہ کے لیے بھی امن نہیں ہوتا کہ مومن ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ جائے بلکہ قرآن کریم اپنے مؤمنوں کی تعریف کرتا ہے جن کو ہر وقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا خوف لاحق ہوتا ہے جس طرح ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُونَ ۝ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ﴾ (المعارج: ۲۷،۲۸)

”وہ مومن جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیوں کہ ان کے رب کا عذاب ماموں (نہ ڈر کیا ہوا) نہیں ہے۔“

بہر حال مسئلہ زیر بحث کے متعلق میں نے اپنے قصور علم اور بے بضاعتی کے باوجود مکمل وضاحت کی ہے۔ اگر صواب ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فضل وکرم ہے اور اسی کی رہنمائی کا ثمر ہے اگر میں نے اس میں کوئی غلطی یا خطا کی ہے تو وہ میرے نفس کی خامی اور میرے ناقص علم کا قصور ہے۔ واللہ اعلم بالصواب.

زکوٰۃ کے فنڈ سے شادی

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص مسکین ہے اور وہ شادی کرنا چاہتا ہے اس شخص کو شادی کے لیے زکوٰۃ فنڈ سے رقم دینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا!!

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہئے کہ مذکورہ شخص زکوٰۃ فنڈ کی رقم سے شادی کرسکتا ہے کیونکہ مسکین زکوٰۃ کے مصارف میں سے ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسَٰكِينِ وَالْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغَٰرِمِينَ وَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَ اللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ (التوبة: ٦٠)

اس سے ثابت ہوا کہ زکوٰۃ مسکین کو دی جائے گی اور مسکین اس کو کہا جاتا ہے جس کے پاس کھانے کے لیے تھوڑی مقدار میں ہو جس سے وہ کفایت نہ کرسکے اور اس کے پاس بچت رقم نہ ہو لہٰذا اگر یہ آدمی مسکین ہے تو زکوٰۃ سے اس کی امداد کی جاسکتی ہے۔

هٰذا ما عندي والله اعلم الصواب.

کتاب النکاح
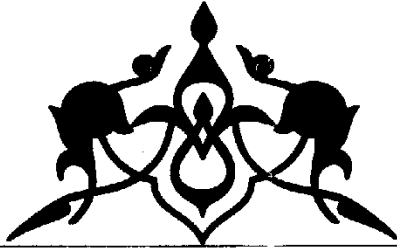
والدین کی رضامندی

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک لڑکی کا نکاح والدین کی رضامندی کے بغیر کیا ہے کیا ایسا نکاح جائز ہے یا نہیں جب کہ لڑکی راضی نہیں ہے اور والدین راضی ہیں تو کیا ایسا نکاح جائز ہے؟ بینوا توجروا!

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہئے کہ ایسا نکاح ناجائز وحرام ہے کیونکہ جب والدین ناراض ہیں تو نکاح نہیں ہوگا جس طرح حدیث میں ہے:

((ایما امرأة نکحت بغیر اذن موالیها فنکاحها باطل وثلاث مراة.)) [1]

''جس نے اپنے والد کی اجازت کے بغیر نکاح کیا اس کا نکاح باطل ہے، باطل ہے، باطل ہے۔''

اس سے ثابت ہوا کہ اگر والدین ناراض ہیں اور خوشی سے نکاح کی اجازت نہیں دیتے تو وہ نکاح باطل ہے دوسری حدیث ہے:

((لا نکاح الا بولی.)) [2]

''ولی کے بغیر نکاح نہیں ہے۔''

پھر اگر لڑکی نکاح پر راضی نہیں ہے اور والدین راضی ہیں تو بھی یہ نکاح نہیں ہوگا یہ بھی نکاح حرام ہے اور اگر کوئی ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تو بھی یہ نکاح نہیں ہوگا بلکہ (زنا) ہوگا اور زنا کی سزا دی جائے گی۔ اگر دونوں کنوارے ہیں تو ۱۰۰ کوڑے اور اگر شادی شدہ ہیں تو ان کو رجم کیا جائے گا۔

اور اگر عورت سے زبردستی نکاح کیا گیا ہے تو عورت بے قصور ہے صرف مرد کو سزا دی

---

[1] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب في الولی، رقم الحدیث: ۲۰۸۳

[2] ترمذی، کتاب النکاح، باب ما جاء لا نکاح الا بولی.

جائے گی۔ ھذا ما عندی والعلم عند ربی!

ولایت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ شمیم نے اپنے بیٹے کو اجازت دی کہ وہ اپنی بہن کی شادی کروائے پھر بیٹے حاجی قاسم نے شادی کروائی تو شمیم نے کہا کہ میں لڑکی نہیں دوں گا اب بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق باپ کی اجازت پر بیٹا بہن کا نکاح کرواسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا!

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہئے کہ جب باپ نے اپنے بیٹے کو اجازت دے دی اور بیٹے نے بہن کی منگنی بھی کر دی اور اب باپ شادی (نکاح) کی اجازت نہیں دیتا تو یہ سراسر غلط ہے جب ایک مرتبہ بیٹے کو اس نے اجازت دی تو یہ نکاح جائز ہے۔ اور نکاح ہوگیا۔ ھٰذا ما عندی والعلم عند ربی!

اقرب الی الولایۃ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں مسمات بوڑھی بنت سوزل خان عاقلہ بالغہ، میرا والد فوت ہوگیا ہے جس نے اپنی زندگی میں میری منگنی بنام محمد صالح کے ساتھ کی جس پر میں اور میری والدہ راضی ہیں۔ اب میرا چچا میری شادی دوسری جگہ کرانا چاہتا ہے جو نہ صرف میری مرضی کے خلاف ہے بلکہ باعث تکلیف ونقصان ہے۔ اب عرض یہ ہے کہ اس صورت میں میرے نکاح کا ولی وارث میرا چچا سہراب خان ہوگا یا کسی دوسرے نانا یا ماما کو حق ولایت حاصل ہوگا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہئے کہ اگر کسی عورت کا ولی عورت کی مخالفت کر کے اس کا نکاح روکے یا معقول جگہ نکاح نہ کرنے دے تو اس صورت میں عورت کسی بھی مرد کو اپنا ولی مقرر کرسکتی ہے۔

جس طرح سنن دار قطنی ابواب النکاح میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((قال اذا کان ولی المرأة مضارا فولت رجلا فنکاحها ونکاحة جائزة.))

''یعنی اگر عورت کا ولی نقصان دینے والا ہو تو عورت کسی بھی مرد کو اپنا ولی مقرر کر کے نکاح کر سکتی ہے۔''

مسند شافعی سے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ حدیث نقل کی ہے:

((لا نکاح الا بشاهدی عدل وولی مرشد.)) ❶

''یعنی نکاح دو عادل گواہوں اور ایک خیر خواہ ولی کے بغیر نہیں ہے۔''

چونکہ مذکورہ صورت میں سہراب خان مضار ہے اس لیے نکاح کا حق ولایت ختم ہو گیا مسمات بوڑھی اپنے نکاح کے لیے اپنے نانا یا ماما یا کسی بھی مرد کو ولی مقرر کر کے اپنی مرضی سے نکاح کروا سکتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

حالت فرار میں نکاح

سوال: کوئی عورت جو غیر مسلم ہو کسی آدمی کے ساتھ بھاگ جائے اور پھر جا کر اسلام قبول کرے تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الوهاب: یہ کون سا اسلام ہوا کہ کوئی عورت برائی کی نیت سے کسی کے ساتھ بھاگ جائے، پھر اس کے عشق میں مبتلا ہو کر مسلمان ہو جائے۔ ایسے مطلب کے اسلام کی اللہ تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

((فمن کانت هجرته الی الدنیا یصیبها او امرأة ینکحها فهجرته الی ماهاجر الیه.)) ❷

---

❶ ...فعی، جلد نمبر ۹، صفحہ ٤٨٢، ط: بیروت.

❷ کتاب ...حی، رقم الحدیث: ١.

اس سے ظاہر ہوا کہ جو کوئی آدمی کسی کے ساتھ شادی کرنے کی خاطر ایمان لے آتا ہے یا کوئی دین کا بڑا کام کرتا ہے تو اس کا یہ ایمان اور کام قبول نہیں ہے۔ اسلام میں یہ حکم ہے کہ کفار سے جو عورتیں مسلمان ہو کر آئیں تو ان کا امتحان لیا جائے کہ پکی مسلمان ہیں بھی یا نہیں پھر جب پتہ چل جائے کہ پکی مؤمنات ہیں تو مسلمان ان سے شادی کر سکتے ہیں جس طرح سورۃ الممتحنہ میں بیان ہوا ہے۔

بہر حال ایسے مطلب کا ایمان معتبر نہیں ہے لیکن یہاں اگر وہ عورت مسلمان ہونے کے بعد واقعی شریعت پر عمل کر رہی ہے تو پھر اس کو واپس کافروں کی طرف نہیں لوٹایا جائے بلکہ مسلم معاشرہ کے اندر ہی رکھا جائے لیکن ایک دم اس کا نکاح اس آدمی کے ساتھ نہ کیا جائے جس کے عشق میں مبتلا ہو کر بھاگی ہے بلکہ کافی عرصہ تک دونوں کو توبہ تائب ہو کر الگ رہنا چاہیے، پھر کافی عرصہ بعد کسی بڑے آدمی کو وارث بنا کر شرعی طور پر نکاح کیا جائے تو یہ نکاح صحیح ہوگا۔

باقی اگر ایک رات کسی کے ساتھ برائی کے ساتھ گذارے اور دوسرے دن نکاح کر لے تو اس طرح جائز نہیں ہے جس طرح کتاب وسنت میں بیان ہے۔ دیکھئے سورۃ نور پ ۱۸ رکوع ۱ اور اس کی تفسیر۔ واللہ اعلم بالصواب!

نکاح پر نکاح پڑھنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ محمد سومر اور در محمد نے آپس میں رشتہ داری کی جس میں محمد سومر شادی کر کے آ گیا جب کہ در محمد نے ابھی تک شادی نہیں کی، اب در محمد سومر کی بیوی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور وہ سومر کو نہیں دیتے۔ حالانکہ در محمد نے سومر کی بیوی کی ماں کو اپنے پاس بٹھایا ہوا ہے جب کہ اس کے ساتھ زنا بھی کیا ہے اب اس کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہے۔ ایسا نکاح جائز ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا!

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہئے کہ در محمد کا سومر کی بیوی سے نکاح نہیں ہو گا اس کے دو سبب ہیں۔

❶ ...... نکاح پر نکاح جائز نہیں ہے۔ جب پہلا خاوند طلاق دے گا پھر نکاح جائز ہوگا۔

❷ ...... یہ بھی پتہ نہیں کہ سومر کی بیوی کی والدہ سے اس نے نکاح کیا ہے یا نہیں۔ اس کی بیوی اس پر حرام ہے اگر نکاح نہیں بھی کیا ہے تو بھی سومر کی منکوحہ سے اس کا نکاح نہیں ہوگا اور دوسری بات کہ ایسی حرکت اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے کہ کوئی بیٹا کسی عورت سے زنا کرے اور پھر اس کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہے۔ هٰذا ما عندي والله اعلم بالصواب

دو کزن عورتیں اور ایک مرد

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ دو کزن عورتیں ایک مرد کے نکاح میں رہ سکتی ہیں یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ اگر کوئی مانع موجود نہیں ہے تو دو کزن عورتیں ایک مرد کے نکاح میں رہ سکتی ہیں اور نکاح میں رکھنا جائز ہے۔ هٰذا ما عندي والله اعلم بالصواب.

قرآن پاک سے نکاح

سوال: کچھ لوگوں میں یہ مروج ہے کہ اپنی بیٹیوں کو بغیر شادی کے بٹھا دیتے ہیں اور ان کا رشتہ کسی شخص کو دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے بلکہ کہتے ہیں کہ ہمارا کوئی بھی ثانی اور ہم پلہ نہیں ہے۔ لہٰذا وہ اپنی لڑکیوں کا نکاح کسی شخص سے کرنے کے بجائے قرآن پاک سے کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے اپنا حق معاف کروا دیا ہے اب ہم پر کوئی حق نہیں۔ کیا ان کا یہ طرز عمل درست ہے؟

الجواب بعون الوهاب: ان لوگوں کا یہ طریقہ بالکل غلط ہے اور کتاب وسنت کے ارشاد کے بھی خلاف ہے اور یہ ان کی بیٹیوں پر بھی ظلم عظیم ہے، ایسے ظالموں کی اللہ کے نزدیک سخت گرفت ہوگی اور اس سے عربوں کی جاہلیت کے زمانہ کی پوری طرح سے نقالی ہوتی ہیں عرب کے جاہل کہا کرتے تھے کہ ہمارا کوئی بھی ثانی وہم پلہ نہیں لہٰذا وہ بچپن ہی میں بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے اور آج کل کے لوگوں نے بچیوں کو زندہ دفنانے کا ایک اور طریقہ ایجاد کیا ہے وہ یہ ہے کہ انہیں بغیر نکاح کے بٹھا دینا ان کے ساتھ یہ طرز عمل اپنانا ان کے ساتھ ظلم عظیم ہے اور زندہ دفنانے کے مترادف ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ﴾ (النور: ٣٢)

''تم میں سے جو مرد، عورت بے نکاح ہوں ان کا نکاح کردو۔''

اس ارشاد ربانی کے مطابق اپنی بچیوں کی (جو بلوغت کو پہنچ چکی ہوں) شادی کرنا ہر شخص کے لیے ضروری ہے خواہ وہ کوئی بھی ہو خواہ امیر ہو یا غریب یا کوئی اور ہر آدمی کو اپنی لڑکی کو اس کے شوہر کے حوالے کرنا ہے اور جو کوئی اس حکم الٰہی کی نافرمانی کرے گا وہ عنداللہ سخت مجرم ہوگا۔ باقی یہ کہنا کہ ہم نے حق معاف کروادیا ہے تو یہ اللہ کے دین میں احداث اور بہت بری بدعت ہے تعجب ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے تو حقوق نہیں معاف کروائے۔ (بچیوں کی قرآن پاک کے ساتھ شادی کروا کر)

حالانکہ واقعتاً ان کا کوئی ثانی نہ تھا لیکن آپ ﷺ نے اپنی چاروں بیٹیوں کی شادی کروا کر یہ سنت جاری فرما دی اور یہ ثابت کر کے دکھلایا کہ کوئی بچی (بالغہ) نکاح کے بغیر بٹھائی نہیں جا سکتی اور اب جو شخص بھی آپ ﷺ کے طریقہ سے اعراض کرے گا یا اپنی لڑکیوں کو آپ ﷺ کی بچیوں سے اعلیٰ سمجھے گا تو وہ اپنے ایمان کی خیر طلب کرے۔

آپ کے طریقہ کا مخالف مسلماں ہی نہیں رہتا۔ یہی سبب ہے کہ اس طرح کے لوگوں کی ایسی روش کے جو گندے نتائج سامنے آتے ہیں ان میں ہر صاحب دانش کے لیے سامان

عبرت مل جاتا ہے۔لہٰذا جسے ایسے خراب نتائج سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا ہو اسے چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کے طریقہ پر کار بند ہو جائے۔

خلاصہ کلام:...... یہ طریقہ کار بالکل غلط اور بہت گندا ہے اور اسلام کے قوانین کے مخالف اور اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ کے ارشادات عالیہ کے برخلاف ہے اس سے ہر مسلمان کو اپنا دامن بچانا چاہئے۔ ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

بالغ کا غیر بالغ سے نکاح

سوال: ایک لڑکی دو تین سالوں سے بالغ ہے کیا ان کا نکاح ایک ایسے لڑکے سے کرنا صحیح ہے جو ابھی سات یا آٹھ سال کا ہو۔ بینوا توجروا!

الجواب بعون الوھاب: یہ نکاح درست ہو سکتا ہے اس شرط پر کہ وہ لڑکی اس نکاح پر راضی ہو ورنہ نہیں ہوگا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح بچپن میں ہوا وہ بحال ہو گیا اور دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ جب عورت کا صغرسنی میں نکاح درست ہو سکتا ہے حالانکہ وہ بلوغت بعد بھی ناقصات عقل ہے تو پھر چھوٹے مرد کا نکاح کیونکر درست نہیں ہوگا کیونکہ مرد میں تو عقل جلدی آجاتی ہے اور بلوغت پر کامل عقل پیدا ہو جاتی ہے باقی عورت کی رضا شرط ہے وہ اپنی خوشی سے راضی نہ ہو تو ہرگز نکاح درست نہیں ہوگا۔ ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

نیواء کا حکم

سوال: شادی کے موقعہ پر رشتہ دار یا دوست احباب لڑکے یا لڑکی والوں کو تحفہ تحائف دیتے ہیں کیا یہ شریعت میں جائز ہے اور اگر کوئی رقم دیتا ہے تو وہ لینا یا دینا شریعت میں اس کا حکم واضح کریں؟

الجواب بعون الوھاب: سوال سے بالکل ظاہر ہے کہ مسئلہ ہدیہ کے باب سے ہے

جس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے کیونکہ شریعت میں ہدیہ دینے کی ترغیب آئی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جناب کریم ﷺ کو اور ایک دوسرے کو ہدیہ دیتے تھے۔ لہٰذا اس میں کوئی بھی قباحت نہیں ہونی چاہئے۔

یہ سوال نہیں ہوتا کہ خاص شادی کے موقع پر ہدیہ دینا کیسا ہے کیونکہ ہدیہ کی مطلق ترغیب آئی ہے لہٰذا ہمارے لیے کوئی بھی سبب نہیں ہے کہ شادی کے موقعہ پر اس کو خارج کر دیں بلکہ یہ موقع یا ہدایا وتحائف کے دوسرے مواقع وہ سب اس میں شامل ہیں اور اس لینے دینے کا ہدیہ ہونا اس سے واضح ہے کہ یہ مقرر نہیں ہے بلکہ آئے ہوئے احباب اپنی خوشی سے مرضی کے مطابق دیتے ہیں اگر کوئی نہیں دیتا تو اس پر کوئی معیار نہیں ہے۔

کہ اس کو ولیمہ سے باہر نکالا جائے بہرحال اس لینے دینے پر ہدیہ کی معنی بالکل صادق آتی ہے، لہٰذا شادی کے موقع پر اس کو الگ کرنے والوں کو کوئی ایسی دلیل پیش کرنی چاہئے جو اس موقع پر اس کو عمومی حکم سے الگ کرے۔ علاوہ ازیں اس عمومی حکم کے علاوہ خاص موقع پر ہدیہ بھیجنے کی دلیل یہ ہے جو درج ذیل ذکر کی جاتی ہے۔

امام محدثین امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح کتاب النکاح میں یہ باب باندھا ہے۔'' باب الہدیۃ العروس'' اس میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کرتے ہیں کہ

> ''آپ ﷺ نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے شادی کی پھر اس کے ولیمہ کے موقع پر حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا کی طرف حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہدیہ (جس میں ایک طعام جو کہ پنیر گھی اور کھجور کے ساتھ بنایا جاتا تھا) کے طور بھیجا۔'' (الحدیث)

اس سے خصوصی طور پر معلوم ہوا کہ شادی کے موقع پر بوقت ولیمہ شادی کرنے والے کو ہدیہ دیا جا سکتا ہے، پھر جو چاہے پیسے دے یا کھانے کی چیز دے یہی سبب ہے کہ امام محدثین جیسے محقق اور مرقق نے بھی اس پر باب الہدیۃ العروس'' باندھا ہے فتدبر۔

بلکہ اس مسئلہ کے متعلق اتنا بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی خود دے تو یہ بطریق اولیٰ

جائز ہے۔

لیکن ایسے موقع پر احباب سے زبردستی مدد لینا بھی درست ہے جس طرح نبی ﷺ نے جب حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا اس کے ولیمہ کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے حکم فرمایا کہ (جیسا کہ حدیث کے فقروں میں موجود ہے) جو کچھ بھی ہو وہ لے آؤ۔ پھر کوئی کھجوریں لے آیا تو کوئی پنیر وغیرہ پھر ان کو ملا کر حیس بنا کر یہ ولیمہ کیا اگر دوست احباب اپنی رضا خوشی سے لینے دینے میں مدد کریں گے تو آخر اس میں کون سی قباحت ہے اور منع کا کیا سبب ہے۔

بہرحال ایسے موقعوں پر جو احباب واقراب دیتے ہیں وہ جائز وحلال بلکہ مندوب ومستحب ہے کیونکہ یہ آپ ﷺ سے ثابت ہے۔ (کما مر انفاً)

باقی منع کرنے والوں کے پاس کوئی بھی دلیل نہیں ہے۔ هٰذا ما عندي والله اعلم بالصواب.

چاچی بھتیجی اور ایک مرد

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں شاہ محمد اپنی بیوی کی بھتیجی سے شادی کرنا چاہتا ہے کیا شریعت کے مطابق اس طرح کا نکاح کرنا جائز ہے؟

الجواب بعون الوھاب: معلوم ہونا چاہئے کہ یہ نکاح نہیں ہوگا کسی بھی آدمی کے گھر میں، یعنی نکاح میں پھوپھی اور بھتیجی ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں قرآن پاک میں ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَ

اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا﴾ (النساء: ۲۳)

اس سے ثابت ہوا کہ پھوپھی اور بھتیجی ایک ساتھ نکاح میں نہیں رہ سکتیں۔

حدیث پاک میں ہے:

((عن ابی هريرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ نهى ان تنكح المرأة على عمتها ولا العمة على بنت اخيها .)) [1]

''سیّدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا ہے کہ عورت اور اس کی خالہ کو یا عورت اور اس کی پھوپھی کو جمع کیا جائے۔''

هٰذا ما عندي والله اعلم عند ربي

حکمت الٰہی

سوال: دو بہنوں کو اکٹھے نکاح میں رکھنے کی منع میں کیا حکمت ہے؟

الجواب بعون الوهاب: ایسے سوالات صرف اعتراضات کے نمبر بڑھانے کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں رکھتے۔ اگر کوئی اسلام کا پیروکار ایسا سوال کرتا ہے تو اس کو ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں! اگر کوئی ملحد کرتا ہے تو پہلے وہ اسلام کو سچا مانے پھر کوئی دوسری بات کرے لیکن جو اسلام کو مانتا ہی نہیں ہے اس میں کسی بات کی حکمت کے متعلق پوچھتا ہے تو وہ محض اپنا اور دوسروں کا ٹائم ضائع کر رہا ہے، بہرصورت اسلام کی اس مخالفت میں بھی عظیم حکمت ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ دو سوکنوں کی آپس میں اکثر نہیں بنتی، کبھی کبھی تو وہ حد سے بڑھ جاتی ہیں، ایک سوکن دوسری سوکن کو نقصان پہنچانے کے لیے لگا ہے بگا ہے اس کی جان کے در پے ہوتی ہے جبکہ اسلام دو بہنوں کی آپس میں ایسی عداوت اور قطع تعلقی کو ہرگز پسند نہیں کرتا، اس لیے اسلام دو بہنوں کو ایک ساتھ جمع کرنے سے منع کرتا ہے۔ اگر دونوں کا ایک دوسری کو

[1] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب ما یکره ان یجمع بینهن من النساء، رقم الحدیث:۲۰٦۵ .

نقصان پہنچانے کا خیال بھی نہ رہے لیکن دل تو ایک دوسرے سے بغض آلودہ اور متنفر ہو جاتے ہیں اور یہ جو بات اسلام میں قطعاً پسند نہیں ہے کیونکہ یہ بات رشتہ داری چھیننے پر منتج ہوتی ہے اور رشتہ داری توڑنا بہت بڑا گناہ ہے۔ واللہ اعلم

صغر سنی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عمرو اور زید آپس میں بھائی ہیں۔ عمرو کی بیٹی اور زید کا بیٹا دونوں صغیر تھے صغر سنی میں ان کا نکاح کیا گیا مگر اس وقت لڑکی بالغ ہوگئی ہے اور لڑکا ابھی غیر بالغ ہے طرفین اس بات پر راضی ہیں کہ اس نکاح کو ختم کر کے لڑکی کا دوسری جگہ نکاح کروایا جائے۔ کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا.

الجواب بعون الوھاب: معلوم ہونا چاہئے مذکورہ مسئلہ میں والد کو جو حق اور اختیار حاصل تھا وہ ختم ہو جاتا ہے مگر اب عورت جس کا صغر سنی میں نکاح کیا گیا وہ بالغ ہونے پر نکاح ختم کرانا چاہتی ہے تو یہ جائز ہے جس طرح حدیث پاک ہے:

((عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان جارية بكرا اتت النبى ﷺ فذكرت ان اباها زوجها وهى كارهة فخيرها رسول الله ﷺ .)) ❶

''ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک باکرہ عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور ذکر کیا کہ اس کے والد نے اس کا نکاح اس جگہ کیا ہے جہاں پر وہ ناخوش ہے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو اختیار دیا۔''

واللہ اعلم بالصواب

ولیمہ

سوال: ولیمہ جماع سے قبل ہے یا بعد؟

الجواب بعون الوھاب: ولیمہ قبل الدخول اور بعد الدخول دونوں طرح نبی ﷺ

❶ راوه احمد وابوداؤد، ابن ماجه.

کے فعل سے ثابت ہے، جو قبل الدخول ہے اس کی دلیل وہ حدیث ہے کہ جس میں ہے کہ نبی ﷺ نے جب زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو آپ نے اپنے صحابہ کو گوشت اور روٹی کا ولیمہ کھلایا۔ انہیں اپنے گھر بلایا کھانا کھلایا، پھر وہ لوگ آپ کے گھر ہی میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ آپ ﷺ گھر سے باہر چلے گئے، جب واپس آئے تو لوگ بیٹھے تھے، آپ واپس چلے گئے پھر آئے تو ابھی لوگ بیٹھے تھے آپ پھر واپس چلے گئے اور ایسا دو یا تین بار ہوا اور آپ ﷺ انہیں کہہ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم چلے جاؤ۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب وہ چلے گئے تو میں نے آپ کو ان کے جانے کی اطلاع دی۔ اس وقت تک آیۃ الحجاب جو سورۃ الاحزاب میں ہے نازل ہو چکی تھی، آپ اپنے اہل پر داخل ہو گئے اور میرے اور اپنے درمیان پردہ گرا دیا تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ولیمہ قبل الدخول تھا۔

اور جو بعد الدخول ولیمہ کا مسئلہ ہے تو اس کی دلیل جنگ خیبر میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا واقعہ ہے کہ جس میں یہ وضاحت ہے کہ پہلے آپ اپنے اہل پر داخل ہوئے اور پھر گھی، ستو اور کھجور کا ولیمہ کیا۔

تو اس دلیل سے بعد الدخول ولیمہ ثابت ہوتا ہے، بحرحال اس میں وسعت ہے جب انسان کو سہولت ہو تب وہ ولیمہ کرے قبل الدخول، بعد الدخول کی کوئی شرط نہیں۔

خود نکاح پڑھنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک گاؤں میں تین مولوی صاحبان ہیں ایک اہلحدیث اور دو حنفی، اہلحدیث مولوی کی شادی ہوئی نکاح کے وقت اہلحدیث مولوی نے کہا کہ حنفی مولوی کا پڑھا ہوا نکاح جائز نہیں ہے، اس لیے اہلحدیث مولوی نے خود اپنا نکاح پڑھا طرفین کے گواہ موجود تھے۔ مذکورہ نکاح صحیح ہوا یا نہیں؟ بینوا وتوجروا!!

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مذکورہ نکاح اگر کتاب وسنت کی شرائط کے مطابق کیا گیا ہے تو بلاشبہ یہ درست اور صحیح ہے اگرچہ اس صورتحال کی صریح جز نظر سے

نہیں گذری ہے کیونکہ نکاح کا خطبہ ایک مسنون دعا ہے قرآن وحدیث اس دعا کو کسی خاص شخص کے ساتھ مقید نہیں کیا ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اس دعا کو خود پڑھتا ہے تو یہ جائز ہے اگرچہ اس دعا کو پڑھنے والا مجلس میں موجود ہے۔

سوال: اگر گاؤں میں کوئی پڑھا لکھا نہیں ہے تو اس میں اپنا پڑھا ہوا نکاح صحیح ہوگا یا نہیں؟ بینوا وتوجروا!

الجواب بعون الوهاب: اس سوال کے جواب کے لیے اوپر کے سوال کا جواب کافی ہے باقی نکاح کے شرائط یہ ہیں۔

1. عورت محرمات میں سے نہیں ہو۔
2. ایجاب وقبول ہو۔
3. دو گواہ موجود ہوں۔
4. ولی النکاح راضی ہو۔
5. مہر موجود ہو۔

اگر یہ شرائط موجود ہیں تو نکاح ہو جائے گا باقی خطبہ پڑھنا یہ مسنون دعا ہے نکاح کے شرائط میں سے نہیں ہے۔ هٰذا ما عندی والله اعلم بالصواب

پاگل شوہر کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ عبدالحکیم جو کہ پاگل ہے اس کی ایک بیٹی ہے جس کا نکاح عبدالحکیم کے دوسرے بھائی کے بیٹے سے کروایا گیا اور انہوں نے اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا اب وہ اپنے ماموں کے ہاں رہتی ہے اس بات کو تقریباً چار سال ہوئے ہیں اور خاوند نے ابھی تک نہ بیوی کا مطالبہ کیا ہے اور نہ ہی خرچہ وغیرہ دیتا ہے، اور شریعت محمدی کے مطابق بتائیں کہ کیا وہ لڑکی دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا!!

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہئے کہ جب خاوند اپنی بیوی کو خرچہ نہ دے اور نہ ہی چار سال تک حال احوال پوچھے اب اس صورت میں عورت نکاح ختم کروا سکتی ہے۔

جس طرح قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا﴾ (البقرة: ٢٣١)

''عورتوں کو نقصان پہنچانے کی خاطر روکے مت رکھو۔''

یہ بھی ظلم ہے کہ اس کو خرچہ وغیرہ نہ دیا جائے یہ بھی نقصان پہنچانا ہے:

﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (النساء: ١٩)

''عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔''

تاکہ وہ اچھی طرح زندگی بسر کرسکیں۔

دوسری جگہ اللہ نے فرمایا:

﴿فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ﴾ (البقرة: ٢٢٩)

''اچھائی کے ساتھ رکھنا ہے یا عمدگی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔''

اور حدیث پاک میں ہے:

((عن سعيد بن المسيب رضي الله عنه في الرجل لايجد ماينفق على اهله قال يفرق بينهما.)) [1]

اس سے معلوم ہوا کہ عورت دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے باقی خرچہ وغیرہ بند کرنا یہ ظلم ہے اور ظلم کرنا ناجائز ہے۔ هٰذا ما عندي والله اعلم بالصواب!

غیر فطری دودھ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید اور عمر ماموں، بھانجا ہیں دونوں کی اولاد نے ایک عورت کا دودھ پیا یعنی وہ دودھ شریک بھائی ہوئے اب دو نسلیں چھوڑ کر تیسری نسل میں وہ ایک دوسرے سے رشتہ داری وغیرہ کرسکتے ہیں یا نہیں؟

بینوا توجروا!

[1] سنن سعيد بن منصور، جلد نمبر ٢، صفحه نمبر: ٥٥.

الجواب بعون الوھاب: معلوم ہونا چاہئے کہ یہ دونوں تیسری نسل میں آپس میں نکاح وغیرہ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ بیچ میں ایک نسل کا فرق آ گیا ہے۔لہٰذا ان کا آپس میں نکاح وغیرہ کے ناجائز ہونے کا کوئی بھی ثبوت نہیں ہے۔ ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

وٹہ سٹہ کی شادی

سوال: شریعت اسلامیہ میں شغار کسے کہتے ہیں کیا مہر کی موجودگی کے ساتھ ادلے بدلے پر بھی شغار کا نام صادق آتا ہے؟

الجواب بعون الوھاب: شغار کے متعلق مختصراً عرض پیش خدمت ہے کہ ہمارے خیال بلکہ تحقیق کے مطابق شغار کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ تبادلہ (ادلہ بدلہ، وٹہ سٹہ) بغیر مہر کے ہو۔ باقی اگر مہر دونوں طرف سے مقرر ہے تو پھر ایسے تبادلہ اور وٹہ سٹہ میں کچھ بھی قباحت وحرمت نہیں اور نہ ہی وہ ممنوع شغار کے باب میں سے ہے۔اس کی دلیل ابوداؤد وغیرہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی وہ حدیث ہے جو شغار کی ممانعت میں ان الفاظ سے وارد ہوئی ہے:

((قلت لنافع ما الشغار قال ینکح ابنة الرجل وینکحه بنته بغیر صداق وینکح اخت الرجل فینکحه اخته بغیر صداق .))[1]

شغار کی یہ تفسیر اگرچہ تابعی نافعؒ سے مروی ہے لیکن نافع ابن عمر رضی اللہ عنہما کا تلمیذ رشید ہے اس نے یہ تفسیر ضرور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے معلوم کی ہوگی۔ اس تفسیر کی مؤید ایک مرفوع حدیث بھی ہے جو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لا شغار قالوا یارسول اللہ وما الشغار قال نکاح المرأة بالمرأة لا صداق بینهما .))

''یعنی (دین اسلام میں) شغار (ادلہ بدلہ، وٹہ سٹہ) نہیں انھوں نے کہا اے اللہ

---

[1] سنن ابی داؤد مع عون المعبود طبع ملتانی، ج۲، ص ۱۸۷ .

کے رسول ﷺ شغار کیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا شغار یہ ہے کہ ایک عورت کا نکاح دوسری عورت کے بدلے میں بغیر مہر کے کیا جائے۔"

اس روایت کی سند اگرچہ ضعیف ہے لیکن ایسے مقام یا امور میں اس سے استیناس کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس جگہ صرف شغار کی تفسیر کرنا مدنظر ہے اور یہ تفسیر صحیح سند سے نافع اور امام مالک رحمہ اللہ سے ثابت ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ نافع نے یہ تفسیر ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کی ہے، لہٰذا یہ روایت اس کی تقویت کا باعث بنے گی اور محققین کسی ایک پہلو یا معنی کو متعین کرنے کے لیے ضعیف حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور اکثر علماء کے نزدیک اس کی تقویت کا باعث بنے گی اور محققین کسی ایک پہلو یا معنی کو متعین کرنے کے لیے ضعیف حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور اکثر علماء کے نزدیک بھی شغار کی یہی تفسیر معتبر ہے۔ باقی معاویہ رضی اللہ عنہ کی حدیث تو درحقیقت ہماری ہی مؤید ہے اگرچہ اس کو مولوی حصاری صاحب وغیرہ نے اپنے مسلک کے اثبات میں پیش کیا ہے تاہم اس میں ان کی عدم توجہ اور عدم تدقیق کو دخل ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:

((ان العباس بن عبد الله بن العباس انكح عبد الرحمن بن الحكم ابنتهٗ وانكحهٗ عبد الرحمن بنتهٗ وكانا جعلا صداقا فكتب معاوية الى مروان يأمرهٗ بالتفريق بينهما .))

(سنن ابی داؤد، كتاب النكاح)

"یعنی عباس بن عبداللہ بن عباس نے عبدالرحمٰن بن الحکم سے اپنی بہن کا نکاح کرایا اور عبدالرحمٰن بن الحکم نے عباس بن عبداللہ کو اپنی بہن نکاح میں دی اور انھوں نے مہر مقرر کی تھی تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان کو خط لکھا (اس خط میں یہ بھی تھا کہ) کہ انھوں نے مروان کو ان دونوں میں تفریق کا حکم دیا ہوا تھا۔"

دراصل ان حضرات کو "وكانا جعلا صداقا" کے الفاظ سے غلطی لگی ہے اوپر جو ہم نے ان الفاظ کا معنی لکھا ہے وہ ان ہی حضرات کا کیا ہوا معنی ہے ان الفاظ کا مذکورہ معنی قواعد

کے خلاف ہے کیونکہ اس صورت میں ”جعل“ کا دوسرا مفعول ہے ہی نہیں حالانکہ جعل دو مفعولوں کو چاہتا ہے کما فی کتب النحو. صحیح بات یہ ہے کہ اس جگہ اس کا دوسرا مفعول محذوف ہے۔اس کی تقدیر اس طرح ہے ”کانا جعلا النکاح کل واحد منهما الآخر ابنتهٗ صداقا.“ (کذا فی عون المعبود ج۱۲ ص ۱۸۷) طبع ملتان یعنی ان دونوں نے ایک دوسرے کے نکاح ہی کو مہر ٹھہرایا ہے، اس معنی کی دلیل مسند ابی یعلیٰ کی یہی روایت ہے جو معاویہ رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے مروی ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں: ”جعلاه صداقا.“ اب دیکھئے اس میں جعل کا مفعول اول ”ہ“ موجود ہے اور یہ بالکل واضح ہے کہ یہ ضمیر انکاح مصدر کی طرف راجع ہے جو انکح میں ہے ”کما قالوا اعدلوا هو (العدل) اقرب للتقوىٰ“ بہرحال مقصد یہ تھا کہ انھوں نے ان کے اس تبادلہ ہی کو صداق بنایا، اس لیے معاویہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان واجب الاذعان کے مطابق ان دونوں میں تفریق کا حکم صادر فرمایا نہ کہ اس لیے کہ وہ محض وٹہ سٹہ تھا۔ والاحادیث تفسیر بعضهٗ بعضا. لہٰذا مسند ابی یعلیٰ کی حدیث ابوداؤد والی حدیث کی تفسیر کر رہی ہے اور جعلا کے مفعول اول کی تعیین بھی کرتی ہے۔ مولانا حصاری وغیرہ کو جعل کے مفعول اول سے صرف نظر کرنے کی وجہ سے غلطی لگی ہے باقی کچھ حضرات اس ادلے بدلے کو مفاسد کی وجہ سے ممنوع قرار دیتے ہیں اس کے متعلق گزارش ہے کہ یہ مفاسد محض جہالت اور بے علمی کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتے ہیں ورنہ جو سمجھدار لوگ ہیں وہ ان کا شکار نہیں ہوتے اگر مفاسد ہی کو دلیل بنایا جائے تو ایسے مفاسد جہالت کی وجہ سے صرف ایک ہی نکاح میں بھی آسکتے ہیں بلکہ ایسے مفاسد مشاہدہ میں بھی آئے ہیں رشتے دار اپنی بچی کا ایک جگہ نکاح کردیتے ہیں لیکن بعد میں کچھ اغراض کی خاطر اپنی بچی روک دیتے ہیں یا مزید فضول اور غیر شرعی شرائط لگا دیتے ہیں کہ یہ باتیں قبول کرو ورنہ ہم اپنی بچی واپس نہیں کریں گے تو پھر ایسے جہال کو کیا کیا کریں؟

درحقیقت وٹہ سٹہ نہ مفاسد کا سرچشمہ ہے نہ ہی اس میں کوئی خرابی ہے مگر یہ خرابیاں محض جہالت کی وجہ سے پیش آتی ہیں یہ تو وٹہ سٹہ نہ ہونے کی صورت میں بھی ممکن ہیں بلکہ واقع

ہو چکی ہیں بہر حال میری تحقیق یہ ہے کہ شغار ممنوع وہ ہے جو بلا صداق ہو اور یہ ہی شغار کی صحیح تفسیر ہے۔ سر دست اسی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

لڑکی کی رضا مندی

سوال: اکثر ممالک میں یہ مروج ہے کہ کسی بالغہ لڑکی کی شادی پانچ چھ سال کے نابالغ لڑکے کے ساتھ کر دی جاتی ہے اور اس لڑکی سے اس کے متعلق کچھ بھی پوچھا نہیں جاتا۔ بالآخر وہ لڑکی یا تو خودکشی کا ارتکاب کر بیٹھتی ہے یا چھپ چھپا کر بدکاری کی مرتکب ہوتی ہے، کیا مذکورہ فعل (یعنی رشتہ داروں کا لڑکی کا نابالغ لڑکے کے ساتھ اس کی اجازت ومرضی کے بغیر نکاح کرنا شریعت اسلامی کی نظر میں جائز ہے؟

الجواب بعون الوهاب: یہ کام سراسر ظلم اور ناانصافی ہے اور جاہلیت کے زمانہ کی یاد ہے اسلامی شریعت کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں اسلام سے پہلے عرب کے جہال میں اس طرح کے ظلم ہوا کرتے تھے اور اس طرح کی جاہلیت کی رسوم ورواج چلتی رہتی تھیں عورتوں کو ذرہ برابر عزت واحترام حاصل نہ تھا بلکہ انہیں جانوروں سے بھی کم تر سمجھا جاتا تھا انہیں بولنے کی بھی اجازت نہ ہوتی تھی۔

گویا انہیں انسان ہی نہیں سمجھا جاتا تھا مگر اسلام کے آنے کے بعد ان کی حالت بتدریج سدھرنے لگی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں انسانی صف میں جگہ دی بلکہ انہیں انسانی زندگی نصف قرار دیا گیا اور قرآن حکیم نے اعلان کیا کہ:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ....﴾ (البقرة: ٢٢٨)

''یعنی جس طرح ان کے اوپر مردوں کے حقوق ہیں اسی طرح مردوں پر ان کے حقوق ہیں۔''

اس آیت کریمہ نے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی ان کے حقوق دلوائے اور قرآن کریم میں کئی مقامات پر عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کر کے ساتھ پیش آنے ان کے حقوق ادا

کرنے اور ان کے ساتھ ناانصافی نہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور جناب رسول اکرم ﷺ نے بھی اس سلسلہ میں کافی اصلاحی اقدام اٹھائے نکاح کے سلسلہ میں آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

''ورثاء کی مرضی کے ساتھ ساتھ جس عورت کا نکاح کیا جائے اس کی اذن واجازت ورضاء معلوم کی جائے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

''ہر عورت سے اس کی اذن معلوم کرنا ضروری ہے، یعنی (کنواری ہو یا بیوہ باقی آپ نے فرمایا کہ بیوہ کو تو زبان کے ساتھ اپنی رضا بتانی ہے اور اگر کنواری ہے تو اس کی خاموشی ہی اجازت ہے۔''

بہرحال کنواری سے پوچھنا بھی ضروری ہے اور اگر پوچھنے پر انکار کردے تو اس کا نکاح ہرگز ہرگز نہیں ہوگا۔ خواہ اس کے والدین کی رضا بھی ہو تب بھی نکاح نہیں ہوگا۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ ایک عورت رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آ کر عرض کیا کہ میرے والد نے میرا نکاح ایسے شخص سے کروایا ہے جس کے ساتھ نکاح کرنے میں میں راضی نہیں ہوں بلکہ اسے ناپسند کرتی ہوں اس کی یہ بات سن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تو یہ نکاح برقرار نہیں رکھنا چاہتی تو تو آزاد ہوسکتی ہے اس پر اس عورت نے کہا اب جب میرے والد نے یہ کام کردیا ہے تو میں بھی اسے برقرار رکھتی ہوں لیکن مجھے دیکھنا یہ تھا کہ عورتوں کو بھی کچھ حق حاصل ہے یا نہیں؟

بہرحال اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ اگر عورت راضی نہیں تو وہ نکاح ہی باطل ہے، اگرچہ وہ نکاح والد ہی کیوں نہ کروائے۔ بہرحال یہ رواج قطعاً غلط ہے اور عورت پر شدید ظلم وجبر بھی ہے اور عورت کی رضا کے بغیر اس طرح کا نکاح قطعاً باطل ہے۔ لہٰذا ایسے ظلم کو بیک قلم وزبان بند کرنا چاہیے شریعت اسلامیہ ایسے مظالم کی ہرگز اجازت نہیں دیتی یہ جاہلیت کی رسوم ہیں جن سے مسلمانوں کو اجتناب کرنا چاہیے ورنہ اس کے بہت برے نتائج نکلیں گے ان

کے ذمے دار بھی یہی لوگ ہوں گے اور اللہ کے نزدیک ان کا بہت سخت مؤاخذہ ومحاسبہ ہوگا۔

رضاعت کی حد

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک لڑکی نے مسمات الف کا دودھ فقط ایک دفعہ چند قطرے پیے کیا مسمات الف کا بیٹا مذکورہ لڑکی سے نکاح کرسکتا ہے؟بینوا وتوجروا!

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مسمات الف کا بیٹا مذکورہ لڑکی سے نکاح کرسکتا ہے۔

باقی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نکاح نہیں ہوگا کیونکہ یہ لڑکی دودھ شریک بہن ہوئی ان لوگوں کا کہنا ہے کہ جس بچے نے بھی ایک گھونٹ پی لیا تو وہ بچہ اس عورت کی اولاد کا دودھ شریک بھائی بن جائے گا۔ حالانکہ ان کے پاس کوئی بھی ثبوت نہیں ہے صرف عقل وقیاس پر چلتے ہیں جب نبی کریم ﷺ سے صحیح اور واضح روایت موجود ہے تو پھر محض قیاس آرائیاں کس طرح صحیح ہوں گی۔

کوئی بھی بچہ اس وقت دودھ شریک بھائی ہوگا جب ایک سے لے کر پانچ مرتبہ تک دودھ چوس کر پیئے۔ جس طرح صحیح حدیث میں موجود ہے۔

((عن عائشة رضي الله عنها انها قالت كان فيما انزل من القرآن عشر رضعات معلومات يحرم ثم نسخن بخمس معلومات فتوفي رسول الله ﷺ وهي فيما يقرأ من القرآن .))[1]

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ قرآن پاک میں پہلے دس مرتبہ دودھ پینے سے حرمت ثابت کرنے کا حکم نازل ہوا تھا۔ پھر یہ منسوخ ہوا اور اس کے بدلے پانچ مرتبہ دودھ پینے سے حرمت ثابت کرنے کا حکم مقرر رہا۔ رسول اکرم ﷺ

[1] صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب التحريم بخمس رضعات، رقم الحديث ٣٥٩٧.

کی وفات تک یہی پانچ مرتبہ دودھ پینے سے حرمت ثابت ہونے کا حکم قرآن سے پڑھا جاتا رہا ہے۔"

جبکہ دوسری جگہ فرمایا ہے:

((لا تحرم المصة والمصتان .)) ❶

"یعنی ایک بار یا دو بار دودھ چوسنے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔"

تو ان احادیث صحیحہ کو چھوڑ کر اگر عقلی بات پر چلا جائے گا تو وہ بات گمراہی کے گڑھے میں گرائے گی۔ اگر اس طرح کی بات ہوتی تو رسول اللہ ﷺ ضرور ہمیں سکھاتے جب کہ ہمیں حکم ہے کہ:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ (الحشر: ۷)

"جو کچھ تمہیں رسول دیں اسے لو اور جس سے تمہیں وہ منع کریں اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔"

هٰذا ما عندي والعلم بالصواب

بالغ کا نابالغ سے نکاح

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیٹی کا نکاح صغرسنی میں کیا اس کا والد فوت ہوگیا بعد از بلوغت یہ لڑکی اپنا خاوند قبول نہیں کرتی اب بتائیں کہ یہ نکاح برقرار رہے گا یا نہیں؟ بینوا وتوجروا!!

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہئے کہ یہ نکاح برقرار نہیں رہے گا، کیونکہ اب جب کہ لڑکی بالغہ ہوگئی ہے تو اس کو اختیار حاصل ہے قبل از بلوغت کے نکاح کو برقرار رکھے یا رد کردے جس طرح حدیث شریف میں ہے:

---

❶ صحيح مسلم، رقم الحديث: ۳۵۹۰.

((عن ابن عباس رضي الله عنهما ان جارية بكرا اتت النبي ﷺ فذكرت ان ابها زوجها وهى كارهة فخيرها رسول الله ﷺ .))

(رواه احمد وابوداؤد و ابن ماجه)

اس سے ثابت ہوا کہ اس لڑکی کو اختیار حاصل ہے کہ اس نکاح کو برقرار رکھے یا رد کرے اب جب کہ لڑکی صغرسنی والی نکاح قبول نہیں کرتی تو یہ نکاح نہیں ہوگا۔ هٰذا ما عندي والعلم عند ربي .

ماں کی ولایت کہاں تک ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ بنام عبدالرحیم ایک لڑکی لے کر فرار ہوگیا جس میں لڑکی کی والدہ بھی راضی تھی اس نے ہی اپنے ہاتھ لڑکی کو عبدالرحیم کے ساتھ بھیجا۔ عبدالرحیم نے نکاح کرکے جا کر کورٹ میں بیان دلایا۔ اب لڑکی ملی ہے جب کہ وہ حاملہ ہے۔ اس لڑکی پر کیا سزا عائد ہوگی۔ شریعت محمدی کے مطابق کیا حکم ہے؟ بینوا وتوجروا!

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہئے کہ مذکورہ مسئلہ میں نکاح جائز نہیں ہے اگرچہ والدہ کا ساتھ کیوں نہ ہو، کیونکہ ولایت کا حق باپ کو حاصل ہے یہاں پر باپ موجود نہیں ہے جس طرح حدیث میں ہے:

((لا نكاح الا بولي .))

اور دوسری جگہ ہے:

((ايما امرأة نكحت بغير اذن وليها فنكاحها باطل فنكاحها باطل فنكاحها باطل)) [1]

اب عبدالرحیم نے زنا کیا ہے اس لیے اس کو زنا والی سزا ملنی چاہئے اور اس پر زنا والی حد عائد ہوگی۔ هٰذا ما عندي والله اعلم بالصواب .

---

[1] مسند احمد، وابن ماجه، كتاب النكاح، باب لا نكاح الا بولي .

دوران عدت کا نکاح

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ محمد فوت ہوگیا اس کی بیوی سکینہ نے عدت پوری ہونے سے قبل ہی بغیر ولی کی اجازت کے دوسری جگہ نکاح کر لیا۔ حالانکہ اس میں اس کا والد اللہ بخش بھی ناراض ہے ،اب بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق یہ نکاح صحیح ہے یانہیں؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہئے کہ یہ نکاح ناجائز ہے اس میں دو شرطیں ہیں۔

1. سکینہ کی عدت پوری ہونی چاہئے۔
2. ولی یعنی (والد) راضی ہونا چاہئے جس طرح حدیث میں ہے:

((لا نکاح الا بولی .))

اور دوسری روایت ہے:

((ایما امرأہ نکحت بغیر اذن ولیھا فنکاحھا باطل .))[1]

''دونوں شرائط کی عدم موجودگی کی وجہ سے نکاح باطل اور ناجائز ہوگا۔''

ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ مشتاق بن ریاض احمد کا نکاح بچپن میں مسمات مختاراں بی بی سے کروایا گیا اب مختاراں بی بی نے بلوغت کے بعد انکار کر دیا ہے کہ مجھے یہ نکاح قبول نہیں ہے کیونکہ مشتاق احمد بن ریاض احمد بدعتی اور جواری ہے لہٰذا وہ مشرک ہے اور میں ایک مشرک کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ جب کہ مسمات مختاراں کی ابھی رخصتی بھی نہیں ہوئی ہے۔ شریعت کے مطابق بتائیں کہ یہ نکاح جائز ہے یانہیں؟

---

[1] اخرجه الاربعة الا النسائی، وصححة ابو عوانه وابن حبان والحاکم .

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ یہ نکاح ثابت نہیں ہوگا کیونکہ:

1. ...... بلوغت کے بعد لڑکی کو اختیار حاصل ہے۔
2. ...... ایک مسلم کا غیر مسلم کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہوگا جب کہ خاوند مشرک ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

((عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان جارية بكرًا اتت النبى ﷺ فذكرت ان اباها زوجها وهى كارهه فخيرها رسول الله ﷺ .))[1]

''ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک لڑکی نبی ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اس کے ابو نے اس کا نکاح ایسی جگہ کیا ہے جو اس کو پسند نہیں ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس کو اختیار دے دیا۔''

اس سے ثابت ہوا کہ والدین کی رضا مندی کے ساتھ ساتھ لڑکی کو بھی یہ اختیار حاصل ہے کہ بلوغت کے بعد وہ نکاح برقرار رکھے یا نہ رکھے۔ هٰذا ما عندی والله اعلم بالصواب

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میاں بیوی نکاح کے بعد ایک دن اکٹھے رہے، پھر اس کے بعد خاوند نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور بیوی نے طلاق کے پانچویں دن دوسرے مرد سے نکاح کرلیا، یعنی قبل از عدت اب گذارش یہ ہے کہ مذکورہ نکاح شریعت کے مطابق جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مذکورہ صورت میں یہ نکاح ناجائز ہے کیونکہ قبل از عدت کیا گیا نکاح ناجائز ہے اور طلاق کی عدت تین حیض ہے جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾ (البقرة: ٢٢٨)

''یعنی طلاق یافتہ عورتیں تین حیض تک اپنے آپ کو نکاح سے بچا کے رکھیں۔''

---

[1] سنن ابوداؤد، كتاب النكاح، باب فى البكر يزوجها ابوها ولا يستأمر، رقم الحديث:٢٠٩٦.

اور یہ حکم اس عورت کے لیے ہے جس کو حمل نہیں ہے اور اگر کوئی حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہے جس طرح قرآن میں ہے:

﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ (الطلاق : ٤)

''یعنی حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل (بچہ پیدا ہونا) ہے۔''

لیکن اگر حیض آتا ہی نہیں صغرسنی یا کبرسنی کی وجہ سے تو اس کی عدت تین مہینہ ہے جس طرح قرآن میں ہے:

﴿وَالّٰٓـئِيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـئِيْ لَمْ يَحِضْنَ﴾ (الطلاق : ٤)

''اور وہ عورتیں جو حیض سے ناامید ہو چکی ہیں اگر تمھیں کوئی شک ہے تو ان کی عدت تین ماہ ہے یا جن عورتوں کو ابھی حیض نہ آتا ہو۔''

بہرحال دوران عدت نکاح کرنا جائز نہیں ہے جس طرح قرآن میں ہے:

﴿وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ﴾ (البقرة : ٢٣٥)

''یعنی جب مقررہ عدت اپنے خاتمہ تک نہ پہنچ جائے تب تک نکاح کا ارادہ نہیں کرو۔''

هٰذا ما عندي وَاللّٰه اعلم بالصواب

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ عبدالرحمٰن اور سموں نے آپس میں رشتہ داری کی اس طرح کے سموں نے اپنا عوض عبدالرحمٰن کو دیا اور عبدالرحمٰن سے عوض لے کر اپنے بھائی عبدالغنی کی شادی کروائی اس طرح پر کہ عبدالغنی اپنی بیٹی عبدالرحمٰن کو دے گا اور دوسری بیٹی سموں کو اپنی بیٹی کے عوض دے گا اس کے بعد عبدالغنی کی لڑکی پیدا ہوئی جو عبدالرحمٰن کو دی گئی لیکن وہ فوت ہوگئی بعدازاں عبدالغنی کو دوسری لڑکی پیدا ہوئی جس کی مانگ سموں کر رہا ہے لیکن اب عبدالرحمٰن عبدالغنی سے زبردستی دوسرے رشتہ کا تقاضا کر رہا ہے۔ شریعت محمدی کے مطابق بتائیں کہ لڑکی کا حقدار سموں ہوگا یا عبدالرحمٰن؟

بینوا توجروا!

الجواب بعون الوھاب: معلوم ہونا چاہیے کہ اس لڑکی کا حقدار سموں ہوگا کیونکہ انہوں نے اپنی لڑکی دے کر اپنے بھائی عبدالغنی کی شادی کروائی تھی۔ اب وہی اس کی بیٹی کا حقدار ہے اسی کا حق رہتا ہے جب کہ عبدالرحمٰن کو اپنا حق مل چکا ہے اب اس کا حق باقی نہیں رہے گا اور سموں نے اپنے بھائی کے ساتھ شرط رکھی تھی کہ آپ کی شادی میں کراؤں گا اور جو لڑکی پیدا ہوگی وہ میری ہوگی۔ ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

معدوم چیز کا سودہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ماں، بیٹی، بہن، پیسوں میں دینا یا عوض میں یا پیٹ کا بچہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوھاب: مختصر گذارش یہ ہے کہ آزاد مرد اور آزاد عورت کو پیسوں میں بیچنا شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ وہ آزاد ہونے کی حیثیت سے کسی کی ملکیت نہیں ہیں۔ کتب احادیث میں ان کا بیچنا ممنوع ہے۔ اگر کوئی بھی مرد دنیاوی لالچ میں آ کر ان کو بیچے گا تو اس کا حق ولایت ختم ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس قبیح فعل سے بچائے۔ آمین!

اسی طرح وٹہ سٹہ یا عوض کا نکاح بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((لا شغار فی الاسلام))[1]

اسی طرح پیٹ کا لکھا بھی لینا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ جو چیز معرض وجود میں نہیں ہے، اس کا عقد کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ ھٰذا ما عندی واللہ أعلم بالصواب.

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک شخص بنام عاشق حسین نے اپنی دادی کا اس وقت دودھ پیا کہ جب وہ دودھ اس کی غذا تھی اور اس دودھ کی مقدار بہت زیادہ ہے، یعنی عشر رضعات سے بھی زیادہ ہے اور وہ دودھ اس کی دادی کو غیر فطری طور پر ہوا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ عاشق حسین اپنی چاچے محمد علی کی کسی بچی

---

[1] صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب تحریم النکاح الشغار وبطلانه، رقم الحدیث:٣٤٦٨.

سے شریعت اسلامی کے مطابق نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب بعون الوهاب: صورت مسئولہ میں عاشق حسین اپنے چچا محمد علی کا رضاعی بھائی ہوا اور محمد علی کی سب بیٹیاں اس کی رضاعی بھتیجیاں ہوئیں اس لیے یہ رشتہ عاشق حسین کے لیے اسی طرح حرام ہے جس طرح نسبی رشتے اس لیے اس نکاح شرعاً درست نہیں۔

١:......اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ ..... وَأَخَوٰتُكُم مِّنَ الرَّضَاعَةِ﴾ (النساء: ٢٣)

''یعنی اللہ تعالیٰ نے تمھارے اوپر تمھاری......اور رضاعی بہنیں حرام قرار دیا ہے۔''

٢:......رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((الرضاعة تحرم ما تحرم والولادة.)) (صحيح بخاری، مسلم)

''کہ نسب سے جو رشتے حرام ہوتے ہیں وہ رضاعت سے بھی حرام ہوجاتے ہیں۔''

اس معنی میں مندرجہ ذیل روایات بھی وارد ہوئی ہیں۔

٣:......رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((ان الله حرم من الرضاع ما حرم من النسب.))

(رواه احمد، والترمذی وصححه)

٤:......رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((قالت ان عمها من الرضاعة استأذن عليها محبيته فاخبرت رسول الله ﷺ فقال لها لا تحببي منه فانهٗ يحرم من الرضاعة ما يحرم من النسب.)) (صحيح مسلم، كتاب النكاح)

اس آیت اور احادیث سے ثابت ہوا ایسی صورت میں ایسا نکاح باطل ہے، اس لیے یہ رشتہ ختم کیا جائے اور یہی شریعت کا حکم ہے۔

نوٹ:...... شریعت میں رضاعت کے ثبوت کے لیے دودھ کا قدرتی اور غیر قدرتی طور پر پیدا ہونا وغیرہ کوئی قید مذکور نہیں ہے۔
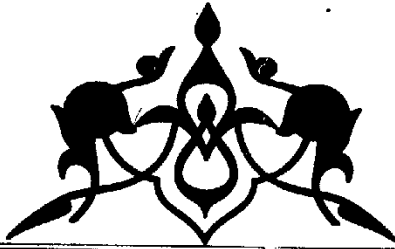
كِتَابُ الطَّلَاقِ

طلاق ثلاثہ

(سوال): کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری بیوی نے منع کرنے کے باوجود پہلے بھی کافی دفعہ گالی گلوچ کی ہے ۱۹۸۶۔۴۔۱ گھر میں جھگڑا ہوا میں نے اپنی بیوی کو کہا کہ گالی مت دے لیکن وہ گالی دینے سے نہ رکی تو میں نے اسے تین سے بھی زیادہ دفعہ طلاق کے الفاظ کہہ دیئے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ آج کے بعد تو میری ماں ہے۔ میری یہ شادی وٹے سٹے کی صورت میں ہوئی تھی اب سامنے والوں نے بھی طلاق دینے کی تیاری کر لی ہے صرف میری طلاق کی وجہ سے تین اور طلاقیں بھی واقع ہو رہی ہیں، لہٰذا اگر قرآن وحدیث میں میری اس طلاق کا کوئی حل ہے تو بتائیں تا کہ میں اپنی بیوی کو اپنے گھر لے آؤں؟

الجواب بعون الوهاب: مذکورہ سوال میں دو باتیں ہیں پہلی یہ کہ ایک ہی مجلس میں کئی طلاقیں دی گئی ہیں۔ دوسری یہ کہ اپنی بیوی کو ماں کا درجہ دیا ہے جو کہ ظہار کا مسئلہ ہے۔

پہلے مسئلے کے متعلق معلوم ہونا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ کے دور میں ایک ہی مجلس میں دی جانے والی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مسند میں بھی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حسن سند سے ایک روایت مذکور ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

((عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال طلق ركانة بن عبد يزيد أخو بني المطلب إمرأته ثلاثا في مجلس واحد فحزن عليها حزنا شديدا قال فسأله رسول الله ﷺ كيف طلقتها؟ قال طلقتها ثلاثا قال: فقال في مجلس واحد؟ قال نعم قال فانما تلك واحدة فارجعها ان شئت فقال فرجعها فكان ابن عباس يرٰى انما الطلاق عند كل طُهْر.)) [1]

[1] مسند احمد، جلد١، ص ٢٦٥، رقم الحديث:٢٣٩٧.

''ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں رکانہ بن عبد یزید نامی ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دیں جس کے بعد کافی غمگین ہوا پھر یہ معاملہ نبی ﷺ کی مجلس میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے رکانہ سے دریافت کیا کہ آپ نے کیسے طلاق دی تو رکانہ نے کہا کہ میں نے تین طلاقیں دے دی ہیں تو آپ ﷺ نے دوبارہ دریافت کیا کہ کیا ایک ہی مجلس میں تو صحابی نے جواب دیا جی ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا (اگر تو نے ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دی ہیں تو یہ ایک ہی ہے) لہٰذا اگر آپ چاہیں تو رجوع کر سکتے ہیں تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رکانہ نے اپنی بیوی سے رجوع کر کے اسے واپس لے آئے۔''

اسی وجہ سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا مؤقف تھا کہ تین طلاقیں تین طہر (پاکیزگی کے ایام) میں دینی چاہئیں۔ یعنی اگر کوئی اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہے تو ہر مہینے پاکیزگی کے ایام میں ایک طلاق دے اس طرح تین مہینوں میں تین طلاقیں ہوں گی۔ اور اگر ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دیتے ہیں تو یہ تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوگی اور ایک اور دو طلاقیں رجعی ہوتی ہیں۔ لہٰذا طلاق کی عدت تین ماہ ہے اس مدت کے اندر اندر خاوند اپنی بیوی سے رجوع کرسکتا ہے اور اگر تین مہینوں کی مدت گزر جائے تو نکاح ٹوٹ جائے گا، لیکن پھر بھی طرفین کی رضا مندی سے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر مہربانی ہے کہ طلاق جیسے مبغوض معاملے میں بھی تحمل والا معاملہ اپنایا اور جلد بازی نہیں کی۔ حالانکہ انسان ہمیشہ ایک ہی حالت میں نہیں ہوتا بلکہ کبھی غصہ اور پریشانی کی وجہ سے جلد بازی میں اپنی بیوی کو کئی طلاقیں دے دیتا ہے اور اس طرح جتنی طلاقیں دی ہیں اگر اتنی ہی شمار کی جائیں تو طلاق دینے والے کو سوچنے اور غور وفکر کا موقع بھی نہ ملے۔ بعض مرتبہ مطلقہ عورت خاوند کی محبوبہ بھی ہوتی ہے لیکن اب ان کو گھر آباد کرنے کا کوئی موقع حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے شریعت مطہرہ نے ایک مجلس کی کئی طلاقوں کو ایک ہی شمار کیا ہے تاکہ طلاق دینے والے کو

غور وفکر کر کے صحیح فیصلے کا موقع مل سکے، اگر خاوند کو بیوی سے جدا ہونا بھی ہے تو بھی اسے سوچنے سمجھنے کا موقع ملے گا۔

بہرحال صورت مسؤلہ میں اگرچہ سائل نے اپنی بیوی کو کتنی ہی طلاقیں دی ہیں۔ وہ سب ایک ہی شمار ہوگی۔ اس لیے جس تاریخ کو طلاق دی ہے اس سے تین ماہ تک دو عادل گواہوں کی موجودگی میں اپنی بیوی سے رجوع کر سکتا ہے۔ مسئلہ ظہار کے بارہ میں قرآن مجید کے اٹھاسویں پارے کی سورۃ المجادلۃ کے پہلے رکوع میں جو حل بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ ظہار کرنے والے مرد کے پاس اگر غلام ہے تو اپنی بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے پہلے اس کو بطور کفارہ آزاد کر دے۔ لیکن چونکہ اب غلام نہیں ہیں اس لیے اس پر عمل نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے غلام کی عدم موجودگی کی صورت میں دوسری صورت بھی بیان فرمائی ہے کہ بغیر ناغہ (لگاتار) کیے دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنے پڑیں گے جن کے درمیان انقطاع (فاصلہ) نہیں کیا جائے گا یہ کام بطور کفارہ عورت کو چھونے سے پہلے کرنا ہے اور جو مسلسل دو مہینوں کے روزوں پر عمل کی طاقت نہیں رکھتا اس کے لیے تیسری صورت بیان کی ہے کہ اس آدمی کو ۶۰ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا پڑے گا اب اگر صورت مسؤلہ میں سائل کو لگاتار دو مہینوں کے روزوں کی استطاعت ہے تو مسلسل دو مہینے روزے رکھنے پڑیں گے اور اگر طاقت نہیں ہے تو ۶۰ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے۔ اب سائل کے لیے مناسب یہی ہے کہ پہلے دو گواہوں کی موجودگی میں اپنی بیوی کو واپس اپنے گھر لے کر آئے اور پھر دو مہینے کے روزے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا کر اپنا گھر نئے سرے سے آباد کرے۔

ھٰذا ما عندنا والعلم عنداللّٰہ العلام وھو اعلم بالصواب والیه المرجع والمآب وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ واصحابہ وسلم!

لا طلاق فی اغلاق

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اسحاق احمد نے اپنی بیوی کو طلاق دی پھر فوراً ہی رجوع کر لیا لیکن بعد میں زبردستی طلاق لکھوائی گئی حالانکہ وہ

عورت حاملہ بھی ہے۔شریعت کے مطابق اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الوھاب: معلوم ہونا چاہیے کہ اگر خاوند نے اپنی بیوی کو طلاق دی پھر نادم اور پریشان ہو کر فوراً ہی رجوع کر لیا دو گواہوں کی موجودگی میں تو یہ طلاق رجعی ہوئی اور خاوند دوران عدت اگر بیوی سے رجوع کرنا چاہے تو رجوع کر سکتا ہے۔ باقی جو جبراً طلاق لکھوائی گئی ہے وہ جائز نہیں ہے۔ ایسے واقعات موجود ہیں ایک آدمی نے بیک وقت تین طلاقیں دیں پھر رجوع کرنا چاہا تو آپ ﷺ نے رجوع کی اجازت دے دی۔ باقی زبردستی کی طلاق ناجائز ہے یہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب

نوٹ:...... اگر زبردستی اس صورت میں ہے کہ جان کو خطرہ ہے تو طلاق نہیں ہوگی ورنہ دوسری صورت میں صرف ذہنی دباؤ ڈال کر طلاق لی جائے تو یہ طلاق المکرَہ نہیں ہوگی۔

(قاسم شاہ راشدی)

عورت کا خلع طلب کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ قریباً (۶) ماہ ہوئے ہیں محمد بخش نے اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا ہے نہ خرچہ دیتا ہے اور نہ ہی طلاق دے رہا ہے۔ جب کہ بیوی طلاق اور خرچہ چاہتی ہے کیوں کہ اس کے چار چھوٹے بچے ہیں اور وہ حاملہ بھی ہے اور حق مہر بھی لینا چاہتی ہے۔ اب گذارش یہ ہے کہ شریعت کے مطابق جو بھی فیصلہ یا حکم ہو اس سے آگاہ کیا جائے؟

الجواب بعون الوھاب: معلوم ہونا چاہیے کہ شریعت کے مطابق خرچہ خاوند کو دینا ہے اگر خاوند ظلم کرتا ہے تو عورت خاوند سے طلاق لے سکتی ہے اور اگر وہ حاملہ ہے تب بھی طلاق ہو سکتی ہے اور صغیر بچے ماں کے پاس رہیں جب تک بالغ نہ ہو جائیں اور خرچہ والد کو دینا ہے باقی حق مہر اس صورت میں لے سکتی ہے جب خاوند طلاق دے ورنہ دوسری صورت میں (یعنی خلع) میں مہر واپس نہیں لے سکتی۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

بدکردار شوہر یا پاک دامن عورت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسمات حاجو بنت دین محمد کا کہنا ہے کہ میرا خاوند محمد صدیق مجھے زبردستی شراب پلا کر برے کام کے لیے غیروں کے پاس بھیجتا ہے اگر میں انکار کرتی ہوں تو سزا دے کر بھیجتا ہے اب میں ان باتوں کی وجہ سے بیزار ہوں اور نکاح ختم کروانا چاہتی ہوں کیا شریعت کے مطابق عورت طلاق لے سکتی ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا!

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہئے کہ اگر خاوند ایسا بد اخلاق ہے تو عورت طلاق لے سکتی ہے جس طرح حدیث پاک میں ہے:

((عن سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ فی الرجل لایجد ما ینفق علی امرأته قال یفرق بینهما.)) [1]

اور دوسری حدیث میں ہے:

((لا ضرر ولا ضرار.)) [2]

اس سے ثابت ہوا کہ خاوند نقصان پہنچانے والا نہ ہو اگر وہ نقصان پہنچانے والا ہے یا غیر شرعی کام کرواتا ہے تو ان دونوں صورتوں میں خاوند بیوی کے درمیان جدائیگی کی جائے گی۔ هٰذا ما عندي والله اعلم بالصواب

حالت جنون کی طلاق

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ غلام محمد نے پاگل پن کے دوران اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں لیکن اس کے گواہ موجود نہیں اور جو ثبوت میں طلاق نامہ ہے اس پر بھی جعلی دستخط ہیں۔ اور غلام محمد طلاق کے بعد بھی بیوی کے پاس آتا ہے

---

[1] بحواله سنن سعيد بن منصور، جلد٢، صفحه ٥٥ .

[2] ابن ماجه، كتاب الاحكام، باب من بنى فى حقه ما يضر بجاره، رقم الحديث: ٢٣٤١ .

خرچہ وغیرہ بھی دیتا ہے کیا شریعت کے مطابق یہ طلاق ہوئی یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ یہ طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ حدیث میں ہے:

((عن علی ان رسول الله ﷺ قال رفع القلم عن الثلاثة عن النائم حتى يستيقظ وعن الصبی حتی یشب وعن المعتوه حتى يعقل .)) ❶

اس سے ثابت ہوا کہ یہ طلاق واقع نہیں ہوگی اور کئی وجوہات ہیں مثلاً گواہ موجود نہیں ہیں اور تحریر بھی خاوند کی نہیں ہے۔ اس لیے خاوند کی ملکیت سے اولاد کی موجودگی میں اس کو آٹھواں حصہ ملے گا۔ هٰذا ما عندی والله اعلم عند ربی .

فرضی طلاق نامہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ جاوید اختر بن دین محمد آف لاڑکانہ شہر کا نکاح مسمات ناہید اختر بنت ڈاکٹر شبیر احمد پٹھان کے ساتھ ہوا جس سے ایک بیٹی بھی پیدا ہوئی ہے ان کی شادی کو تین سال اور ایک مہینا ہوا ہے چند دن قبل جاوید اختر راہو نے کسی عرض نویس کو اپنی طبع کے متعلق بتایا جس نے ایک طلاق نامہ بنا کر طلاق دینے والے اور گواہوں کے نام اور فرضی دستخط کر کے ناہید اختر کو پہنچائے، اس جوڑے کو ایک ڈیڑھ سالہ لڑکی ہے جو اپنے گھر آتی رہتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے طرفین راضی ہیں اور شکوہ سے ڈرے ہوئے ہیں۔ آپ سے یہ جواب طلب ہے کہ کیا فرضی طلاق نامہ کوئی درجہ رکھتا ہے جس کا خاوند کو کوئی وہم وگمان نہ تھا اور نہ ہے۔ برائے مہربانی حقیقت حال مطابق فیصلہ سنائیں گے؟ (سائل محمد علی بن حاجی محمد اسماعیل ڈیرو)

الجواب بعون الوهاب معلوم ہونا چاہیے کہ جب خاوند انکاری ہے کہ میں نے

---

❶ سنن ترمذی، کتاب الحدود، باب ما جاء فیمن لا یحب علیه، رقم الحدیث:۱٤٢٣ .

طلاق لکھ کر نہیں دی ہے اور اس کا کوئی گواہ بھی موجود نہیں ہے اگر کسی دوسرے اجنبی نے لکھ کر دی ہے تو یہ طلاق نہیں ہوئی اور گواہ بھی انکار کر رہی ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔ کیونکہ طلاق دینے کے بھی اصول ہیں اور گواہ بھی ہونے چاہئیں۔ جب کہ یہاں پر اصول اور گواہ موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ طلاق نہیں ہوگی۔

1. عرض نویس نے فرضی نام لکھے ہیں جس سے ثابت ہوا کہ گواہ بھی موجود نہیں ہے۔
2. کہ خاوند نے یہ طلاق نامہ نہ پڑھا ہے اور نہ ہی لکھوایا ہے۔ هٰذا ما عندي واللّٰه اعلم بالصواب.

سوال: شفیع محمد نے اپنی بیوی شہناز کو تین طلاقیں اس حالت میں دی ہیں کہ وہ حاملہ ہے اور اس عورت کے ساتھ شفیع محمد کا بھائی شادی کرنا چاہتا ہے کیا وہ شادی کرسکتا ہے اور عورت کتنا عرصہ عدت گذارے گی؟ بینوا توجروا!!

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہئے کہ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے، جب بچہ پیدا ہوگا اس وقت عدت ختم ہو جائے گی۔ اللہ کا فرمان ہے:

﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ .....﴾ (الطلاق : ٤)

حاملہ عورت کی عدت وضع حمل ہے، عدت گزرنے تک عورت کا نان ونفقہ اور رہائش وغیرہ شفیع محمد کے ذمہ ہوگا۔ عدت گذرنے کے بعد عورت کسی معتبر شخص ولی کے واسطے سے اپنا نکاح کرواسکتی ہے "لا نكاح الا بولي" مگر شفیع محمد کے بھائی کے ساتھ اپنی رضا خوشی سے وہ نکاح کرتی ہے تو یہ جائز ہے۔ شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے۔ هٰذا ما عندي واللّٰه اعلم بالصواب

"تم طلاق"

سوال: اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو یہ کہتا ہے "تم طلاق" تو کیا اس کی بیوی مطلقہ ہو جائے گی؟

الجواب بعون الوهاب: اصل مسئلہ یہ ہے کہ طلاق، نکاح اور رجوع اگر مذاقاً بھی

کہے تو ہوجاتی ہیں، جیسا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ترمذی (کتاب الطلاق)، ابوداؤد وغیرہ میں یہ حدیث حسن سند کے ساتھ وارد ہوئی ہے:

((ثلاث جدهن جدوهزلهن جد النكاح والطلاق، والرجعه .))

"تین چیزیں ایسی ہیں ان کی حقیقت بھی حقیقت ہے اور ان کا مذاق بھی حقیقت ہے، نکاح، طلاق، رجوع۔"

لیکن آں جناب نے جوصورت تحریر فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ "تم طلاق" آپ کی زبان سے غلطی سے نکل گئے ہیں جیسا کہ نحو کی کتاب میں بدل غلط کی مثال دی جاتی ہے کہ کسی کو کہنا یہ ہے کہ جاء زید لیکن نکل گیا، جاء حمار پھر اس کا تدارک کرتے ہوئے حمار کے بعد زید کہے، خطا میں اور مذاق میں فرق ہے۔ مذاق میں ان الفاظ کے نکلنے کا ارادہ تو ہوتا ہے لیکن وہ دل میں یہ ارادہ کرتا ہے کہ یہ الفاظ میں مذاق سے کہہ رہا ہوں لیکن خطا میں تو ان الفاظ کے کہنے کا نہ خطاءً نہ مذاقاً ارادہ ہی نہیں ہوتا بلکہ زبان کی سبقت سے نکل جاتے ہیں اور اس کا کوئی اعتبار نہیں بموجب حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما مرفوعاً:

((إن الله تجاوز لي عن امتي الخطا والنسيان وما استكرهوا عليه .)) (رواه ابن ماجه)

"میری اُمت سے اللہ تعالیٰ نے تین چیزیں درگزر فرمائی ہیں غلطی، بھول چوک اور زبردستی۔"

لہٰذا اس سے کوئی طلاق وغیرہ واقع نہیں ہوگی۔ پھر صحیح طور پر جو الفاظ آپ کی زبان سے نکل گئے وہ تھے "تم طلاق" یہ جملہ نا تمام ہے یہ اس طرح بھی ہوسکتا ہے "تم طلاق چاہتی ہو" وغیرہ وغیرہ اگر بالفرض یہ الفاظ دانستہ طور پر کہے تھے تب بھی آپ کی نیت پر منحصر ہوگا اگر نیت یہ تھی کہ تم طلاق یافتہ ہو تو طلاق ہوجائے گی لیکن دوسرے الفاظ سے طلاق نہیں ہوئی لہٰذا اگر آں جناب کی واقعتاً نیت تھی کہ "تم طلاق یافتہ ہو" تو پھر طلاق واقعہ ہوگی لیکن رجعی ہوگی جو عدت کے اندر اس سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ هذا ما عندي والله اعلم بالصواب.

معاملات کے مسائل

رشوت کا حکم

سوال: رشوت کی تعریف اور تشریح فرما کر یہ وضاحت کریں کہ کیا مجبوراً آدمی حصول حق کے لیے رشوت دے سکتا ہے؟

الجواب بعون الوهاب: آپ کا خط ملا گذارش ہے کہ رشوت کی معنی یہ ہے کہ:

"کسی شخص کو کچھ مال اس غرض سے دینا کہ وہ شخص امر باطل وناحق پر اس کی اعانت کرے اور اس غرض سے جو مال دے وہ راشی ہے اور جو مال لے وہ مرتشی ہے اور جو شخص دونوں کے درمیان اس لین دین کی بات چیت کرائے وہ رائش ہے اور حدیث میں ان تینوں شخصوں پر خدا کی لعنت آئی ہے اور امر حق کے حاصل کرنے کے لیے یا ظلم ظالم کے دفع کرنے کے لیے مال دینا رشوت نہیں ہے۔" (فتاویٰ نذیریہ: ص۳۰/۲طبع قدیم)

لغت حدیث کی مشہور کتاب مجمع بحار الانوار میں بھی اس طرح لکھا ہے، چنانچہ اس کتاب کی عبارت جلد۲صفحہ۳۲۹) طبع جدید سے مع ترجمہ ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

((الرشوة وفيه لعن الله الراشي ، اي من يعطيه الذي يعينه على الباطل والمرتشي أي آخذه والرائش" أي الساعي بينهما ومن يعطي توصلاً الى أخذ حق اور دافع ظلم فغير داخل فيه وروى ان ابن مسعود رضي الله عنه أخذ بارض الحبشة بشئي فاعطى دينارين حتى خلى سبيله" وروى عن جماعة من ائمة التابعين قالوا: لا بأس أن يدافع عن نفسه وماله اذا خاف الظلم.))

"رشوت کے معنی ہیں باطل مال اور حدیث میں راشی وہ شخص ہے جو کسی دوسرے شخص کو کچھ مال اس لیے دیتا ہے کہ وہ اس کی باطل وناحق پر مدد کرے، اور مرتشی

وہ شخص ہے جو اس طرح کا ناحق مال باطل پر اعانت کے لیے لیتا ہے، اور رائش یہ وہ شخص ہے جو ان دونوں شخصوں کے درمیان لین دین کی بات کرتا ہے، ان تینوں پر اللہ کی لعنت آئی ہے، جو آدمی کچھ مال دیتا ہے اس غرض سے کہ اس طرح وہ اپنا حق حاصل کر سکے یا اپنے سے ظلم کو دفع کر سکے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ حبشہ کی زمین میں کسی معاملہ میں ناحق پکڑا گیا تو اس نے دو دینار دیئے تب ان کو چھوڑا گیا اور تابعین و ائمہ کی ایک جماعت سے یہ روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر کوئی کچھ مال وغیرہ دے کر اپنی جان و مال سے ظلم دفع کرے جب انہیں خوف ہو کہ اگر وہ کچھ نہ دے گا تو اس کی جان یا مال کو نقصان پہنچے گا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی جس روایت کی طرف مجمع بحار الانوار کی عبارت میں اشارہ ہے وہ ہم ذیل میں امام بیہقی کی کتاب السنن الکبریٰ سے نقل کرتے ہیں۔

((باب: من اعطاها ليدفع بها عن نفسه اوماله ظلماً او يأخذبها حقاً.))

''یعنی یہ باب اس باب کے بیان میں ہے کہ اگر یہ رشوت کوئی دوسرے شخص کو دیتا ہے اس غرض کے لیے کہ اس طرح وہ اپنی جان و مال سے ظلم دفع کرے یا اپنا حق حاصل کریں تو اس کا کیا حکم ہے؟''

پھر اس باب کے تحت یہ روایتیں لائیں ہیں:

((اخبرنا ابو الحسين بن الفضل القطان ببغداد انبا عبدالله بن جعفر ثنا يعقوب بن سفيان ثنا زيد بن المبارك الصنعانى وكان من الخيار قال ثنا وكيع ثنا ابو العميس (هو عتبة بن عبدالله بن عتبة بن عبدالله بن مسعود) عن القاسم بن عبدالرحمن عن ابن مسعود رضي الله عنه انه لما أتى أرض الحبشة

أخذ بشيئ فتعلق له فاعطى دينار ين حتى خلى سبيله .)) [1]

اس روایت کی سند کے متعلق بعد میں کچھ عرض کریں گے یہاں متن کا ترجمہ لکھا جاتا ہے۔

''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ جب حبشہ کی زمین میں آیا تو کسی بات میں پکڑا گیا اور وہ ان سے چمٹ گئے (یعنی وہ آپ کو چھوڑ نہیں رہے تھے۔) حتی کہ انہوں نے دو دینار دیئے تب ان کی خلاصی ہوئی۔''

اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں، لیکن قاسم بن عبدالرحمٰن جو ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کررہیں ہیں وہ اگرچہ ثقہ ہے (ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا پوتا بھی ہے) لیکن انہوں نے اپنے دادا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کچھ نہیں سنا لہٰذا یہ قرین قیاس ہے کہ انہوں نے یہ روایت اپنے والد عبدالرحمٰن سے سنی ہو اور انہوں نے اپنے والد ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور یہ چونکہ ان کے خاندان اور دادا کی بات ہے لہٰذا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ روایت انہوں (قاسم) نے ضرور اپنے والد عبدالرحمٰن سے سنی ہوگی۔ (واللہ اعلم)

پھر امام بیہقی دوسری روایت وہب بن منبہ تابعی سے ذکر کرتے ہیں:

((أخبرنا ابن الفضل انبأ عبدالله بن جعفر ثنا يعقوب بن سفيان ثنا زيد (هو ابن المبارك) ثنا عبدالملك بن عبدالرحمن عن محمد بن سعيد هو (ابن رمانة) عن ابيه (هو سعيد بن رمانة) عن وهب بن منبه قال: ليست الرشوة التى يا ثم فيها صاحبها بأن يرشو فيدفع عن ماله ودمه، انما الرشوة التى يأثم فيها ان ترشوا لتعطى ماليس لك .)) [2]

''یعنی وہب بن منبہ (جو ایک مشہور تابعی ہے) سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ: وہ رشوت جو اس کا دینے والا اس کی وجہ سے گنہگار ہوتا ہے وہ یہ نہیں

[1] بیهقی، کتاب آداب القاضی، جلد ۱۰، صفحه ۱۳۹ .

[2] السنن الکبریٰ: ج۱۰، ص۱۳۹ .

ہے جو آدمی اپنے خون ومال کے مدافعت میں دیتا ہے ہاں جس رشوت دینے
سے آدمی آثم وگنہگار ہوگا وہ یہ ہے کہ تو رشوت اسے اس لیے دے کہ تجھے وہ چیز
وغیرہ مل جائے جو تیری نہیں یا اس پر تیرا حق نہ ہو۔"

اس روایت کی سند کے دو راوی محمد بن سعید بن رمانہ اور اس کے والد سعید بن رمانہ کا ذکر فن رجال کی کتاب تہذیب التہذیب میں ملتا تو ہے، لیکن ان کے متعلق جرحاً وتعدیلاً کچھ نہیں لکھا اور نہ ہی کسی دوسری کتاب سے کچھ مزید پتہ چل سکا۔

بہرحال فتاویٰ نذیریہ کی عبارت سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ ان کے ہاں جو مال اپنے حق کے حاصل کرنے یا ظلم کے دفع کرنے کے لیے دیا جاتا ہے وہ رشوت ہی نہیں لیکن امام بیہقی کی رائے یہ ہے کہ یہ بھی رشوت ہے اس لیے باب میں یہ لکھا "من اعطاھا" اور ھا کی ضمیر رشوت کی طرف لوٹتی ہے جو اس باب سے پہلے باب میں گذر چکی ہے لیکن اس طرح کی رشوت دینے والا گنہگار نہ ہوگا اس طرح وہب بن منبہ کی عبارت سے بھی ظاہر ہے کہ یہ بھی رشوت ہے لیکن اس کا دینا والا گنہگار نہ ہوگا۔

راقم الحروف کی تحقیق بھی یہ ہے یعنی آدمی اپنے حق حاصل کرنے کے لیے یا اپنی جان ومال سے ظلم کی مدافعت کے لیے کچھ دیتا ہے تو وہ رشوت تو ہے لیکن اس کے دینے والا آثم (گنہگار) نہ ہوگا کیونکہ وہ مجبور ہے، البتہ لینے والا ضرور گنہگار ہوگا کیونکہ اس کے پاس اس مال کے لینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

راقم الحروف کو جو کتاب وسنت کی روشنی میں جو کچھ سمجھ میں آیا وہ ذکر کر دیا ہے اگر صحیح ہے تو یہ من عنداللہ سے ورنہ یہ میری غلطی ہے۔

قرآن کریم سورۃ الانعام میں ہے:

﴿وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ﴾ (الانعام: ۱۱۹)

آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالت اضطراب کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے ان کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے۔"

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ جو چیزیں کتاب وسنت میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہیں تو وہ اشیاء یا امور حرام ہیں لیکن اضطراری اور مجبوری کی حالت میں مستثنیٰ ہیں یعنی جو چیزیں ناجائز وحرام ہوں لیکن اگر اضطراری یا مجبوری یا اکراہ کی حالت ہو تو جائز ہو جاتی ہیں لیکن اس جواب کا یہ مطلب نہیں کہ اب اس چیز کو بے تحاشا حلال سمجھ کر خوب کام میں لایا جائے بلکہ جتنی مقدار سے ہو گیا ہے تو پھر مزید استعمال نہ کرے، اب رشوت جو ایک مضطر ومجبور آدمی اپنے حق کے حصول کے لیے دیتا ہے تو وہ اس دینے پر مجبور ہے کیونکہ اگر نہیں دیتا تو اس کا حق غصب ہو جاتا ہے لہٰذا ایسی صورت میں دینے والا گنہگار نہ ہو گا ہاں لینے والا آثم (گنہگار) ہو گا۔

اب ایک حدیث ملاحظہ کیجیے:

((عن ابن ابی ذرّ الغفاری رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ تجاوز لی عن امتی الخطاء والنسیان وما استکرھوا علیه .)) [1]

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری امت کی تین چیزوں سے درگذر فرمایا ہے۔ [1] غلط سے کوئی کام ہو جائے۔ [2] بھول کر کوئی کام کیا ہو۔ ۳۔ جس پر وہ مجبور کر دیا گیا ہو۔"

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی مجبوری یا اکراہ کی وجہ سے کسی کام کے کرنے پر مجبور ہو گیا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے درگذر فرماتا ہے۔

---

[1] حدیث حسن رواہ ابن ماجة ، کتاب الطلاق ، باب طلاق المکرہ والناسی ، رقم الحدیث:۲۰۴۳ .

بہرحال اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ اگر مجبور ہو کر اپنے حق کے حصول کے لیے یا اپنے اوپر ظلم کے دفعیہ کے لیے رشوت دیتا ہے تو وہ اس سے گنہگار نہیں ہوگا۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سوچ لینی چاہیے کہ آیا فی نفس الامر اور واقعتاً دینے پر مجبور ہے؟ اور اس کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر اس کے سوائے اور کوئی جائز صورت ہے تو پھر رشوت ہرگز نہیں دینی چاہیے۔ هذا ما عندي والله اعلم بالصواب

نقد اور ادھار میں فرق

سوال: زید کو بکر ایک من گندم اس شرط پر دیتا ہے کہ گندم اس وقت ۱۵ روپے من ہے پر تو چوتھے یا پانچویں مہینے بعد مجھے یہ رقم مزید پانچ روپے ڈال کر بیس روپے دینا کیا اس طرح کا سودا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: جس طرح سوال سے ظاہر ہے کہ بکر جو پانچ روپے مزید لیتا ہے وہ چار پانچ مہینے کی ادھار کے سبب لیتا ہے یعنی وہ زائد پیسے محض ادھار والے وقت کی عوض (بدلے) میں ہیں باقی ان کی عوض (بدلے) خریدار کو زیادہ کچھ بھی نہ دیا گیا ہے نہ گندم اور نہ دوسری کوئی چیز اور ادھار والے وقت کے بدلے جو رقم زائد لی جاتی ہے وہ سود ہی ہوتی ہے کیونکہ وہ کسی دوسری چیز کے بدلے میں نہیں ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر بیچنے والے کو رقم کیش ملتی تو وہ ۱۵ روپے سے زائد نہ لیتا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ زائد رقم (پانچ روپے) محض ادھار کے عوض ہے اور یہ سود ہے اور نص قرآنی موجب حرام ہے لہٰذا یہ سودا ناجائز ہے اور دونوں گروہوں کے راضی ہونے یا نہ ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیز دونوں گروہوں کے راضی ہونے سے حلال نہیں ہوسکتی۔ والله اعلم بالصواب!

لیس منا کا مفہوم

سوال: حدیث میں آیا ہے جو دھوکہ دیتا ہے "فليس منا" جو چھوٹوں پر رحم نہیں

کرتا اور بڑوں کا ادب نہیں کرتا اس کے بارے میں آیا ہے "فلیس منا" اس کا کیا مفہوم آیا وہ اُمت محمدیہ ﷺ سے خارج ہو کر کافر ہو گیا یا اور کوئی مفہوم ہے۔ مہربانی فرما کر قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

الجواب بعون الوهاب: دھوکہ وفراڈ کرنے والے چھوٹوں پر رحم نہ کرنے والے، بڑوں کی عزت وتوقیر نہ کرنے والوں کے متعلق وعیدیں وارد ہوئی ہیں لیکن احادیث مبارکہ میں یہ الفاظ نہیں کہ " فهو ليس من امتي. "یعنی وہ میری امت میں سے نہیں بلکہ "فليس منا" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں یعنی ہمارے بتائے ہوئے راستہ پر نہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہماری امت میں سے نہیں اگر یہ مطلب لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کاموں کا مرتکب کافر ہو گیا اور وہ کبھی بھی جہنم سے نہیں نکالا جائے گا۔

حالانکہ خود قرآن مجید فرماتا ہے کہ مشرک کے علاوہ باقی کبیرہ گناہ جسے اللہ تعالیٰ چاہے ابتدا ہی میں معاف کردے یا بالآخر معاف کردے۔ لہٰذا اگر ان کاموں کا مرتکب امت سے خارج ہے اور کافر ہو چکا ہے تو اس کی مغفرت ہرگز نہ ہوگی اور یہ بات نص قرآنی اور کتنی ہی صحیح احادیث کے خلاف ہے۔

لہٰذا اس کا یہ مطلب نہیں بلکہ یہ اس طرح ہے جس طرح کسی نالائق بچے کو اس کا والد یہ کہتا ہے کہ تو میرا بیٹا ہی نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ تو میرا حلالی بیٹا ہی نہیں اور میری اولاد سے خارج ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تو میرا لائق اور نیک وصالح بیٹا نہیں ہر زبان میں کلام مبالغہ اور زور پیدا کرنے کے لیے اس طرح افعال بد کو استعمال کیا جاتا ہے، یعنی اگر تو میرا بیٹا ہوتا تو میرے ساتھ اس طرح کا سلوک نہ کرتا اور اس قدر میری نافرمانی نہ کرتا گویا کہ تو مجھے اپنا باپ ہی تسلیم نہیں کرتا۔

اس طرح کی عبارات ہر زبان میں کلام میں مبالغہ اور اہمیت ظاہر کرنے کے لیے موجود ہیں جو مجاز یا استعارہ یا تشبیہ بلیغ وغیرہ میں پیش کی جاتی ہیں اور اہل لسان کہنے والے جسے کہا گیا ہے اور کس حالت میں کہا گیا ہے ان سب باتوں کو مدنظر رکھ کر پھر اس کا صحیح مطلب اخذ

کرتے ہیں۔

حسد کرنے والے کے متعلق صحیح حدیث میں اس طرح ہے کہ:

''حسد انسان کی نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔''

باقی سائل کے نقل کردہ الفاظ مجھے یاد نہیں، مخلوق کو تکلیف دینے والے کے متعلق صحیح بخاری میں اس طرح ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دیگر لوگ محفوظ ہوں اور فرمایا وہ شخص کامل مؤمن نہیں جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی محفوظ و مامون نہیں۔

باقی آگے سائل نے نماز وغیرہ کے متعلق لکھا ہے اس لیے عرض ہے کہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ کرے گا۔ لہٰذا ان کاموں کے مرتکب کی نماز (اگر اس نے صحیح طریقہ پر پڑھی ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرض سمجھ کر اس کی رضا کے حصول کے لیے ادا کی ہے تو وہ نماز) اور دیگر اس طرح کے کام ضائع نہیں ہوں گے۔ بلکہ اصل معاملہ اس طرح ہوگا کہ اگر کسی شخص نے کسی کے ساتھ بھی ظلم وزیادتی کی ہوگی اور اس کی زندگی میں اس حق تلف کیا ہوگا تو اگر اس نے اس سے معافی طلب نہیں کی تو آخرت میں اس کے اعمال میں سے مظلوموں کو ظلم کے بقدر دیا جائے گا۔ پھر اگر مظلوموں میں نیکیوں کی تقسیم کے بعد بھی اس کی کوئی نیکی بچ گئی تو نجات پا جائے گا اور اگر کوئی نیکی نہ رہی بلکہ سارے کے سارے اعمال مظلوموں میں تقسیم ہوگئے تو وہ جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔ پھر بعد ایمان اور توحید پر مستقیم رہنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل وکرم سے نجات پا جائے گا اور یہی صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ هذا ما عندي والله اعلم بالصواب!

سودی کے پیچھے نماز پڑھنا

سوال: ایک شخص جو سود کو جائز کہتا ہے (جس کا تذکرہ پہلے سوال میں کیا جا چکا ہے۔) کیا اس کی اقتداء میں نماز ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہئے کہ سود کی حرمت قطعی ہے اور اس پر اجماع ہے۔ لہٰذا جو شخص سود کو عمداً ہر حالت میں حلال وجائز سمجھے گا وہ بلاشبہ کافر ہے، پھر جو شخص کافر (اسلام سے خارج) ہے اس کے پیچھے نماز پڑھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کما لا یخفی

باقی مذکورہ صورت میں (یعنی بحالت اضطرار سود کے استعمال کو جائز سمجھنے والے) ایسے شخص کی اقتدا میں نماز جائز ہے کیونکہ مذکورہ شخص سود کو ہر صورت میں جائز نہیں سمجھتا بلکہ وہ شخص اضطراری صورت میں جائز سمجھتا ہے۔ چونکہ پہلے سوال کے جواب میں تفصیل کے ساتھ عرض کیا گیا کہ سود بحالت اضطرار جائز ہے کیونکہ اضطراری حالت کو عام حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کو کافر نہیں کہا جائے گا اور اس کے پیچھے بشرطیکہ صحیح العقیدہ ہو نماز جائز ہے وہ شخص اس مسئلہ کی وجہ سے امامت سے خارج نہیں ہو سکتا۔

مجبوری میں سود کا حکم

سوال: ایک مولوی صاحب جو اپنے آپ کو عقیدتاً وعملاً اہلحدیث کہتا ہے اس کا خیال ہے کہ اگر کہیں قحط سالی واقع ہو جائے اور کسی شخص کے بچے واہل خانہ فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہے ہوں یا کچھ دنیاوی معاملات کی وجہ سے مجبور ہو اور اسے کچھ پیسوں کی ضرورت ہو اور کسی دوسرے ذریعہ سے اسے رقم نہ مل رہی ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ سود پر رقم حاصل کر کے اپنی ضرورت کو پورا کر لے اور بطور دلیل قرآن کریم کی یہ آیت پیش کرتا ہے:

﴿...فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (البقرة: ۱۷۳)

"میں جو شخص مجبوری میں ڈال دیا جائے اس حال میں کہ نہ باغی ہو اور نہ ہی حد سے بڑھنے والا تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے۔"

اس آیت کے لحاظ سے بحالت مجبوری حرام کھانا جائز ہے لہٰذا اس شخص کو بھی سخت مجبوری درپیش ہے لہٰذا اس کے لیے سود کی رقم لینا جائز ہے اس مولوی صاحب کو اس کے متعلق

صحیح احادیث بھی بتائی گئی ہیں لیکن وہ اپنے موقف پر اڑا رہا ہے اور اسی طرح اس سے یہ بھی دریافت کیا گیا کیا یہ موقف سلف صالحین میں سے بھی کسی کا ہے؟ جواباً اس نے کہا کہ سلف یا خلف اور حدیث وغیرہ کی یہاں کوئی ضرورت نہیں کیونکہ قرآن پاک ناطق اور یقینی ہے حدیث اور سلف صالحین کا عمل ظنی ہے اس لیے یقین ظن پر غالب ہے؟

الجواب بعون الوهاب: مذکورہ صورت میں ایسے شخص کے لیے اپنی اور اپنے اہل خانہ بال بچوں کی جان بچانے کے لیے سود پر قرضہ لینا جائز ہے۔ اگرچہ سود لینا ودینا دونوں گناہ کبیرہ ہیں جس کے متعلق قرآن کریم اور احادیث میں نہایت تفصیل کے ساتھ وضاحت موجود ہے اور سود کو حرام قرار دیا گیا ہے مگر جب یہ شخص نہایت مجبوری اور بے بسی کی حالت میں مجبور اور پریشان ہے اور اسے سود لینے کے علاوہ کوئی اور راستہ نظر نہیں آرہا کہ وہ اپنے بال کا شکم سیر کر سکے ایسی صورت میں اس کے لیے سود لینا جائز ہے اور ایسی حالت کو شرعی اصطلاح کے مطابق اضطرار کہا جاتا ہے اور اضطراری حالت کو شریعت اسلامیہ نے مستثنیٰ قرار دیا ہے کیونکہ کتنی ہی اشیاء ہیں جن کو حرام قرار دینے کے بعد بھی اضطراری صورت میں جائز وحلال قرار دیا گیا ہے جس طرح میتۃ، لحم الخنزیر، دم (خون) شراب وغیرہ۔

حاصل مطلب کہ حرام اشیاء کو بوقت مجبوری استعمال کرنا جائز قرار دیا گیا ہے معلوم ہوا کہ الضروریات تبیح المحظورات والا قائدہ درست ہے اس کے بعد قرآن کریم کی آیت ذکر کی جاتی ہے جس میں اس مسئلہ کی وضاحت پورے طریقے سے موجود ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ﴾

(الانعام: ۱۱۹)

"یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے لیے تم پر جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے مگر جب تم مجبور ہو جاؤ۔"

اس آیت کریمہ میں دو مقام پر کلمہ ما کا استعمال ہوا ہے ایک حرام سے پہلے اور دوسرا اضطرار سے پہلے۔ دونوں جگہوں پر ما کا کلمہ عام ہے، یعنی دونوں جگہوں پر کسی بھی چیز کی

تخصیص بیان نہیں ہوئی اس لیے پہلی جگہ میں یہ بیان ہے کہ حرام کے تمام افراد وغیرہ ما کے عموم میں داخل ہیں ہمارے اس نکتہ کو مزید تقویت اس حقیقت سے بھی ملتی ہے کہ قرآن کریم سورۃ الانعام والی آیت میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ﴾

یعنی حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہیں حرام کے متعلق تفصیل کے ساتھ سمجھایا ہے، لیکن جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سورۃ انعام مکی ہے اور اس میں زیر بحث آیت سے پہلے ''میتة ولحم الخنزیر'' وغیرہما کی حرمت کا تذکرہ موجود ہی نہیں بلکہ اس آیت کے دوسرے رکوع کے بعد ان محرمات کا تذکرہ کیا گیا ہے اسی طرح کچھ حرام اشیاء کا ذکر سورۂ نحل کے آخر میں کیا گیا ہے لیکن سورۃ نحل سورۃ انعام کے بعد نازل ہوئی ہے۔ ان دونوں سورتوں کے علاوہ دوسری کسی بھی مکی سورۃ میں ان کا (حرمت) ذکر نہیں۔

زیر بحث آیت:

﴿وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ﴾

کا مطلب ہوگا کہ حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں حرام اشیاء کے متعلق تفصیل سے سمجھا رہا ہے اور سمجھائے گا یعنی یہاں ماضی بمعنی مستقبل کے ہے اور کلام عرب میں ایسا مستقبل کا فعل جس کا وقوع یقینی ہو اس کے لیے ماضی کا فعل استعمال کرتے ہیں، یعنی ایسے آنے والے کام کا وقوع ایسا یقینی ہوتا ہے کہ گویا وہ ہو چکا ہے۔ مثلاً:

﴿اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ﴾ (النحل: ۱)

''اللہ کا حکم آپہنچا پس تم اس میں جلدی نہیں کرو۔''

وغیرہما من الآیات یعنی مقصد یہ ہوا کہ تمہیں اپنے خیال کے مطابق حلال شے کو حرام قرار دینے کا اختیار نہیں بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ وقتاً فوقتاً حرام وحلال کے متعلق بیان دیتا رہتا ہے اور دیتا رہے گا، تمہیں اس مسئلہ کے متعلق بھی ارشاد ربانی کا منتظر رہنا چاہیے جسے اس سے پہلے حرام کیا گیا ہے اس کو سمجھیں اور جس کے متعلق بعد میں آگاہی معلوم ہو اس کے

مطابق عمل کریں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ زیر بحث آیت میں حرام اشیاء کے بیان سے پہلے رب تعالیٰ نے یہ تفہیم دی ہے کہ تمہاری طرف حرام اشیاء کے متعلق وحی کی رہنمائی آتی رہے گی۔ لہٰذا تمہیں اس تفہیم پر عمل کرنا چاہئے اور تم اپنے خیال سے حرام اور حلال اشیاء کا تقرر نہ کرو اور وہ حرام اشیاء بعد میں تمہیں وقتاً فوقتاً بتائی جائیں گی جن میں سے میتۃ (مردار) خنزیر کا گوشت، خون وغیرہ بھی شامل ہوں گے اور بعد میں سود اور شراب وغیرہ کی حرمت سے بھی تمہیں آگاہ کیا جائے گا۔

ان تمام حرام اشیاء کے متعلق یہ اصولی بات پہلے سے ہی ذہن نشین رکھیں کہ اضطراری حالت بہرحال مستثنیٰ ہوگی ﴿إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ﴾ گویا مختصر الفاظ میں یہ کہا جائے کہ رب تعالیٰ بعد میں حرام اشیاء کا تذکرہ کر رہا ہے۔ اس سورت میں خواہ اس کے بعد نازل کی گئی مکی ومدنی سورتوں میں، لہٰذا پہلے ہی سے تمہیدی طور پر یہ حقیقت ذہن نشین کروا دی کہ آنے والی حرام اشیاء سے (جو بھی حرام کی جائیں) اضطراری حالت مستثنیٰ رہے گی بس یہی اصولی حقیقت ہے جو آنے والی تمام محرم اشیاء کے متعلق رہنمائی کرتی ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اس آیت سے پہلے اس سورت میں یا کسی دوسری سورت میں جو اس سے پہلے نازل ہوئی ہو اگر اس میں میتۃ وغیرہ کی حرمت کا ذکر ہوتا تو پھر شاید کسی کے لیے یہ کہنے کی گنجائش نکل آتی کہ یہ اضطراری حالت صرف میتۃ وغیرہ کے ساتھ خاص ہے نہ کہ کسی دوسری چیز کے ساتھ لیکن اب جو صورتحال ہے اس کے لحاظ سے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ احتمال ختم ہو جاتا ہے۔ اب ہمیں غور کرنا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس آیت میں مذکورہ محرم اشیاء کے علاوہ دیگر کون سی اشیاء ہیں جن کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

جس طرح ارشاد فرمایا:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا

بِالْاَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (المائدة: ٣)

تو جس طرح آیت میں المیتۃ وغیرہ کو حرام کے لفظ سے ملقب کیا گیا ہے تو اسی طرح سود پر بھی حرمت کا لفظ بولا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا

﴿وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (البقرة: ٢٧٥)

بہرحال حرام کی تمام اقسام پر "ماحرم" کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ اور اس میں حرمت ربا بھی داخل ہے لہٰذا "ما" کے دوسرے عموم میں بھی اضطرار کی دوسری اقسام داخل ہیں اور ان سب میں کلمہ ما شامل ہے اور اضطراری کی بھی کئی اقسام ہیں جن کو مفسرین نے اچھی طرح وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مثلاً ایام قحط میں ایسی حالت ہو جائے آدمی کو جان کا خطرہ لاحق ہو جائے یا کوئی ظالم شخص اسے مجبور کرے کہ حرام کھاؤ ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا وغیرہ۔ مذکورہ آیت میں اضطرار کو مستثنیٰ کیا گیا ہے، یعنی ماحرم کی تمام اقسام سے اضطرار کی تمام اقسام مستثنیٰ ہیں نیز اضطرار کی وضاحت تفسیر المنار میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

((قوله الا ما اضطررتم اليه" استثنا مما حرمه فمتى وقعت الضرورة بان لم يوجد من الطعام عند شدة الجوع الا المحرم زال الحرمة وهٰذه قاعدة عامة فى يسر الشريعة الاسلاميه والضرورة تقدر بقدرها فيباح للمضطر تزول به الضرورة ويتقى الهاك .))

مذکورہ عبارت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مضطر کے لیے بقدر ضرورت حرام کو استعمال کرنا مباح ہے اسلامی شریعت کو عام کرنے لیے یہ قاعدہ عام ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم

میں یہ ارشاد بھی ہے کہ ﴿لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا﴾ مفسرین نے یہ کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ہے ﴿وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ﴾ تو رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو بہت افسوس ہوا کہ جو افعال ابھی واقع ہی نہیں ہوئے اور دل میں تو ہر وقت کئی خیال آتے رہتے ہیں اور ان خیالات کے متعلق بھی اگر مؤاخذہ ہوا تو یہ بات بہت مشکل پڑ جائے گی پھر رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو تسلی کی خاطر یہ آیت ﴿لا یکلف اللہ.... الخ﴾ نازل ہوئی یعنی اللہ تعالیٰ نفس کو اس بات کی تکلیف دیتا جو اس کے قوت برداشت میں ہے ہو اور اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو تکلیف مالا یطاق نہیں دیتا۔

یہاں بھی انسان جو بھوک میں مر رہا ہے، اس کے لیے یہ بھی تکلیف ہے جس کا برداشت کرنا انسان سے محال ہے، اس لیے اسے شخص کو مضطر کہا جائے گا اور اس کے لیے بقدر ضرورت حرام کا استعمال جائز ہے۔ اس کے علاوہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

((انما الاعمال بالنیات وانّما لکل امرئ ما نویٰ .)) [1]

''یعنی تمام اعمال کا دارومدار نیت ہے۔''

لہٰذا جو شخص اس حرام چیز کو جس نیت سے استعمال کرے گا اس لحاظ سے اس کا حساب وکتاب ہوگا۔ باقی مولوی مذکورہ کا یہ کہنا کہ قرآن کریم ناطق اور یقینی ہے اور حدیث ظنی ہے وغیرہ اس کا یہ کہنا غلط ہے کیونکہ حرمت ربا تو جس طرح حدیث سے ثابت ہے اسی طرح کئی آیات کریمہ بھی اس کی حرمت کا اثبات کرتی ہیں۔ دراصل قرآن اور حدیث میں فرق کرنے والا اصول غلط ہے کیونکہ حدیث پاک کو وحی خفی کہا جاتا ہے اور قرآن کریم کو وحی جلی اور وحی کا نزول من جانب اللہ ہے تو پھر اس میں ظن کو آخر کیا دخل ہے۔

ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

---

[1] صحیح بخاری: بدء الوحی: رقم الحدیث ۱ .

ہندو کو کرایہ پر زمین دینا

سوال: ایک شخص ہے جو اپنے آپ کو اہلحدیث کہلاتا ہے اس نے نفع پر اپنی ملکیت ایک ہندو کو دی ہے اور وہ ہندو کاروبار کر رہا ہے اور ہندو تو سود کا لین دین کرتے ہیں اور جب اسے کہا جاتا ہے تو جواباً کہتا ہے کہ میں نے اسے سود لینے کے لیے تو نہیں کہا اور نہ ہی میں سود کھاتا ہوں اگرچہ رقم ہم دونوں کی مشترکہ ہے لیکن میں صرف اپنا نفع لیتا ہوں جب کہ اس کا شریک وہ رقم سود پر بھی دیتا ہے؟

الجواب بعون الوهاب: واضح ہو کہ ہندو ہو یا مسلمان ہر اس شخص کے ساتھ عقد شراکت ناجائز ہے جو سود لیتا یا دیتا ہے چونکہ ہندو یقیناً سود لیتے اور دیتے ہیں ان کے ساتھ عقد شراکت بالکلیہ ناجائز ہے۔ سود کھانے والے، سود دینے والے، اور سود کی کتابت کرنے والے، اور سودی کاروبار کے شاہد سب کے سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں اور سب پر رسول اکرم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ سود کسی بھی صورت میں جائز نہیں۔ حتی کہ سودی کاروبار کا کاتب بھی ملعون ہے۔ حالانکہ کتابت یا شاہدی یہ کوئی عقد نہیں اور نہ ہی ان کو کچھ حصہ ملتا ہے ان کا صرف اتنا تعلق ہے اس کے باوجود بھی ان پر لعنت فرمائی گئی ہے تو پھر بتایئے کہ جو سود کی رقم میں شریک ہو وہ اس سے کس طرح بچ سکتا ہے۔ اگر سود ہندوؤں کے ہاتھوں جائز ہوتا تو پھر ہر کوئی اپنی دوکان پر ہندو کو رکھ لیتا پھر اپنے خیال سے سود کما کر مالک کو گھر بیٹھے امیر کر دیتا اور اگر کوئی اعتراض کرتا تو کہہ دیتا کہ میں نے کب اس کو سود لینے دینے کے متعلق کہا ہے وہ اپنے طریقے سے نفع حاصل کر کے دیتا ہے کیا اس طرح کسی ہندو کے ذریعے گھر بیٹھے منافع کمائے کیا اسے جائز کہا جائے گا ہرگز نہیں اگر اپنا کاروبار چمکانے کے لیے ایسے حیلے جائز رکھیں جائیں گے تو پھر سود سے منع کیونکر وارد ہوئی؟

اگر اس طرح حیلوں کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا جائے تو پھر قرآن کریم میں بنی اسرائیل پر

ملامت کیونکر وارد ہوئی کہ جب انہیں ہفتہ کے دن شکار سے منع فرمائی گئی لیکن انہوں نے ہفتہ کے دن شکار تو نہ کیا لیکن مچھلیوں کو واپس جانے سے روکا اور شکار اتوار کے دن ہی کیا تو انہیں اصلاً جس بات سے روکا گیا تھا انہوں نے وہی بات دوسرے طریقے سے اختیار کی۔

حاصل مطلب یہ ہے کہ جس کام یا فعل سے منع کیا گیا ہے وہ خود کرنا یا دوسرے سے کروانا ایک ہی بات ہے جس طرح ناحق قتل کرنا ناجائز ہے مگر اگر کوئی شخص خود تو کسی کو قتل نہیں کرتا بلکہ کچھ رقم کسی کو دے کر قتل کرواتا ہے تو اسے خود قتل کروانے کا مجرم نہیں بلکہ اسے خود قاتل ہی تصور کیا جائے گا۔ پھر خواہ اس نے وہ کام خود نہیں کیا مگر اسی کی رقم پر ہوا ہے لہٰذا سود کسی بھی صورت میں جائز نہیں۔

''نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سود کا گناہ ۷۰ حصے ہے اس کا کم حصہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی والدہ کے ساتھ زنا کرے۔'' (ابن ماجہ)

اس کے علاوہ ہندو کے ساتھ عقد شرکت کو کتب شرع میں ناجائز کہا گیا ہے کیونکہ کئی افعال کو ہندو جائز سمجھ کر کرتا ہے جو مسلمان کے لیے ناجائز ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

ایڈوانس رقم کا حکم

سوال: اگر گندم کی کٹائی میں دو یا تین ماہ لیٹ ہو لیکن اس کی کٹائی سے پہلے آدھی قیمت لے کر مالک کسی کو گندم دینے کا وعدہ کرتا ہے تو اس کا اسلامی شریعت میں کیا حکم ہے کیا یہ کام ان کا اس فرمان ((لا تبع ما ليس عندك .)) کے مخالف تو نہیں ہے۔ بینوا توجروا!

الجواب بعون الوهاب: یہ معاملہ شرعاً بیع سلم کی صورت کا ہے جسے اہل حجاز کی لغت میں بیع سلف کہتے ہیں اس کی صحت کے لیے کچھ شرائط ہیں جن کا یقینی طور پر لحاظ رکھنا ہے ۔مثلاً جو جنس فروخت ہو رہی ہے اس کا مقرر اور معلوم ہونا کب وہ چیز ادا کرے گا یہ مدت مقرر کرنا قیمت اور وزن کا طے ہونا اور اس جنس کی قیمت اور مقدار حساب کر کے اس کی قیمت اسی میں مجلس نقد ادا کرنا وغیرہ جو احادیث سے معلوم ہوتے ہیں۔

بلوغ المرام میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب مدینے میں آئے تو ہم باغوں کے پھلوں کو بیع سلم کے طور پر بیچتے تھے جس کی مدت سال یا دو سال یا تین سال مقرر کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

((فلیسلف فی کیل معلوم و وزن معلوم الی اجل معلوم.))

(متفق علیه)

''یعنی بیع سلم کرو تو ناپ تول اور مدت ادائیگی مقرر ہونی چاہیے۔''

ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ:

((ان کنا نسلف علی عهد رسول الله وابی بکر وعمر فی الحنطة والشعیر والتمر والزبیب.)) [1]

''یعنی نبی اکرم کے عہد مبارک میں اور عہد صدیقی اور عہد فاروقی رضی اللہ عنہما میں ہم گندم کو جو کو اور منقیٰ کھجور کی جنس میں بیع سلف کرتے تھے اور دوسری روایت میں ہے کہ جن کو ہم قیمت دیتے تھے ان کے پاس ہم اُن جنسوں کو نہیں دیکھا کرتے تھے۔''

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ ضرورت مند لوگ مالداروں سے اور مالدار تاجر یا سوداگر کسان یا زمینداروں سے عہد نبوی میں اور عہد خلفاء راشدین میں بیع سلم عام طور پر کی جاتی تھی۔ (ماخوذ از اخبار تنظیم اہلحدیث ۴ اکتوبر)

باقی الاعتصام میں مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ نہ لینے والا لاچار یا عاجز ہو کہ نہ لے تو اس بات کو گو مولانا حصاروی صاحب نے رد کیا ہے لیکن کسی حد تک مجھے یہ بات صحیح سمجھ میں آتی ہے ہمارے ملک میں ایسے بہت سے رواج ہیں مثلاً کسی غریب کو پیسوں کی ضرورت ہے اور اس کے پاس زمین بھی ہے پھر خریدنے والے اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی خاطر اسے مجبور کرتے ہیں کہ اتنی جنس لیں گے ہم سے بات کر پھر تمہیں پیسے دیں گے پھر وہ مجبور ہو کر ان سے بات کرتا ہے وہ بھی چلنے والے ریٹ سے کافی کم یہ مجھے ظلم سمجھ میں آتا ہے۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب البیوع باب فی السلف، رقم الحدیث:۳٤٦٣.

یہ صورت نہ ہو اور غریب کی لاچاری مجبوری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھانا ہو تو پھر یہ معاملہ صحیح ہے، البتہ قیمت پوری دینی چاہیے باقی ''لا تبع ما ليس عندك'' یہ جنس کے علاوہ دوسری چیزوں میں ہے اور یہ ابن سیرین کا قول ہے کہ اناج ستوں میں ہو تو نہ بیچو تو یہ اس معاملہ (بیع سلم) سے دوسری صورت ہے یعنی بیع سلم میں ایسا نہیں ہوتا ہے کہ اس فلاں زمین سے گندم تمہیں بیچ دیتا ہوں بلکہ محض پیسوں کے عوض جنس بیچ کے دینی ہے جو ایک مدت مقرر پر ادا کی جائے گی پھر یہ جنس وہ اپنی اس جنس کے اتارنے کے بعد اس سے ادا کرے یا دوسری جگہ سے لے کر دے وہ اس پر مدار ہے لہٰذا وہ معاملہ ابن سیرین والے کہنے کے مخالف نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اناج ستوں میں (اس کے طرف اشارہ کرکے) بیچا نہ جائے گا۔

امید ہے کہ اس سے آپ کے سوال کا جواب کسی حد تک حل ہو چکا ہوگا۔

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب

تنخواہ پر تقریر کرنا

سوال: دینی امور میں قرآن پاک کی تعلیم دینا امامت کرانا خطبہ دینا جلسوں میں تقریر کے لیے جانا وغیرہ پر اجرت لینا صحیح حدیث کے مطابق ہے یا غلط ہے؟

الجواب بعون الوهاب: قرآن کریم وغیرہ تبلیغ دین کے لیے سنا کر اس پر اجرت لینا جائز نہیں، قرآن کریم فرماتا ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَسْاَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا﴾ (الشوریٰ: ۲۳)

البتہ قرآن کریم سکھلانا یا اس کی اور علوم دینیہ کی تعلیم دینا اور تدریس کرنا اس پر اجرت لی جا سکتی ہے۔

صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک آدمی جس کو سانپ نے ڈس لیا تھا اس پر سورۂ فاتحہ سے دم کیا اور وہ اچھا ہو گیا پھر انہوں نے معاوضہ میں بکریاں لیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاوضہ کو بحال رکھا اس کو جائز قرار دیا اور مزید یہ فرمایا کہ قرآن پر جو تم

لیتے ہو وہ زیادہ حق ہے۔

بہر حال جملہ دلائل کو دیکھ کر یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ دین کی تبلیغ کرنی ہے یا قرآن سنا کر تبلیغ اسلام وشریعت کرنی ہے تو اس پر اجرت نہیں لینی چاہیے البتہ کسی کو قرآن پڑھ کر دم کرے یا معلم بن کر محنت کرے یا بچوں کو قرآن پڑھائے یا دینی علوم کی مدارس میں تعلیم دے تو یہ تبلیغ کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ محنت ہے جو وہ کرتا ہے۔ لہٰذا اس پر معاوضہ درست ہے، ان دونوں میں جو فرق ہے اس کو خوب غور وفکر کر کے سمجھ لینا چاہیے اسی طرح امامت وخطابت کا معاملہ ہے اگر کوئی مسکین وفقیر ہے اور وہ اپنا کام یا کوئی دھندھا ومشغلہ ترک کر کے خطابت وغیرہا کے فرائض انجام دیتا ہے تو اگر اس کو معاوضہ نہ دیا جائے گا تو وہ اپنی زندگی کی ضروریات کو کس طرح پورا کرے گا اگر ایک آدمی سب کچھ چھوڑ کر اسی کام میں لگ گیا ہے تو ان کو اس کا معاوضہ دینا چاہیے لیکن یہ دین کی تبلیغ کا صلہ نہیں بلکہ اس محنت کا صلہ ہے جو وہ اپنا سب کچھ ترک کر کے کر رہا ہے ورنہ اگر وہ یہاں متعین نہ ہوتا تو کوئی مشغلہ اختیار کر کے اپنے روزگار کا انتظام کر لیتا۔ اسی طرح جلسوں وغیرہ میں جانے کا معاملہ ہے۔ اگر جہاں جلسہ ہو رہا ہے وہ کافی دور رہے اور وہاں پہنچنا کافی رقم صرف کیے بغیر آسان نہ ہو تو جو بلانے والے ہیں وہ ان کو اتنا خرچہ دیں جس سے وہ وہاں پہنچ جائے۔

ہاں تبلیغ پر وہ ان سے کچھ رقم طے کر کے لے یہ جائز نہیں۔ البتہ بلانے والے اپنی مرضی سے (بلا تقاضے کے) ان کو ہدیۃً کچھ دے دیں تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ واللہ اعلم

مندر کی جگہ مسجد بنانا

سوال: ایک غیر مسلم کی زمین ہے اس میں ان کا مندر بھی ہے وہ زمین غیر مسلم ایک مسلمان کو قیمتاً بیچتا ہے کیا وہ مسلمان اس مندر کو مٹا کر اس کی جگہ پر مسجد تعمیر کرا سکتا ہے؟

الجواب بعون الوھاب: جب غیر مسلم نے وہ زمین بیچ کر مسلمان کو دے دی تو وہ زمین اس خریدنے والے مسلمان کی ملکیت ہوگئی اب اس مندر میں اس غیر مسلم کا کوئی بھی

واسطہ نہیں لہٰذا وہ مسلمان اپنی ملکیت میں کس بھی جائز نمونے سے تصرف کر سکتا ہے، یعنی وہ بغیر خوف وخطر کے اس مندر کو مٹا کر اس کی جگہ مسجد تعمیر کرا سکتا ہے یا اس مندر کو ختم کر سکتا ہے اور تھوڑی بہت اس کی مرمت کر کے مسجد میں تبدیل کر دے تو بھی جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ مندر میں بت رکھے ہوئے ہوں تو پھر اس میں نماز پڑھنا جائز نہیں پر اگر اس میں بت نہ ہوں تو پھر وہ عام جگہوں کے مثل ایک جگہ ہے جس میں نماز پڑھنے کی ممانعت قرآن وسنت میں وارد نہیں ہے جن جگہوں میں نماز پڑھنے کی ممانعت ہے۔ (مثلاً مقبرہ یا حمام وغیرہ) ان میں سے یہ جگہ نہیں ہے لہٰذا نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب.

بندوق کا شکار

سوال: کیا بندوق سے کیا گیا شکار حلال ہے؟ واضح ہو کہ بندوق سے جب کسی پرندہ کو مارا جاتا ہے تو شکار کرنے والا ''بسم اللہ اللہ اکبر'' بھی کہتا ہے اور اس کے نشانے سے پرندے گر کر مر جاتے ہیں جب تک ذبح کرنے کے لیے پرندے تک پہنچتے ہیں تو پرندے مر جاتے ہیں اسی صورت میں کچھ مولوی صاحب کہتے ہیں کہ وہ حلال ہیں جس طرح پالتو باز یا شکاری کتے یا تیر وغیرہ سے کیا گیا شکار حلال ہے اسی طرح یہ شکار بھی حلال ہے؟

الجواب بعون الوهاب: بندوق سے کیا ہوا جو شکار قبل از ذبح مر جاتا ہے تو اسے کھانا حرام اور ناجائز ہے اصل مسئلہ یہ ہے کہ شکار کرنے کے وقت ''بسم اللہ اللہ اکبر'' کہہ کر کسی ایسی چیز کے ساتھ چھوٹ ماری جائے جو تیز ہونے کی وجہ شکار میں نفوذ کر جائے اگر ایسی چیز نہیں بلکہ وہ ثقیل اور بھاری چیز جس کے ثقل کی وجہ سے شکار مر جاتا ہے جیسا کہ پتھر وغیرہ تو ایسا شکار قبل از ذبح مر گیا تو وہ حرام ہے اسے کھانا جائز نہیں بندوق سے کیا ہوا شکار بھی بسبب ثقل مر جاتا ہے لہٰذا اس سے کیا ہوا شکار قبل از ذبح کہا جائے گا۔

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ شکار کی کوئی چوٹ آ کر لگتی ہے اس کا کیا حکم؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اذا اصبت بحده فكل واذا اصاب بعرضه فقتل فانه وقيذ فلا تأكل .)) ❶

''کہ اگر اسے تیز سائیڈ سے چوٹ لگی ہے تو کھا سکتے ہو مگر جب تیز سائیڈ نہیں لگی تو وہ شکار قتل ہوگیا ہے اسے نہ کھائیں۔''

((عن ابراهيم عن عدى بن حاتم رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ اذا رميت فسميت فخزقت فكل وان لم تخزق فلا تأكل ولا من المعراض الا ماذكيت ولا تأكل من البندقية الا ماذكيت .)) (اتحاد، جلد٦، صفحه ٢٤)

بہرحال یہاں مختصراً ذکر کر کے بحث کو ختم کیا جاتا ہے کہ بندوق کا شکار بغیر ذبح کیے حرام ہے۔ هٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

پاکستانی قانون کی شرعی حیثیت

سوال: اگر پاکستان میں زنا کے متعلق قانون شہادت کو عمل میں لایا جاتا ہے تو کیا اس سے زنا بڑھ جائے گا؟

الجواب بعون الوهاب: میرے محترم دوستو! آپ لوگ ان سوالات کی نوعیت پر بھی تو غور کرو کیا ایسے سوالات کسی عقل یا ہوش وحواس رکھنے والے کے ہو سکتے ہیں؟

اس سوال کا مطلب یہ ہوا کہ اگرچہ اس وقت پاکستان میں زنا کم ہے کیونکہ بڑھ جانا یہ کسی چیز کی فرع ہوتی ہے اس بات کی کہ پہلے یہ کم ہے لیکن اسلامی قانون شہادت کے عمل سے بڑھ جائے گا۔ حالانکہ یہ بات مشاہدات اور واقعات کے برخلاف ہے اس وقت زنا کے متعلق قانون شہادت ابھی عمل میں نہیں آیا ہے، تب بھی زنا اور اس کے اسباب ومحرکات ہمارے ملک پاکستان میں اس قدر زیادہ ہیں جوان کے تجربہ کے بعد زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں کہ کیا

❶ صحيح البخاري، كتاب الذبائح والصيد، باب صيد المعراض، رقم الحديث:٥٤٨٦.

یہ اسلامی ملک ہے؟ اسلامی معاشرہ یا سوسائٹی ہے؟ ملحد اور بے دین لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں جن کی وجہ سے زنا اور اس کے محرکات واسباب میں اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر افسوس آج دیکھنے والوں کی آنکھیں دیکھنے سے محروم ہیں، ان کی آنکھوں کے سامنے معاشرہ کا بیڑہ غرق ہو رہا ہے مگر ان کو کچھ نظر نہیں آتا اور پھر اوپر سے یہ کہتے رہتے ہیں کہ اسلامی قانون شہادت عمل میں آئے گا تو زنا بڑھ جائے گا۔ تُف ہو ایسی سمجھ پر۔ حیف ہو ایسی بے ہودہ سوچ پر! دراصل ان کو اسلامی تہذیب کی شناخت نہیں ہے اسلام جو کہ پاک سوسائٹی کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے اس کو یہ لوگ جانتے تک نہیں ہیں، اسلام نے جو زنا کے قلع قمع کیلئے جو ارشادات عالیہ دیئے ہیں ان سے بھی یہ عقل کے دشمن سراسر ناواقف ہیں، اسلامی قانون شہادت کا زنا کے بڑھنے یا کم ہونے میں کوئی حصہ نہیں ہے اس قانون کا ایک مقصد ہے جو آگے بیان کیا جاتا ہے۔ (ان شاء اللہ)

زنا کے بڑھنے کے اسباب صرف یہ ہیں کہ اسلام جیسا سماجی نظام وجود میں لانا چاہتا ہے اور اس کے لیے جو احکامات اور اوامر ونواہی پیش فرمائے ان پر عمل نہیں ہے۔ اس حقیقت کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اسلام ہر وقت ٹکٹکی تیار کر کے نہیں کھڑا ہے کہ بس کوئی آئے اور اس پر چڑھ کر اس کا خاتمہ کیا جائے، بلکہ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ”آخر الدواء الکی“ یعنی داغنا آخری دوائی ہے، جو صرف اس حالت میں عمل میں لائی جاتی ہے جب مرض کا علاج دوسری دوائی سے نہ ہو رہا ہو۔ ایسے نہیں ہے کہ جس کو سر میں درد ہو اس کو داغ دیا جائے یا جس کو پیٹ میں درد ہو اس کو بھی داغ لگایا جائے، بعینہٖ اسی طرح اسلامی حدود ایک آخری چارہ کار ہیں۔ اس سے پہلے مسلمانوں کا معاشرہ ہوگا تو اول زنا کا بیج ہی ختم ہو جائے گا اس کے حدود کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی لیکن پھر بھی اگر ایسے معاشرے کے باوجود بھی کوئی نالائق منہ نکالتا ہے اور تمام پابندیوں کو توڑ کر نفس شیطان کا بندہ ہو جاتا ہے اور ایسی بدکاری کرتا ہے تو اس کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے کہ دوسرے ایسے نالائق لوگوں کے لیے سبق بن جائے۔

نبی ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی مرد اجنبیہ غیر محرم عورت کے ساتھ خلوت اختیار کرتا ہے

تو تیسرا ان کے ساتھ شیطان ہوتا، یعنی شیطان ضرور ان کے دلوں میں ناجائز خیالات ڈالے گا اور وہی خیالات انسان کے ارادے کے اسباب بن جاتے ہیں اور اگر ارادہ کیا تو جا کر برائی کے گڑھے میں گرے گا۔ لیکن یہ حضرات اگر جان بوجھ کر یہی پرچار کرتے ہیں کہ عورتوں کو نکالو ان کا پردہ چاک کرو ان کو کھلم کھلا میدانوں پر جلوہ افروز ہونے دو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر تفریح گاہ جیسا کہ میلے اور کلفٹن بازاریں وغیرہ آج کل بے پردہ عورتوں سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ لوگ ان کی بے پردگی کی حمایت کیوں کرتے ہیں، صرف اس لیے کہ ان کی حریص اور شہوت پرست آنکھوں کی ضیافت کا سامان میسر ہو اور ان اچھی شکل وصورت والی حسین وجمیل عورتوں کو دیکھ کر ان کی بے لغام آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ ورنہ دوسروں کی عورت کو باہر نکالنے اور بے پردہ کرنے سے آخر ان کو اور کیا حاصل ہوتا ہے؟ جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ حضور ﷺ نے کسی غیر محرم عورت کے ساتھ خلوت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے مگر آج کل کے مغرب زدہ انسان کالجز اور یونیورسٹیز میں مخلوط تعلیم کی کیوں حمایت کر کے اپنی بیٹیوں اور نور نظروں کو پروفیسروں اور شاگردوں کے ساتھ اکیلے ملاقات ومجلس کے لیے اور ان کے ساتھ کندھا کندھے کے ساتھ ملا کر ان نام نہاد تعلیمی اداروں کے گندے ماحول میں خود جا کر چھوڑ کر آتے ہیں۔

میرا اپنا چشم دید واقعہ ہے کہ یونیورسٹیز میں ایسا ماحول ہے جیسا کہ ہندوؤں کی کتابوں میں ملتا ہے کہ سری کرشن پانی کے بیچ میں بیٹھا ہے اور کتنی ہی گوپیاں اس کے اردگرد کھڑی ہیں بعینہٖ، اسی طرح پروفیسر صاحب کرشن کا روپ بنا کے بیچ میں کرسی لگا کے بیٹھ جاتا ہے اور اس کے اردگرد زرق وبرق لباس میں ملبوس اور پاؤڈر اور لپ اسٹک کی سرخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور اپنے حسن کے بے پناہ ہتھیاروں سے لیس ہو کر وہ نوجوان لڑکیاں اس پروفیسر کے اردگرد گوپیوں کے روپ میں کرسیوں پر براجمان ہوتی ہیں۔ خدارا انصاف سے بتائیں ضمیر کی آواز کی طرف کان دے کر سنو، اس ہیئت اور کیفیت میں پروفیسر صاحبان کیا پڑھاتے ہوں گے اور وہ طالبات کیا سبق حاصل کرتی ہوں گی، کیا یہ بھی میرے لکھنے کے متقاضی ہے؟

اور پھر میرا یہ بھی تجربہ ہے کہ یہ پروفیسر محض ان نوجوان لڑکیوں کے منظور نظر بننے کی خاطر امتحانوں میں زیادہ نمبر دے دیتے ہیں حتیٰ کہ کچھ لڑکے ڈبل یا ٹرپل ایم۔اے کر رہے ہوتے ہیں اور وہ یونیورسٹی ''حور'' ایم۔اے کے پہلا امتحان دی رہی ہوتی ہے، پھر بھی اس کو اس لڑکے سے زیادہ نمبر ملیں گے اور وہ لڑکا جس کو زیادہ نمبر ملنے کا امکان ہوتا ہے اس کو کم نمبر دیئے جاتے ہیں۔

راقم الحروف کی آنکھوں نے کیا کچھ دیکھا ہے یہ داستان بہت لمبی ہے جس کو بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے تو ایسے ماحول میں اور ایسے جذبات سفلیہ کو بھڑکانے والے حالات میں نوجوانوں میں زنا کے محرکات اور اس کی مائل کرنے کی باتیں پیدا نہ ہوں گی تو کیا وہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما جیسے پاکباز انسان بنیں گے؟ یہاں پر اور بھی بہت کچھ لکھ سکتے ہیں، مگر سردست اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ب: ...... اسلام کا حکم ہے کہ کوئی غیر مرد کسی غیر محرم عورت کی طرف نہ دیکھے، اسی طرح عورت کو بھی یہی حکم ہے کہ غیر مرد سے اپنی نظر کو جھکائے (سورۃ النور) لیکن اس حکم کی ہمارے ملک پاکستان میں جو مٹی پلید کی جاتی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔

ج: ...... اسلام کا یہ حکم ہے کہ دوسرے کے گھر میں بغیر اجازت اور بغیر سلام کیے ہوئے مت داخل ہو، (سورۃ النور) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی آدمی نے کسی دوسرے کے گھر کے سوراخ وغیرہ سے گھر والوں کی بے خبری کی حالت میں دیکھا اور گھر والوں کو اس کا پتہ پڑ گیا اور انہوں نے کسی چیز سے اس کی آنکھ پھوڑ دی تو ان پر کوئی دیت وغیرہ نہیں ہوگی۔

د: ...... اسلام کا حکم ہے کہ آپ کے خادم یا آپ کے چھوٹے بچے دو تین وقتوں میں اپنے والدین سے اجازت لے کر پھر آئیں۔ (۱) صبح کی نماز سے تھوڑا پہلے (۲) دوپہر کے وقت جب گھر والے گرمی کی وجہ سے کپڑے وغیرہ اتار کر سو رہے ہوں (۳) عشاء کی نماز کے بعد (سورۃ النور) یہ حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ اوقات خلوت کے ہوتے ہیں انسان

اپنے گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ خلوت میں یا ایسے لباس میں ہوسکتا ہے جس میں ان کو دیکھنا جائز اور مناسب نہیں، کیونکہ اگر بچوں نے اس عمر میں ایسی چیز کا مشاہدہ کیا تو وہ شہوانی خیالات کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں، لہٰذا دین اسلام میں اتنی بھی اجازت نہیں ہے کہ چھوٹے بچے بھی اپنے والدین کے پاس ان اوقات میں بغیر اجازت کے نہیں جا سکتے۔ آج اسی دین کے پیروکاروں کا کیا حال ہے۔ ان کے گھر T-V سے بھرے ہوئے ہیں۔ جن سے کئی فحش ڈرامے، بیہودہ موسیقی اور انتہائی شرم ناک باتیں نشر ہوتی ہیں۔ اجنبی عورتوں کی صورتیں واضح طور پر دیکھی جاتی ہیں، حالانکہ ان کو ان عورتوں سے نظروں کو جھکانے کا حکم ہے، خدا کے لیے ان پر کچھ غور کریں جن گھروں میں ایسے فاحش مناظر اور بے حیائی والی باتیں ہوں گی ان کی اخلاقی حالت کیا ہوگی؟ ایسے گھر فحاشی کے اڈے نہ بنیں گے تو کیا پاکیزہ انسانوں والے ماحول والے بنیں گے؟ دل اور نفس اسی طرح نفسانی خواہشات مرد اور عورت دونوں میں فطرتاً رکھی ہوئی ہے، پھر ایسے گھروں میں جب ایسے بے حیا مناظر نشر ہوں گے تو کیا ان شوق سے دیکھنے والوں مرد عورتوں کے دلوں میں سفلی جزبات کو بھڑکانے والے محرکات پیدا نہیں ہوں گے؟ یہاں کچھ اور بھی زیادہ کچھ لکھنے کی ضرورت ہے لیکن کاغذ کی تنگ دامنی اور مضمون کی طوالت سے بچنے کے لیے قلم کو روکنا پڑ رہا ہے۔

ھ: ...... اسلام جاندار چیزوں کی تصویر کشی سے سختی سے روکتا ہے، اس سلسلے میں بے شمار احادیث تواتر کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہیں، تصویر کی ان بے انداز خرابیوں اور برائیوں میں سے ایک یہ بھی ہے اس فن کو اتنا فروغ دیا گیا ہے جو عورتوں کی چھپی تصویروں کو تو چھوڑو، برہنہ تصاویر بھی راقم الحروف نے دیکھی ہیں، تم کسی بھی دکان پر جاؤ گے تو تقریباً ہر چیز پر عورت کی تصویر نظر آئے گی خاص طور پر دار اللباس پر جاؤ گے تو وہاں عورت کا بڑا مجسمہ نظر آئے گا، ایسا سب کچھ کیوں ہے؟

و: ...... گانا بجانا، صحیح بخاری کی حدیث سے حرام و ناجائز معلوم ہوتا ہے لیکن ہماری قوم کا کیا حال ہے جو گانے بجانے اور ڈانس وغیرہ سے اس کو فراغت ہی نہیں ملتی، کیا گانے بجانے

اور ساز وغیرہ کے برے نتائج سے ہمارے سمجھدار لوگ عاجز ہیں، میرے خیال میں گانا بجانا اور اس آواز وغیرہ سے انسان کے دل ودماغ پر ایسا خراب اثر پڑتا ہے اور اس کے عقل وپرور پر اتنا نشہ چڑھا دیتا ہے کہ اتنا نشہ شراب بھی نہیں چڑھاتی، ایسا ساز سننے والا جس عورت سے وہ ساز یا آواز سن رہا ہوتا ہے تو اس کو ایسے خیالات آتے ہیں ابھی ابھی اٹھ یا جا کر اس بہترین آواز والی عورت کو اپنی آغوش میں لے۔ ہمارے سلف صالحین نے ایسے ساز والی آواز کو زنا کا محرک یا رقیۃ الزنا تصور کیا ہے۔ اسی طرح کئی دوسری ایسی اشیاء وغیرہ ہمارے ملک میں بہت ہیں۔ کیا وہ ساری اشیاء زنا کی محرکات میں سے نہیں ہیں اور بالفعل اس کے اضافہ میں بہت بڑا رول ادا نہیں کیا ہے؟ کیا یہ سینمائیں وغیرہ زنا کے وجود میں لانے کی کامیاب فیکٹریاں نہیں ہیں؟ اگر یقیناً ہیں جیسا کہ یقیناً ہیں بھی تو پھر وہ معترض حضرات بتائیں اتنے بڑے زنا کا طوفان بدتمیزی میں آخر اسلام کا قانون شہادت کیا اضافہ کرے گا، آخر اس حالت میں اضافہ کی گنجائش کہاں ہے، پیمانہ پہلے ہی لبریز ہے، اگر کچھ ڈالو گے تو چھلک پڑے گا، باقی اس میں کیا اضافہ ہوگا؟ آپ نرم مزاجی سے میری گزارشات پر نظر ڈالیں، پھر سوچیں کیا میں نے جھوٹ لکھا ہے؟

بہرحال زنا اور اس کے محرکات کے اضافے کا سب سے بڑا سبب اسلامی قوانین کی پاسداری نہ کرنا اور اسلامی معاشرے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیے ہوئے احکامات سے انحراف اور اوپر بیان کیے ہوئے بے حیائی کے کاموں سے لگاؤ رکھنے کی وجہ سے ہے۔

اب میں اسلام کی زنا کے متعلق شہادت کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں، اسلام نے جو احکامات، سوسائٹی اور معاشرے کو پاکیزہ رکھنے کے لیے دیئے ہیں، ان پر اگر ہم پوری طرح عزم واستقلال سے عمل کریں، تو نتیجتاً ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا جس میں زنا تو دور کی بات ہے زنا کی بو بھی نہیں آئے گی اور نہ ہی اس تک پہنچنے کے اسباب ومحرکات ہوں گے، ایسے معاشرے میں اولاً زنا ہوگا ہی نہیں، لیکن پھر بھی اگر کوئی جنیت وبد باطن انسان جرأت کر کے ایسا انتہائی برا کام کرتا ہے تو اسلام نے اس کے لیے نہایت ہی سخت اور عبرتناک

سزا تجویز کی ہے، یعنی اگر غیر شادی شدہ کنوارہ ہے تو اسے ۱۰۰ سو کوڑے لگائے جائیں اور اگر شادی شدہ ہے تو اس کو رجم (سنگسار) کرنے کا حکم ہے، اور اس کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہیے تاکہ سب کو اس سے عبرت حاصل ہو، مطلب کہ اسلام کے احکامات پر عمل کرنے سے اول تو ایسی برائی وجود میں ہی نہیں آئے گا اگر اِکا دُکا واقعہ ہو بھی گیا تو اس کو سزا بھی ایسی ملے گی جس سے دوسرے بھی سبق حاصل کریں گے اور ایسی بے حیائی سے باز آئیں گے۔

اب جب کہ زنا کے لیے اتنی بڑی سزا مجوزہ ہے تو اس کے نفاذ کے لیے گواہی بھی ایسی پکی ہونی چاہیے، کیونکہ رجم (سنگسار) والا آدمی تو یقیناً ختم ہو جائے گا، لیکن جس کو سو کوڑے لگیں گے وہ بھی تو بڑے خطرے میں ہے، یعنی جان جانے کا بھی خطرہ ہے، لہٰذا انسانی حیاتی کو مدنظر رکھ کر اس کی ثابتی کے لیے ایسا سخت قانون شہادت مقرر کیا گیا ہے ورنہ اگر ایک دو آدمیوں کی گواہی کافی سمجھی جاتی تو پھر کتنے ہی لوگ محض اپنی ذاتی دشمنی اور عناد کی بنا پر کسی پرہیز گار آدی کو بھی اس میں ملوث کر سکتے ہیں تاکہ اس کی جان جوکھے میں چلی جائے۔ اسی طرح کئی بے گناہ بھی اس کی لپیٹ میں آسکتے ہیں، اس لیے قانون شہادت کو سخت مقرر کیا گیا ہے۔ اس صورت میں معاشرہ پاک ہونے کی وجہ سے اول تو زنا کا وجود ہی نہیں ہوگا اگر کسی سے کوئی غلطی سرزد ہو بھی گئی اور دو تین آدمیوں نے دیکھ بھی لیا ہے لیکن چار گواہوں کا معاملہ پورا نہیں ہوا ہے، لہٰذا ان لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس کی پردہ پوشی کریں شاید وہ مرد بھی شرمندہ ہو کر اپنے کیے ہوئے گناہ پر از حد پشیمان ہو اور سچے دل سے توبہ تائب ہو اور اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرما دے۔ بہرحال گواہوں کا اندازہ پورا نہیں ہے تو ان کو پردہ پوشی کرنی چاہیے کیونکہ ایسے پاکیزہ معاشرہ جس کے اکثر لوگ اس کام سے دور ہوتے ہیں، اس میں ایک دو مثالوں سے کوئی نمایاں نقصان نہیں ہوتا۔ اس لیے گواہوں کے نامکمل ہوتے کے موقع پر اس پر پردہ پوشی کرنا ہی بہترین طرز عمل ہے، نہ کہ ڈنڈھورا پیٹا جائے تاکہ جس کو پتہ نہیں ہے اس کو بھی پتہ چل جائے۔ اس طرح سے مسلم معاشرہ میں بے حیائی کی اشاعت ہوگی اور لوگ سوچیں گے

کہ اس سوسائٹی میں بھی ایسے مرد یا خواتین موجود ہیں جن سے برائی کا کام پورا کروایا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ چیز اور زیادہ معاشرے کی خرابی کا باعث بن جائے گی۔ اور لوگ برائی کا سوچیں گے، اور پردہ پوش سے برائی کی اتنی اشاعت نہیں ہوگی۔ قرآن کریم میں بھی برائی کی اشاعت کے بارے میں سخت مذمت کی گئی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (النور: ۱۹)

یعنی ''بیشک وہ لوگ جو ایمان والے لوگوں میں بے حیائی کی بات پھیلانا چاہتے ہیں ان کے لیے دنیا وآخرت میں دردناک عذاب ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کی بے حیائی کی بات کو اشاعت کرنے سے جو خطرناک نتائج نکلیں گے یا تباہ کن اثرات پیدا ہوں گے ان کی سنگینی کا علم اللہ تعالیٰ ہی رکھتا ہے، تمہیں اس کا کوئی علم نہیں۔''

بہرحال بے حیائی جس طرح خود بے حد خراب اور بڑا گناہ کا کام ہے اس طرح اس کی اشاعت اور ترویج بھی نہایت ہی خراب اور گناہ کا کام ہے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ)) (مسلم)

''یعنی کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔''

مگر یہ ساری باتیں وہاں کارگر ثابت ہوں گی۔ جہاں اسلامی معاشرہ قائم ہوگا، باقی ہمارا ملک جس میں پہلے ہی بے حیائی کی فیکٹریاں اور کارخانے ہیں، اسلامی نظام والا معاشرہ ہی نہیں ہے بے حیائی کی باتیں عروج پر ہیں۔ برائی کے محرکات چپے چپے پر قدم قدم پر سامنے آرہے ہیں، ایسے ماحول میں کوئی بھی اسلامی قانون کارآمد ثابت نہیں ہوگا اگرچہ اس کی تقاضا کے لیے سردھڑ کی بازی لگائی جائے لہٰذا ہمارے مسلمانوں کو سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہیے اور ذہن میں رکھنا چاہیے کہ کوئی بھی اسلامی قانون برائی کو پھیلانے اور اس میں

اضافے کا باعث نہیں بن سکتا، بلکہ اسلام کے سارے قوانین نور اور روشنی رشد وہدایت کے راستے ہیں۔ ان پر عمل کرنے سے دنیا آخرت دونوں میں انسان سرخرو ہوسکتا ہے اور برائی کا نام ونشان نیست ونابود ہوجائے گا، لیکن اگر ہمارا معاشرہ ہی خراب ہو تو بجائے اسلامی قوانین پر نکتہ چینی کرنے کے اپنے معاشرے کی اصلاح کرنی چاہیے لیکن لوگ خواہ مخواہ پانی اندرونی خباثتوں کو ظاہر کرنے کی خاطر لوگوں کے سامنے فضول اور بیہودہ سوالات اٹھا کر کوئی ان کی خدمت نہیں کررہے اور نہ ہی مجموعی طور پر انسانی بھلائی کا سامان اکٹھا کرتے ہیں محض اپنا منہ خراب کرتے ہوئے اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

نشہ آور ادویات کا حکم

سوال: اکثر ادویات میں نشہ آور اشیاء الکحل وغیرہ استعمال ہوتا ہے تو ان ادویات کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الوهاب: ادویات نشہ اور اشیاء کے علاوہ بہت ساری اشیاء سے مرکب ہوتی ہیں اور دوسری اشیاء کے ملنے سے ان کا نشہ زائل ہوجاتا ہے جب ایسا ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اب وہ نشہ آور ہے ہی نہیں۔

اور یہ علم ان کیمیاء کے ماہر اہل علم سے حاصل ہوتا ہے کہ وہ مختلف اشیاء کو ملا کر ایک مرکب بناتے ہیں اور پھر اس میں تجربات کرتے ہیں اور اس کے آثار فعل ترکیب وغیرہ کو جانچتے ہیں۔

ہاں ایسی دوا جس سے نشہ زائل نہ ہو اور مخصوص مقدار یا اس سے زائد پینے سے نشہ دیتی ہو تو ایسی دوا حرام ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے، کیونکہ صحیح حدیث میں ہے:

((ما اسكر كثيره فقليله حرام ، او كما قال النبى ﷺ))

''جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ دیتی ہو اس کی تھوڑی مقدار کا استعمال بھی حرام ہے۔''

یہ مسئلہ جدید مسائل میں سے ہے، لہٰذا جو متبحر اہل علم ہیں اور قرآن وسنت کے علم کے

ساتھ ساتھ دنیاوی علوم سے بھی واقفیت رکھتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ بیٹھیں اور ان مسائل پر کتاب وسنت کی روشنی میں غور وخوض کریں اور پھر ایک محاضرہ رکھیں جس میں عصری علوم کے ماہرین بھی ہوں اور پھر وہ اس پر بحث کریں تو جو نتیجہ آئے اور انشراح صدر ہو اور جو تحقیق سے بات ثابت ہو اسے مکمل تحقیق کے ساتھ نافذ کریں اور کسی سے نہ ڈریں تاکہ اس مسئلہ میں جو اشتباہ ہے اور مشکل ہے وہ حل ہو سکے، لیکن میں اس وقت اس مسئلہ میں اپنی کوئی واضح رائے نہیں دے سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب

ابوالقاسم عفی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس مسئلہ میں اپنے برادر محترم ومکرم سے تبادلہ خیال کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا، کہ اقرب الی الصواب بات یہی ہے کہ اس سے بچا جائے، ہر حال میں۔ چلو اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ اور اجزاء کے ملنے کی وجہ سے نشہ اس کا زائل ہو جاتا ہے، لیکن نبی علیہ السلام نے نشہ کو بیماری قرار دیا ہے تو جو خود بیماری ہو وہ بیماری کو کیسے دور کرے گی اور آپ ﷺ نے اسے دواء نہیں فرمایا: اگر سارے اطباء اور ڈاکٹر اکٹھے ہو کر بھی یہ کہیں کہ یہ شفاء ہے تو ہم انہیں ہی جھوٹا کہیں گے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر سچا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

یہی ہمار، مسلک اور ہمارا عقیدہ ہے، اسی پر ہمارا ایمان ہے اور یہی راہ راست پر چلنے والوں کا عقیدہ ہوتا ہے، اگر کوئی یہ جرأت کرے اور ڈاکٹرز کی بات کو سچ سمجھے اور نبی ﷺ کی بات کو غلط تو وہ اپنے ایمان پر غور کرے نوحہ کرے اللہ ہی حق بات فرماتے ہیں اور راہ راست پر ہدایت دیتے ہیں۔

ممکن ہے کوئی یہ بات کہے کہ اگر اس سے علاج ہو رہا ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟

تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت ساری حلال اشیاء نباتات معدنیات جڑی بوٹیاں پیدا فرمائیں ہیں کہ جن سے علاج ممکن ہے تو ان حلال اشیاء کو چھوڑ کر ہم حرام کی طرف کیوں جائیں اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج: ۷۸)

''اللہ نے تمہارے دین میں تم پر کوئی سختی نہیں کی۔''

تو حرج اصلاً تصور نہ کریں بلکہ یہ مصمم ارادہ اور نیت صادقہ اور کتاب وسنت کی اتباع میں ہوتا ہے۔

ٹیلی ویژن کا حکم

سوال: ٹیلی ویژن اور اسلامی فلموں کا کیا حکم ہے؟ کیا ہم تعلیم کی غرض سے یہ استعمال کر سکتے ہیں اور کیا ٹیلی ویژن تصویر میں داخل ہے؟

الجواب بعون الوهاب: یہ اس وقت کی بڑی عجیب بات ہے کہ ہم فلموں کا نام سنتے ہیں کہ یہ اسلامی فلمیں ہیں کہ یہ اسلامی اشتراکیت یا اسلامی جمہوریت ہے، مجھے ابھی تک کوئی شخص ایسا نہیں [illegible] کہ جو مجھے اس بارہ میں سمجھائے کہ ان کے یہ اسلامی نام کیونکر رکھے گئے ہیں، یہ نظر[illegible]ت اور اصطلاحات، جو یہودی ہیں یہ کیوں ہمارے اندر آئے ہیں۔ آسمان زمین سے کہاں ہے تو یہ کہاں ہے۔ کیا تعلق ہے ان کا اس دین کے ساتھ جو دین منزل من اللہ ہے، یہ باطل نظریات اور خود ساختہ الفاظ واصطلاحات جو اہل الاھواء والبدع کی پیداوار ہیں، کیا ہم میں ایک بھی ایسا صاحب بصیرت آدمی نہیں کہ جو ان اشیاء کی گہرائی میں جا کر سوچے، کیا کوئی یہ بات واضح کر سکتا ہے کہ جو لوگ غیر ممالک میں رہتے ہیں، وہ یہ فلمیں وغیرہ تعلیم وتربیت کے لیے استعمال کرتے ہیں، کوئی بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا، کیونکہ ان لوگوں کا اس سے مقصد صرف اور صرف انہیں دیکھ کر انسانی جواہر کا ضیاع اور اخلاق کی بربادی اور فحاشی کے اندھیرے کنویں میں دھکیلنا ہے۔ یہ صرف لغو کھیل اور ان کی بری تسکین اور نفسانی خواہش کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہیں۔ ان سے ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ کچھ وقت دنیاوی امور سے چھٹکارا پا کر اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کرنا ہے، تو یہ اشیاء وہ صرف اور صرف [illegible]ان مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں نہ کہ ان کا اس سے مقصد کوئی تعلیم وتربیت ہے او[illegible] کل جتنی بھی فلمیں بنائی جاتی ہیں، وہ صرف اور صرف اخلاق کو تباہ کرنے والی ہیں اور خاندانی نظام کو

تباہ کرنے والی ہیں کیونکہ جب ایک عورت اسے دیکھتی ہے اور پردہ اسکرین پر جو دیکھتی ہے پھر عام زندگی وہ اپنے آپ کو ویسا تصور کرتی ہے جس سے بالآخر زنا تک سرزد ہو جاتا ہے اور کتنے ہی شریف لوگ ایسے ہیں جو چور، ڈاکو بن جاتے ہیں جس کا سبب بھی بعض اوقات یہی پردہ اسکرین پر چلنے والی فلم ہوتی ہیں کہ وہ عام زندگی میں اپنے آپ کو ویسا تصور کرتا ہے اور پھر وہ سب کر گزرتا ہے جو دیکھتا ہے افسوس ہے آج کل کے علماء کرام پر جو ان اشیاء کے تھوڑے سے فائدے کو دیکھتے ہوئے جواز کا فتویٰ دے دیتے ہیں کہ اگر انہیں جائز منفعت کے لیے استعمال کیا جائے تو ٹھیک ہے، حالانکہ حقیقت میں یہ فوائد کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ اس دنیا میں جو بھی اشیاء وہ نفع اور نقصان دونوں کو شامل ہیں، ہم اس میں موازنہ کریں کہ ان میں نفع کتنا ہے اور نقصان کتنا ہے اگر ان میں نقصان کی بہ نسبت نفع زیادہ ہے تو ہم پھر اسے جائز کہہ سکتے ہیں۔

لیکن جب اس کا نقصان اس کے نفع سے بڑا ہو تو ہم اسے کیسے فائدہ مند کہہ سکتے ہیں ((واثمهما اكبر من نفعهما)) کہ ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے۔ یعنی شراب اور جوئے کا۔ تو یہاں بھی ان فلموں اور پردہ اسکرین کا نقصان ان کے نفع سے کئی گنا بڑا ہے، تو ایک عاقل انسان کے لیے یہی لائق ہے کہ ان سے بچے۔ یہ اشیاء اخلاق اور جوہر انسانی کو تباہ کرنے والی ہیں اور یہ تمام اشیاء یہود کے ہاتھوں میں ہیں اور وہ اہل اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور یہ بات قرآن سے ثابت ہے، میں نے ایک انگریزی کتاب جس کا مصنف بھی انگریز ہی تھا کا مطالعہ کیا جس میں یہود کی میٹنگ کا تذکرہ تھا اور ان میٹنگز میں جو قرار دادیں پاس ہوئیں ان کا تذکرہ تھا، ان اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں نے یہ بات اس میں بڑی واضح اور صراحت کے ساتھ کہی کہ یہ انسان جن کو یہ اپنے لیے ایک تفریح کا ذریعہ سمجھتا ہے انہیں ان مسلمانوں میں عام کر دو تا کہ ان کے اخلاق برباد ہو جائیں اور یہ لوگ افراط وتفریط کا شکار ہو جائیں، تو بتائیں ان یہودیوں کی بات پر یقین کریں یا اپنوں کی۔

فصل:...... پھر یہ بات کہی جاتی ہے کہ فلم یہ ایک متحرک تصویر ہے جو پردہ اسکرین پر

دیکھی جاتی ہے، جاندار کی تصویر حرام ہے جس کے بارہ میں بے شمار احادیث وارد ہوئیں ہیں جو تواتر کی حد کو پہنچ جاتی ہیں کئی صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہ مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاندار کی تصویر بنانے سے منع فرمایا ہے اور جو ایسا کرتا ہے اس پر لعنت فرمائی ہے اور ساتھ میں یہ بھی فرمایا کہ تصویر بنانے والے اللہ کی مخلوق میں سے بدترین لوگ ہیں جنہیں قیامت کے دن یہ کہا جائے گا کہ جو تصویریں تم بنایا کرتے تھے آج ان میں جان ڈالو اور وہ اس سے قاصر ہوں گے اور انہیں سخت عذاب دیا جائے گا اور یہ عمل کبیرہ تباہ کرنے والا گناہ ہے اگرچہ یہ آج پورے عالم اسلام میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ مسلمانوں کے دل اس چیز پر کیسے راضی ہو گئے تو جو حرام ہے اور شیطان کی رضامندی کا سبب ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی ہے اور پھر افسوس یہ کہ ہم ان کا نام رکھتے ہیں۔ ''اسلامی'' افسوس ہے مسلمانوں پر اور ان کے ایسے اسلام پر'' اور پھر مزید سونے پہ سہاگا کہ جب انہیں اس کام سے روکا جائے تو جواب دیتے ہیں کہ یہ کام تو فلاں عالم فاضل بھی کرتے ہیں اور فلاں فلاں ملک میں یہ رائج ہے وہ ممالک کہ جنہیں ہم اسلامی ملک کہتے ہیں، کتنی عجیب بات ہے۔ کیا ہم کسی ایک ملک کے ساتھ خاص ہیں؟ یا کیا ہم کسی خاص عالم فاضل پر ایمان لائے ہیں؟ بلکہ ہمارا ایمان تو اللہ اور اس کے رسول پر ہے اور انہی کی اتباع کرنا ہم پر لازم وملزوم ہے اگر ساری دنیا ایک چیز کو مل کر حلال یا حرام کرنا چاہیں تو بھی وہ اس کو حلال یا حرام نہیں کرسکتی جب تک کہ اللہ یا اس کے پیغمبر جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کو حلال وحرام قرار نہ دے دیں۔ کیونکہ ایک مومن کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ہدایت اور بھلائی صرف اللہ اور اس کے رسول کی اتباع میں ہے نہ کہ غیروں کی۔

اگر سارے ممالک اسلامیہ ایک حرام چیز کو حلال کرنے پر تل جائیں اور اللہ اور اس کے پیغمبر نے اسے حرام کیا ہو تو وہ تمام غلطی پر ہیں اگر کہیں درستگی ہے تو وہ صرف اللہ اور اس کے رسول کے پاس ہے۔

لیکن افسوس در افسوس کہ یہ مسئلہ قلوب مسلمین سے اس طرح نکال دیا گیا ہے، اس

طرح مسلمان اس کی اہمیت سے غافل ہو گئے ہیں کہ علماء کرام کہ جو اپنے آپ کو سلف کے عقیدہ پر تصور کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اہل الحدیث کہلاتے ہیں وہ بھی پوری طرح اس میں ملوث ہیں، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بعض اہل حدیث جماعت کے اکابر فضلاء جو کیمرے کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور لوگوں کو خطبہ دیتے ہیں، انہیں کتاب وسنت کی اتباع کا وعظ کرتے ہیں انہیں بدعتوں، فحاشی، منکرات سے روکتے ہیں لیکن ان کے سامنے مصور ان کی تصویر کشی کر رہا ہوتا ہے اور ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی کہ اس کام سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے منع فرمایا ہے، بلکہ حالت تو یہ ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ گویا اس کام کو حرام ہی قرار نہ دیا گیا ہو۔ میں نے انہیں اس بات پر تنبیہاً خط لکھا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ اب زندگی کا ایک حصہ ہے جس سے بچنا ناممکن ہے کیونکہ اس سے ہماری تصاویر اور ہماری بات دوسروں تک پہنچتی ہے اور ہمارے مسلک کی ترویج ہوتی ہے۔ تو مجھے دوبارہ ان کی طرف لکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ آج ہماری زندگی کا معیار اس قدر گر گیا ہے کہ آج حرام اشیاء ہماری زندگی کا لازمی جزو بن چکی ہے جس سے بچنا ناممکن ہے، پھر تو مجھے خطرہ ہے کہ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا، کہ پتا نہیں کیا کیا حرام اشیاء ہماری زندگی کا حصہ بنتی ہیں اور ہم اسے جائز قرار دیں گے، یہ عریاں رقص، فلمی گانے، آلات موسیقی، مخلوط محفلیں، سود اور رشوت خوری اور ایسی بے شمار اشیاء جو حرام ہیں لیکن یہ سب ہماری زندگی کا لازمی جزو بن جائیں گی تو یہ بھی حلال ہو جائیں گی۔ اور پھر لوگ ان میں بھی جائیں گے اور اپنے وقت کو ضائع کریں گے۔ جیسا کہ سائل نے کہا تھا کہ اسلامی فلمیں کہ جو صرف تعلیم کی غرض سے دیکھی جاتی ہیں ان میں کوئی لہو ولعب نہیں۔

چلو بالفرض مان لو کہ یہ اسلامی فلمیں فقط تعلیم کے لیے ہیں، لیکن ان میں صحابہ، تابعین اور اولیاء اللہ اور محدثین کی جو تصویر کشی کی جاتی ہے کیا آج کا کوئی آدمی ان پاک ہستیوں کے برابر ہو سکتا ہے؟ کیا آپ اس کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ آج کا ایک فاحش انسان کسی صحابی کی تصویر کشی میں ملوث ہو۔ ارے یہ صحابی تو کیا یہ تو اس صحابی کے پاؤں کی مٹی کی دھول کے

برابر بھی نہیں ہوسکتا کہ جو مٹی کی دھول نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ان کے قدموں پر لگی۔ تو کیسے ایک آدمی ان جیسی تصویر پیش کرسکتا ہے اور پھر اسے پردہ اسکرین پر دکھلایا جائے۔

بہرحال بات تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہی خارج عن البحث ہے، ہم فضول اس میں وقت کو ضائع نہ کریں ان میں صرف جاہل ہی اپنا وقت ضائع کرسکتا ہے، ۱۴ صدیاں گزر گئیں آج تک کسی بھی اہل علم نے تعلیم وتربیت کے لیے اسلاف کے زندہ ہونے کی شرط نہیں لگائی تو آج ہمیں اس کی اتنی کیا ضرورت پڑ گئی کہ ہم ان بے کار اور بری اشیاء کی طرف رجوع کریں، کیا ان حرام اشیاء کے بغیر آج تعلیم ممکن نہیں؟ غور کریں۔

رہی بات جہاں تک ٹیلی ویژن کی تو بذات خود ٹیلی ویژن برا نہیں لیکن چونکہ یہ ہی فلموں کی رؤیت کا ذریعہ بنتا ہے اور پھر اس کو دیکھنے کے بعد انسان سینما اور بڑی اسکرینوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اگر انسان شہر میں رہتا ہو تو وہ سینما گھر کی طرف جائے گا ہی۔ اور پھر جب سینما کی طرف متوجہ ہوگا اور لازمی امر ہے کہ پھر اسے مال بھی زیادہ خرچ کرنا پڑے گا اور بہت ساری مشکلات سے بھی گزرنا پڑے گا تو یہ تمام کام انتہائی برے ہیں۔ اور اگر گاؤں کا ماحول ہو وہاں اگر ایک گھر والے بھی ٹی وی لے آئیں تو پورا گاؤں ان کے گھر امنڈ آتا ہے اور ان کا گھر سینما کا نظارہ پیش کررہا ہوتا ہے، جہاں مرد عورت بچے ہر عمر کے افراد آتے ہیں، تو جو گھر اللہ کی برکتوں سے بھرا ہوتا ہے وہ فحاشی، منکرات اور فسق وفجور کا اڈا بن جاتا ہے اور اسے دیکھ کر لوگوں کے ذہن خراب ہوتے ہیں وہ ایک علیحدہ نقصان ہے۔ بعض لوگ پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم اس پر صرف خبر سنتے ہیں تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ جو نیوز کاسٹر ہوتی ہے، بہت دفعہ عورتیں اور لڑکیاں ہوتی ہیں تو انسان خبر سنے گا، کیا وہ ان عورتوں کی تصاویر نہیں دیکھے گا، اور اللہ تعالیٰ کا تو یہ فرمان ہے: ﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ﴾ (النور: ۳۰) کہ مومنوں کو حکم دیجئے کہ اپنی نگاہوں کو پست رکھیں، تو کیا خبریں دیکھنے سے اللہ کے اس حکم کی نافرمانی نہیں ہوتی۔ اور پھر کیسے ممکن ہے کہ ایک گھر میں ٹی وی ہو اور آدمی اسے خبروں یا اسلامی پروگرام یا تقاریر تک محدود رکھے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جب صاحب گھر

باہر جائے گا تو کیا وہ ٹی وی پر پہرہ دار بٹھائے گا، ہوسکتا ہے اس کے جانے کے بعد اس کے اہل خانہ اس پر منکر اور بری اشیاء دیکھیں، کیونکہ جو ہذیانی کیفیت فلمیں دیکھنا نفسانی خواہشات جنسی میلان جس طرح مردوں میں ہوتا ہے عورتوں میں بھی تو ہوتا ہے تو کتنی ہی پاکباز عقلمند عورتیں اس ٹی وی کی وجہ سے اس فحاشی کے دلدل میں دھنس جاتی ہیں۔

باب:...... اس کے علاوہ ویسے ہی اسلام میں تصویر ممنوع اور حرام ہے اور یہ ٹیلی ویژن تصویر کا ایک آلہ ہے اور مشکوک چیز ہے، اور جو مشکوک اشیاء کے قریب بھی جاتا ہے ممکن ہے کہ وہ مشکوک سے حرام میں داخل ہو جائے اور عین ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے انسانی فحاشی میں غرق ہو جائے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ﴾ (الانعام: ۱۵۱)

''فحاشی کے قریب بھی نہ جاؤ چاہے جو ظاہر ہو یا پوشیدہ۔''

تو جو شخص بھی یہ پسند کرتا ہو کہ وہ اپنے ایمان اور عزت کی حفاظت کرے تو ان تمام عوامل سے اپنے آپ کو بچائے کہ جو ایک پاکدامن انسان کو برائی کے راستے پر ڈال دیں جو اہل اسلام اور اسلام کے دشمنوں کی ایجادات ہیں کہ ان کے ذریعہ سے لوگوں کو صراط مستقیم سے ہٹائیں۔

تو ہمارے علم کے مطابق ٹی وی بھی ممنوع ہے شرعی لحاظ سے۔ اور ہر مومن مرد اور مومنہ عورت پر یہ لازم ہے، اپنے آپ کو اور اپنے گھر اس بڑی تباہی اور ہلاکت سے بچائیں کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو تمام گھر والوں کا گناہ سربراہان کے ذمہ ہوگا۔ کیونکہ نبی ﷺ نے ہرقل کو جو خط لکھا تھا اس میں یہ بھی لکھا تھا:

((فان تولیت فعلیك اثم الاریسیین)) (الجامع الصحیح للبخاری)

''اگر تو ایمان نہ لایا پھر گیا تو تمام اریسیوں کا گناہ تیرے سر ہوگا۔''

تو عزیزان من! ایسی تمام اشیاء سے اپنے آپ کو بچالو کہ جو ظاہراً تو بڑی اچھی ہیں لیکن حقیقت میں زہر قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

غیر مسلم کو قربانی کا گوشت دینا

سوال: قربانی فرض ہے یا سنت؟ نیز قربانی کا گوشت غیر مسلم یا مسلمان بے نمازی کو دیا جا سکتا ہے؟

الجواب بعون الوهاب: قربانی سنت ہے یا واجب اس کے متعلق کو علماء میں اختلاف ہے لیکن دلائل کے لحاظ سے صحیح بات یہی ہے کہ قربانی فرض یا واجب نہیں ہے، البتہ اسے سنت مؤکدہ کہا جا سکتا ہے اور باوجود استطاعت کے ترک کرنا مناسب نہیں اس کے دلائل درج ذیل ہیں۔

◆:......امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول تعلیقاً نقل کیا ہے کہ:

((قال ابن عمر رضی اللہ عنہما هي (اى الضحية) سنة ومعروف .))

(صحيح بخاری : كتاب الاضاحی)

اس اثر کو مشہور محدث حماد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مصنف میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما تک موصول سند کے ساتھ لایا ہے اور امام جبلہ بن سحیم کے طریق سے روایت کرتے ہیں کہ:

((ان رجلاً سأل ابن عمر عن الاضحية اهى واجبة فقال ضحىٰ رسول الله ﷺ والمسلمون بعده .))[1]

''یعنی ایک سائل نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ کیا اضحیٰ (قربانی) واجب ہے تو سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے جواب دیا کہ آپ ﷺ نے قربانی کی ہے اور آپ کے بعد مسلمان بھی کرتے آئے ہیں۔''

اس حدیث کی امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے تحسین کر رکھی ہے اور فرماتے ہیں کہ:

((والعمل على هذا عند اهل العلم ان الاضحية ليست واجبة .))

''یعنی اس حدیث پر اہل علم عمل کر کے قربانی کو واجب نہیں سمجھتے۔''

---

[1] سنن ترمذی، كتاب الاضاحی، باب الدليل على ان الاضحية سنة، رقم الحديث: ١٥٠٦ .

امام ترمذی کی اس عبارت پر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں لکھتے ہیں:

((وكانه فهم من كون ابن عمر لم يقل فى الجواب نعم انه لا يقول بالوجوب فان الفعل المجرد لا يدل على ذالك وكانه اشار بقوله والمسلمون إلى انها ليست من الخصائص وكان ابن عمر حريصا على اتباع افعال للنبى ﷺ فلذالك لم يصرح بعدم الواجب.))

''یعنی گویا امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا سوال کے جواب میں ہاں نہ کہنا سے یہ سمجھتے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اس کے وجوب کے قائل نہیں (کیونکہ اگر وجوب کے قائل ہوتے تو جب سائل نے پوچھا کہ قربانی واجب ہے تو آپ فرماتے کہ ہاں (واجب ہے) اور صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل نقل نہ کرتے)

اور مجرد فعل (جس کے ساتھ امر قولا شامل نہ ہو) وجوب پر دلالت نہیں کرتا اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما والمسلمون (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمان بھی قربانی کرتے تھے) کا لفظ اس لیے بڑھایا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص قربانی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی خاصہ نہ سمجھ بیٹھے) سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال اور اسوہ حسنہ کی اتباع کے حریص تھے اس لیے عدم وجوب کے صریح الفاظ بھی ذکر نہ کیے صرف آپ کا فعل ذکر کر کے اشارہ کر دیا کہ یہ واجب نہیں کیونکہ آپ کا فعل مبارک اگرچہ قابل اتباع ہے اور اس کی پیروی کرنا اجر وثواب کا باعث ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات بہت پسندیدہ اور محبوب ترین ہے، تاہم اگر وہ فعل امر کے ساتھ نہیں ہے یعنی اس فعل کے متعلق آپ نے امر نہیں فرمایا تو وہ فعل واجب نہیں ہوگا۔ تقریباً تمام مکاتب فکر کے علماء کا یہی مسلک ہے کہ محض فعل وجوب پر دلالت نہیں کرتا۔

❹:...... سیدہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ابوداؤد میں روایت مروی ہے کہ:

((قال رسول الله ﷺ من كان له ذبح يذبحه فاذا اهل هلال ذى الحجة فلا يأخذن من شعره ولا من اظفاره شيئا حتى

یضحی .)) [1]

''یعنی جس کے پاس قربانی کا جانور ہو اور وہ قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو پھر ذوالحج کے چاند دیکھنے کے بعد اپنے بال نہ کتروائے اور ناخن نہ تراشے یہاں تک کہ قربانی کرلے اس کے بعد حجامت بنوا سکتا ہے۔''

اس سے بھی واضح سنن نسائی کے الفاظ ہیں کہ:

((من رأى هلال ذي الحجة فاراد ان يضحي فلا يأخذ من شعره ولا من اظفاره حتى يضحي .)) [2]

اس حدیث میں ہے کہ ذوالحج کا چاند دیکھنے کے بعد اگر کسی کا قربانی کرنے کا ارادہ ہو وہ حجامت نہ بنوائے۔ مطلب کہ یہ الفاظ ((فاراد ان يضحي .)) اس حقیقت پر واضح دلیل ہیں کہ قربانی کرنے والے کے ارادہ پر مبنی ہے اور جس کام کا یہ حال ہو (یعنی وہ مسلم کے ارادہ پر منحصر ہو) وہ فرض یا واجب نہیں ہوسکتا، کیونکہ فرض یا واجب میں اس کام کرنے والے کے ارادہ پر منحصر نہیں ہوتا کہ اس کی مرضی کرے یا نہ کرے بلکہ وہ کام ہر حال کرنے کا لازم ہوتا ہے چاہے وہ اسے پسند کرے یا کرے کرے۔

باقی قربانی کرنے والے کو حکم ہے کہ وہ قربانی سے پہلے حجامت نہ بنوائے سو یہ تعجب کی بات نہیں مثلاً نفلی نماز فرض یا واجب نہیں ہے مگر اگر کوئی پڑھتا ہے تو اسے کچھ باتوں ضروری خیال رکھنا ہے اور ان پر لازی طور پر عمل کرنا ہے۔ مثلاً وضو، قرأۃ، رکوع، سجود وغیرہا یعنی نفلی نماز فی نفسہ تو فرض یا واجب نہیں مگر جو پڑھتا ہے تو اس پر یہ تمام کام کرنا ہیں ورنہ ان میں سے کوئی کام ترک کرے گا تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔

اسی طرح نفلی روزہ کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے کہ نفلی روزہ واجب نہیں مگر جو رکھے گا

---

[1] سنن ابی داؤد: كتاب الضحايا، باب الرجل يأخذ من شعره في العشر وهو يريد ان يضحي: رقم الحديث، ٢٧٩١.

[2] سنن نسائي: كتاب الضحايا، باب من اراد ان يضحي فلا يأخذ من شعره، رقم الحديث، ٤٣٦٦.

اس پر ان تمام پابندیوں کا خیال رکھنا ضروری ہے جو فرضی روزہ میں ہوتی ہیں۔علی ہذا القیاس بعینہٖ قربانی کا معاملہ بھی ہے یعنی گو قربانی فی نفسہٖ نہیں مگر جو شخص کرے گا تو اس پر یہ پابندی ضرور لاگو ہوگی کہ وہ ذوالحج کے چاند دیکھنے کے بعد قربانی کا جانور ذبح کرنے تک حجامت نہ بنوائے زیادہ سے زیادہ قربانی کے وجوب وفرضیت پر جو دلیل پیش کی جاتی ہے وہ حدیث ہے جو سنن ابی ماجہ، ابواب الاضاحی باب الاضاحی واجبة هي ام لا، رقم الحديث، ۳۱۲۳ میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((من كان له سعة ولم يضح فلا يقربن مصلانا .))

''یعنی جسے وسعت ہو پھر بھی قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے۔''

لیکن اول تو اس حدیث کے مرفوع وموقوف ہونے میں اختلاف ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے نہ کہ مرفوع جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں لکھا ہے اور حجت مرفوع حدیث میں ہے نہ کہ موقوف میں، دوسرا یہ کہ اگر اسے مرفوع تسلیم ہی کر لیا جائے تو بھی یہ حدیث وجوب پر صراحتاً دلالت نہیں کرتی بلکہ اس سے صرف اس کی تاکید معلوم ہوتی ہے۔

جیسا کہ پیاز وغیرہ کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ پیاز (کچا) کھا کر مسجد میں نہ آئیں بلکہ صحیح حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو پیاز وغیرہ بدبودار شے کھا کر مسجد میں آتا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے بقیع (مقام) تک دور مسجد سے نکلوا دیتے تھے محض تنبیہ کی خاطر۔

حالانکہ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس سے پیاز کی حرمت ثابت نہیں ہوتی یعنی پیاز کھانا حرام نہیں کیونکہ دیگر دلائل سے اس کی علت معلوم ہوتی ہے اور حکم محض تنبیہ وتاکید کے لیے تھا اس طرح اس حدیث سے بھی (اگر اس کا مرفوع ہونا ثابت ہوتو) صرف قربانی کا موکد ہونا ثابت ہوتا ہے لاغیر۔

اسی طرح مشہور محدث حافظ ابن حزم ظاہری فرماتے ہیں کہ:

((لا یصح عن احدمن الصحابة انها واجبة وصح انها لیست واجبة عن الجمهور .)) ❶

یعنی کسی ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں اور یہ بات جمہور علماء سے منقول ہے۔''

باقی جس شخص نے نماز سے پہلے قربانی کر دی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دوبارہ قربانی کرنے کا حکم فرمایا، اس سے بھی قربانی کے وجوب پر استدلال نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ اس بات میں کوئی عجب ونکارت نہیں کہ دین میں کوئی ایسا کام ہو جو فی نفسہ نہ ہو لیکن اس کا بدل یا عوض اور ضروری ہو، کیونکہ جو قربانی کے وجوب کے قائل ہیں۔ (مثلاً علماء احناف) وہ اس بات پر متفق ہیں کہ مثلاً کسی شخص نے کسی ایسے دن نفلی روزہ رکھا جس دن کا روزہ اس پر نہ تھا مگر اگر اس نے عمداً (جان بوجھ کر) روزہ توڑ ڈالا تو یہی علماء کہتے ہیں کہ اب اس پر دوسرے دن کا روزہ اس پر واجب ہے حالانکہ پہلا روزہ جو اس نے رکھا تھا وہ اس پر نہ تھا بلکہ نفلی تھا اور کہتے ہیں کہ کسی نے نفلی حج کا احرام باندھا پھر اسے فاسد کر دیا تو اس پر اس حج کی قضاء ہے۔ حالانکہ وہ حج اس پر نہیں تھا بلکہ نفلی تھا۔ اس طرح قربانی بھی اگرچہ ابتدا نہیں مگر صحیح طور پر ادا نہ کرنے کے سبب (مثلاً نماز سے پہلے قربانی کر دے) شارع علیہ السلام نے اس پر اس کا اعادہ لازمی قرار دیا ہے مسلمان کا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے سامنے سر اطاعت وتسلیم خم کرے پھر جہاں حکم ہوگا وہاں چوں وچرا بھی نہ کی جائے گی۔

وہ حکم لازمی مانا جائے گا اور جہاں حکم نہیں ہوگا اور محض فعل مبارک ہوگا تو وہاں سنتا واستحباباً پیروی اتباع کی جائے گی لیکن تصور نہ کیا جائے گا۔ باقی رہی ام بلال الاسلمیہ والی حدیث جو ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے کہ:

((قالت قال رسول الله ﷺ ضحوا بالجذع من الظأن فانه جائز .))

''یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنبے میں سے جذعہ کی قربانی کرو بلاشبہ یہ

---

❶ المحلی، جلد ٦، صفحه ١٠، كتاب الاضاحی، مسئله: ٩٩٣.

جائز ہے۔"

یہ امر حقیقت میں فرضی نہیں بلکہ یہ آپ کی طرف سے رخصت ہے جس پر دلیل دوسری صحیح حدیث ہے جس کے الفاظ اس طرح ہیں:

((لا تذبحوا الا مسنة الا أن یعسر علیکم فتذبحوا جذعة من الضأن.)) ❶

"یعنی قربانی کے جانوروں میں سے مسنہ (دو دانتوں والے جانور) کے علاوہ دوسرے جانور کی قربانی مت کرو مگر جب مسنہ نہ ملے تو پھر ایک دنبہ ذبح کردو جو جذعہ ہو یعنی دوندہ نہ ہو بلکہ آٹھ نو ماہ کا ہو۔"

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ ام بلال رضی اللہ عنہا والی حدیث میں بھی امر محض رخصت کے لیے ہے نہ کہ وجوب کے لیے ورنہ اگر اس وجوب پر عمل کرو گے تو اس کا مفہوم یہ بنے گا کہ قربانی کے لیے صرف دنبوں کا جذعہ ہی ذبح کیا جائے۔ دوسرا نہیں حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے۔

ان کے علاوہ بھی کچھ احادیث مروی ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی سنداً صحیح نہیں مگر صرف ایک حدیث جو سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

((انه ﷺ قال من وجد سعة فلیضح))

"یعنی آپ ﷺ نے فرمایا جسے گنجائش ہو وہ قربانی کرے۔"

یہ حدیث اگرچہ مذکورہ بالا بیان کی گئی احادیث کے ہم پلہ نہیں، تاہم اس کے روات ثقہ ہیں مگر اس میں بھی امر استحبابی ہے کیونکہ اس طرح ہی دیگر دلائل کے ساتھ جن میں کچھ ذکر کیے گئے ہیں اس روایت کو جمع کیا جاسکتا ہے ورنہ دوسری صورت میں جمع نہیں ہوسکتا، اس کے بعد اگر ترجیح کی طرف رجوع کیا جائے گا تو لامحالہ یہی احادیث جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی واجب نہیں اس حدیث پر راجح ہوں گی کیونکہ یہ اصح ہیں اور اپنے مطلب پر واضح ہیں اور حدیث مرجوح ہوگی۔

❶ صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، باب سن الاضحیة، رقم الحدیث: ٥٠٨٢.

باقی رہی یہ بات کہ قربانی کا گوشت غیر مسلموں کو دیا جا سکتا ہے یا نہیں تو اس کے لیے گذارش ہے کہ اس گوشت سے بے شک، کافروں کو دیا جا سکتا ہے اس کی دلیل درج ذیل ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح: (کتاب الاضاحی باب ما یوکل من لحوم الاضاحی وما یتزود منها: رقم الحدیث: ٥٥٦٩) میں سیدنا سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

((قال النبی ﷺ من ضحی منکم فلا یصبحن بعد ثالثة وبقی فی بیته منه شئ فلما کان العام المقبل قالوا یا رسول الله ﷺ نفعل کما فعلنا العام الماضی قال کلوا واطعموا وادخرو فان ذالك العام کان بالناس جهد فاردت ان تعینوا فیها.))

''یعنی آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جو بھی قربانی کرے تو تین دنوں کے بعد اس قربانی کے گوشت میں سے کچھ اس کے گھر میں باقی نہیں رہنا چاہئے پھر جب دوسرا سال آیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرض کیا اس سال بھی ویسے ہی کریں (جس طرح گذشتہ سال کیا تھا) آپ ﷺ نے فرمایا کہ کھائیں اور کھلائیں (مطلق عام انسانوں کو) اور ذخیرہ کر کے رکھو (گذشتہ سال جو میں نے منع کیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ) اس سال لوگوں کو بہت تکلیف تھی یعنی قحط سالی تھی اور جو بھوک کی وجہ سے بڑی پریشانی درپیش تھی اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ تم ان کی مدد کرو اس لیے جس نے منع کیا تھا۔''

اسی طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

((انهم قالوا یا رسول الله ﷺ ان الناس یتخذون الاسقیة من ضحایاهم ویجمعون فیها الودك قال رسول الله ﷺ وماذالك قالوا نهیت ان تؤکل لحوم الضحایا بعد ثلاث قال علیه الصلاة والسلام نهیتکم من اجل الدافة التی دفت فکلوا

وادخروا وتصدقوا .))❶

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو قربانی کے گوشت سے دوسرے لوگوں کو کھلانے کا حکم فرمایا اس لیے جائز ہے کہ ہرکوئی کھانے والا اس سے کھا سکتا ہے کیونکہ اگر اس سے کسی کے لیے کھانا حرام ہوتا تو وہ آپ ذکر کرتے۔ اسی طرح ایک دوسری حدیث میں بھی "تصدقوا" کا لفظ وارد ہوا ہے یعنی اس سے صدقہ وخیرات کرو اور مطلق خیرات (یعنی فرضی صدقات کے علاوہ) کسی کو بھی دی جاسکتی ہے خواہ وہ مسلم ہو یا کافر چونکہ یہاں بھی آپ ﷺ نے اس گوشت سے مطلق خیرات کا امر فرمایا ہے، لہٰذا کسی کو بھی خیرات کے طور دیا جا سکتا ہے خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم کیونکہ یہ بیان کا موقعہ تھا اگر یہ طعام مسلمانوں کے ساتھ مخصوص تھا تو آپ خود اس کی وضاحت فرمادیتے۔

مطلق اور عام حکم نہ فرماتے:

((وماكان ربك نسيا .))

اور قربانی بھی نہیں جیسا کہ اوپر ثابت کر آئے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَكُلُوا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ﴾ (الحج: ٣٦)

اس آیت میں بھی قربانی اور ہدی کا گوشت میں سے خود کھانے اور حاجتمند کو کھلانے کا حکم ہے اور حاجتمند اور سوالی کو مخصوص نہیں کیا گیا کہ وہ صرف مسلم ہی ہو مذکورہ بالا احادیث سے حافظ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مسلم اور غیر مسلم کو قربانی کا گوشت دینے کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور مزید پہلی حدیث میں جو آپ نے فرمایا کہ:

((من ضحىٰ منكم .))

کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ حکم اس کے ساتھ لاگو نہیں ہے جو قربانی نہ کرے۔ مطلب یہ ہوا کہ قربانی واجب نہیں جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔ هٰذا ما عندي والله اعلم بالصواب!

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، رقم الحدیث: ٥٠٠٣.

منذور لغیر اللہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مشائخ اسلام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک شخص مشرک اور پوجاری بلکہ اپنے آپ کی پوجا کروانے والا ہے جس کے پاس نذر (لغیر اللہ) کا مال مویشی یعنی جس طرح دنبے، بکریاں، گائیں وغیرہ وغیرہ ہیں اور یہ مذکور شخص اس مال سے گذر سفر کرتا ہے اور وقتاً فوقتاً فروخت کر کے حوائج دنیوی پوری کرتا رہتا ہے اب یہی شخص بائع ہو کر وہ مال فروخت کرتا ہے اور دوسرا شخص ہمیشہ اس کے مال کا گاہک ہے اب وہ مشرک مذکورہ شخص سے مال منذور لغیر اللہ اپنی رقم سے خرید کر کے بازار میں بیچتا ہے اس طریقہ سے ہمیشہ تجارت کرتا رہتا ہے۔ اب بتایا جائے کہ وہ منذور لغیر اللہ مال دنبے، بکریاں وغیرہ میں مشتری کے لیے کیا حکم ہے؟ ایک مقامی عالم سے پوچھا گیا ہے تو اس نے جواب دیا کہ وہ مال مشرک نے خرید کیا ہے اور اس کے عوض رقم دی ہے اس لیے وہ اس کے لیے جائز ہے کیونکہ شریعت میں اصل بات اباحت ہے جب اس اباحت کے لیے کوئی مانع وحائل واقع نہیں ہو جاتا مذکورہ بالا صورت میں مشرک نے اپنی رقم دے کر مال خریدا ہے جس کا ناجائز منافع منتقل ہو کر بائع کو پہنچے اس لیے اس مال میں شرعی طور پر کوئی بھی قباحت نہیں اگر مجرم ہے تو وہی مشرک ہے جو ناجائز مال لیتا رہتا ہے۔

اس کے علاوہ شریعت میں جو چیزیں حرام ہیں ان میں سے کچھ ذاتی طور پر حرام ہیں جس طرح خنزیر اور میتہ وغیرہما اور کچھ اشیاء ایسی ہیں جن میں حرمت اعتباری ہے اس لیے حرمت ذاتی اور حرمت اعتباری کے فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ منذور لغیر مال حرمت اعتباری سے حرام کیا گیا ہے جس طرح چوری کیا ہوا مال بھی حرمت اعتباری رکھتا ہے مگر جب وہ مال عیوض دے کر حاصل کیا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں اس طرح اس صورت میں بھی مشتری نے عیوض دے کر مال خریدا ہے لہٰذا اس پر کچھ ملامت نہیں اب آپ سے گذارش ہے کہ آپ اس کی وضاحت کریں کہ مولوی مذکورہ کی مذکورا بالا فتویٰ درست ہے؟

الجواب بعون الوھاب: منذور لغیر اللہ مال کی خرید وفروخت اور اکل وشرب سب حرام اور ناجائز ہے کیونکہ اُحل بہ لغیر اللہ کی حرمت تمام صورتوں کو شامل ہے۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت میں بعض صورتوں میں جانوروں کو ذبح کیا جاتا تھا اور بعض صورتوں میں جانوروں کو بغیر ذبح کیے غیر اللہ کے نام پر نذر کر کے مجاوروں کے حوالہ کر دیا جاتا تھا۔

قرآن کریم نے ان تمام رسومات کو غیر شرعی قرار دیا ہے اسی طرح منذور لغیر اللہ مال کا منافع لینا بھی ناجائز ٹھہرے گا جس طرح سورۃ المائدۃ میں ایسے جانوروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ منذور لغیر اللہ مال کا مالک جو بائع ہے اس کے اس مال کو فروخت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نذر لغیر اللہ سے باز آ گیا ہے تبھی تو وہ اپنی ملکیت سمجھ کر وہ مال فروخت کر رہا ہے ورنہ جس مال کو غیر اللہ کے نام پر کیا جاتا ہے وہ اس کے پاس رہتا ہے مثلاً بت یا قبر و قبے وغیرہ کے گرد وہ مال گھومتا رہتا ہے اس مال کی خرید وفروخت نہیں ہوا کرتی۔

گذشتہ زمانوں میں بھی مشرکین جانوروں کو بتوں کے نام کر کے ان کو آزاد کر کے چھوڑ دیتے تھے یا پھر آستانوں پر جا کر ذبح کرتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ بائع شخص کا مال اگر منذور لغیر اللہ ہوتا تو وہ مال ضرور کسی جگہ قبر، قبے وغیرہ کے پاس پہنچایا جاتا اور اس کے بیچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا باقی مشرک سے منذور لغیر اللہ کیا ہوا مال خریدنا بالکل ناجائز ہے ہاں ان سے ذاتی طور پر جو ان کا ذاتی مال ہو اس کی خرید وفروخت جائز ہے۔ جیسا کہ احادیث مبارکہ میں مذکور ہے کہ رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین مال اور مختلف چیزیں مشرکین سے خرید کرتے تھے۔ ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب والعلم عند ربی۔

ادب کے مسائل

ٹوپی سر پر رکھنا

سوال: انسان کو عام زندگی میں سر ڈھانپ کر رکھنا چاہیے یا کھلا؟

الجواب بعون الوھاب: میری یہ تحقیق ہے کہ احرام کی حالت کے علاوہ آپ ﷺ اپنا سر مبارک ڈھانپا کرتے تھے لہٰذا اگرچہ سر کھلا رکھنا جائز تو ہے اور کھلے سر نماز بھی جائز ہے لیکن تاہم سر ڈھانپنا افضل اور مستحب ہے باقی سر کس سے ڈھانپا جائے؟ تو اس کے لیے احادیث میں کالی پگڑی کا ذکر آتا ہے۔ اور اکثر اوقات آپ ﷺ کے سر مبارک پر عمامہ ہوا کرتا تھا اور منبر وغیرہ پر عمامہ کے ساتھ ہونے کا تذکرہ احادیث میں موجود ہے۔ صحیح بخاری میں وضو کے وقت پگڑی پر مسح کا ذکر آتا ہے۔ فتح مکہ کے وقت آپ کے سر مبارک پر کالی پگڑی تھی لیکن احادیث میں ٹوپیوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ رنگ کا تعین کرنا بہت مشکل ہے لیکن ایک حدیث جو کہ ابو الشیخ لائے ہیں اس میں ہے کہ: ''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ دوران سفر کانوں والی ٹوپی پہنتے تھے جب کہ دوران حضر شامی ٹوپی پہنتے تھے۔''

اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات میں ٹوپیاں پہننے کے آثار ملتے ہیں جن کی تفصیل کی یہاں پر گنجائش نہیں ہے۔

حاصل کلام:...... پگڑی خواہ ٹوپی آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی سنت ہے دونوں میں سے کسی پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے یا کبھی اس پر اور کبھی اُس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب وصلی اللہ سبحانہ وتعالیٰ علی سیدنا محمد والہ وصحبہ وبارك وسلم!

داڑھی کا حکم

سوال: داڑھی کی مقدار کتنی ہونی چاہیے؟

الجواب بعون الوھاب: داڑھی کے متعلق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حکم ہے کہ اس کو چھوڑ دو

اس لیے داڑھی رکھنا فرض ہے۔

(الف) داڑھی کہتے کس کو ہیں؟

داڑھی سے مراد وہ بال ہیں جو رخساروں اور ٹھوڑی پر ہوتے ہیں، دائیں آنکھ کی دائیں طرف سے اور بائیں آنکھ کی بائیں طرف سے لے کر ٹھوڑی کے آخری تک اسی طرف دونوں طرف کی سائیڈوں سے آخر تک جتنے بھی بال ہیں وہ داڑھی کا حصہ ہیں یعنی داڑھی میں شمار ہوتے ہیں۔

لغت عربی میں یہی داڑھی کی حد مقرر ہے اس لیے جو لوگ داڑھی کو سیدھا کھڑا کرنے کے لیے خط وغیرہ لیتے ہیں یا رخساروں سے بال صاف کرتے ہیں وہ ناجائز کام کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اوپر سے اس طرح کا خط ہرگز نہیں لینا چاہیے۔

باقی لمبائی میں داڑھی کتنی ضروری ہے؟

اس کے لیے اصولی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾ (الاحزاب: ٢١)

''یعنی ہر بات، کام، اور معاملے میں رسول اللہ ﷺ کا نمونہ ایک بہترین نمونہ ہے اس لیے تم بھی (اے مومنو) ہر بات اور کام میں ان کا نمونہ اختیار کریں۔''

اب جب ہم احادیث میں ان کا نمونہ دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی داڑھی مبارک سینے پر پڑتی تھی لہٰذا یہی داڑھی کی شرعی حد ہے یعنی داڑھی اتنی رکھنی ہے کہ سینے تک پہنچے، اس سے زیادہ کو بیشک کاٹا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی جو شرعی حد تھی وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ ﷺ کی مبارک داڑھی کی صورت میں ہمیں دکھا دی ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ کے اتباع میں ان کے حکم کی تکمیل ہیں داڑھی کو اتنا رکھنا ہے کہ سینے تک پہنچے۔ واللہ اعلم بالصواب!

مولانا کا استعمال

سوال: ایک مولوی صاحب نے سورۃ بقرۃ کی آخری آیت پڑھی:

﴿أَنتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ (البقرة: ٢٨٦)

اور استدلال کیا کہ مولانا کہلوانا جائز نہیں ہے کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب بعون الوهاب: سورۃ مسؤلہ میں مولانا کہلوانا ناجائز نہیں بلکہ جائز ہے۔ باقی آیت کے مذکورہ سے مستعمل کا استدلال لینا درست نہیں کیونکہ مولانا کا لفظ مشترکہ لفظ ہے جس کے بہت سے معنی ہیں لہٰذا یہ لفظ بہت سے معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

((وفی النهاية المولى يقع على جماعة كثيرة كالرب والمالك، والسيد والمنعم والمعتق والناصر، والمحب والتابع والجار وابن العم والحليف والمقيد والمهر والعبد والمنعم عليه.))

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لفظ ایک ہی ہے جو سید اور عبد پر استعمال کیا جاتا ہے۔

اس لفظ کو غیر اللہ کے لیے استعمال کیا گیا ہے:

((عن زيد بن ارقم عن النبى ﷺ قال مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ.)) [1]

دیکھیں ایک ہی لفظ دونوں اشخاص پر ایک ہی وقت میں اور ایک ہی معنی میں استعمال کیا گیا ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ نے اس لفظ کو اللہ کے علاوہ غیر اللہ پر استعمال فرمایا ہے اس لیے معلوم ہوا کہ مولانا کا لفظ اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے بھی استعمال کرنا جائز ہے، اگر ناجائز ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کیسے غیر اللہ کے لیے استعمال فرماتے، اسی طرح ایک اور حدیث میں بھی جو صحیح بخاری کی حدیث ہے مزید دلیل کے طور پر پیش کی جاتی ہے:

[1] سنن ترمذی، كتاب المناقب، رقم الحديث:٣٧١٣.

((عن ابی هريرة رضي الله عنه عن النبی ﷺ قال لا يقل احدكم اطعم ربك وضی ربك وليقل سيدی مولای .)) ❶

هٰذا ما عندی والله اعلم بالصواب

رسم ختنہ کی دعوت

سوال: آج کل رواج ہے کسی سرمایہ دار شخص کے بیٹے یا پوتے کی رسم طہر (ختنہ) ہوتا ہے جس میں شادی کی طرح دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں غیر شرعی کام بھی شامل ہوتے ہیں، ایسی مجلسوں میں جانا اور ان کی دعوت قبول کرنا کیسا ہے؟

الجواب بعون الوهاب: صورت مسؤلہ میں واضح ہو کہ جس شادی میں ڈھول بجایا جائے ،مغنیات گانا گانے والیاں گانے گاتی رہیں اور مختلف قسم کی رسومات اور بدعات اور فحش قسم کا عمل ہو ایسی شادی یا محفل میں شرکت کرنا اور ان کی دعوت کو قبول کرنا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ﴾ (المائدة : ٢)

”نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ و زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔“

اسی طرح حدیث شریف میں ہے:

((عن عمران بن حصين قال نهى رسول الله ﷺ عن اجابة طعام الفاسقين .))❷

صحیح مسلم میں ایک روایت ہے:

---

❶ صحيح البخاری، كتاب العتق، رقم الحديث: ٢٥٥٢ .

❷ اخرجه للطبرانی فی الاوسط، جلد١، صفحه ١٣٨، رقم الحديث: ٤٤١ . ط: بيروت .

((عن علی رضی اللہ عنہ قال حدثنی رسول الله ﷺ بـاربع کلمات لـعـن الـلـه من لعن والديه ولعن الله من ذبح لغير الله ولعن الله من أوىٰ محدثا ولعن الله من غير منار الارض .)) ❶

اسی طرح ایک اور روایت ہے:

((عـن ابـراهيـم بن ميسرة مرسلاً قال قال رسول الله ﷺ من وقر صاحب بدعة فقد أعان على هدم الاسلام .))❷

کوڑے یا لاٹھی

سوال: حد لگاتے ہوئے لاٹھی استعمال کی جائے یا موجودہ دور کے کوڑے؟ بینوا وتوجروا!

الجواب بعون الوهاب: سزا کے لیے اس وقت یہ (عموماً) درختوں کی ٹہنیوں کے کوڑے ہوا کرتے تھے یہ موجود فٹکے نہیں ہوتے تھے یہ تو موجودہ ظالموں کی ایجاد ہے جو کہ سراسر ظلم پر مبنی ہے اس طرح کے فٹکوں کا کوئی ثبوت شریعت میں نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب .

مارشل لاء کیا ہے؟

سوال: قرآن وحدیث کی روشنی میں مارشل لاء کی وضاحت کی جائے کہ کیا وہ صحیح ہے؟

الجواب بعون الوهاب: اسلام وقرآن وحدیث میں مارشل لا کے ہم معنی کا کوئی بھی لفظ وارد نہیں ہوا ہے نہ ہی یہ ظالمانہ قوانین اسلام میں ہیں، یہ ظالم اور جابر حکمرانوں کی ایجاد ہیں اور یہ انگریزوں کی ہی اندھی تقلید ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

❶ صحيح مسلم، كتاب الأضاحى، باب تحريم الذبح لغير الله تعالىٰ ولعن فاعله، رقم الحديث:٥١٢٤ .

❷ البيهقى فى شعب الايمان، جلد٧، صفحه نمبر٦١، رقم الحديث: ٩٤٦٤ ط: بيروت.

مجلس شوریٰ

سوال: مجلس شوریٰ کے متعلق بحث کریں؟ بینوا وتوجروا!

الجواب بعون الوهاب: قرآن کریم میں ہے:

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾ (الشوریٰ: ۳۸)

''وہ اپنے کام باہم مشورے (سے چلاتے) ہیں۔''

لٰہذا خلیفہ کو دینی ودنیاوی امور میں مشورہ تو بہرحال لینا ہے۔ لیکن اس مشورے کے متعلق وہ پابند نہیں ہے کہ بعینہٖ اس مشورے کی پابندی کرے بلکہ خلیفہ اپنے صوابدید کے مطابق عمل کرسکتا ہے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ دین دار ہو اور شریعت کا پابند ہو خواہش نفسانی کا پیروکار نہ ہو اور مجلس شوریٰ کو اپنے دلائل کے ساتھ اپنی بات پر قائل کرسکے، محض قابض اور زبردستی حکومت پر قبضہ کرکے شریعت سے انحرافی کرنے والا نہ ہو۔ قرآن میں ہے:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ (آلعمران: ۱۵۹)

''یعنی ان سے مشورہ ضرور لے تاکہ ہر بات ہر پہلو سے واضح ہوجائے پھر تیرا خیال اور عزم میں جس بات پر محکم ہوجائے تو اس پر اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے عمل کردے۔'' واللہ اعلم بالصواب

گنجا ہونا

سوال: سنن ابن ماجہ میں باب الخوارج کے تحت ایک حدیث ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان (خوارج) کی نشانی پورے بال منڈواتے ہیں کیا اس سے بالوں (سر وغیرہ) کے منڈوانے کی منع معلوم نہیں ہوتی؟

الجواب بعون الوهاب: اس حدیث سے سر کے بال پورے منڈوانے کی منع معلوم

نہیں ہوتی اس لیے کہ یہ محض ان کی ایک نشانی معلوم ہوتی ہے اور احادیث میں یہ نشانیاں دوسروں (حق پرستوں میں) بھی ملتی ہیں اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ بیان کی ہوئی نشانی ممنوع ہو اور ابوداؤد میں صحیح سند کے ساتھ حدیث ہے:

((عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ان النبی ﷺ رأى صبيا قد حلق بعض رأسه وترك بعضهٗ فنهاهم عن ذالك فقال احلقوه كله او اتركوه كله.)) ❶

''یعنی آپ ﷺ نے ایک بچے کو دیکھا جس کے سر کے کچھ بال مونڈے ہوئے تھے۔آپ ﷺ نے فرمایا: یا تو پورے سر کو مونڈوا دو یا سارے پر بال رکھ لو۔''

کچھ کو مونڈوانا اور کچھ چھوڑ دینا ایسا نہ کرو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سر مونڈوانا ناجائز نہیں ہے۔

اسی طرح حج پر پورا سر منڈوانا بڑے ثواب کا کام ہے اگر یہ کام ناجائز ہوتا تو حج پر اس کا یہ امر نہ ہوتا کیونکہ حج پر ایسی کسی چیز کی اجازت نہیں ہے جس کی پہلے منع ہو، البتہ سر منڈوانے کے بجائے بال رکھنا۔بہتر ہیں اس لیے کہ آپ ﷺ نے حج کے سوا سر کے بال مکمل طور پر منڈوائے نہ تھے۔لہٰذا یہ سنت ہوئی۔ ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

نفلی روزے

سوال: ماہِ شعبان کے درمیان میں جو روزے رکھے جاتے ہیں اور جن پر کچھ اہلحدیث بھائی بھی عامل ہیں یہ احادیث میں سے ثابت ہیں یا نہیں؟ ان کا حکم کیا ہے؟ یہ سنت ہیں یا بدعت؟

الجواب بعون الوهاب: صحیح احادیث سے جو معلوم ہوتا ہے۔(جتنا مجھے علم ہے) وہ یہ

❶ سنن ابوداؤد، کتاب الترجل، باب فی الذبی له روایة.

ہے کہ اس ماہ شعبان میں رسول اکرم ﷺ دوسرے مہینوں کی نسبت زیادہ روزے رکھتے تھے۔ باقی خاص بیچ کے بارے مجھے ابھی تک کوئی صحیح حدیث معلوم ہو نہ سکی ہے اس لیے اس مہینے میں جو روزہ رکھے گا۔ (شروع بیچ، یا آخر کو خاص نہ کر کے) تو وہ سنت کا متبع ہے اور اس کو اس کا اجر وثواب بھی ملے گا۔ ماہ شعبان میں زیادہ روزے رکھنے کے بارے میں صحاح ستہ میں احادیث موجود ہیں۔ هٰذا ما عندي والله اعلم بالصواب

معانقہ کب؟

سوال: کیا سفر سے لوٹنے کے علاوہ دوسرے مواقع پر معانقہ (گلے ملنا) کیا جا سکتا ہے؟

الجواب بعون الوهاب: معانقہ کرنا گلے ملنا یہ انسان کا انسان سے محبت کرنے کا ایک طریقہ اور اس کا اظہار ہے کہ جو محبت وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے دل میں رکھتا ہے اور اپنے دوست سے ملاقات کے وقت اظہار مسرت کا ایک طریقہ ہے، یہ بالکل جائز ہے بلکہ مستحب اور ثواب کا باعث ہے۔ (ان شاء اللہ) اگر انسان کی اس سے نیت اپنے بھائی کی عزت وتکریم اور محبت ہو۔

نبی ﷺ نے اس شخص کو فرمایا تھا کہ جس نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ فلاں سے محبت کرتا ہے، تو آپ نے فرمایا تھا ((هَلْ أَخْبَرْتَهُ بِذَالِكَ ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ قَدِ أَخْبَرْتَهُ بِهِ فَاذْهَبْ وَأَخْبِرْهُ)) کیا تو نے اسے بتایا کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اگر تو نے ابھی تک اسے نہیں بتایا تو جاؤ اور اسے بتا دو۔

اور معانقہ اطلاع محبت کا بہترین ذریعہ ہے، صحیح حدیث میں ہے:

((ذَرُونِي مَا تَرَكْتُكُمْ ، مَا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوْهُ وَمَا أَمَرْتُكُمْ بِهِ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ ، أَوْ كَمَا قَالَ ﷺ)) [1]

---

[1] صحيح مسلم، سنن النسائي، كتاب الحج.

"مجھے چھوڑ دو جب تک میں تمہیں چھوڑے رکھوں، جس سے روکوں اس سے رک جاؤ اور جس چیز کا حکم دوں اپنی طاقت کے مطابق اسے بجالاؤ۔"

اور معانقہ کرنا اباحت اصلیہ کے تحت جائز ہے، کیونکہ نہ تو شریعت نے اس سے روکا ہے اور نہ کوئی سختی کی ہے تو یہ مباح ہے۔

امام دارقطنی نے اپنی سنن اور ابونعیم نے الحلیہ اور امام بیہقی نے سنن الکبریٰ اور طبرانی نے معجم الکبیر میں ابوثعلبہ الخشنی رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ تقریباً ایک جیسے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ان اللہ تعالیٰ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحد حدودا فلا تعتدوھا و حرم اشیاء فلا تنتھکوھا وسکت عن اشیاء رحمۃ لکم غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا))

(ھذا حدیث حسن کمال قال النووی)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے فرائض رکھے ہیں انہیں ضائع مت کرو اور جو اس نے حدیں مقرر فرمائی ہیں ان کی خلاف ورزی نہ کرو اور حرام اشیاء کی خلاف ورزی نہ کرو اور جن اشیاء کا حکم بیان نہیں کیا گیا سکوت اختیار کیا گیا ہے تو یہ اس کی تم پر رحمت ہے نہ کہ وہ بھول گیا ہے، ان کے بارہ میں بحث میں نہ پڑو۔"

تو یہ سکوت عنہ عمل ہے ہمیں اس میں بحث سے گریز کرنا چاہیے اور یہ مباح بلکہ مندوب ہے، اخلاص نیت سے۔

اور جو سفر سے واپس آئے تو اس کے ساتھ معانقہ کرنے کے ثبوت میں بہت سارے آثار وارد ہوتے ہیں لیکن مقیم کے بارہ میں اسی طرح کے آثار نہیں ملتے۔ مسافر سفر سے آتا ہے تو اس کے ساتھ معانقہ کی کوئی خاص علت نہیں بلکہ صرف اظہار محبت ہوتا ہے تو یہی علت اصلیہ مقیم میں بھی موجود ہے اور گزشتہ دو روایتیں بھی اس کی تائید کرتی ہیں کہ مقیم سے معانقہ کیا جا سکتا ہے۔ معجم الاوسط للطبرانی اور تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی میں ایک حدیث ہے کہ

((ان النبی ﷺ ارسل الی ابی ذر وکان خارجامن البیت فلما جاء اخبر برسالة النبی ﷺ، قال ابو ذر فلما جئت التزمنی النبی ﷺ)) (الحدیث)

''نبی ﷺ نے ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس پیغام بھیجا آپ گھر سے باہر تھے جب واپس آئے تو گھر والوں نے نبی ﷺ کے پیغام کے بارہ میں بتایا تو ابوذر فرماتے ہیں: میں آپ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے مجھے اپنے سے چمٹا لیا۔''

اگرچہ ایک راوی کے مبہم ہونے کی وجہ سے اس میں کچھ ضعف ہے، لیکن یہ ضعف یسیر ہے جو شواہد سے دور ہو جاتا ہے اور دوسرے آثار جو میں بیان کر چکا ہوں وہ اس کی تائید کرتے ہیں۔

نیز ترمذی اور ابن ماجہ کی وہ روایت انس کہ جس میں ہے کہ ایک آدمی نے آپ سے سوال کیا کہ یارسول اللہ! جب ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملے تو کیا اس کے لیے جھک سکتا ہے؟ فرمایا: نہیں: پھر پوچھا: کیا اس سے چمٹ کر اس کا بوسہ لے سکتا ہے؟ فرمایا: نہیں، پھر پوچھا کیا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کرے؟ فرمایا: ہاں۔''

تو یہ روایت حنظلہ بن عبیداللہ السدوسی کے ضعف کی وجہ سے ضعیف ہے اور ائمہ جرح وتعدیل سے اس کی تضعیف ثابت ہے اور ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ یہ روایت آثار صحیحہ جو بیان کیے جا چکے ہیں ان کے بھی مخالف ہے، چلو اگر بالفرض اسے صحیح مان بھی لیا جائے تو ہم اس کو مقیم کے ساتھ معانقہ کرنے پر محمول کریں گے کیونکہ مسافر کے ساتھ معانقہ کرنا یہ تو صحیح سندوں سے ثابت ہے۔

اگرچہ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے، لیکن امام ترمذی کا تساہل مشہور ہے اور اس جیسی روایات سے احتجاج پکڑنا غلط ہے۔ اس حدیث کے ضعیف ہونے سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ کسی کے لیے بھی جھکنا جائز ہے بلکہ دوسرے دلائل سے غیر اللہ کے لیے جھکنا حرام قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اس میں رکوع کی مشابہت آ جاتی ہے اور رکوع اور سجود غیر اللہ کے لیے

جائز نہیں ہے۔

نــوٹ:......ابوالقاسم عفی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک حدیث بیان کی جو مسند احمد میں اور بیہقی نے کتاب الادب میں ذکر کی ہے صحیح سند کے ساتھ کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((ان رجلا من اهل البادية كان اسمه زاهر بن حراء قال: وكان النبى ﷺ يحبه وكان ذميما فاتاه النبى ﷺ يوما وهو يبيع متاعه فاحتضنه من خلفه وهو لا ينظر......)) الخ

''کہ ایک آدمی دیہاتیوں میں سے جس کا نام زاہر بن حراء تھا وہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور میں غریب آدمی تھا، ایک مرتبہ آپ تشریف لائے زاہر بازار میں اپنا سامان بیچ رہا تھا تو آپ ﷺ نے اسے پیچھے سے پکڑ کر گلے سے لگا لیا، زاہر نہ دیکھ سکے تو وہ کہنے لگے: کون ہے؟ پھر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ نبی ﷺ تھے تو زاہر اپنی پیٹھ کو آپ کے سینہ مبارک سے اچھی طرح ملا دیا تو آپ ﷺ آواز لگانے لگے اس غلام کو کون خریدے گا؟ تو زاہر کہنے لگے اے اللہ کے رسول! میں تو ایسا شخص ہوں کہ جس کی کوئی قیمت ہی نہیں لگائے گا تو آپ نے فرمایا: تو اللہ کے ہاں بہت قیمتی ہے۔''

اس حدیث میں نبی ﷺ نے اپنے صحابی کو اپنے سینے سے چمٹایا اور وہ صحابہ سفر سے نہیں آئے تھے بلکہ مقیم تھے اور یہی محل استشہاد ہے اور صحیح بخاری میں بھی ہے کہ نبی ﷺ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو سینے سے لگایا اور ان کے لیے دعا فرمائی۔ ((اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ)) ''اے اللہ اسے قرآن کا علم عطا فرما۔''
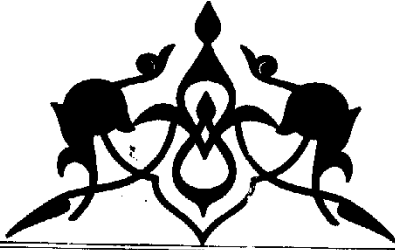
تحقیق وتنقید
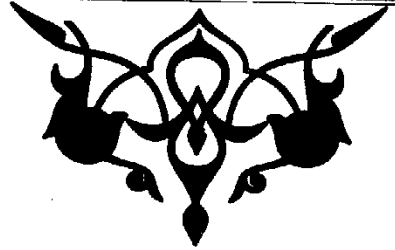
شاہ صاحب رحمہ اللہ نے عزیزم محمد علی صاحب کو یہ جواب تحریر کیا اور اس کا نام رکھا "السعی الوافر لاثبات سماع حسین بن علی الجعفی عن عبد الرحمن بن یزید بن جابر؟"

جعفی کا جابر سے سماع

سوال: کیا حسین بن علی الجعفی کا عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر سے سماع ثابت ہے؟

الجواب بعون الوهاب: جلیل القدر محترم المقام برادرم وعزیزم میاں محمد علی صاحب حفظہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید ہے کہ آپ بمع متعلقین بخیریت تام ہوں گے۔

امابعد! آپ کا مکتوب ملا بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے یاد کیا جس کے لیے آپ کا شکریہ!

آپ نے جو حدیث شریف لکھی ہے اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ میں بھی ان محدثین و محققین کے زمرہ میں شامل ہوں جو اس حدیث مبارکہ کی تصحیح کرتے ہیں۔ باقی اس کے متعلق جو علت بیان کی جاتی ہے وہ مرفوع ہے۔ (الحمدللہ) تفصیل درج ذیل ملاحظہ کریں گے۔

علت کے متعلق آپ نے پہلا حوالہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''تاریخ الکبیر'' کا دیا ہے اس کے لیے یہ گذارش ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عبارت اس طرح شروع کی ہے۔

"ویقال هو الذی" یعنی عبارت کی شروع میں صیغہ مجہول کو لایا گیا ہے جو تمریض پر دلالت کرتا ہے (یعنی اس طرح کہا گیا ہے) یعنی اس کا قائل (کہنے والا) نامعلوم ہے، لہٰذا اس سے حجت لینا درست نہیں ہوگا یہ رائے امام اعلیٰ مقام کی اپنی ہوتی تو بیشک اس کو اہمیت و وزن حاصل ہوتا لیکن یہ قول کسی دوسرے کا ہے جس کا قائل نامعلوم ہے باقی رہی ''تاریخ الصغیر'' کی عبارت تو اس میں صرف اہل الکوفۃ کے الفاظ ہیں۔

حسین بن علی جعفی'' کا نام صراحتاً مذکور نہیں ہے اور'' اہل کوفۃ'' کا لفظ ابو اسامہ (حماد بن اسامہ) پر صادق آتا ہے اور ابو اسامہ واقعی عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر سے سماع نہیں کیا ہے بلکہ عبدالرحمٰن بن یزید بن تمیم سے اور ابو اسامہ کے عدم سماع سے یہ لازم نہیں آتا کہ حسین بن علی جعفی نے بھی ابن جابر سے نہ سنا ہو۔ امام ابن القیم'' جلاء الافہام'' میں یہ لکھا ہے کہ اکثر ائمہ حدیث اس طرف گئے ہیں کہ

ابو اسامۃ عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر سے سماع نہیں کیا ہے بلکہ ابن تمیم سے کیا ہے۔

البتہ حسین بن علی جعفی نے دونوں سے سماع کیا ہے۔

◆1:...... امام ابن ابی حاتم فرماتے ہیں کہ:

((سالت محمد بن عبدالرحمن بن اخی حسین الجعفی عن عبدالرحمن بن یزید بن جابر فقال قدم الکوفة عبدالرحمن بن یزید بن تمیم وعبدالرحمن بن یزید بن جابر بعد ذالك بدهر والذی یحدث عنه ابواسامة لیس هو ابن جابر هو ابن تمیم.))

اس عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ ابو اسامہ نے ابن جابر سے سماع نہیں کیا ہے بلکہ ابن تمیم سے باقی حسین جعفی کی ابن جابر سے سماع کی نفی اس میں نہیں ہے اور ابن جابر بھی (اس عبارت سے معلوم ہوا کہ) دو مرتبہ کوفہ آئے تھے لہٰذا حسین جعفی کا سماع ممکن بلکہ قرین قیاس ہے۔

◆2:...... امام ابوبکر بن ابی داؤد فرماتے ہیں کہ:

((سمع ابو اسامة من ابن المبارك عن ابن جابر وجمیعاً یحدثان عن مکحول وابن جابر ایضاً دمشقی فلما قدم هذا قال ان عبدالرحمن بن یزید الدمشقی حدث عن مکحول فظن ابو اسامة انه ابن جابر الذی روی عنه ابن المبارك،

وابن جابر ثقه مأمون يجمع حديثه وابن تميم ضعيف .))

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن بن یزید کو ابن جابر سمجھنے میں غلطی ابواسامہ نے کی ہے نہ کہ حسین جعفی نے کی ہے۔

۳:...... امام ابوداؤد السنن میں فرماتے ہیں کہ (ابن تمیم) متروک الحدیث ہے:

((حدث عنه ابو اسامة وغلط فى اسمه قال حدثنا عبدالرحمن بن يزيد بن جابر الشامى وكل ما جاء عن ابى اسامة عن عبدالرحمن بن يزيد فانما هو ابن تميم .))

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت بھی صاف بتا رہی ہے کہ ابن جابر کے متعلق غلطی ابو اسامہ سے ہوئی ہے اور وہ جب بھی عبدالرحمٰن بن یزید سے روایت کرتا ہے تو وہ ابن تمیم ہی ہوتا ہے لیکن امام ابوداؤد نے بھی غلطی کرنے والوں میں حسین جعفی کا نام شامل نہیں کیا ہے۔

بہرحال ابن جابر سے سماع کا انکار اکثر ائمہ حدیث نے ابواسامہ کے لیے کیا ہے۔ حسین جعفی کے لیے رجال کی کتب تہذیب التہذیب للحافظ ابن حجرؒ وتہذیب الکمال للحافظ ابی الحجاج المزی میں عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر کے تلامذہ میں حسین بن علی جعفی کا نام جزم کے ساتھ استعمال کیا ہے اور حسین کے اساتذہ میں ابن جابر کا نام بھی ''تہذیب الکمال'' للمزی میں موجود ہے۔ حافظ مزی عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر کے متعلق فرماتے ہیں:

((روى عنه حسين بن على الجعفى وابوا سامة حماد بن اسامة ان كان محفوظاً .))

اس عبارت سے محفوظ ہوا کہ حافظ مزی حسین کی روایت ابن جابر کے متعلق جزم کے ساتھ کہی ہے لیکن حماد بن اسامہ (ابواسامہ) کے متعلق شک ظاہر کیا ہے، اس لیے فرمایا کہ:

((ان كان محفوظاً .))

اسی طرح ابن القیم ''جلاء الافہام'' میں امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ

انہوں نے ابوحاتم کی کتاب "الضعفاء" پر کلام کرتے ہوئے فرمایا:

((قوله حسين الجعفي روى عن عبدالرحمن بن يزيد ابن جابر وابو اسامة يروى عن عبدالرحمن بن يزيد بن تميم فغلط في اسم جده .))

اس سے معلوم ہوا کہ ابن جابر سے حسین روایت کرتا ہے، لیکن ابواسامہ ابن تمیم سے روایت کرتا ہے لیکن غلطی سے اس کے دادے کا نام "تمیم" کے بجائے جابر لیا گیا ہے۔

یہاں پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ابن ابی حاتم کتاب العلل میں فرماتے ہیں کہ:

((سمعت ابي يقول عبدالرحمن بن يزيد بن جابر لا اعلم احدا من اهل العراق يحدث عنه والذى عندى ان للذى يروى عنه ابو اسامة وحسين الجعفي واحد وهو عبدالرحمن بن يزيد بن تميم لأن ابا اسامة روى عن عبدالرحمن بن يزيد عن القاسم عن ابى امامة خمسة احاديث اوستة احاديث منكرة لا يحتمل ان يحدث عبدالرحمن بن يزيد بن جابر مثله ولا اعلم احدا من اهل الشام روى عن ابن جابر من هذه الاحاديث شيئا وأما حسين الجعفي فانه يروى عن عبدالرحمن بن يزيد بن جابر عن ابى الاشعث عن اوس بن اوس عن النبى ﷺ في يوم الجمعة انه قال افضل الايام يوم الجمعة فيه الصعقة وفيه النفحه وفيه كذا" وهو حديث منكر لا اعلم احدا رواه غير الحسين الجعفي واما عبدالرحمن بن يزيد بن تميم فهو ضعيف الحديث وعبدالرحمن بن يزيد بن جابر ثقة ثم كلامه........... .))[1]

---

[1] علل الحديث جلد١، صفحه ١٩٧

اس کا جواب یہ ہے کہ امام ابو حاتم نے حسین جعفی کی ابن جابر سے سماع کے انکار پر کوئی ٹھوس ثبوت نہیں پیش کیا ہے جو پانچ چھ حدیثیں ذکر کی گئی ہیں وہ ابو اسامہ کے واسطے سے نہیں آخر اس میں حسین جعفی کا کیا قصور؟ کرے کوئی بھرے کوئی یہ کہاں کا انصاف ہے؟ کیا حسین جعفی کا اہل عراق میں سے ہونا ہی اس پر دلیل ہے کہ وہ ابن جابر سے روایت نہیں کرتا؟ خود سوچیں کہ یہ تو کوئی دلیل نہیں ہے ابو اسامہ سے واقعتاً کچھ غلطیاں ہوئی ہیں لیکن حسین جعفی کی اس قسم کی غلطی کسی نے بھی بیان نہیں کی ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ التقریب میں ابو اسامہ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

((وكان باخره يحدث من كتب غيره.))

یعنی آخر عمر میں وہ دوسروں کی کتابوں سے حدیثیں بیان کرتا تھا اور یہی سبب ہے کہ اس سے چند غلطیاں صادر ہوئی اس کے برعکس حسین جعفی پر ایسا کوئی الزام نہیں ہے بلکہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ تہذیب التہذیب میں محمد بن عبدالرحمٰن الہروی سے نقل کیا ہے کہ:

((ما رأيت اتقن منه.)) [1]

یعنی حسین جعفی سے بڑھ کر زیادہ متقن (مضبوط حافظہ والا) میں نے نہیں دیکھا۔

لہٰذا ایسے متقن اور ثقہ راوی کے بارے میں بغیر دلیل کہ سوء ظن رکھنا کہ وہ ابن جابر اور ابن تمیم کے درمیان فرق نہ کر سکا بڑی بے انصافی ہے۔ باقی ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا کہ "یہ حدیث (اوس بن اوس رضی اللہ عنہ کی) منکر ہے میں نہیں مانتا کہ حسین الجعفی کے بغیر کسی نے اس روایت کو بیان کیا ہو۔"

یہ بھی عجیب ہے کہ یہ حدیث منکر ہے، کیونکہ دوسرے کسی نے یہ روایت نہیں کی ہے کسی دوسرے کا یہ روایت نہ کرنا کوئی نکارت کی علت نہیں بن سکتی، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صحیح میں پہلی روایت (انما الاعمال بالنيات.) بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بغیر کسی دوسرے سے وارد نہیں ہے اور ان سے بھی صحیح سند کے ساتھ روایت کرنے والا ایک ہی راوی ہے۔ جب کہ

[1] التهذيب: صفحه ٣٠٨، جلد ٢ طبع نشر السنة لاهور.

اس سے بھی روایت کرنے والا ایک ہے اس کے بعد نیچے جا کر کئی شاگرد بنتے ہیں۔

کیا یہ روایت اس لیے منکر کہی جائے گی کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والا ور پھر ان سے بیان کرنے والا ایک ہی راوی ہے؟ ہرگز نہیں! جب کہ حسین جعفی ثقہ اور متقن حافظہ کا مضبوط ہے اس کے اوپر جرح بھی ثابت نہیں ہے تو ایسے ثقہ کی روایت کو منکر قرار دینا سراسر ناانصافی ہے۔

علاوہ ازیں منکر قرار دینے کا سبب یہ بھی ہوتا کہ حسین جعفی اس حدیث میں کسی اوثق (اپنے سے زیادہ ثقہ) کی مخالف کی ہو، لیکن ایسا بھی نہیں ہے اور نہ ہی متن میں ایسی کوئی بات ہے جو دوسری احادیث کے مخالف ہو بلکہ متن کے تو کتنے ہی دوسرے صحیح شاہد موجود ہیں۔ جمعہ کے بارے میں جو کچھ بیان ہے اس کی مؤید سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جو کہ مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن خزیمہ وغیرہم میں مذکور ہے جو معنی کے اعتبار سے اس حدیث کے متفق ہے۔

اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسام کو مٹی وغیرہ نہیں کھاتی اس کے بھی شواہد موجود ہیں اور اس کا شاہد وہ صحیح حدیث بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں قبر میں نماز تب ہی پڑھی ہوگی، جب ان کا جسم اطہر صحیح سلامت ہوگا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کتنا بڑا وقفہ ہے وہ ہر کوئی جانتا ہے لیکن اتنے طویل بلکہ اطول عرصہ کے بعد بھی ان کا جسم مبارک صحیح سالم تھا بہرحال یہ حدیث صحیح بھی اس حدیث مبارک کے اس ٹکڑے:

((ان اللہ حرم علی الارض .)) (الحدیث)

کی مؤید ہے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس امت کے درود وسلام کا پہنچنا بھی کتنی ہی احادیث صحیحہ مبارکہ میں موجود ہے جن میں یہ بیان ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فرشتے امت کی طرف سے بھیجے گئے صلوٰۃ وسلام کو پہنچاتے ہیں۔ اب بتایا جائے کہ آخر اس حدیث میں کون سا ٹکڑا منکر ہے جو دوسری احادیث صحیحہ کی مخالف میں ہے جس کی وجہ سے اس کو منکر کہا

جاتا ہے۔ جب سند کے تمام راوی ثقہ ہیں اور متن کسی دوسرے صحیح متن کے مخالف ومنافی نہیں تب بھی اس کو منکر سمجھنا ماسوائے سینہ زوری اور دھاندلی کے اور کچھ نہیں ہے۔

امام ابو حاتم کا مقام ومرتبہ بلا شبہ بلند ہے ہم اس کے علم کے مقابلے میں جہلا کے قریب ہیں، تاہم جو بھی انسان اگرچہ وہ امامت کے مرتبہ پر فائز ہو لیکن اس سے غلطی اور سہو وخطا بہرحال ممکن ہے بلکہ وقوع پذیر ہے، لہٰذا بلا دلیل اور ٹھوس ثبوت کے یہ کہنا کہ یہ روایت منکر ہے ہرگز قابل قبول نہیں ہے بلکہ مردود ہے۔

خلاصہ کلام کہ اس سند کے راوی حسین جعفی کا اس روایت میں غلطی سے ابن تمیم کو ابن جابر کہنے والی بات میں صرف امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ ہی منفرد ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی رائے نہیں دی ہے بلکہ "یقال" کہہ کر کسی غیر معلوم محدث کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا یہ اشارہ امام ابو حاتم کی طرف ہی ہو لیکن چونکہ امام ابو حاتم الرازی کی یہ علت صحیح نہیں ہے اس لیے ان کا نام لینے کے بجائے مجہول فعل استعمال کر کے اس علت کی تمریض کی طرف اشارہ کیا ہے۔ واللہ اعلم

باقی دوسرے اکثر ائمہ حدیث جن میں امام دارقطنی جیسے معتدل امام کا بھی نام شامل ہے وہ عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر سے حسین بن علی الجعفی کے سماع کے قائل ہیں۔

علاوہ ازیں حسین جعفی کے سماع کے لیے یہ بھی زبردست دلیل وثبوت ہے کہ صحیح ابن حبان میں یہ حدیث مبارکہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس سند کے ساتھ لائے ہیں۔

((حدثنا ابن خزيمة حدثنا ابو كريب حدثنا حسين بن علی حدثنا عبدالرحمن بن يزيد بن جابر ......الخ .))

کہ اس سند میں حسین جعفی ابن جابر سے سماع کی (حدثنا) کہہ کر تصریح کر رہے ہیں۔"

لہٰذا عدم سماع کا قول مردود ہے ورنہ اگر اُن کا سماع ابن جابر سے نہ ہوتا تو حدثنا کہنے سے یہ سیدھا سادا جھوٹ ہوا۔ حالانکہ حسین جعفی نہ جھوٹا نہ مجروح بلکہ ثقہ، متقن اور پختہ عابد راوی ہے۔ لہٰذا جب ایسا پختہ راوی اپنی تصریح کرتا ہے تو باقی سارے ظنون اور بے دلیل

قیاسات،شکوک وشبہات ختم ہو جانے چاہئیں۔

جن لوگوں نے اس روایت میں یہ علت پیش کی ہے کہ امام علی بن المدینی حسین بن علی الجعفی سے روایت کرتا ہے وہ کہتا ہے:

((حدثنا عبدالرحمن بن يزيد بن جابر سمعته يذكر عن ابى الاشعث الصنعانى عن اوس بن اوس الحديث .))

''اور ان کا کہنا ہے کہ ابن جابر ابو الاشعث الصنعانی سے سماع کی تصریح نہیں کی ہے لیکن یہ علت بھی قادحہ نہیں ہے۔''

کیونکہ کتب رجال (التہذیب) وغیرہ میں ابن جابر کے اساتذہ میں ابو الاشعث الصنعانی کا نام بھی ہے۔اور علی بن المدینی والی روایت سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوا کہ ابن جابر ابو الاشعث سے عنعنہ کیا ہے اور ابن جابر مدلس بھی نہیں ہے۔لہٰذا اس کی عنعنہ بھی سماع پر محمول ہے۔(كما لا يخفى على ممارس كتب اصول الحديث)

مزید علی بن المدینی کی روایت میں بھی حسین بن علی جعفی اس جابر سے تحدیث کی تصریح کی ہے یعنی امام ابن المدینی بھی امام ابن خزیمہ سے حسین جعفی کی ابن جابر سے سماع کی تصریح میں متفق ہے۔فنعم الوفاق وحبذا الاتفاق اس سے بھی ثابت ہوا کہ حسین جعفی کا سماع ابن جابر سے ثابت ہے۔فالحمد لله على ذالك .

باقی انبیاء کرام علیہم السلام کی قبروں میں نماز پڑھنا یا زندہ ہونا۔یہ سارا برزخی معاملہ ہے اس کو دنیا کے معاملے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔شہداء بھی تو قرآنی نص کے مطابق زندہ ہیں لیکن دنیاوی زندگی ان کی بھی فی الحال ختم ہو چکی ہے۔اسی طرح انبیاء کرام کی بھی برزخی زندگی کو تصور کرنا چاہئے۔

بہرحال وہ عالم برزخ کے معاملات ہیں ان پر جتنا کتاب وسنت سے ثابت ہے ویسا ایمان رکھنا ہے کمی کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔قرآنی ارشاد عالیہ ہے۔

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ

اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ (الاسراء: ٣٦)

"اور جس چیز کا تجھے علم نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑ بلاشبہ کان، آنکھ اور دل ان سب کے بارے میں پوچھا جائے گا۔"

بہرحال آپ کے سوال کا جواب راقم الحروف نے اپنے قصورِ علم کے اعتراف کے باوجود جتنا رب کریم نے سمجھایا عرض رکھ دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر آپ ہی سوچیں کہ میں اس میں کتنا کامیاب ہوا ہوں۔

میرے لیے کوئی دوسری خدمت ہو تو حاضر ہوں۔

تاریخ اسلام

سوال: اس وقت کتب تاریخ میں سے اُردو زبان میں صحیح اور تحقیقی انداز میں مستند اور سلیس تاریخ اسلام کی کون سی کتاب ہے جو کم علم اور عام آدمی کے بھی کام آسکے؟ بینوا بالدلیل وتوجروا عند الجلیل العاجرا!

الجواب بعون الوهاب: کتب تاریخ میں اُردو زبان میں اب تک تو کوئی بھی کتاب باسند دیکھنے میں نہیں آئی، مگر ویسے مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کی کتاب بنام تاریخ اسلام جو تین جلدوں میں ہے کسی حد تک دیکھنے کے قابل ہے، فی الحال اسی کا مطالعہ کیا جائے، اگر مزید تحقیق کی طلب ہو تو عربی کتب کی مراجعت کے سوا کوئی اور صورت نہیں۔

تقلید کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چار اماموں کی تقلید کرنا فرض یا واجب ہے یا نہیں؟ بینوا بالدلیل!

الجواب بعون الوهاب: تقلید کی اہل اصول نے جو معنیٰ کی ہے وہ یہ ہے کہ کسی کی بات کو بغیر دلیل کے لے لینا اور اس کی اتباع کرنا یہ تقلید کہلاتی ہے۔ یہ واجب وفرض تو کیا

جائز بھی نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ سورۃ الاعراف میں فرماتے ہیں:

﴿اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ﴾

(الاعراف : ۳)

''اس کی تابعداری کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے طرف نازل ہوا ہے اس کے علاوہ جو دوسروں سے آیا ہے۔اس کی تابعداری مت کرو۔''

اور ظاہر ہے کہ رب العزت کی طرف سے نازل ہونے والی چیز کتاب اللہ یعنی اللہ کی کتاب یا نبی ﷺ کی حدیث ہے جس کو وحی خفی کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ سورہ قیامہ میں فرماتے ہیں:

﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ (القيامة : ١٩)

''اور قرآن کا بیان کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔''

اور سورۃ النحل میں فرماتے ہیں:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ٤٤)

''اور ہم نے یہ قرآن یا دین تمہاری طرف اس لیے نازل کیا تا کہ آپ لوگوں کے لیے بیان کریں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم یا دین قویم کی تبیین یا تشریح اور تفسیر ووضاحت نبی ﷺ کے حوالے کی گئی ہے اب ان دونوں آیات کو ملانے سے یہ صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جو کچھ قرآن کے متعلق بیان یا شرح فرمائی ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے اس لیے ﴿اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ میں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ حدیث بھی شامل ہے۔بہرحال اس ابتدائی آیت کریمہ میں ہمیں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ اور رسول کے ارشادات عالیہ کے علاوہ کسی اور کی اتباع نہیں کرنی ''اُولوا الامر'' یعنی حاکم یا اہل علم کی اتباع کا حکم صرف اس وقت تک ہے جب تک ان کا کام یا طریقہ کتاب وسنت کے برخلاف نہ ہو، اگر ان کا کوئی امر یا قول وفعل کتاب وسنت

کے برخلاف ہے تو ان کی اتباع ہرگز ہرگز جائز نہیں ہوگی جس طرح مشہور حدیث ہے:

((لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق.)) [1]

''یعنی جس بات میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو اور مخلوق کی فرمانبردار ہو تو اس کی اتباع جائز نہیں ہے۔''

اور ظاہر ہے کہ اللہ کے رسول کی نافرمانی یہ اللہ کی نافرمانی ہوگی جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ (احزاب: ٣٦)

''جس آدمی نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں ہے۔''

بہرحال کسی امتی کی اگرچہ وہ علم وفضل کی چوٹی پر فائز ہو تابعداری اس وقت تک ہے جب تک اس کا قول یا فعل اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات سے ٹکرانے والا نہ ہو اگر اس کا کوئی بھی عمل یا ارشاد کتاب وسنت کی تعلیمات کے برخلاف ہوگا تو کسی بھی صورت میں اس کی تابعداری جائز نہیں ہوگی جتنے بھی بلند پایہ کے ائمہ گذرے ہیں ان سب کے اقوال ان کے متبعین کی ہی کتابوں میں ملتے ہیں جن میں انہوں نے وضاحت کے ساتھ تاکید فرمائی ہے کہ اگر ان کی کوئی بات کتاب وسنت کے متضاد ہو تو اس کو ترک کردو اور یہ بھی بات ہے کہ ہر آدمی کی کوئی بات لی جائے گی تو کسی بات کو چھوڑا جائے گا ماسوائے آپ ﷺ کی ہستی کے جن کی ہر بات کی لازماً اتباع کرنی ہوگی کیونکہ دوسرے مجتہدین سے صحیح باتیں بھی صادر ہوئی ہیں تو کن کن باتوں میں ان سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں خصوصاً جب چند علمائے کرام کے درمیان کسی مسئلہ پر اختلاف ہو تو اس صورت میں کسی کی بھی اتباع نہیں کی جائے گی بلکہ ان تمام کے اقوال کو کتاب وسنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا، پھر جو بات کتاب وسنت کے موافق ہوگی اس کو قبول کیا جائے گا اور جس بات میں کتاب وسنت کی موافقت نہیں ہوگی اس کو ترک کیا جائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے اندر ارشاد فرماتے ہیں کہ:

---

[1] مسند احمد جلد نمبر ٥، صفحه ٦٦، رقم الحديث: ٢٠٦٨٠.

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ﴾ (النساء: ٥٩)

''اور اگر تم کسی بات پر اختلاف کرو تو اس پورے معاملے کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹاؤ۔''

تقلید کے مفاسد:

(۱)...... مقلد اپنی خداداد صلاحیتوں اور علمی استعداد کو بالکل کھو بیٹھتا ہے جس کی وجہ سے کہ اس کے ذہن پر یہ خیال بیٹھ جاتا ہے کہ اس پر صرف یہ فرض ہے کہ وہ کسی نہ کسی ذریعہ سے وہ علم حاصل کر لے کہ اس کے امام نے اس مسئلہ کے متعلق اس کو یوں حکم دیا ہے اس علم حاصل کرنے کے بعد اس پر دوسرا کوئی فریضہ نہیں ہے اور اس کا فرض صرف یہ ہے کہ وہ اپنے امام کے قول پر عمل کرے اور بس! اس لیے ایسا آدمی علم رکھنے کے باوجود کتاب وسنت کے نصوص اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات عالیہ میں غور وفکر کرنا اور تدبر وتفکر سے کام لینا ترک کر دیتا ہے اور اپنے امام کے اقوال میں غور وفکر کر کے مسائل کا استخراج واستنباط ضروری سمجھے گا، اس لیے وہ اپنی علمی لیاقت کو بالکل بیکار بنا دیتا ہے اللہ تعالیٰ نے جو لیاقتیں اور صلاحیتیں انسان کو عطا فرمائی ہیں۔ جب انسان ان سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے تو وہ رفتہ رفتہ بیکار ہو جاتی ہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دل، آنکھیں اور کان اس لیے دیئے ہیں کہ وہ ان سے کام لے کر حق کو سمجھ سکے اور پوری طرح عمل پیرا ہو سکے لیکن اگر وہ اپنے دل سے حق کے بارے میں نہیں سوچتا یا آنکھوں سے حق بات نہیں دیکھتا اور کانوں سے بھی حق بات سننے کے لیے تیار نہیں رہتا تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس کے یہ سوچنے سمجھنے والے اعضاء بالکل بیکار اور ناکارہ بن جائیں گے پھر ایسے آدمی کے لیے حق کی راہیں بند ہو جاتی ہیں۔

(۲)...... اس قسم کی بے دلیل تقلید کا مطلب یہ ہوگا کہ مقلد اپنے مقلد کو گویا نبوت کا منصب دے رہا ہے جب کہ نبی تو اللہ تعالیٰ کی طرف مبعوث ہوتا ہے اس کی ہر ایک بات بجائے خود ایک دلیل ہوتی ہے اس لیے نبی کے فرمان ملنے کے بعد کسی امتی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس پیغمبر سے حکم کی دلیل مانگے بلکہ اس کا تو حکم ہی خود دلیل ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا

پیغام لے کر آیا ہے لہٰذا اگر کسی امتی کے بارے میں بھی یہی عقیدہ رکھا جائے یا ذہن میں یہ خیال ڈالا جائے کہ اس کی ہر بات بغیر دلیل کے ہمارے اوپر واجب اور لازم ہے اور ہمیں اس کی لازماً اتباع کرنی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ گویا ہم نے ایک امتی کو نبوت کے منصب پر فائز کر دیا۔

(۳)......مقلد حضرات کا طرز عمل ایسے تناقض کا موجب ہے جس کا حل آج تک ان کی طرف سے پیش نہیں ہوسکا ہے، یعنی ایک طرف وہ اپنے آپ کو مقلدین کہلواتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے امام کے بنا دلیل متبع ہیں کیونکہ اہل اصول کے یہاں تقلید کی معنی ہی یہی ہیں کہ "اخذ قول الغیر بغیر حجة" یعنی کسی دوسرے کی بات کو بغیر دلیل کے لینا اور اس کو حجت بنا کر اتباع کرنا اور دوسری طرف یہی حضرات اپنے اختلافی مسائل میں کتاب وسنت سے بھی دلائل لیتے رہتے ہیں ظاہر ہے کہ جب ان حضرات کے پاس اپنے مسائل کے متعلق دلائل بھی ہیں جو وہ وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہتے ہیں تو پھر وہ غیر مقلد ہوئے کیوں کہ دلیل اور تحقیق یہ تقلید کے بالکل منافی ہے اگر کوئی مقلد ہے تو اس کو دلیل پیش کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اگر وہ دلیل پیش کرتا ہے تو وہ محقق اور غیر مقلد ہوا گویا ان حضرات نے دو متضاد چیزوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن عقل والے اس بات پر متفق ہیں کہ دو نقیض ایک ہی وقت اور ایک ہی جگہ جمع نہیں ہوسکتے مگر یہ حضرات اپنے طرز عمل سے یہ تاثر دے رہے ہیں کہ وہ ایک ہی وقت میں مقلد بھی ہیں تو غیر مقلد بھی یعنی جب وہ دلیل پیش کرتے ہیں تو اس وقت غیر مقلد بن جاتے ہیں۔ اور پھر کہتے ہیں کہ ہم مقلد ہیں یہ تو دو نقیضوں کا جمع کرنا ہوا جو کہ محال ہے۔

(۴)......ایک عالم جو قرآن کی تفسیر اور حدیث وفقہ کے درس وعربیت کے دوسرے علم کو پڑھانے اور حدیث وغیرہ کے کتابوں کی شروحات وحواشی لکھنے کے باوجود جب اپنے آپ کو مقلد کہلاتا ہے تو یہ دوسرے الفاظ میں گویا اللہ رب العزت کی نعمت کا انکار کرنا ہوا مقلد کی معنی کسی دلیل کے بغیر کسی کے پیچھے پڑنا اور ایسا کرنے والا جاہل ہوتا ہے پھر اتنے سارے

علم رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو مقلد یعنی جاہل کہلوانا اللہ تعالیٰ کی نعمت کے انکار کے مترادف ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ (الضحیٰ: ۱۱)

"یعنی اللہ کی نعمت کو واضح کر کے بیان کر۔"

مگر یہ حضرات اتنی بڑی نعمت کے اظہار کے بجائے اپنے آپ کو جاہل کہنے پر پتہ نہیں کیوں مصر ہیں۔ ان کا یہ حال ہے کہ جب ان کو دلیل پر نظر پڑنے کے بعد یقینی علم حاصل ہو جاتا ہے کہ اس مسئلہ میں ان کا مؤقف کمزور ہے جس کا وہ کلی طور پر اعتراف بھی کرتے ہیں کہ اس مسئلہ میں ہمارے مخالف کا مؤقف صحیح اور راجح ہے لیکن اس کے باوجود یہ کہنے سے نہیں ڈرتے کہ مؤقف اگرچہ مخالف کا درست ہے لیکن ہم چونکہ مقلد ہیں اس لیے ہمیں اس بات پر عمل کرنا ہے۔ درج ذیل ہم اس کے دو مثال پیش کرتے ہیں:

((فالحاصل ان المسئلة الخيار من مهمات المسائل وخالف ابو حنيفة فيه الجمهور وكثير من الناس من المتقدمين والمتاخرين وصنفوا رسائل فى ترديد مذهبه فى هذه المسئلة رجح مولانا شاه ولى الله المحدث دهلوى قدس سره فى رسائل مذهب الشافعى من حجة الاحاديث والنصوص وكذالك قال شيخنا مدظله بترجح مذهبه قال الحق والانصاف وان الترجيح للشافعى فى هذه المسئلة ونحن مقلدون يجبر علينا تقليد امامنا ابى حنيفة رحمه الله والله اعلم التقرير الترمذى: صفحه ٦٥٠ للشيخ الهند محمود الحسن رحمه الله نص تميل الى قول المخالف فى مسئلة السب لكن اتباعنا للمذهب واجب.))[1]

---

[1] البحر الرائق: ص١٢٥، ج ٥ فصل فى الجزية.

اگر جاہل ان پڑھ سوال کرے کہ وہ کیا کرے تو کچھ عالم کہتے ہیں کہ قرآن میں یہ نہیں ہے کہ:

﴿فَسْئَلُوٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ٤٣)

''کہ اگر تمہیں علم نہیں ہے تو تم علم والوں سے پوچھو۔''

تو اس سے تقلید ثابت ہوتی ہے تو اس کا کیا جواب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم کسی کی تقلید کرو بلکہ فرمایا کہ علم والوں پوچھو، سوال کرو اور اس پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پوچھنے والا کسی عالم سے اس طرح دریافت کرے کہ اس مسئلہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا کیا فرمان ہے۔ اس عمل کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ کا کیا نمونہ ہے اس طرح تو نہیں پوچھنا کہ اس مسئلہ کے بارے میں فلاں عالم کا کیا مسلک ہے کیونکہ دینی مسائل میں اتباع صرف اللہ کے دین کی کرنی ہے جس کا مبلغ ومبین رسول اللہ ﷺ کی ہستی ہیں۔ ان باتوں میں اُن کے علاوہ کسی اور کے اتباع نہیں کی جائے گی ہاں صرف اس صورت میں ہوسکتی ہے جب اس کے فتوے یا بتائے ہوئے مسئلہ پر کتاب وسنت سے صریح دلیل لائی گئی ہو یا کتاب وسنت کے نصوص میں سے مستنبط اور مستخرج ہو۔ باقی اگر کوئی دلیل نہ صریح ہے اور نہ ہی مستنبط تو ایسی صورت میں اس کی اتباع جائز نہیں ہوگی چنانچہ امام ابوحنیفہ خود فرماتے ہیں کہ اس آدمی پر ہمارے قول کے مطابق فتویٰ دینا حرام ہے جس کو ہمارے قول کی دلیل کا علم نہ ہو، ظاہر ہے کہ کسی عالم یا امام کی بتائی ہوئی فتویٰ یا مسئلہ کی ہمیں دلیل معلوم ہو جائے تو اس صورت میں اتباع اس دلیل کی ہوئی نہ کہ امام کی ذاتی رائے کی لہٰذا یہ تقلید نہ رہی۔ (واللہ اعلم بالصواب)

وجہ تاخیر

سوال: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا بدلہ قاتلوں سے اپنی خلافت کے زمانے میں نہ لینے کا سبب کیا تھا؟

الجواب بعون الوهاب وبحسن توفيق العزيز العليم: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر سارے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین متفق نہ تھے اگرچہ صحابہ میں سے کچھ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی لیکن دوسری جانب بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی ایک بڑی جماعت تھی جنہوں نے ابھی تک بیعت نہیں کی تھی اور ان کا اس بات پر زور تھا کہ پہلے قاتلوں سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا قصاص لیا جائے بعد میں کلی بیعت ہونی چاہیے اس جماعت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین تھے، اُدھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت میں باغیوں میں سے بھی کافی تعداد موجود تھی ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے ناممکن نہیں تھی تو بھی انتہائی درجے کی مشکل ضرور تھی کہ وہ ان باغیوں سے قصاص لے۔ حالانکہ وہ ان کی اپنی جماعت میں تھے، یہ بات ہوتے ہوئے بھی اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے قصاص لیتے اور دوسری ساری باتوں کو نظر انداز کرتے تو نتیجہ یہ نکلتا کہ خود اپنی خلافت خطرے میں پڑ جاتی، کیونکہ اس طرف صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی کافی جماعت آپ کے مقابل تھی یعنی دوسرے لفظوں میں ان کی حمایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل نہ تھی۔

باقی اگر اپنی جماعت والوں سے بھی اس طرح کا معاملہ کرتے تو ان کا حمایتی کون رہتا۔ حالانکہ اس وقت واقعی دوسرا کوئی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ خلافت کا حقدار نہ تھا اور جب خلافت کا وزن اوپر آ گیا تو اس کو چھوڑنا بھی اچھا نہ تھا اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خواہش یہ تھی کہ امت ایک کلمہ پر متفق ہو جائے اور خلافت متفقہ طور پر قائم ہو جائے تو پھر ان باغیوں اور قاتلوں سے قصاص لینا آسان ہوگا اور آسانی سے لیا جائے گا اور اس حقیقت کا اظہار خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا لیکن اُدھر اسّی (۸۰) دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین جن میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی تھے ان کا اس بات پر زور تھا کہ اس طرح بلکہ پہلے قاتلوں سے قصاص لیا جائے بعد میں دوسری بات اور وہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین مجتہد تھے، پھر ان کا اجتہاد غلط یا صحیح بہرحال اس صورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو موقعہ ہی نہ ملا جو ان قاتلوں سے قصاص لے سکے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ساری زندگی خلافت کے زمانے سے لے کر آخر تک جنگوں اور مقابلوں میں

گذری کچھ اپنوں سے (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے جنگ جمل میں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے جنگ صفین میں) اور بعد میں خوارج سے مقابلے ہوتے رہے حتی کہ آپ کی شہادت بھی ایک خارجی کے ہاتھوں ہوئی۔

خلاصہ کلام:......حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کی بیعت متفقہ طور پر نہ ہونے کے سبب قصاص لینے سے قاصر رہے اور دوسری طرف کے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اس بات پر زور دے رہے تھے کہ اول قصاص بعد میں دوسری بات لہٰذا اس افراتفری اور انتشار کے سبب قاتلوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت یہ قصاص نہ لیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور غیر ارادی عمل

سوال: مندرجہ ذیل حدیث سے یہ ثابت ہورہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کچھ غیر شرعی افعال صادر ہوئے تھے۔ کیا یہ درست ہے؟

((وقال الامام احمد حدثنا يعقوب ثنا ابى عن ابن اسحاق حدثنى يحيىٰ بن عباد بن عبدالله بن الزبير عن ابيه عباد سمعت عائشة رضي الله عنها تقول مات رسول الله ﷺ بين صدرى ونحرى وفى دولتى ولم اظلم فيه احداً فمن سفهى وحداثة سنى ان رسول الله ﷺ قبض وهو فى حجرى ثم وضعت رأسه على وسادة وقمت الدم مع النسآء واضرب وجهى.))

(البدايه والنهايه: ج ٥،ص ٢٤٠)

''یعنی سیدہ محترمہ فرماتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں میرے سینے اور ٹھوڑی کے درمیان فوت ہوئے اور میں نے کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ میں نے اپنی کم عقلی اور کم عمری کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک کو تکیے پر رکھا پھر دیگر عورتوں کے ہمراہ خون کے چھینٹے اپنے منہ پر مارنے لگی؟''

الجواب بعون الوهاب: سیدتنا وامنا ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق جو روایت آپ نے بتائی تھی تمام کتب میں دیکھی گئی سنداً درست ہے لیکن ان روایات میں بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا خود صراحت فرماتی ہیں کہ "بسفاهتی وحداثة سنی" کچھ روایات میں لسفاهة رأی کے الفاظ ہیں جن کا صاف مطلب ہے کہ میری کم عمری اور کم عقلی کی بناء پر یہ غلطی مجھ سے صادر ہوئی۔ محترمہ ام المؤمنین کا مرتبہ ومقام یقیناً بہت بلند وبالا ہے لیکن آپ غلطی یا لغزش سے معصوم تو نہ تھیں اور یہ غلطی محض ہنگامی اور چند لمحات کے لیے نبی اکرم ﷺ کی وفات حسرت آیات کے فرط غم وحزن میں وقتی طور پر عقلی تقاضا پر غالب آ گئی انسان کتنا ہی بڑا مقام ومرتبہ پالے لیکن ایسے واقعات گاہے بہ گاہے آتے رہتے ہیں کہ انسان ان سے مغلوب ہوکر کچھ نازیبا فعل کر گذرتا ہے، لیکن بعد میں ان پر نادم ہوتا ہے۔

خود سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ تلوار میان سے نکال کر کھڑے ہو گئے کہ جو شخص بھی یہ کہے گا کہ نبی اکرم ﷺ رحلت فرما گئے ہیں تو اس کا سرتن سے جدا کر دوں گا یہاں تک کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آئے اور آپ نے حقیقت حال بہترین الفاظ میں واشگاف کیا تب جا کر عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اصل حقیقت سے آگاہی ہوئی اور خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

حالانکہ اس سے پہلے جو کچھ فرما رہے تھے وہ عقل کے تقاضا کے خلاف تھا۔ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر بچپنے کی ہے اور رسول اکرم ﷺ کا ان سے پیار ومحبت وشفقت کسی سے مخفی نہیں لہٰذا ایسے محبوب اور محترم سید المرسلین ﷺ جیسے عظیم شوہر کی وفات ان کے لیے غیر معمولی واقعہ تھا۔ لہٰذا اس ہنگامے کی بنا پر بے حد غم وحزن کے بسبب یہ غلطی صادر ہوگئی جس پر آپ خود نادم وپشیمان تھیں جس طرح خود اسی روایت سے ثابت ہوتا ہے، لہٰذا اسے کسی ناجائز کام اور بے جا فعل کے لیے دلیل بنانا جہالت سے کم نہیں۔

سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک اور غلطی بھی صادر ہوئی تھی وہ یہ کہ آپ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے وقت گھر سے نکل کر کوفہ وغیرہ چلی گئیں تھیں گو نیت اصلاح ہی کی تھی لیکن اس طرح مناسب نہ تھا اسی وجہ سے رسول اکرم ﷺ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے کسی نے

بھی آپ سے اتفاق نہ کیا بلکہ اس فعل کو نامناسب قرار دیا۔

سیر اعلام النبلاء میں حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ روایت لائے ہیں کہ خود بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا کو بعد میں اس معاملہ پر اس قدر ندامت وپشیمانی ہوئی کہ اسے یاد کر کے ہمیشہ روتی رہتیں تھیں۔

بہرحال انسان کتنے ہی بڑے مقام پر فائز ہو لیکن ایسی لغزش سے معصوم نہیں رہ سکتا کہ ایسی غلطیاں بھی انسان سے صدور میں نہ آئیں پھر تو انسان انسان ہی نہ رہا بلکہ فرشتہ بن گیا۔

بہرحال یہ ایک لغزش تھی جو فرط غم میں بے اختیار صدور میں آئی جس پر بعد میں ندامت بھی ہوئی اور یقیناً اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے معافی بھی طلب کی ہوگی اور وہ غلطی معاف بھی ہوگئی۔ میرے خیال میں تو یہ سیدنا ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کی یہ ایک خوبی ہے کہ آپ نے اس غلطی کو چھپانا مناسب نہ سمجھا بلکہ واضح طور پر اعتراف کیا کہ سفاہت کے سبب یہ غلطی مجھ سے صادر ہوئی۔ واللہ اعلم!

صحابی اور شراب نوشی؟

سوال: مندرجہ ذیل حدیث سے لوگوں نے استدلال کیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ شراب نوشی کرتے تھے کیا اس روایت کے تحت ان کا یہ مؤقف درست ہے؟

((حدثنا عبدالله حدثني ابى ثنا زيد بن الحباب حدثني حسين (اى ابن واقد) ثنا عبدالله بن بريده قال دخلت انا وابى على معاوية فجلسنا على الفرش ثم أُتينا بالطعام فاكلنا ثم أُتينا بالشراب فشرب معاويه ثم ناول ابى ثم قال ماشربته منذ حرمه رسول الله ﷺ ثم قال معاويه كنت اجمل شاب قريش واجوده ثغرا وما شئى كنت اجدله لذة كما كنت اجده وانا شاب غير اللبن.)) (المسند الامام احمد: ج ٥، ص٣٤٧)

الجواب بعون الوهاب: دراصل اس روایت کے معنی کو غلط سمجھنے کی وجہ یہ سمجھ میں آتی

ہے کہ "ثم ناول ابی" کے بعد "ثم قال" کا قائل سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کو قرار دیا گیا ہے حالانکہ عربی ترکیب کے مطابق یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ "ثم قال" ثم ناول پر معطوفہ ہے۔ اور "ناول" کا فاعل یقیناً سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں لہٰذا "ثم قال" کا فاعل بھی وہی ہوں گے نہ کہ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ اور اس روایت کے مطابق کو غلط سمجھنے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ شراب سے مراد خمر لیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں شراب عربی زبان کا لفظ ہے جو کہ مشروب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی کوئی بھی مشروب (پینے کی چیز) جب کہ اپنی سندھی زبان یا اُردو میں شراب سے حرام خمر مراد لیا جاتا ہے وگرنہ عربی زبان میں اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ﴾ (البقرة: ٢٥٩)

"پھر دیکھ اپنے طعام اور پینے کے پانی کی طرف (کہ یہ سو سال گذر جانے کے بعد بھی متغیر نہیں ہوئے)۔"

دوسری جگہ پر ارشاد فرمایا:

﴿یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (النحل: ٦٩)

"شہد کی مکھی کے پیٹ سے پینے کی چیز (شہد) نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہیں اور اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔"

ایک اور جگہ پر فرمایا:

﴿اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ﴾ (ص: ٤٢)

"یعنی اپنے پاؤں کو زمین پر ماریں تو غسل کے لیے ٹھنڈا پانی اور پینے کا پانی ظاہر ہو جائے گا۔"

صحیح حدیث میں ہے کہ روزے دار کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

((یترك طعامه وشرابه وشهوته من اجلي .)) [1]

---

[1] صحيح بخاري: كتاب الصوم، باب فضل الصوم، رقم الحديث، ١٨٩٤ .

''یعنی روزے دار میرے لیے کھانے پینے کو میرے لیے چھوڑتا ہے۔''

مثال تو بے شمار ہیں لیکن یہاں پر چند امثلہ سے آپ کو بخوبی معلوم ہو گیا کہ شراب کا مطلب مطلق پینے کی چیز ہے نہ کہ خاص خمر حرام ہی اس کا مطلب ومعنی ہے۔ یہ حدیث امام احمد کی مسند کے علاوہ دوسری کسی کتاب میں نہیں ملتی اور المسند کی کوئی مبسوط شرح نہیں الفتح الربانی میں یہ روایت لائے ہیں لیکن اس کے متعلق بہت قلیل لکھا ہے جو بھی ناکافی اور غیر صحیح ہے لہٰذا یہاں پر جو کچھ لکھ جا رہا ہوں وہ اس احقر العباد ہی کی تحقیق ہے۔

لہٰذا اگر صواب ہے تو یہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی مہربانی ہے جس نے مجھ گنہگار کو اس کی تلقین فرمائی اور اگر غلط ہے تو یہ میرے علم کے قصور اور میرے نفس کی غلطی ہے۔

بہرحال مذکور بالا بحث کو ذہن میں رکھنے کے بعد اس روایت کا مطلب یہ ہو گا کہ عبداللہ بن بریدہ کہتے ہیں کہ میں اور میرے والد سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاں داخل ہوئے جس نے ہمیں بچھونے پر بٹھایا اور پھر ہمارے لیے طعام لایا گیا جو کہ ہم نے تناول کیا اس کے بعد مشروبات لذیذہ (شربت وغیرہ) بھی لایا گیا سب سے پہلے معاویہ رضی اللہ عنہ نے نوش جان کیا۔ یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ نے وہ مشروب واپس نہیں کیا تھا اور نہ ہی ایسا کوئی لفظ ادا فرمایا جس سے ایسا معلوم ہوتا ہو کہ انہوں نے اس مشروب کے پینے سے انکار کیا کیونکہ ایسا یا اس مطلب پر دلالت کرنے والا کوئی لفظ اس روایت میں بالکل بھی موجود نہیں۔

اب یہ ہو سکتا ہے کہ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کو دل میں کھٹکا اور شبہ پیدا ہوا ہو کہ یہ مشروب مسکرات میں سے تو نہیں اور اس خیال وارادے سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف استفسارانہ نظروں سے دیکھا ہو اور ان (بریدہ رضی اللہ عنہ) کی ہیئت سے معاویہ رضی اللہ عنہ نے اندازہ لگایا ہو کہ شاید اسے کوئی شک پیدا ہوا ہے اس لیے ان کے پوچھنے سے پہلے ہی حفظ ماتقدم کی خاطر خود ہی وضاحت فرمائی کہ وہ مسکر (شراب) جب سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے میں نے نہیں پیا ''ثم'' تراخی اور مہلت کے لیے آتا ہے اس سے یہی مطلب نکل رہا ہے جو ہم اوپر کی

سطور میں رقم کر آئے ہیں۔

اور انسان کبھی کبھی دوسرے انسان کی عندیہ کو کچھ آثار وقرائن یا موجودہ ہیئت سے معلوم کر لیتا ہے، اس لیے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کے شک وشبہ کو اچھے طریقے سے دفع کرنے کی سعی کرتا ہے۔

فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے ہاں آئے تو ابراہیم علیہ السلام نے ان کو مہمان جانا اور بچھڑا بھون کر لے آئے جب انہوں نے طعام سے کچھ بھی تناول نہ کیا تو ابراہیم علیہ السلام کو خوف پیدا ہوا:

﴿فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ﴾ (هود: ٧٠)

''پس جب ان کے ہاتھوں کو دیکھا وہ نہیں پہنچ رہے تھے اس کی طرف تو ان کی طرف سے خوفزدہ ہوگئے اور انھوں نے کہا کہ آپ ڈریں نہیں ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔''

فرشتے عالم الغیب تو نہ تھے ابراہیم علیہ السلام کے چہرے اور کچھ دیگر قرائن سے معلوم کر گئے کہ یہ ہم سے خوف زدہ ہوا ہے اس لیے انہوں نے اصل حقیقت سے آگاہ کر کے آپ علیہ السلام کے خوف وشک وشبہات کو دور کر دیا۔ بعینہٖ اسی طرح سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی بریدہ رضی اللہ عنہ کی موجودہ کیفیت سے اندازہ لگالیا کہ شاید ان کو کوئی شک پیدا ہوا ہے کہ یہ الفاظ کہہ کر اس شبہ کو دور کر دیا ''حرمة'' میں ضمیر منصوب یعنی (ہ) مسکر کی طرف راجع ہے کیونکہ سیاق کلام سے یہی معلوم ہوتا ہے اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ اس روایت میں مسکر کا تذکرہ ہی موجود نہیں پھر ضمیر اس کی طرف کیسے راجع ہو سکتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں ایک جگہ پر ہے کہ:

﴿مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (النحل: ٦١)

اسی طرح سورۃ فاطر (۴۵) میں ارشاد فرمایا کہ:

﴿مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (فاطر: ٤٥)

ان دونوں آیات میں "علیھا" اور "ظھرھا" میں "ھا" کی ضمیر زمین کی طرف راجع ہے۔ حالانکہ قریب میں زمین کا کوئی ذکر ہی موجود نہیں۔ سورۃ ص ۳۲ میں:

﴿حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ﴾ (ص: ۳۲)

میں "توارت" کی ضمیر کو اکثر مفسرین نے شمس (سورج) کی طرف راجع کیا ہے۔ حالانکہ یہاں پر سورج کا ذکر موجود ہی نہیں۔ یہ اس لیے کہ عربیت کے قانون کے مطابق قرینہ حالیہ یا قرینہ مقالیہ یا سیاق وسباق سے کوئی بات یا امر معلوم ہو رہا ہے تو اس کی طرف ضمیر عائد کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح یہاں پر بھی قرینہ حالیہ موجود ہے کہ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کے نمونہ وکیفیت سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو خیال ہوا کہ اسے شاید کچھ شک وشبہ ہوا ہے کہ وہ مشروب مسکر ہے۔ اس لیے اس دل میں سوچے ہوئے مسکر کی طرف ضمیر (ہ) کو حرمہ میں داخل کر کے اس کی طرف راجع کر دیا۔

بہر حال سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے سلسلہ کلام کو مزید جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ میں تو قریش کا جوان وجمیل تھا اور میرے دانت عمدہ ومضبوط تھے یعنی بڑھاپے کا کوئی اثر اس پر نہ ہوا تھا تب بھی دودھ کے علاوہ کسی دوسری چیز میں مجھے کوئی لذت حاصل نہیں ہوا کرتی تھی وغیرہ یعنی پھر اب بڑھاپے میں میں کسی طور پر مسکر پیئوں گا خاص طور پر جب سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حرام قرار دیا ہے میں نے اصلاً نہیں پیا یعنی یہ مسکر مشروب نہیں بلکہ کوئی لذیذ مشروب وغیرہ ہے۔ لہٰذا آپ اس کے پینے سے ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں۔

اس طرح اس روایت کے تمام قطعات آپس میں مل جاتے ہیں اور معنی ومطلب میں کوئی خرابی بھی پیدا نہیں ہوتی، لیکن اگر ((ثم قال ماشربته منذ حرم......الخ .)) کو سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کا مقولہ قرار دیا جائے تو پھر ثم قال معاویہ میں جو بات سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی ہے وہ اگلے جملے سے بالکلیہ غیر متعلق رہ جائے گی اور یہ دونوں جملے ایک دوسرے سے اجنبی بن جائیں گے اور اصلاً کچھ مطلب بھی بن نہ پائے گا اس پر خوب غور کریں۔

واللہ اعلم بالصواب

امام ابن حبان

سوال: امام ابن حبان رجال پر حکم لگانے میں متشدد تھے یا متساہل؟

الجواب بعون الوهاب: امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ جس طرح توثیق وتعدیل میں متساہل ہیں اسی طرح جرح وغیرہ کے سلسلہ میں کافی جگہوں پر بہت زیادہ تشدد سے کام لیتے تھے۔

جمہور محدثین نے مدلسین رواۃ کو چند مراتب میں تقسیم کیا ہے اس کے لیے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب طبقات المدلسین کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق امام بخاری جیسے عظیم محقق ومجتہد فرماتے ہیں کہ:

((ما اقل تدليسه .))

یعنی ان کی تدلیس بہت کم ہے۔

امام ابن معین رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بھی سفیان ثوری کی مدلس یا معنعنہ روایت قبول کی ہے کما یعلم بمطالعہ شرح ابن رجب العلل الترمذی وغیرہ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے طبقات المدلسین میں امام سفیان ثوریؒ کو دوسرے مرتبہ میں ذکر کیا ہے۔اور انہوں نے اس مرتبہ کی معنعن روایتوں کو دیگر ائمہ حدیث نے بلا تصریح سماع قبول کی ہیں۔لہٰذا جمہور محدثین اور بڑے پائے کے ائمہ کے مقابلہ میں ابن حبان کی رائے کو کوئی وزن نہیں۔

بڑی بات تو یہ ہے صحیح ابن حبان میرے پاس مکمل موجود ہے اور میں نے وہ مکمل طور پر پڑھی ہے جس میں بے شمار جگہوں پر مدلسین کی روایات کو جو تیسرے مرتبہ کے ہیں معرض استدلال میں پیش کیا ہے اوران کو صحیح بھی قرار دیا ہے۔حالانکہ وہ ان روایات میں سماع کی تصریح نہیں کر رہے آپ خود صحیح ابن حبان دیکھ کر معلوم کر سکتے ہیں۔لہٰذا جب ابن حبان نے خود بھی اس پر عمل نہیں کیا تو پھر دوسروں پر ان کی محض رائے کیسے حجت یا دلیل بن سکتی ہے؟خصوصاً اس صورت میں تو جمہور محدثین ان کے مخالف ہیں۔

خلاصہ کلام:...... امام سفیان ثوری یا دیگر حدیث کے رواۃ جو تدلیس کے مرتبہ اولیٰ

یا ثانیہ میں داخل ہیں ان کی روایات بلاتصریح سماع بھی مقبول ہیں الا یہ کہ وہ روایت زیادہ صحیح اور اصح روایت کے مخالف ہو اور جمع وتوفیق بھی ممکن نہ ہو تو پھر دوسری بات ہے۔ ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

اہل حدیث

سوال: اہل حدیث کہلانے کے متعلق کچھ وضاحت کریں؟ بینوا توجروا!

الجواب بعون الوھاب: صحیح اسلام پر وہ ہے اور شرع کا متبع وہ ہے اور قرآن وحدیث کا حقیقی تابعدار وہ ہے جو قرآن وحدیث پر عمل کرتا ہے۔ اور فرقہ بندی کی قرآن وحدیث میں منع وارد ہے۔

﴿وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا﴾ (آل عمران: ۱۰۳)

''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامو اور پھوٹ نہ ڈالو۔''

اور یہ جو حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، دیوبندی، بریلوی وغیرہا فرقہ بنا رکھے ہیں یہ سراسر اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت ہے اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرقہ بنانے کی اجازت نہیں دی ہے یہ لوگوں کی ایجاد ہے اور یہ بدعت سیۂ انہی کی پیداوار ہے جس کو ہرگز پسند کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مسلمان کیا ہے اور گمراہ فرقوں سے امتیاز کرنے کے لیے اگر کوئی پوچھے تو یہ کہنا کافی ہے کہ ہم اہلحدیث مسلک کے ہیں۔ یعنی قرآن وحدیث پر عمل کرنے والے ہیں۔

قرآن کریم میں حدیث کا لفظ قرآن کے لیے بھی استعمال ہوا ہے:

﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ﴾ (الاعراف: ۱۸۵)

''پھر اب یہ اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔''

﴿فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ﴾ (الطور: ۳۴)

''اچھا اگر یہ سچے ہیں تو اس جیسی ایک بات یہ بھی تو لے آئیں؟''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے کلام کو بھی قرآن نے حدیث کیا ہے:

﴿وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا﴾ (التحریم: ۳)

''اور یاد کر جب نبی (ﷺ) نے اپنی بعض بیویوں سے ایک پوشیدہ بات کہی۔''

حدیث شریف میں بھی حدیث کا لفظ قرآن وحدیث رسول اللہ ﷺ کے لیے استعمال ہوا ہے لہٰذا اہلحدیث کا مطلب ہوا قرآن وحدیث پر عمل کرنے والے۔

یادرہے کہ یہ لفظ صرف امتیاز کے لیے ہے نہ کہ فرقہ بندی کے لیے۔ اصل میں ہمارا نام صرف مسلم ومسلمون ہے باقی ایک غیر مسلم کو کس طرح پتہ پڑے کہ کون حق پر ہے تو اس کے لیے آسان راستہ یہ ہے کہ آج قران اور احادیث صحیحہ کے تراجم،سندھی، اُردو اور انگریزی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ایک غیر مسلم منصف مزاج تعصب ترک کر کے خالی الذہن محض حق کی تلاش اور صحیح راستہ معلوم کرنے کے خاطر ان قرآن وحدیث کے تراجم کا مطالعہ کرے اس کو خود معلوم ہوسکتا ہے کہ حق کس طرح ہے آیا حنفی طرف، یا مالکی، شافعی یا حنبلی کی طرف یا بریلوی یا دیوبندیت کی طرف یا کسی اور فرقہ کی طرف اسی طرح غیر جانبدار ہو وہ دین کے ان سرچشموں کا مطالعہ کرے گا تو ان شاء اللہ اس کو حق معلوم ہو جائے گا اور قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے کہ جو اللہ کے راستہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اللہ تعالیٰ ضرور اس کو دنیا کا راستہ دکھائے گا۔

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (العنکبوت: ٦٩)

''اور جو لوگ ہماری راہ میں سختیاں برداشت کرتے ہیں ہم انھیں اپنی راہیں ضرور دکھاتے ہیں یقیناً اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا ساتھی ہے۔''

بہرحال حق کے متلاشی کو کسی فرقہ کی طرف دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ براہ راست قرآن وحدیث کا مطالعہ کرے اور ان تمام فرقوں کا قرآن وحدیث سے موازنہ کرے۔ واللہ اعلم بالصواب!

گستاخ رسول کا حکم

سوال: سلمان رشدی اور اس کی کتاب کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

الجواب بعون الوهاب: میں نے اس کی کتاب نہیں پڑھی لیکن مختلف رسائل وجرائد میں اس کے کچھ اقتباسات پڑھے ہیں جیسے الاعتصام وغیرہ میں، اس خبیث نے شان رسالت، قرآن، اسلام اور اہل اسلام کے متعلق جو بکواسات کی ہیں ایک خوف الٰہی رکھنے والے انسان کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہے، اللہ کی قسم! اس کی اس خبیث حرکت پر ہمیں متحد ہونا چاہیے اور دینی حمیت اور غیرت کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور اس کے خلاف ہر طرح سے آواز بلند کرنی چاہیے اور اس کی حرکت خبیثہ کو عام کیا جائے تاکہ اس کا سدباب ہو سکے۔

تفسیر ابن عباس

سوال: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک تفسیر منسوب ہے جو کہ تفسیر ابن عباس کے نام سے مشہور ہے اس کی اسنادی حیثیت کیا ہے؟

الجواب بعون الوهاب: تفسیر ابن عباس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کی سند سلسلة الکذب ہے اس کی سند میں ایک راوی محمد بن مروان السدی ہے جو کہ متہم بالکذب راوی ہے اور یہ سدی محمد بن السائب الکلبی سے روایت بیان کرتا ہے اور یہ بھی رافضی اور متہم بالکذب ہے اس طرح کلبی ابوصالح باذام سے روایت بیان کرتا ہے اور یہ بھی متروک راوی ہے۔ علاوہ ازیں محدثین کرام رحمہم اللہ کی تصریحات کے مطابق باذام نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کچھ نہیں سنا لہٰذا یہ سند بے کار اور واهی تباہی ہے اس لیے اس سے وہی شخص استدلال لے گا جسے علم کا کچھ حصہ بھی نہیں ملا۔

شیعہ راوی

سوال: کیا صحیح بخاری میں شیعہ راوی موجود ہیں اور یہ بھی وضاحت فرمائیں کہ کیا امام نسائی اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ بھی شیعہ تھے؟

الجواب بعون الوهاب: ہاں واقعتاً صحیح بخاری میں کچھ شیعہ راوی ہیں لیکن متقدمین کے نزدیک شیعہ اور روافض میں بہت فرق ہے ان کا معاملہ آج کل کے شیعہ حضرات کی طرح نہ تھا کہ ان کے روافض کے مابین کچھ فرق و امتیاز نہیں بلکہ متقدمین کے نزدیک شیعہ سے مراد وہ لوگ تھے جو صرف تفضیل کے قائل تھے یعنی علی رضی اللہ عنہ کو عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل جانتے تھے، اگرچہ عثمان رضی اللہ عنہ کو برحق امام اور صحابی سمجھتے تھے مگر اس طرح کے کچھ لوگ اہل سنت میں بھی گزرے ہیں جو علی رضی اللہ عنہ کو عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دیتے تھے لہٰذا یہ ایسی بات نہیں جو بہت بڑی قابل اعتراض ہو ہاں کچھ شیعہ شیخین ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے علی رضی اللہ عنہ کو افضل سمجھتے تھے اگرچہ وہ شیخین رضی اللہ عنہما کے متعلق اس عقیدہ کے حامل بھی تھے کہ وہ برحق امام اور صحابی رضی اللہ عنہم تھے لیکن علی رضی اللہ عنہ کو افضل قرار دیتے تھے اور ان کی بات زیادہ سے زیادہ بدعت کے زمرہ میں آتی ہے اور اصول حدیث میں مبتدعین کی روایت کو درج ذیل شرائط سے قبول کیا گیا ہے۔

1. وہ صدوق ہو متہم بالکذب نہ ہو، عادل ہو۔
2. وہ اپنی بدعت کی طرف داعی نہ ہو۔
3. اس کی روایت اس کی بدعت کی مؤید نہ ہو۔

باقی روافض وہ تو متقدمین کے نزدیک وہ تھے جو علی رضی اللہ عنہ اور کچھ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ دیگر تمام صحابہ کو معاذ اللہ بے دین اور غاصب وغیرہ کہتے رہتے ہیں گویا ان لوگوں نے علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دیگر کو ترک کر دیا ہے اس طرح کے شخص کی روایت قطعاً غیر مقبول ہے۔
شیعیت اور رافضیت کی یہ تحقیق علامہ امیر علی نے اپنی کتاب تقریب التہذیب کے حاشیہ کے متصل بعد یعنی تقریب کے ساتھ متصل شامل کر دیا ہے، اس میں اس کے متعلق دوسرے کئی

اصول حدیث کے مسائل اور فن رجال وغیرہ کے متعلق کافی باتیں لکھی ہیں یہ رسالہ قابل دید و لائق مطالعہ ہے۔

الحمد للہ صحیح بخاری میں جو شیعہ راوی ہیں وہ اپنی بدعت کی طرف داعی نہیں اور ان کی روایات بدعت کی مؤید بھی نہیں اور وہ فی نفسہٖ ثقہ وصدوق ہیں بلکہ کچھ روایات ان سے ایسی بھی مروی ہیں جو ان کی بدعت کے خلاف ہیں لہٰذا ایسے راویوں کی روایت میں کچھ حرج نہیں لہٰذا امام محدثین بخاری پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ تفصیل کے لیے اصول حدیث کی کتب کا مطالعہ کیا جائے۔

باقی رہا امام نسائی کا معاملہ تو ان کے متعلق شیعہ ہونے کی بات کہنا بالکل غلط ہے اور امام موصوف پر اتہام ہے۔ باقی امام صاحب نے جو کتاب خصائص علی لکھی ہے وہ اس لیے کہ ان کا کچھ ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا جو علی رضی اللہ عنہ سے بالکل منحرف تھے اور ان کے متعلق ناشائستہ الفاظ کہتے تھے، اس لیے اسے جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ کی مدافعت میں یہ کتاب لکھی اس کتاب میں کچھ احادیث صحیح تو کچھ ضعیف بھی مگر یہ تو محدثین کرتے آئے ہیں (کہ اپنی کتب صحیح وضعیف سب طرح کی احادیث درج کرتے ہیں) دیکھئے ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد ان سب کتب میں کچھ احادیث صحیح ہیں تو کچھ ضعیف۔

امام حاکم واقعتاً شیعیت کی طرف مائل تھے جیسا کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب تذکرۃ الحفاظ میں صراحت فرمائی ہے لیکن غالی شیعہ یا رافضی نہ تھے بلکہ صرف تفضیل کے قائل تھے اور حضرات شیخین کی بہت زیادہ تعظیم وتکریم کرنے والے تھے اور شیعیت اور رافضیت کا فرق میں اوپر درج کر آیا ہوں امام حاکم کا مقام حدیث میں بہت بلند ہے، ان کے ترجمہ کو کتب تاریخ اور تذکرۃ الحفاظ میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بڑے بڑے ائمہ اور حفاظ حدیث نے ان کی بہت ثناء بیان کی ہے باقی رہی ان کی کتاب المستدرک تو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس کی تبییض ونظر ثانی کا موقع نہیں مل سکا، اس لیے اس میں کچھ منکر اور موضوع احادیث ہیں اس کے باوجود بھی اس میں کافی احادیث صحیح اور حسن ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

ایک قول کی حقیقت

سوال: ابوبکر بن عیاش کا قول ہے کہ میں نے کسی فقیہ شخص کو رفع الیدین کرتے ہوئے نہیں دیکھا اس قول کی کیا حیثیت ہے؟ نیز عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے متعلق وارد ہوا ہے کہ وہ رفع الیدین نہیں کرتے تھے اس کے متعلق بھی ہمیں حقیقت سے آگاہ فرمائیں۔

الجواب بعون الوهاب: ابوبکر بن عیاش کا یہ کہنا کہ میں نے کسی فقیہ کو رفع الیدین کرتے نہیں دیکھا نہایت عجیب ہے کیا امام مالک فقیہ نہیں کیا امام شافعی فقیہ نہیں تھے اور امام احمد بن حنبل بھی فقیہ نہیں تھے اور اسی طرح کیا امام اوزاعی بھی درجہ فقاہت پر فائز نہ تھے حالانکہ ان کی ایک کتاب فقہ کے متعلق موجود ہے جو ہمارے مکتبہ میں دو جلدوں میں موجود ہے۔ بہرحال یہ سب فقیہ تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب ائمہ رفع الیدین پر عامل تھے، لہٰذا ابن عیاش کا یہ کہنا صرف ایک بے محل اور بے وزن بات ہے۔ واللہ اعلم

باقی عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے اگر رفع الیدین نہیں کی اس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی سنت پر کچھ اثر نہ پڑے گا پوری امت ایک طرف ہو اللہ کے رسول ﷺ کے قول اور فعل کے مدمقابل اس کا کچھ وزن نہیں اس میں شک نہیں کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے کچھ علماء رفع الیدین کرتے تھے تو کچھ نہیں کرتے تھے اور کچھ کبھی کرتے اور کبھی ترک کرتے تھے بہرحال اس اختلاف کی وجہ اس کی فرضیت اور رکنیت پر کچھ فرق نہیں پڑے گا اور آپ ﷺ کے فعل پر کچھ حرف نہیں آسکتا۔ امتی کے قول یا فعل کو آپ ﷺ کے مقابلہ میں پیش کرنا جاہل اور گستاخ کا کام ہے۔ واللہ اعلم
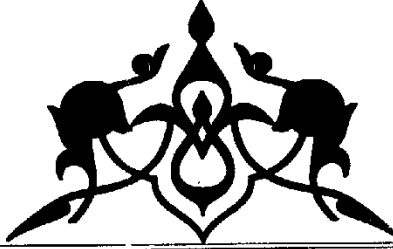
کتاب الصید
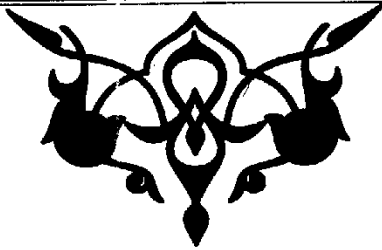
سوال: کچھ جانور حلال تو کچھ جانور حرام کیوں کیے گئے؟

الجواب بعون الوهاب: اللہ سبحانہ وتعالیٰ انسان کو ہر زندگی کے ہر شعبے میں آزماتا ہے، اٹھنے بیٹھنے میں، کھانے پینے میں، لباس پانے کھونے میں، شادی غمی میں تجارت وکاروبار میں کھیتی باڑی میں بادشاہی اور سلطنت میں سماجی اور معاشرتی اقتصادی اور دولت وغربت بیماری اور صحت، سیاحت اور تدبیر منزل عبادات ومعاملات یعنی کہ ہر بات میں امتحان ہوتا ہے اس میں کون سا اعتراض ہے اس کو کیوں حلال کیا اور اس کو کیوں حرام کیا، علاوہ ازیں! جن چیزوں کو حرام کیا گیا ہے وہ آج کی سائنس یا علومِ تجربات ومشاہدات کی بنا ثابت ہو چکیں ہیں کہ وہ چیزیں جسمانی یا روحانی طور پر واقعی نقصان کار ہیں۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں کہ جو چیز انہوں نے حرام کی ہے وہ دراصل ہمارے لیے ظاہری یا معنوی طور پر نقصان کار ہے، جس نے اللہ تعالیٰ پر ایمان اور بھروسہ نہ رکھا وہ ذلیل ہوتا رہا، باقی یہ کہنا کہ اگر کوئی شراب بناتا ہے اس لیے کہ کون اس کو پیتا ہے اور کون اس سے پرہیز کرتا ہے اس پر کیا گناہ! تو ایسا سوال کرنے والوں کو شرم آنی چاہیے، اللہ تعالیٰ تو مالک ہے جس نے یہ کائنات پیدا ہی آزمائش کے لیے کی ہے، اس کو ہر طرح حق ہے کہ ہم سے پوچھے اور آزمائش کرے مگر دوسرے انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسروں کی آزمائش کرے اگر کوئی ایسے کرتا ہے تو وہ خود پہلے امتحان ہے اور جو خود امتحان میں ہو وہ دوسرے کا کیا امتحان لے گا یا اس کے امتحان کا اس کو کیا حق ہے؟ کیا یہ حضرات دوسرے انسانوں کو بھی اللہ تعالیٰ کا مسند پر بٹھانے کے خواہ ہیں؟ اللہ اکبر ثابت کریں خدائی دعویٰ؟

ان صاحبوں سے عقل چھین لی گئی ہے جواب اللہ تعالیٰ کے اختیارات اور اس کی خاص باتوں کو دوسرے انسانوں کے حوالے کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ یا وہ اپنی ہی عقل کے دشمن بننے کے لیے ایسے بودے ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ''نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے۔'' ہوسکتا ہے ان لوگوں کو اعتراضات کے نمبر بڑھا کر اسلام دشمنی کا اشگاف اعلان کرنے کا شوق دامنگیر ہے، بہر حال یہ سوال سراسر فضول اور بیہودہ ہے۔

کتاب المیراث

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ حاجی عبدالحق فوت ہوگئے اور ورثاء چھوڑے 5 بیٹیاں، مرحوم عبدالحق نے اپنی زندگی میں 3 بیٹیوں کو زمین اور سونا برابر برابر دیا، باقی دو بیٹیاں رہ گئی ان کو مکان ہبہ کردیا جس پر اُن تینوں بیٹیوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اس واقعہ کو تقریباً 3 سال گزر گئے۔ اس کے بعد دونوں بیٹیوں نے اپنا مکان فیض محمد کو فروخت کردیا اور قبضہ بھی فیض محمد کو دے دیا۔ اس وقت سے فیض محمد اس جگہ پر رہتا ہے۔ اس پر اُن تینوں بچیوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اس مکان کو فروخت کیے ہوئے تقریباً 10 سال گزر چکے ہیں، اب تینوں بیٹیوں میں سے ایک کہتی ہے کہ مجھے اس مکان میں سے حصہ ملے، وضاحت کریں کہ شریعت محمدی کے مطابق اس لڑکی کو حصہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ہبہ اور تقسیم جائز ہے۔ تین بیٹیوں میں بھی ملکیت برابر تقسیم ہوئی باقی جو جگہ (مکان) رہا تھا، ان دو بیٹیوں کو تقسیم کردی یہ تقسیم برابر ہے۔ اس لیے مکان کی مالکان دو بیٹیاں ہی ہیں، یہ ہبہ صحیح ہے اور یہ دو بیٹیاں اس مکان کو فروخت کرسکتی ہیں چونکہ عرصہ 10 سال سے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوا اور قبضہ بھی فیض محمد کے پاس تھا۔

حدیث میں ہے کہ:

((عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ العائد فی هبته کالکلب یقیئی ثم یعود فی قیئه.)) [1]

''ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہبہ کی ہوئی چیز میں لوٹنے والا اس کتے کی طرح ہے جو قے کردیتا ہے پھر اس قے کو واپس لے لیتا ہے۔''

نیز فرمایا:

[1] صحیح البخاری، کتاب الهبة و فضلها والتحریض علیها، باب نمبر ۳۰۔ صحیح مسلم، کتاب الهبات، باب نمبر ۲۔

((عن ابن عمرو ابن عباس رضی اللہ عنہما عن رسول اللہ ﷺ: قال لا یحل للرجل ان یعطی العطیة ثم یرجع فیها إلا والد فیما یعطی ولد .)) ❶

''ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ کسی آدمی کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی کو عطیہ دے اور پھر اس کو واپس لے لے سوائے والد کے وہ اپنے بیٹے کے عطیہ میں ایسا کرسکتا ہے۔''

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ احمد خان نے اپنے بیٹوں میں ملکیت اُن کے ناموں پر کروادی ان میں سے ایک لڑکا نافرمان ہوگیا اور ساری ملکیت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور احمد خان اپنے اس بیٹے کو ہبہ کی ہوئی ملکیت بیٹے سے واپس لینا چاہتا ہے بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ والد اپنے بیٹے کو دی ہوئی ملکیت واپس لے سکتا ہے:

((عن ابن عباس وابن عمر رضی اللہ عنہما ان النبی ﷺ قال لا یحل لرجل ان یعطی عطیة او یهب هبة فیرجع فیها إلا الوالد فی ما یعطی ولده .)) ❷

''ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کسی آدمی کے لیے جائز نہیں ہے کہ عطیہ، تحفہ کرکے واپس لے مگر والد اپنی اولاد کو دی ہوئی چیز واپس لے سکتا ہے۔''

❀❀❀❀

---

❶ رواه احمد ج١، ص ٢٣٧، رقم: ٢١٢٣.

❷ اخرجه ابوداؤد، كتاب البيوع، باب الرجوع فى الهبة، رقم الحديث: ٣٥٣٩.

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ محمد رمضان کے چھ بیٹے ہیں جس میں سے 4 اکٹھے اور 2 جدا جدا ہیں، عرض یہ ہے کہ جو بیٹے الگ ہیں وہ اپنے والد کو گھر سے نکالنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ گھر ہمارا ہے اس گھر کی جگہ ہماری ہے، اور باپ کو گھر سے زبردستی نکال دینا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں اگر نہیں نکلتے تو پھر ہمیں اس کی قیمت ادا کرو۔ شریعت محمدی کے مطابق اس جگہ کا حقدار بیٹا ہے یا باپ؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ اس جگہ کا مالک باپ ہے جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

((أنت ومالك لأبيك .)) [1]

''نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو فرمایا تھا کہ تو اور تیرا مال تیرے باپ کی ملکیت ہو۔''

باپ کے ہوتے ہوئے بیٹا کسی بھی چیز کا حقدار نہیں ہے اس لیے اس جگہ کا حقیقی مالک محمد رمضان ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

* * * *

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ محمد صدیق کی دو شادیاں تھیں۔ ایک بیوی سے ایک بیٹا اور بیٹی اس کے بعد بیوی فوت ہوگئی۔ محمد صدیق نے دوسری شادی کرنا چاہی مگر گھر والوں نے اس وقت فوتی سے تمام ملکیت بیٹے اور بیٹی کے نام لکھوادی اور محمد صدیق نے دوسری شادی کی اس سے ایک بیٹی پیدا ہوئی اب محمد صدیق فوت ہوگیا ہے اس کی بیوی اور ایک بیٹی زندہ ہے۔ اب اس بیٹی کو اپنے باپ کی اصل ملکیت سے کچھ نہیں ملا۔ باقی والد کے بعد میں لیے ہوئے دوکانوں سے اس بیوی اور بیٹی کو شریعت کے مطابق حصہ ملا۔ اب عرض یہ ہے کہ مرحوم محمد صدیق کی اصل ملکیت سے اس بیوی اور بیٹی کو

---

[1] مسند احمد ٢/ ٢٠٤ و سنن ابی داؤد، کتاب البیوع باب الرجل یاکل من مال ولده، رقم: ٣٥٣٠- سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، باب ما للرجل من مال ولده، رقم: ٢٢٩١.

کچھ ملے گا یا نہیں؟ بینوا وتوجروا.

الجواب بعون الوهاب بشرط صحت السوال.: معلوم ہونا چاہیے کہ فوتی اگر اپنی زندگی میں تمام ملکیت اپنے بیٹے اور بیٹی کے حوالے کردے تو یہ جائز ہے اور اس وقت کوئی دوسری اولاد نہیں ہے۔ یہ اس صورت میں ناجائز ہوتی جب کچھ اولاد کو ملکیت دے دے اور کچھ کو محروم کردے حالانکہ اس وقت کوئی دوسری اولاد نہیں تھی۔ باقی ملکیت بعد میں فوتی نے بنائی اس میں حصہ کے مطابق ہر ایک کو حصہ ملا۔ فوتی نے جو پہلے لکھ کر دیا پہلے جو وارث تھے وہ ملکیت ان وارثوں کی ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب.

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ ایک آدمی نے اپنی ملکیت اپنے بیٹے کو ہبہ کردی بعد میں بیٹا فوت ہوگیا۔ اب اس مرحوم کی ملکیت میں سے باپ کو حصہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ اس ہبہ کی ہوئی ملکیت سے والد کو ورثاء کی طرح حصہ ملے گا۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں بیان ہوا ہے کہ:

((جاءت امرأة الى النبى ﷺ فقالت يا رسول الله انى تصدقت على أمي بجارية وانها ماتت فقال آجرك ورد عليك الميراث.)) [1]

''ایک عورت نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ میں نے ایک لونڈی اپنی ماں کو صدقہ کے طور پر دی ہے پھر میری ماں فوت ہوگئی تو آپ ﷺ نے فرمایا تجھے تیرے اس صدقے کا اجر بھی ملے گا اور آپ وارث کی حیثیت سے دوبارہ اس لونڈی کو اپنی وراثت میں لے سکتیں ہیں۔''

اس لیے اب وہ باندی آپ کی ملکیت ہے۔ هذا هو عندى والعلم عند ربى.

[1] سنن ابن ماجه، كتاب الصدقات، باب من تصدق بصدقة ثم ورثها، رقم: ٢٣٩٤.

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ابراہیم فوت ہوگیا جس نے درج ذیل ورثاء چھوڑے۔ چچازاد بھائی فیض محمد اور اسماعیل، پھر بعد میں فیض محمد وفات پاگیا جس نے ایک بیوی جال تین بیٹیاں کابلہ، سنگھار، رحیماں، ایک بھائی اسماعیل وارث چھوڑا۔ بعد میں اسمٰعیل کا انتقال ہوگیا جس نے یہ ورثاء چھوڑے ہیں پانچ بیٹے عثمان، قاسم، اللہ ڈنو، امین، سائیڈنو، ایک بیٹی صفوراں، ابراہیم نے اپنی زندگی میں ہی چچازاد اسمٰعیل کے بیٹے قاسم کو کل ملکیت دینے کی وصیت بھی کی تھی اب عرض یہ ہے کہ مذکورہ ورثاء کو شریعت کے مطابق کتنا حصہ ملے گا اور ابراہیم کی وصیت کے مطابق قاسم کو کتنا حصہ ملے گا۔

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مرحوم ابراہیم کی ملکیت میں سے پہلے اس کے کفن دفن کا خرچہ ادا کیا جائے، اس کے بعد اگر ابراہیم پر قرض تھا تو اس کو ادا کیا جائے۔ اس کے بعد ابراہیم نے قاسم ولد اسمٰعیل کے لیے جو وصیت کی تھی کل مال کے تیسرے حصے سے اس وصیت کو پورا کیا جائے گا۔ اس کے بعد جو ملکیت باقی بچے گی اسے ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح تقسیم کیا جائے گا۔ مرحوم ابراہیم کے وارث صرف دو چچا زاد بھائی ہیں لہٰذا ملکیت دونوں فیض محمد اور اسمٰعیل کے درمیان آدھی آدھی یعنی ہر ایک کو 8 آنے ملیں گے۔ مرحوم فیض محمد کی ملکیت 8 آنے تھی۔ اس میں سے بیوی جال کو آٹھواں حصہ 1 آنہ، تین بیٹیوں کو 2 تہائی $\frac{2}{3}$ یعنی 5 آنے 4 پائیاں ملیں گی، باقی بچا 1 آنہ 8 پائیاں یہ فیض محمد کے بھائی اسمٰعیل کو ملیں گے۔ مرحوم اسمٰعیل کو فیض محمد اور ابراہیم کی ملکیت میں سے حصہ ملا تھا۔ 9 آنے، 8 پائیاں، اس ملکیت کے 11 حصے کر کے ہر ایک بیٹے کو دو حصے اور ہر بیٹی کو ایک حصہ دیا جائے گا۔ مزید وضاحت نیچے نقشے کے اندر بتائی جارہی ہے وہاں دیکھیں۔

مرحوم ابراہیم:......ملکیت 1 روپیہ

ورثاء:...... چچازاد فیض محمد 8 آنے۔ چچازاد اسمٰعیل 8 آنے

فوت ہونے والا فیض محمد:......ملکیت 8 آنے۔

ورثاء:...... تین بیٹیاں کابلہ، سنگھار، رحیمہ مشترکہ طور پر 5 آنے 4 پائیاں، بیوی جامل 1 آنہ۔ بھائی محمد اسمٰعیل 1 آنہ 8 پائیاں۔

فوت ہونے والا اسمٰعیل:...... ملکیت 9 آنے 3 پائیوں کو 11 حصے کر کے تقسیم کیا جائے گا۔

وارث:...... بیٹا 2 حصے، بیٹا 2 حصے، بیٹا 2 حصے، بیٹا 2 حصے، بیٹا 2 حصے، بیٹی 1 حصہ۔

هٰذا هو عندي والعلم عند ربّي .

موجودہ اعشاریہ فیصد نظام میں یوں تقسیم ہوسکتا ہے۔

میت ابراہیم کل ملکیت 100

چچازاد بھائی فیض محمد عصبہ 50

چچازاد بھائی اسمائیل عصبہ 50

میت فیض محمد کل ملکیت 50

بیوی $\frac{1}{8}$ = 6.25

تین بیٹیاں $\frac{2}{3}$ 33.3 فی کس 11.1

بھائی اسمائیل عصبہ 10.41

میت اسمائیل کل ملکیت 60.41

پانچ بیٹے عصبہ 54.91 فی کس 10.98

1 بیٹی عصبہ 5.49

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ حسن فوت ہو گیا جس نے وارث چھوڑے 3 بیٹے احمد، حبیب اللہ، رحمت اللہ پھر حبیب اللہ فوت ہو گیا جس نے وارث چھوڑے ایک بیٹی جمال خاتون اور بھائی رحمت اللہ، احمد، اس کے بعد احمد فوت ہو گیا جس نے وارث چھوڑے ایک بیٹا غلام حسین ایک بیوی سلیمہ خاتون، اس کے بعد رحمت اللہ کا انتقال ہو گیا

جس نے وارث چھوڑے ایک بیٹا حبیب اللہ اور بیوی سلیمہ خاتون، اس کے بعد سلیمہ خاتون فوت ہوگئی جس نے ورثاء چھوڑے دو بیٹے غلام حسین اور حبیب اللہ، اس کے بعد حبیب اللہ فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے تین بیٹے رضا محمد، عزیز اللہ، امان اللہ اور چار بیٹیاں اور اخیافی بھائی غلام حسین، اس کے بعد جمال خاتون فوت ہوگئی جس نے وارث چھوڑے بیٹا ہاشم، بیٹیاں وڈن، زینب، رحمت اور خاوند ابراہیم، بتائیں کہ شریعت کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا۔

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے اس کے کفن کا خرچہ کیا جائے، پھر اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے، پھر اگر وصیت کی ہے تو کل مال کے تیسرے حصے سے ادا کی جائے، بعد میں مرحوم کی ملکیت منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طریقہ سے تقسیم کیا جائے گا۔

حسن فوت ہوگیا ملکیت منقولہ خواہ غیر منقولہ ایک روپیہ

وارث بیٹا احمد 5 آنے 4 پائیاں، بیٹا حبیب اللہ، 5 آنے 4 پائیاں، بیٹا رحمت اللہ 5 آنے 4 پائیاں۔

حبیب اللہ نے وفات پائی ملکیت 4 پائیاں۔ 5 آنے

وارث بیٹی جمال خاتون 2 آنے 8 پائیاں، بھائی احمد 1 آنہ 4 پائیاں، بھائی رحمت اللہ 1 آنہ 4 پائیاں۔

رحمت اللہ وفات کر گیا ملکیت 6 آنے 8 پائیاں

ورثا: بیٹا حبیب اللہ 5 آنے 10 پائیاں، بیوی سلیمہ خاتون 10 پائیاں۔

احمد فوت ہوگیا ملکیت 6 آنے 8 پائیاں

وارث: بیٹا غلام حسین 5 آنے 10 پائیاں، بیوی سلیمہ خاتون 10 پائیاں

سلیمہ خاتون وفات کر گئی کل ملکیت 1 آنہ 8 پائیاں

وارث: بیٹا غلام حسین 10 پائیاں، بیٹا حبیب اللہ 10 پائیاں

حبیب اللہ فوت ہوگیا کل ملکیت 6 آنے 8 پائیاں

وارث: بیٹا 1 آنہ۔ $1\frac{1}{2}$ پائیاں، بیٹا 1 آنہ $1\frac{1}{2}$ پائیاں، چار بیٹیاں 2 آنے 3 پائیاں، سوتیلا بھائی غلام حسن پائی $1\frac{1}{2}$۔

اس کے بعد مائی جمال خاتون فوت ہوگئی کل ملکیت 2 آنے 8 پائیاں

وارث: بیٹا ہاشم $9\frac{1}{2}$ پائیاں، بیٹی وڈن $4\frac{3}{4}$ پائیاں، بیٹی زینب $4\frac{3}{4}$ پائیاں، بیٹی رحمت $4\frac{3}{4}$ پائیاں۔

خاوند ابراہیم 8 پائیاں باقی بچی $\frac{1}{4}$ پائی اس کو پانچ حصے کرکے 2 حصے بیٹے کو اور ایک ایک حصہ ہر بیٹی کو۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

موجودہ اعشاری فیصد نظام یوں ہوسکتا ہے

میت حسن ترکہ 100

بیٹا احمد عصبہ 33.3

بیٹا حبیب اللہ عصبہ 33.3

بیٹا رحمت اللہ عصبہ 33.3

میت حبیب اللہ کل ترکہ 33.33

بیٹی جمال خاتون $\frac{1}{2}$ 16.67

بھائی احمد عصبہ 8.33

بھائی رحمت اللہ عصبہ 8.33

میت احمد کل ملکیت 41.66

بیٹا غلام حسین عصبہ 36.46

بیوی سلیمہ $\frac{1}{8}$ 5.20

میّت سلیمہ خاتون کل ملکیت 10.40

بیٹا غلام حسین عصبہ 5.20

بیٹا حبیب اللہ عصبہ 5.20

میّت بیٹا حبیب اللہ کل ملکیت 41.66

2 بیٹے عصبہ 20.83

4 بیٹیاں عصبہ 20.83

اخیافی بھائی محروم

میّت مائی جمال خاتون کل ملکیت 16.66

خاوند $\frac{1}{4}$ 4.165

بیٹا عصبہ 4.998

3 بیٹیاں عصبہ 7.497

❀❀❀❀

سوال: ❶ سیّد حیات شاہ ولد سیّد مراد شاہ جو کہ فوت ہو چکے ہیں انھوں نے وارث چھوڑے۔ ایک بیوہ، دوسرے والد سے ایک بہن اور چچا زاد بھائی کے بیٹے اور چچا زاد بھائی کی بیوی اور چار چچا زاد بہنیں، وضاحت کریں کہ شریعت محمدی کے مطابق مرحوم کے ترکے میں سے سب کو کتنا کتنا حصہ ملے گا۔ ❷ مذکورہ سیّد حیات شاہ نے اپنی بیوی کے نام وصیت کی تھی کہ میری ساری ملکیت میری بیوی کو دی جائے۔ اس مسئلہ کے متعلق عالم حضرات کیا فرماتے ہیں؟

الجواب بعون الوھاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مرحوم کی ملکیت میں سے سب سے پہلے مرحوم کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے، دوسرے نمبر پر اگر مرحوم پر قرضہ تھا تو اسے ادا کیا جائے، تیسرے نمبر پر اگر میّت نے جائز وصیت کی تھی تو کل مال کے ثلث حصے سے اسے پورا کیا جائے۔ مگر مذکورہ صورت میں جو وصیت کی گئی ہے یہ وصیت جائز نہیں کیونکہ وصیت اس انسان کے حق میں جائز ہوتی ہے۔ جسے میّت کے ترکے میں سے کچھ حصہ نہ ملا ہو جبکہ بیوی حصے دار ہے

اسے حصہ ملا ہے اور بیوی وارث ہے اور وارث کے لیے وصیت جائز نہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ .)) [1] ''وارث کے لیے وصیت جائز نہیں ہے۔''

اس کے بعد مرحوم کی کل ملکیت خواہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح تقسیم کیا جائے گا۔ بیوی کو چوتھا حصہ 4 آنے ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ﴾ کی وجہ سے بہن کو آدھا 8 آنے اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿إِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَّلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ﴾ کی وجہ سے باقی جو چوتھا حصہ 4 آنے بچیں گے وہ چچا زاد بھائی کے دونوں بیٹوں کو دو دو آنے دیں گے۔

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک عورت مسمات سونی فوت ہوگئی اور ورثاء میں خاوند، دو بیٹیاں 2 بھائی چھوڑے۔ مرحومہ کی ملکیت میں سے وارثوں کو کتنا ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہو کہ مذکورہ صورت میں پہلے مرحومہ کے کفن دفن کا خرچہ مرحومہ کی ملکیت میں سے نکالا جائے، پھر قرضہ ادا کرنے کے بعد باقی ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر 4 آنے خاوند کو 5 آنے 4 پائیاں ہر ایک بیٹی کو اور آٹھ پائیاں ہر ایک بھائی کو دیے جائیں گے۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

موجودہ اعشاری نظام میں یوں بھی تقسیم ہوسکتا ہے

ترکہ 100

خاوند	2 بیٹیاں	2 بھائی عصبہ
$25\frac{1}{4}$	$66.66\frac{2}{3}$	8.34

---

[1] مسند احمد، ج ٤ ص ١٨٦، رقم الحديث ١٧٦٨٠۔ جامع الترمذی، کتاب الوصایا، باب ما جاء وصية لوارث رقم الحديث: ٢١٢٠۔ ابن ماجه، کتاب الوصایاباب لا وصية، ١٢.

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ جمال خاتون نے اپنی زندگی میں ہی اپنے والد کی وراثت میں سے ملے ہوئے کل حصہ اپنی خوشی اور رضا مندی کے ساتھ اپنے چچازاد بھائیوں غلام حسین اور حبیب اللہ کو بطور ہبہ اور ہبہ کر کے دے دی۔

اب جمال خاتون کی وفات کے بعد جمال خاتون کا بیٹا اور دوسرے وارث مذکورہ ہبہ کی ہوئی ملکیت واپس لینا چاہتے ہیں۔ وضاحت کریں کہ اس ہبہ کی ہوئی ملکیت کو واپس لینا جائز ہے یا نہیں، شریعت محمدی کے مطابق اس کا حکم کیا ہے؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ ہبہ کی ہوئی ملکیت واپس لینا ناجائز ہے جیسا کہ حدیث مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((عن ابن عباس رضي الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ العائد فى الهبة كالكلب يقيئى ثم يعود فى قيئه .)) [1]

''ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہبہ کی ہوئی چیز کو لوٹانے والا کتے کی مانند ہے جو قے کرتا ہے اور پھر اس کو کھالیتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ مالک کا ہبہ کی ہوئی ملکیت واپس لینا ناجائز ہے اس لیے ورثا کے لیے اس ہبہ کی ہوئی ملکیت کو واپس لینا بالاولی ناجائز ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

***

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ ایک آدمی زید دفوت ہوگیا اور وارث چھوڑے ایک بیوی، دو بیٹے، دو بیٹیاں۔ وضاحت کریں کہ شریعت کے مطابق مرحوم کی ملکیت میں سے وارثوں کو کتنا کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہو کہ مرحوم کی ملکیت میں سے مرحوم کے کفن دفن کے خرچے اور قرض وغیرہ ادا کرنے کے بعد باقی ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر وراثت اس

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الهبة، الخ، باب نمبر ۳۰، مسلم كتاب الهبات، باب نمبر ۲، نسائی، کتاب الهبة، باب ذكر الاختلاف على طاؤس فى الراجع فى هبته۔

طرح تقسیم ہوگی۔ بیوی کو 2 آنے ہر ایک بیٹے کو 4 آنے آٹھ پائیاں اور 2 آنے 4 پائیاں ہر ایک بیٹی کو دیے جائیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب

موجودہ اعشاریہ فیصد نظام میں یوں تقسیم ہوگا

ترکہ 100 روپے

بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5

2 بیٹے عصبہ 58.33

2 بیٹیاں عصبہ 29.165

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص بنام چھٹو فوت ہوگیا اور وارث چھوڑے ایک بیوی 2 بھائی، ایک بہن۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک وارث کو کتنا حصہ ملے گا۔

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مرحوم کی ملکیت میں سب سے پہلے کفن دفن کا خرچہ کیا جائے گا پھر اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے۔ باقی ملکیت کو ایک روپیہ مقرر کرکے 4 آنے بیوی کو، 4 آنے آٹھ پائیاں ہر ایک بھائی کو، اور 2 آنے 4 پائیاں بہن کو ملیں گی۔ باقی چار پائیوں کے پانچ حصے کرکے ایک حصہ بہن کو اور دو دو حصے ہر ایک بھائی کو دیئے جائیں۔ هذا هو عندي والعلم عند ربي

موجودہ اعشاریہ نظام میں یوں تقسیم ہوگا

100 روپے

بیوی $\frac{1}{4}$ 25

2 بھائی 60 فی کس 30

1 بہن 15

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ رانو خان فوت ہوگیا جس نے ورثاء چھوڑے ایک بیوی، ایک بہن اور ایک چچازاد بہن کا بیٹا وضاحت کریں کہ شریعت محمدیہ کے مطابق ہر ایک کا کتنا حصہ بنے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے مرحوم کی ملکیت میں سے اس کے کفن دفن کا خرچہ کیا جائے گا، دوسرے نمبر پر اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے اس کے بعد اگر جائز وصیت کی ہے تو کل مال کے ثلث میں سے اسے ادا کیا جائے۔ اس کے بعد مرحوم کی کل ملکیت منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ تصور کرکے ورثاء میں اس طرح تقسیم کی جائے گی کہ بہن کو آدھا یعنی 8 آنے ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اِنِ امۡرُؤٌا هَلَكَ لَيۡسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗۤ اُخۡتٌ فَلَهَا نِصۡفُ مَا تَرَكَ﴾ بیوی کو 4 آنے ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَ لَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكۡتُمۡ اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّكُمۡ وَلَدٌ﴾ باقی جو مال بچے گا یعنی 4 آنے وہ چچازاد بہن کے بیٹے کو دیے جائیں گے۔ الحقو الفرائض بأهلها فما بقى فلأولى رجل ذكر.

هذا هو عندى والعلم عند الله

موجودہ فیصد اعشاری نظام میں تقسیم یوں کیا جاسکتا ہے

100 روپے

بہن $\frac{1}{2}$	یعنی 50
بیوی $\frac{1}{4}$	یعنی 25
چچازاد بہن کا بیٹا عصبہ	25

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص بنام خان محمد فوت ہوگیا اور یہ وارث چھوڑے: تین بیٹے، ایک بیٹی۔ شریعت محمدی کے مطابق مذکورہ ورثاء کو کتنا کتنا

حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: مرحوم کی ملکیت میں سے کفن دفن کا خرچہ اور قرضہ وغیرہ ادا کرنے کے بعد باقی ملکیت کو 1 روپیہ قرار دے کر اس طرح تقسیم کی جائے گی کہ 4 آنے 6 پائیاں ہر ایک بیٹے کو اور 2 آنے 3 پائیاں ایک بیٹی کو ملیں گے۔ باقی 3 پائیوں کے سات 7 حصے کر کے ایک حصہ بیٹی کو اور دو دو حصے ہر ایک بیٹے کو دیئے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین﴾

هذا هو عندي والعلم عند ربي

موجودہ فیصد اعشاریہ میں تقسیم یوں ہوگا

ترکہ 100

3 بیٹے عصبہ 85.72

1 بیٹی عصبہ 14.28

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ جان محمد کا بیٹا دھنی بخش اپنے والد کی زندگی میں ہی وفات کر گیا۔ بعد میں خود جان محمد فوت ہو گیا جس نے وارث چھوڑے، ایک بیوی، ایک بیٹی 5 پوتے دو پوتیاں۔ بتائیں کہ جان محمد کی ملکیت میں سے شریعت محمدی کے مطابق کیسے وراثت تقسیم ہوگی؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے سب سے پہلے اس کے کفن دفن کا خرچہ کیا جائے، پھر اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے پھر اگر مرحوم نے وصیت کی ہے تو سارے مال کے تیسرے حصے تک سے پوری کی جائے اس کے بعد باقی مال منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر تقسیم اس طرح ہوگی۔

مرحوم جان محمد ملکیت 1 روپیہ

وارث	پائیاں	آنے
بیوی	00	2
بیٹی	00	8
5 پوتے (ہر ایک کو ایک آنہ)	00	5
دو پوتیاں مشترکہ	00	01

حدیث مبارکہ میں ہے: ((الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فلا ولی رجل ذکر .)) ❶

هذا هو عندی والعلم عند ربی

جدید اعشاری فیصد طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100

بیوی	$\frac{1}{8}$ = 12.5	
بیٹی	$\frac{1}{2}$ = 50	
5 پوتے عصبہ	31.25	فی کس 6.25
2 پوتیاں عصبہ	6.25	فی کس 3.125

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام بیچ اس مسئلہ کے کہ حسن علی فوت ہوا اور ورثاء میں 4 بھتیجے 10 بھتیجیاں ایک بھانجہ چھوڑا اور فوت ہونے والے نے مرتے وقت ساری ملکیت کی وصیت صرف ایک بھتیجے کے نام پر کی۔ وضاحت فرمائیں؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ فوت ہونے والے جو ملکیت چھوڑی ہے سب سے پہلے اس میں سے فوت ہونے والے کے کفن دفن کا خرچہ کیا جائے، دوسرے

❶ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث ابن الابن اذا لم یکن ابن، رقم الحدیث:٦٧٣٥۔ صحیح مسلم، کتاب الفرائض، باب الحقوا الفرائض باهلها، رقم: ٤١٤١.

نمبر پر اگر میت پر قرض تھا تو اسے ادا کیا جائے، تیسرے نمبر پر اگر میت نے کسی کے لیے وصیت کی تھی تو کل مال کے تیسرے حصے تک وصیت پوری کی جائے۔ مگر مذکورہ صورت میں بھتیجے کے نام کی جانے والی وصیت کو ادا نہیں کیا جائے گا کیونکہ بھتیجا میت کا وارث ہے اور وارث کے لیے وصیت جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَا وَصِيَّةَ لِـلْـوَارِثِ .)) ❶ یعنی وارث کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اس قاعدے کے مطابق بھتیجے کو کی جانے والی وصیت میں سے بھتیجے کو کچھ بھی نہیں دیا جائے گا۔ اس کے بعد فوت ہونے والے کی ساری ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر مذکورہ ورثاء میں ترکہ اس طرح تقسیم کیا جائے گا۔

چاروں بھتیجوں کو ملکیت میں سے ہر ایک کو چار چار آنے دیے جائیں گے باقی میت کی دس بھتیجیاں اور بھانجہ محروم ہوں گے اس لیے ان کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔

موجودہ اعشاری فیصد نظام میں یوں ہوگا

100

4 بھتیجے	عصبہ 100	ہر بھتیجے کو 25،25
10 بھتیجیاں	محروم	
بھانجا	محروم	

❀❀❀❀

سوال: ◆❶: کیا فرماتے ہیں علماء کرام بیچ اس مسئلہ کے کہ بنام قاضی مصطفیٰ فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے تین بیٹیاں ایک بیوی۔ ایک بھائی فیض النبی۔

◆❷...... فوت ہونے والے نے اپنے ہاتھ سے ایک ورق پر تحریر کیا کہ میری ساری جائیداد کی مالک میری تین بیٹیاں ہیں۔ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق یہ

❶ مسند احمد ج ٤ ص ٨٦، رقم: ١٧٦٨٠.

جائیداد کس طرح تقسیم ہوگی نیز صرف بیٹیوں کے نام ہبہ نامہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوھاب: معلوم ہونا چاہیے کہ فوت ہونے والے کی ملکیت سے اس کے کفن دفن کا خرچ کیا جائے اس کے بعد اگر میت پر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے اس کے بعد اگر میّت نے وصیت کی ہے تو کل مال کے تیسرے حصے تک کی وصیت کو پورا کیا جائے اس کے بعد فوت ہونے والے کی کل جائیداد کو ایک روپیہ قرار دے کر یوں تقسیم کی جائے گی۔

فوت ہونے والے غلام مصطفیٰ کی کل ملکیت ایک روپیہ (منقولہ خواہ غیر منقولہ)

وارث: بیوی کو 2 آنے 3 بیٹیوں کو مشترکہ طور پر 10 آنے 8 پیسے، بھائی فیض محمد کو 4 پیسے ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وان کن نساء فوق اثنتین فلھن ثلثا ما ترك فان کان لکم ولد فلھن الثمن﴾ حدیث مبارکہ میں ہے: ((الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فلا ولی رجل ذکر .)) (بخاری و مسلم)

باقی رہی بات ہبہ نامے کی تو وہ جائز نہیں جیسا کہ حدیث میں ہے: ((لا وصیة للوارث .)) [1]

باقی ہبہ کی ہوئی ملکیت ابھی تک لڑکیوں نے قبضہ میں بھی نہیں لی اور کھاتے وغیرہ بھی نہیں ہوئے مالک فوت بھی ہوگیا ہے تو اس صورت میں وصیت ہوگی ہبہ نہیں ہوسکتی جیسا کہ اوپر حدیث گزری ہے کہ وارث کے لیے وصیت نہیں ہوسکتی۔ واللہ اعلم بالصواب

موجودہ اعشاری فیصد نظام میں یوں تقسیم ہوگا

100 روپے

بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5

8 بیٹیاں $\frac{2}{3}$ 66.66

1 بھائی عصبہ 20.84

---

[1] مسند احمد ج ٤، ص ١٨٦، رقم الحدیث: ١٧٦٨٠، جامع ترمذی، کتاب الوصایا، باب ما جاء لا وصیة لوارث، رقم الحدیث: ٢١٢٠۔ ابن ماجه، الوصایا، باب لا وصیة لوارث، رقم الحدیث: ٢٧١٢.

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام بیچ اس مسئلہ کے کہ بنام حاجن فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں ایک ماں، دو بہنیں، ایک بھائی اور دو بیویاں چھوڑیں۔ بتائیں کہ شریعت محمدیہ کے مطابق ان میں سے ہر ایک کو کتنا کتنا حصہ ملے گا؟ اس کے بعد مسمات رانی فوت ہوگئی جس کو باقی سب حصے داروں نے اپنا اپنا حصہ ہبہ دیا پھر مسمات رانی نے فوت ہوتے وقت 3 بیٹیاں اور ایک شوہر کو وارث چھوڑا۔

الجواب بعون الوهاب: یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے سب سے پہلے میّت کے کفن دفن کا خرچہ کیا جائے گا۔ دوسرے نمبر پر اگر قرضہ ہے تو اسے ادا کیا جائے گا پھر اگر فوت ہونے والے نے وصیت کی تھی تو کل مال کے تیسرے حصے تک کی وصیت کو پورا کیا جائے گا۔ اس کے بعد کل ملکیت (خواہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ) اس کو ایک روپیہ قرار دے کر تقسیم اس طرح ہوگی۔ فوت ہونے والے حاجن کی کل ملکیت ایک روپیہ 1-0 ورثاء میں سے ماں کو 2 آنے آٹھ پیسے دو بیویوں کو 4 آنے، دو بہنوں کو مشترکہ طور پر 4 آنے 8 پیسے ایک بھائی کو 4 آنے 8 پیسے ملیں گے۔

نوٹ:...... مسمات رانی کو تمام حصہ داروں نے اپنا اپنا حصہ ہبہ کر دیا تھا جس پر کافی عرصہ سے رانی کا قبضہ بھی ہے اس کی مالک مسمات رانی ہی ہوگی اس کے بعد رانی فوت ہوگی اس کی ساری ملکیت کو ایک روپیہ قرار دیا جائے گا۔

وارث حاجن جمن کو 4 آنے بیٹیوں کو صالحان قابل اور کاملہ کو مشترکہ طور پر 10 آنے 16 پیسے مشترکہ طور پر۔ واللہ اعلم بالصواب

موجودہ اعشاری فیصد نظام میں تقسیم یوں ہوگا

میّت حاجن ترکہ 100 روپے

ماں $\frac{1}{6}$ 16.666

2 بہنیں عصبہ 29.17

1 بھائی عصبہ 29.17

2 بیویاں $25\frac{1}{4}$

میّت مسمات رانی

ترکہ 100

شوہر $25\frac{1}{4}$

3 بیٹیاں $75\frac{2}{3}$

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ پیر حاجی یونس فوت ہوگئے جس نے درج ذیل ورثاء چھوڑے۔ ایک بیوی، والد پیر عبدالحق اور والدہ اور 9 بیٹے 3 بیٹیاں۔ اس کے بعد پیر عبدالحق فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں دو بیویاں، سات 7 بیٹے اور ایک 1 بیٹی۔ وضاحت کریں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک وارث کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: اس بات کو ذہن نشین کرلیں کہ فوت ہونے والے پیر یونس کی ملکیت میں سے پہلے نمبر پر اس کی تجہیز و تکفین کا خرچہ نکالا جائے، دوسرے نمبر پر اگر فوت ہونے والے پر قرضہ ہے تو اسے ادا کیا جائے، تیسرے نمبر پر اگر کسی کے لیے وصیت کی تھی تو کل مال کے تیسرے حصے کے برابر تک سے پوری کی جائے۔ اس کے بعد مرحوم کی وراثت منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح تقسیم کی جائے گی۔ بیوی کو آٹھواں حصہ 2 آنے ملیں گے۔ فرمان الٰہی ہے: ﴿فان كان لكم ولد فلهن الثمن﴾ والد پیر عبدالحق کو چھٹا حصہ 2 آنے 8 پیسے ملیں گے اسی طرح والدہ کو بھی چھٹا حصہ 2 آنے 8 پیسے دیئے جائیں گے۔ فرمان الٰہی ہے: ﴿ولابويه لكل واحد منهما السدس مما ترك﴾ اس کے بعد جو ملکیت بچے گی یعنی 8 آنے 8 پیسے ان کو 21 حصے بنا کر ہر بیٹے کو دو حصے اور ہر بیٹی کو ایک حصہ دیا جائے گا۔ فرمان الٰہی ہے: ﴿يوصيكم الله في اولادكم للذكر مثل حظ الانثيين﴾...... اس کے بعد پیر عبدالحق فوت ہوگئے اس کی ملکیت 2 آنے 8

پیسے وارث دونوں بیویوں کو آٹھواں حصہ دیا جائے گا اس کے بعد بھی جو رقم بچے گی اس کو 15 حصے کر کے ہر بیٹے کو دو حصے اور ہر بیٹی کو ایک حصہ ملے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

موجودہ اعشاری نظام میں یوں تقسیم ہوگا

میّت پیر حاجی یونس ترکہ 100

بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5

والد $\frac{1}{6}$ 16.666

والدہ $\frac{1}{6}$ 16.666

9 بیٹے عصبہ 46.429 فی کس 5.158

3 بیٹیاں عصبہ 7.738 فی کس 2.579

میّت پیر عبدالحق ترکہ 100

2 بیویاں $\frac{1}{8}$ 12.5

7 بیٹے عصبہ 81.67

1 بیٹی عصبہ 5.83

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ مرحوم اللہ بچایو نے مرض الموت میں اپنی زمین اپنے بھانجوں کو بطور فروخت کر دی ریٹ (قیمت) بھی طے ہوگیا اور 2000 دو ہزار روپے بطور ایڈوانس بھی دیئے گئے۔ اس وقت زمین کا ریٹ زیادہ تھا جبکہ سودے میں بہت کم لگایا گیا اور خریدار کی مصروفیت اور بیچنے والے کی بیماری کی شدت کی وجہ سے کھاتا (رجسٹری) منتقل ہونے سے رہ گیا ابھی تک کسی قسم کی تحریرات بھی نہیں ہوئیں۔ اب اللہ بچایو فوت ہوگیا اس کی بیوی نے دو ہزار روپے سوتی (ایڈوانس) والے واپس کر دیے بھانجوں نے واپس لے بھی لیے۔ وضاحت درکار ہے کہ شریعت محمدی کے مطابق

اس زمین کا مالک کون ہے؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مرحوم کا مرض الموت میں یہ سودا کرنا ناجائز ہے اس طرح سے وارث بعد میں فقر و فاقے کے اندر مبتلا ہوکر دوسروں کے آگے دست درازی کرنا، اس طرح آخری ایام میں مرحوم کے لیے ایسا کرنا غیر مناسب ہے۔ کیونکہ مرض الموت کے وقت صدقہ وغیرہ کرنا بھی ناجائز ہے کیونکہ اس طرح کرنے سے پچھلے ورثاء کو کچھ بھی نہ ملے گا اس لیے مرض الموت میں ہبہ اور وصیت بھی جائز نہیں ہے۔ حدیث مبارکہ میں ہے:

((عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ اشْتَكَى بِمَكَّةَ فَجَاءَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَلَمَّا رَآهُ سَعْدٌ بَكَى وَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَمُوْتُ بِالْأَرْضِ الَّتِيْ هَاجَرْتُ مِنْهَا قَالَ لَا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ وَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أُوْصِي بِمَالِيْ كُلِّهِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ لَا قَالَ يَعْنِي بِثُلُثَيْهِ قَالَ لَا قَالَ فَنِصْفُهُ قَالَ لَا قَالَ فَثُلُثُهُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الثُّلُثُ وَالثُّلُثُ كَثِيْرٌ إِنَّكَ أَنْ تَتْرُكَ بَنِيْكَ أَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِّنْ أَنْ تَتْرُكَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ .)) [1]

''سیدنا عامر بن سعد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ مکہ میں بیمار ہوئے اسی وقت ان کے ہاں رسول اکرم ﷺ تشریف لائے، جب سعد نے آپ کو دیکھا تو رونے لگے اور کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول ﷺ میں مرتا ہوں اسی جگہ جہاں سے ہجرت کر چکا تھا آپ ﷺ نے فرمایا: ان شاء اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہوگا اور کہا سعد نے کہ اے اللہ کے رسول ﷺ میں وصیت کرتا ہوں میرا سارا مال اللہ کی راہ میں دیا جائے آپ نے فرمایا سارے مال کی وصیت نہ کر پھر

---

[1] اخرجه البخاري، كتاب الوصايا، باب اما يترك ورثته، اغنياء۔ والنسائي كتاب الوصايا، باب الوصية، بالثلث واللفظ للنسائي۔

عرض کیا دو تہائی اس مال کی پھر آپ نے فرمایا نہ دو تہائی بھی نہیں۔ پھر پوچھا آدھا اس مال کا آپ ﷺ نے فرمایا آدھا بھی نہیں۔ پھر اس نے کہا تہائی مال آپ ﷺ نے فرمایا تہائی مال میں وصیت کر کیونکہ تہائی بھی بہت ہے۔ پھر آپ نے ان کو فرمایا وارث تیرے پیچھے غنی اور آسودہ رہیں یہ بات اچھی ہے یا کہ محتاج اور لوگوں کے دست نگر رہیں یہ بات اچھی ہے۔"

حالانکہ شریعت محمدی کبھی بھی ورثاء کو نقصان نہیں پہنچا سکتی جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے:

((عن عبادة بن الصامت ان رسول الله ﷺ قضى لا ضَرَرَ وَلا ضِرارَ.))

اسی طرح دوسری حدیث میں ہے:

((عن ابن عباس رضي الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ لا ضرر ولا ضرارا.))[1]

مذکورہ صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ مرض الموت میں کیا ہوا زمین کا سودا واپس ہونا چاہیے کیونکہ ان دنوں زمین کی قیمت زیادہ تھی تو کم قیمت میں کیسے فروخت کردی ہر باشعور انسان مہنگی چیز کو ستا کیسے فروخت کرے گا۔ دوسری بات یہ کہ ابھی زمین کی خرید وفروخت کی تحریرات بھی نہیں لکھی گئی اس میں دی گئی رقم بطور ایڈوانس بھی بہت کم ہے جو کہ غیر مناسب ہے۔ تیسری بات کہ اب تک رجسٹری وغیرہ بھی نہیں ہوئی، چوتھی بات کہ بیوہ نے ایڈوانس والی رقم واپس کردی اور بھانجوں نے وصول بھی کرلی۔ ان وجوہات کی بنا پر ثابت ہوتا ہے کہ اس سودے کو ختم کرکے واپس کیا جائے مرحوم کے لیے مرض الموت میں یہ فیصلہ کرنا بھی ناجائز تھا کہ آخری وقت میں اپنے ورثا کو لاوارث چھوڑ دے تاکہ دوسرے لوگوں کے سامنے دست درازی کرتے رہیں، لہٰذا یہ زمین اصل ورثاء کی ہی ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب

---

[1] رواه ابن ماجه، كتاب الاحكام، باب من بنى فى حقه ما يضر بجاره، رقم الحديث: ٢٣٤١.

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں مرحوم خدا بخش کی بیوی مسمات رحمت (عاقلہ بالغہ) نے گواہوں کے سامنے کچھ نقدی رقم لے کر باقی زمین اپنے سسر حاجی موسیٰ کو ہبہ کردی ہے۔ اس بات کو تقریباً 35 سال گزر چکے ہیں اور یہ زمین آگے حاجی موسیٰ کے ورثاء میں بھی تقسیم ہو چکی ہے جبکہ اب مسمات رحمت اس زمین کو واپس لینا چاہتی ہے آپ وضاحت کریں کہ آیا رحمت بی بی اپنی اس ہبہ کی ہوئی زمین کو واپس لے سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوھاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مسمات رحمت ہبہ کی ہوئی زمین دوبارہ واپس نہیں لے سکتی نہ ہی یہ جائز ہے۔

((عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ العائد فی هبته کالکلب یقئی ثم یعود فی قیئه .)) (متفق علیه)

((عن ابن عمرو ابن عباس رضی اللہ عنہما عن رسول الله ﷺ: قال لا یحل للرجل ان یعطی العطیة ثم یرجع فیها إلا والد فیما یعطی ولد .)) (رواه احمد)

’’کسی مسلمان کے لیے حلال (جائز) نہیں کہ وہ عطیہ (تحفہ، بخشش) دے کر دوبارہ اسے واپس لے سوائے والد کے وہ اپنی اولاد کو کوئی چیز دے کر واپس لے سکتا ہے۔‘‘

هذا هو عندی والعلم عند ربی

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حاجی یونس (والد) نے اپنی زندگی میں کچھ بیٹوں اور بچیوں کے نام جائیداد کروائی اور چند بیٹوں اور بیٹیوں کو کچھ بھی نہیں دیا، اب عرض یہ ہے کہ وضاحت کریں کہ کچھ اولاد کو دینا اور کچھ کو محروم رکھنا شریعت محمدیہ کے مطابق صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: حدیث میں ہے کہ:((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: سَوُّوا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ فِي الْعَطِيَّةِ......الخ .))

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہبہ کرنے میں اپنی اولاد کے مابین برابری کرو۔'' لہٰذا معلوم ہونا چاہیے کہ مذکورہ تقسیم اور ہبہ صحیح نہیں ہے اگر کوئی آدمی اپنی زندگی میں ہی اپنی ملکیت اولاد میں تقسیم کرنا چاہے تو بیٹیوں اور بیٹوں کو ایک جیسا برابر برابر دے اس کے علاوہ تقسیم کے سارے طریقے درست نہیں ہے۔ اس لیے مرحوم کی زندگی میں تقسیم کی ہوئی ملکیت میں سب بہن بھائی برابر کے وارث بنیں گے۔

جیسا کہ دوسری حدیث مبارکہ میں بیان فرمایا ہے:

((عَنِ النُّعْمَانَ بْنِ بَشِيْرٍ اَنَّ اَبَاهُ نَحَلَهُ غُلَامًا وَاَنَّهُ جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ يَشْهَدَهُ فَقَالَ اَكُلَّ وَلَدِكَ نَحَلْتَهُ قَالَ لَا قَالَ فَارْدُدْهُ .))

(رواه ابن ماجه)

''نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے والد نے ان کو ایک غلام بطور ہبہ دیا، پھر اس بات پر نبی کریم ﷺ کو گواہ بنانے کے لیے آئے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا سب بچوں کو ہبہ کی ہے تو عرض کی کہ نہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس ہبہ کو رد کرتا ہوں۔''

هذا هو عندي والعلم عند ربي

❀❀❀❀

سوال : ❶ ...... کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ بنام سومر نے اپنی زندگی میں ہی 1960 میں اپنے تین بیٹوں ملوک، سلیمان، گلن میں زمین تقسیم کردی تھی۔ ہر ایک بیٹے کو 43 ایکڑ ملی، اس کے بعد ملوک فوت ہوگیا اور زمین کے کھاتے 1974ء میں بیٹوں کے نام ہوئے تھے، بعد میں محمد ملوک کا بیٹا مولا بخش کہتا ہے اس زمین میں میرا بھی حق ہے کیونکہ میں نے جدا 16 ایکڑ خرید کر اپنے دادے سومر خان کے نام لکوائی تھی چونکہ یہ کھاتا

میرے دادے کا تھا اس لیے مجھے نہیں ملی، دوسرے دونوں فریقین کا کہنا ہے کہ یہ زمین دادا سومر کی ملکیت میں ہے۔ یہ بیانات دونوں فریقین کی موجودگی میں لیے گئے ہیں؟

❷...... میاں مولا بخش دارالعلوم سے جو تحریر لے کر آیا ہے اس میں صرف ایک گروہ کا سوال مذکورہ ہے جب دوسرا گروہ سامنے آیا تو پھر سوال کی وضاحت ہوگئی۔ اب وضاحت سے بتائیں کہ شریعت محمدی موجب ان 16 ایکڑ کا حقیقی حق دار کون ہے؟

الجواب بعون الوهاب: ❶......معلوم ہونا چاہیے کہ جب سومر خان نے 1960ء میں اپنے بیٹوں میں زمین تقسیم کی تھی اس وقت مولا بخش اپنے دادے سے اپنی زمین لے لیتا، لیکن اس وقت بھی نہیں لی جب کہا گیا کہ گواہ لاؤ تو گواہ بھی پیش نہیں کیے، پھر جب زمین کی تقسیم 1960ء میں ہوئی اور 1974ء میں کھاتے بھی ہوگئے اگر اس کا حق ہوتا تو اتنا عرصہ خاموش کیسے بیٹھا رہا اپنا حق طلب کیوں نہ کیا اور پھر ورثاء نے صحیح (دستخط) وغیرہ کیے تو کھاتے بنے ہیں اگر اس کا حق ہوتا تو دستخط نہ کرتا، گواہ بھی پیش کرتا، دوسری بات کہ وہاں کھاتا دوسری زمین کا ہے جو کہ دوسرے کے حصے میں ہے وہ زمین اپنے کھاتے میں کروائے اسی کا کھاتا بنے گا باقی اس زمین کا کھاتا نہیں بنتا۔

❷......مولا بخش نے جو تحریر مدرسہ دارالعلوم سے لکھوائی ہے اس میں سوال صرف اپنے حق اور فائدے میں لکھوایا ہے اور یہ سوال سراسر (بالکل) غلط ہے اس لیے جب سوال غلط لکھوایا تو جواب بھی غلط ہوجائے گا۔

مذکورہ وجوہات کی بناء پر مولا بخش کا حق معلوم نہیں ہوتا شریعت محمدی کے مطابق مولا بخش 16 ایکڑ زمین کا حق دار نہیں ہے۔ هذا هو عندي والعلم عند ربي

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ عبدالمجید فوت ہوگیا اور اس کے بھائی نے عبدالمجید کی بیوی کو کہا کہ میں اس کو نئی جگہ بنا کر دیتا ہوں پھر جو تیری جگہ ہے وہ تجھے دوں گا۔ جس میں عبدالمجید کی بیوہ کو تقریباً 9 سال ہوئے ہیں جو اس گھر میں رہتی ہے اب عبدالمجید کے بھائی فوتی کی بیوہ کو یہ گھر نہیں دیتے۔ عبدالمجید کے ورثاء میں

سے ایک بیوی دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بینوا وتوجروا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے فوتی کی ملکیت میں سے کفن دفن پر خرچ کیا جائے گا پھر اس کے بعد قرضہ ہے تو اس کو پورا کیا جائے گا پھر اگر وصیت ہے تو اس کو بھی ثلث مال سے ادا کیا جائے گا۔ فوتی عبدالمجید اپنے ہی گھر میں رہائش پذیر ہے جس کی جگہ بھی الگ ہے جس کے مالک اب اس کی بیوی اور اس کی اولاد ہے۔ جب فوتی کے بھائی نے وعدہ کیا کہ جگہ بنا کے دوں گا اور اس میں فوتی کی بیوی بھی تقریباً 9 سال رہی ہے اپنے بچوں کے ساتھ اس لیے اس کے مالک بھی وہی بنیں گے۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد نظام تقسیم

کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5

دو بیٹے عصبہ 58.333 فی کس 29.166

2 بیٹیاں عصبہ 29.166 فی کس 14.583

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص حکیم نامی فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں سے دو بیٹے حاجی مٹھو اور حاجی میو اور دو بیٹیاں مسمات بھراں اور بختاور چھوڑے اس کے بعد حاجی مٹھو فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں سے دو بیٹے حاجی حسین اور دوسرا گونگا نامی تھا اور آٹھ بیٹیاں چھوڑیں اس کے بعد حاجی میو فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں سے ایک بیوی اور دو بھتیجے چھوڑے۔ شریعت محمدی کے مطابق بتائیں ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا۔ بینوا وتوجروا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے میّت کی ملکیت سے کفن

ودفن کا خرچہ پورا کیا جائے گا اس کے بعد اگر قرضہ ہے تو اس کو پورا کیا جائے گا پھر اگر وصیت ہے تو اس کو ثلث مال سے ادا کیا جائے گا۔ پھر منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر اس کے ورثاء میں اس طرح تقسیم کی جائے گی۔

ورثاء:	بیٹا مٹھو	بیٹا میوو	بیٹی بھراں	بیٹی بخاور
	5 آنہ 4 پائی	5 آنہ 4 پائی	2 آنہ 8 پائی	2 آنہ 8 پائی

اس کے بعد حاجی مٹھو فوت ہوگیا جس کی کل ملکیت کو ایک روپیہ قرار دیا گیا۔

ورثاء: 2 بیٹے- 2 آنہ 8 پائی ہر ایک کو- اور آٹھ بیٹیاں- 10 آنہ پائی مشترکہ

اس کے بعد میوو خان فوت ہوگیا جس کی کل ملکیت کو ایک روپیہ قرار دیا گیا۔

ورثاء:	ایک بیوی	دو بھتیجے
	4 آنہ	12 آنہ مشترکہ

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

میت عبدالحکیم کل ملکیت 100

2 بیٹے	66.66	فی کس	33.33
2 بیٹیاں	33.34	فی کس	16.67

میت حاجی مٹھو کل ملکیت 33.33

2 بیٹے	11.11	فی کس	5.555
8 بیٹیاں	22.22	فی کس	2.777

میت حاجی میوو کل ملکیت 33.33

1 بیوی $\frac{1}{4}$	8.33		
2 بھتیجے عصبہ	25	فی کس	12.5

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مرحوم محمود کی دو بیویاں ہیں ایک بیوی سے دو بیٹے محمد عثمان اور محمد عمر تھے۔ دوسری میں سے تین بیٹے محمد حسن عبدالواحد، رمضان اور ایک بیٹی مسمات سارہ ہیں۔ اس کے بعد محمد عثمان فوت ہوگیا مرحوم نے وفات سے پہلے اپنی ملکیت اپنے بھتیجے کو ہبہ کردی تھی۔ وضاحت کریں کہ شریعت محمدی کے مطابق یہ ہبہ برقرار رہے گا یا دوسرے ورثاء کو بھی حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ہبہ برقرار رہے گا اگر مرحوم نے ساری ملکیت اپنی زندگی میں اپنے بھتیجے کو ہبہ کردی تھی تو اس ساری جائیداد کا مالک محمد عمر کا بیٹا یعنی مرحوم کا بھتیجا ہی رہے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

❀❀❀❀

سوال: ❶...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ بنام قاضی غلام مصطفیٰ نے اپنی زندگی میں صحت اور تندرستی کی حالت میں صاف ستھری تحریر لکھ کر دی کہ میں اپنی جائیداد تین بیٹیوں کو ہبہ کرتا ہوں، ہبہ کی ہوئی ملکیت بیٹیوں کے قبضہ میں بھی آ گئی، یہ ملکیت غلام مصطفیٰ مرحوم کی ذاتی ملکیت تھی؟

❷...... قاضی غلام مصطفیٰ نے وفات کے وقت ورثاء میں دو بیٹیاں، ایک بیوی، اور ایک بھائی، اب وضاحت کریں کہ شریعت محمدی کے مطابق ملکیت کا حقدار کون ہے؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے ملکیت میں سے مرنے والے کے کفن دفن کا بندوبست کیا جائے پھر اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے۔ اس کے بعد اگر وصیت کی ہے تو کل ملکیت کے تیسرے حصے کے برابر وصیت پوری کی جائے، مرحوم نے اپنی ملکیت تندرستی اور حیاتی میں تین بیٹیوں کو ہبہ کردی تھی وہ تینوں اس کی وارث بنیں گی، مذکورہ ہبہ برقرار رہے گی اس لیے جو ملکیت ہبہ کی گئی ہے وہ صرف تین بیٹیوں کو ہی دی جائے گی، کیونکہ مرحوم کی ہبہ کرنے کے بعد وہ ملکیت بچیوں کے قبضہ میں بھی آ گئی ہے، اس لیے یہ وصیت برقرار رہے گی۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ ایک جگہ جو کہ رہائش والی ہے اور ایک دکان اپنی بیوی کے نام پر ہبہ کروا کر گورنمنٹ سے کھاتے بھی کروادی، دکان کا کرایہ وغیرہ مرحوم خود ہی وصول کیا کرتا تھا اب اس مکان میں موجود سارا سامان اس بیوی کا تصور کیا جائے گا یا وہ سامان وارثوں میں تقسیم کیا جائے گا، اسی طرح ایک اور مکان بھی تھا جو کہ مرحوم اور اس کی بہن کے نام تھا مرحوم نے یہ مکان اپنے بھانجوں کے نام کیا ہوا ہے اس مکان میں ابھی تک کوئی بھی رہائش پذیر نہیں ہے۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق یہ سامان وغیرہ ہبہ ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مرحوم نے جو مکان ہبہ کیا تھا وہ بحال اور برقرار رہے گا باقی اگر مرحوم نے سامان بھی ہبہ کر کے دیا تھا اور اس کی تحریر یا گواہ موجود ہیں تو پھر یہ سامان بھی ہبہ میں شمار ہوگا اور اگر تحریر یا گواہ موجود نہیں ہیں تو پھر یہ سامان ورثا میں تقسیم کیا جائے گا اور اگر مرحوم نے اپنی اشیا ہبہ کر کے دی ہیں تو پھر یہ ہبہ برقرار رہے گی۔ باقی جو علماء کرام قبضہ میں ہونے کی شرط لگاتے ہیں وہ غلط ہے اور وہ اپنے اس قول کی دلیل اس حدیث کو پیش کرتے ہیں: ((لا تجوز الهبة إلا مقبوضة .)) یہ حدیث ضعیف ہے جیسا کہ علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الاحادیث الضعیفہ والموضوعہ ص ۳۶۰ میں فرمایا ہے کہ ”لا اصل لہ مرفوعا وانما رواہ عبد الرزاق من قول النخعی کما ذکرہ الذیلعی فی نصب الرایۃ ٤/ ١٢١“ اس میں ثابت ہوتا ہے کہ قبضہ شرط نہیں اسی طرح ایک اور حدیث مبارکہ میں ہے:

((ان المسور بن مخرمة رضی اللہ عنہ ومروان اخبره ان النبی ﷺ حين جاءه وفد هوازن قام فی الناس فاثنى على الله بما هو اهله ثم قال: اما بعد فان اخوانكم جاؤنا تائبين وإني رأيت أن أرد إليهم سهم فمن أحب منكم ان يطيب ذلك فليفعل ومن أحب أن يكون على حظه حتى نعطيه اياه من اوّل ما يفيى الله

علينا فقال الناس قد طيبنا ذلك يا رسول الله .)) ❶

''عروہ بیان کرتے ہیں بے شک مسور بن مخرمہ اور مروان بن حکم نے انھیں خبر دی کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں قبیلہ ہوازن کا وفد مسلمان ہوکر حاضر ہوا۔ نبی کریم ﷺ کھڑے ہوئے لوگوں میں (خطاب کیا) اللہ کی شان کے مطابق اس کی حمد وثنا بیان کی، پھر فرمایا: اما بعد! یہ تمھارے بھائی توبہ کرکے مسلمان ہوکر تمھارے پاس آئے ہیں اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ میں ان کا حصہ (قیدی اور مال و دولت) واپس کردوں۔ اب جو شخص خوشی کے ساتھ ایسا کرنا چاہے وہ کرے اور جو شخص چاہتا ہے کہ اس کا حصہ باقی رہے یہاں تک کہ جب اس کو (قیمت کی شکل) میں اس وقت واپس کردیں جب اللہ تعالیٰ سب سے پہلا مال غنیمت کہیں سے دلا دے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم بخوشی دل سے اس کی اجازت دیتے ہیں۔''

اس میں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ قبضہ شرط نہیں ہے اگر قبضہ شرط ہوتا تو ان صحابہ نے قبضہ میں نہیں لیا تھا، پھر واپس کیسے کردیا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قبضہ شرط نہیں ہے اسی طرح الروضۃ الندیہ ص ۱۶۵ میں ہے: ''ولا حجة لمن اشترط القبض في الهبة .''

هذا هو عندي والعلم عند ربي

❖❖❖❖

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ حاجی عبداللہ اور منشی غلام محمد میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی کپاس کی رقم کا چیک سیٹھ عبدالشکور کی طرف سے ملا دونوں چیک لے کر بینک میں آئے اور -/18000 روپے لیے اور غلام محمد مصطفیٰ نے اور حاجی عبداللہ نے -/1000 ایک ہزار روپے لیے۔ منشی غلام محمد کے پاس کھلے پیسے تھے جو اس نے -/2000 دو ہزار روپے والی دستیاں حاجی عبداللہ کے رومال میں باندھ دیں، باقی پیسے اپنے پاس رکھے

❶ صحيح بخاري، كتاب الوكالة، باب نمبر ٧، رقم الحديث ٢٣٠٧، ٢٣٠٨.

اس کے بعد دونوں سیٹھ جمیل کی دکان پر آ گئے۔ عبداللہ کا گاہک حاجی صاحب آیا اور حاجی عبداللہ سے پیسے مانگے جس پر حاجی عبداللہ نے رومال میں سے اس کے -/1000 ایک ہزار والی دستی نکال دی اور باقی بدھے پیسے دے دیے جس پر منشی غلام نے کہا کہ میں حاجی صاحب کو کھلے پیسے دیتا ہوں منشی غلام محمد نے -/5000 پانچ ہزار حاجی صاحب کو دیے جس کے بعد دونوں وہیں بیٹھے رہے اور رومال والی رقم جو کہ باندھی ہوئی تھی جس میں -/4000 حاجی عبداللہ کے اور -/7000 منشی غلام محمد کے تھے دونوں کے درمیان سے وہ رومال چوری ہو گیا چھان بین کی گئی مگر رقم واپس نہیں مل سکی۔ بتائیں کہ شریعت کے مطابق پیسے کس کو دینے پڑیں گے؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ایک امانت تھی اگر امانت چوری ہو جاتی ہے تو وہ بھروائی نہیں جاتی۔ ((وروى عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده ان النبي ﷺ قال من أودع وديعة فلا ضمان عليه .)) (رواه ابن ماجه، كتاب الصدقات، باب الوديعة، رقم الحديث : ٢٤٠١)

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے جسے امام بیہقی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((لا ضمان على مؤتمن .)) (دارقطنی، کتاب البيوع) کہ جس کے پاس امانت رکھوائی گئی ہے اس پر کوئی چٹی نہیں اور نہ ہی اس سے بھروائی جائے گی۔

یعنی منشی غلام محمد اور حاجی عبداللہ میں سے کسی پر بھی اس رقم کو بھرنا لازم نہیں آتا۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ سلیمان نے بیماری کی حالت میں اپنی ملکیت اپنی بیوی کو ہبہ کر دی تھی اسی بیماری میں سلیمان فوت ہو گیا۔ وضاحت کریں کہ شریعت محمدی کے مطابق یہ ہبہ (بخشش) جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ بیماری کی حالت میں ہبہ وصیت کے حکم میں تبدیل ہو جاتی ہے یعنی وہ ہبہ نہیں رہتا باقی یہ وصیت ہو گی اور وصیت وارث کے حق

میں جائز نہیں ہوتی۔ باقی غیر وارث کو اس طرح کی ہوئی وصیت سے ثلث ملتا ہے۔ اس لیے یہ ہبہ شمار نہ ہوگی اور نہ ہی بیوی کو یہ ملکیت ملے گی حدیث مبارکہ میں ہے: ((لا وصية لوارث.)) ❶ ''وصیت وارث کے لیے نہیں۔''

هذا هو عندي والعلم عند ربي

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مرحوم سوزل کے چھ بیٹے جان محمد، خدا بخش، محمد یوسف، محمد یعقوب، جڑیو، محمد حیات اور ایک بیٹی تھے، سوزل کی موجودگی میں ہی بیٹی اور دو بیٹے جان محمد اور خدا بخش وفات پا گئے اسی طرح سوزل کی بیوی بھی سوزل کی زندگی میں ہی وفات پا گئی، سوزل کے پاس گھر کا ایک پلاٹ ہے جس پر سوزل کا پوتا دودو ولد جان محمد قابض ہے، بتائیں کہ اس پلاٹ کا حقیقی وارث کون ہے؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مذکورہ سوال کے مطابق سوزل دادا ہے اور دودو اس کا پوتا ہے لہٰذا شریعت محمدی کے مطابق پوتا (دودو) اپنے دادا کی وراثت کا شرعی مالک نہیں ہے، اس لیے وہ پلاٹ دودو کو نہیں ملے گا اور اس پلاٹ کے حقیقی وارث اس کے بیٹے ہیں اس لیے یہ پلاٹ سوزل کے بیٹوں میں برابر تقسیم کیا جائے گا یعنی یہ پلاٹ یوسف، یعقوب جڑیو، محمد حیات کو دیا جائے گا۔ باقی باپ کی زندگی میں ہی فوت ہونے والے لڑکوں اور اس کے پوتوں کو (زندہ) بیٹوں کی موجودگی میں حصہ نہیں ملا کرتا۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ پانچ بھائی تھے جو ہندوستان سے ہجرت کرکے آئے تھے جو ملکیت تھی دے کر پاکستان میں ہر ایک نے برابر حصہ لیا۔

---

❶ ترمذي، كتاب الوصايا، باب ما جاء لا وصية لوارث، رقم الحديث: ٢١٢٠۔ نسائي، كتاب الوصايا، باب ابطال الوصية للوارث، رقم الحديث: ٣٦٧١.

ساری ملکیت کے برابر برابر حصے علیحدہ علیحدہ تقسیم ہوئے۔ جن میں سے 4 بھائیوں کی اولاد تھی باقی ایک بھائی بنام سلطان کی اولاد نہ تھی۔ سلطان اپنے بھتیجے عبدالرشید کے ساتھ رہتا تھا عبدالرشید نے اپنے چچا کو والد کی طرح عزت وتکریم کی اور اپنے گھر کا بڑا (سربراہ) مقرر کیا اس کے بعد عبدالرشید محنت مزدوری کرتا رہا اور اپنی محنت میں سے کافی ملکیت جمع کی لیکن چونکہ عبدالرشید نے اپنے گھر کا سربراہ اپنے چچا سلطان کو بنایا تھا اس لیے ساری ملکیت بھی اسی کے نام کروا دی تھی اب سلطان کی وفات کو 22 سال گزر گئے ہیں اور سلطان کے دیگر بھتیجے بھی اپنے حصے کا دعویٰ نہیں کر رہے ہیں جبکہ اب ایک بھتیجا سلیم خان کا کہنا ہے کہ اس ملکیت میں میرا بھی حصہ ہے جبکہ باقی سب بھتیجے خاموش ہیں اور اس چیز کے گواہ بھی ہیں کہ یہ ملکیت سلطان کی اصل ملکیت نہیں بلکہ عبدالرشید نے اپنی محنت سے کما کر اپنے چچا کے نام پر کروائی تھی۔ وضاحت کریں کہ اس ملکیت میں سے دوسرے بھتیجوں کو یا ان کی اولاد کو کتنا حصہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سلطان کی ساری جائیداد عبدالرشید کی ہی ہے کیونکہ سلطان نے عبدالرشید کو جائیداد کا وارث بنایا اس کو ہبہ کر دی اور جو بھی ملکیت جمع ہو عبدالرشید کی ملکیت میں سے جمع ہوئی دوسری بات کہ عبدالرشید کو سلطان نے اپنی ملکیت کا وارث بنایا جس کا فارم بھی موجود ہے تیسری بات کہ اس کے گواہ بھی موجود ہیں کہ یہ ملکیت عبدالرشید کی ہے اس کی کمائی سے بنی ہے جبکہ سب کے سب جدا تھے اور سلطان کی وفات کو بھی ایک بڑا عرصہ 22 سال گزر گئے جس دوران کسی نے مطالبہ کیا جس سے ساری بات واضح ہو جاتی ہے پھر سلطان کے باقی بھتیجے اپنے حصے طلب نہیں کر رہے ہے صرف سلیم خان مانگ رہا ہے تو اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس ملکیت میں سلیم خان کا کوئی حصہ نہیں ہے اور پھر یہ ملکیت عبدالرشید نے اپنی کمائی سے بنائی ہے اور صرف گھر کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے چچا سلطان کے نام کروائی ہے اکبر اور شوکت کا بھی اس میں حصہ معلوم نہیں ہو رہا جب ان کے والد نے حصہ نہیں لیا تو پھر اس کے بیٹے کیسے مطالبہ کر رہے ہیں۔ لہٰذا ساری جائیداد کا وارث

صرف اور صرف عبدالرشید ہے۔ هذا هو عندي والعلم عند ربي

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زمین کا سودا ہوا -/84000 چوراسی ہزار میں، ساتھ ہی خریدار نے وعدہ کیا کہ آپ جب بھی زمین چھڑوانا چاہیں ایک لاکھ روپیہ دے کر چھڑوائیں گے باقی میں نے جو فصل اٹھائیں وہ میری ہوں گی یہ بات گواہوں کی موجودگی میں ہوئی پھر جب دو سال کے بعد زمین کو بیچنے والے نے خریدار کو کہا کہ اپنے وعدے کے مطابق رقم لو اور ہماری زمین واپس کرو تو خریدار کہنے لگا اگر مجھے تنگ کرو گے تو میں آگے کسی اور کو فروخت کر دوں گا۔ پھر اثر ورسوخ والے لوگوں کو کہا گیا کہ خریداروں کو بلائیں اور ان کے بیان لیں تو خریداروں نے کہا کہ 6 مہینے کا وعدہ تھا جو کہ گزر گیا جس پر گواہوں کو طلب کیا تو انھوں نے گواہی دی کہ 2 سال کا وعدہ تھا اور خریدنے والے نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تم بذات خود اپنے لیے واپس لینا چاہو تو میں دے دوں گا اور اگر کسی اور کے لیے لو گے تو نہیں دوں گا۔ اب خریدار قسم اٹھانے کے لیے بھی تیار ہیں آپ بتائیں کہ قسم کس سے لی جائے گی خریدار سے یا فروخت کرنے والے سے؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ قسم اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ فروخت کرنے والوں کے پاس گواہ موجود ہیں اس لیے قسم کی ضرورت نہیں ہے البتہ اگر گواہ موجود نہ ہوتے پھر قسم کی ضرورت پڑتی جو کہ مدعا علیہ (فروخت کرنے والے) پر آتی جیسا کہ حدیث مبارکہ ہے: ((البينة للمدعي.)) (اخرجه الترمذي، كتاب ما جاء في ان البينة على المدعي واليمين على المدعى عليه، رقم الحديث: ١٣٤١)

''دعویٰ کرنے والے کے پاس گواہ ہوں اگر گواہ نہیں تو پھر مدعا علیہ پر قسم اٹھانا ہے۔ اس صورت میں خریدار سے قسم نہیں لی جائے گی۔ دعویٰ کرنے والا خریدار ہے اور اور گواہ موجود ہیں اس صورت میں اگر قسم لی بھی جائے تو مدعا علیہ فروخت کرنے والے پر آتی، بہرحال گواہوں کی گواہی پر اعتماد ہوگا۔ هذا هو عندي والعلم عند ربي.

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کرڑ خان فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں سے ایک بیٹا محمد بخش تین بیٹیاں اور ایک بیوی مسمات سکھڑ اس کے بعد سکھڑ کی اس کے بھائی بلوچ خان سے شادی ہوئی جس سے اس کو ایک بیٹی مسمات تمبل پیدا ہوئی جب سے بلوچ خان کی وفات ہوئی اس وقت سے تمبل کی پرورش اس کے اخیافی بھائی محمد بخش نے کی ہے حالانکہ تمبل کا چچا لال محمد بھی ہے مگر انھوں نے اس کی کوئی دیکھ بھال یا پرورش نہیں کی اس وقت لال محمد کا خیال ہے کہ مسمات تمبل کے نکاح کے لیے ولی وارث میں ہی بنوں اور دوسری محمد بخش جو تمبل کا اخیافی بھائی بھی ہے اور آج تک اس کی پرورش بھی کی ہے بتائیں کہ صورت مذکورہ کے مطابق مسلمات تمبل کے نکاح کا ولی وارث اس کا چچا لال محمد بنے گا یا اس کا اخیافی بھائی محمد بخش کا دوسرا کہ بلوچ خان کی وراثت کس طرح تقسیم ہوگی۔ بینوا توجروا؟

الجواب بعون الوهاب بشرط صحت سوال: معلوم ہونا چاہیے کہ صورت مذکورہ میں مسمات تمبل کے نکاح کا ولی اس کا اخیافی بھائی محمد بخش ہے اور اس کے چچا لال محمد کو نکاح کرانے کا کوئی حق نہیں ہے ایک تو محمد بخش ولی اقرب ہے دوسرا کہ نکاح کی ولایت کے لیے ولی کی شفقت اور خیر خواہی مشروط ہے لال محمد کے اندر دونوں شرائط نہیں ہیں اس لیے نکاح کرانے کا حقدار محمد بخش ہے۔

دلیل اوّل:...... بحوالہ فقہ السنہ صفحہ ۱۳۲۔ ”ولا شك ان بعض القرابة ادخل فى هذا الامر من بعض فالاباء والابناء اولى من غيرهم ثم الاخوة لابوين ثم الاخوة لاب او الام ثم اولاد البنين واولاد البنات ثم اولاد الاخوة واولاد الاخوات ثم الاعمام والاخوال ثم هكذا من بعد هولاء.“

دلیل ثانی:...... بحوالہ فتاویٰ نذیریہ ج۲ ”قال سئل السلام اخرج سفيان فى حامله ومن طريقة الطبرانى فى الاوسط باسناد حسن عن ابن عباس رضی اللہ عنہما

بلفظ لا نکاح الا بولی مرشد او سلطان۔"

بلوچ خان کی ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر اس کی بیوی کو آٹھواں حصہ یعنی (۲) آنے دیے جائیں گے۔ باقی (14) آنوں کو دو حصوں میں کر کے (7) آنے اس کی بیٹی تہیل کو دیے جائیں گے اور سات آنے میّت کے بھائی لال محمد کو دیے جائیں گے جبکہ اس کا بھتیجا محمد بخش محروم رہے گا۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100 روپے

بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5

بیٹی $\frac{1}{2}$ 50

بھائی عصبہ 37.5

بھتیجا محروم

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ برادی فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک بیوی 4 بیٹے 2 بیٹیاں اور بھائی بتائیں کہ شریعت محمدیہ کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے مرحوم کی ملکیت میں سے اس کا کفن دفن کریں پھر اگر قرض ہو تو اسے ادا کریں اس کے بعد اگر کوئی وصیت کی ہو تو کل مال کے تیسرے حصے میں سے پوری کی جائے اس کے بعد باقی مال منقولہ یا غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح سے تقسیم کیا جائے گا۔

مرحوم برادی ملکیت 1 روپیہ 2 بیٹوں 16 پیسے

وارث: بیوی کو 12 پیسے، 4 بیٹے 68 پیسے، بھائی محروم

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5

4 بیٹے عصبہ 70 فی کس 17.5

بھائی محروم

دو بیٹیاں عصبہ 17.5 فی کس 8.75

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص بچل نامی فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک بیٹا غلام محمد اور دو بیٹیاں بیبان اور سونی اس کے بعد غلام محمد وفات پا گیا۔ مرحوم غلام محمد نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے سلیمان کو کچھ زمین کا ٹکڑا کھاتے کروا کر دے دیا تھا اور سلیمان اپنے والد کی حیاتی میں ہی فوت ہوگیا اور سلیمان کے درج ذیل وارث ہیں: ماں باپ دو بیویاں 4 بہنیں اور دو چچا زاد کزن، پھر غلام محمد فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے 4 بیٹیاں فاطمہ، رحیماں، مھنو، چھانی، اور ایک بیوی اور دو بھتیجے الھڈنو اور خیر محمد۔ اس کے بعد غلام محمد کی بیوی مسمات حوا کا انتقال ہوگیا جس نے وارث چھوڑے خاوند، 4 بیٹیاں، بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے، پھر اگر قرض ہو تو اسے ادا کیا جائے اور پھر اگر وصیت کی ہے تو سارے مال کے تیسرے حصے تک سے پوری کی جائے اس کے بعد مرحوم کی باقی ملکیت منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر مرحوم کے وارثوں میں اس

طرح سے تقسیم کی جائے گی۔

مرحوم بچو کل ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیٹا غلام محمد بیٹی بیبان بیٹی سونی

8 آنے 4 آنے 4 آنے

غلام محمد فوت ہوا ملکیت 8 آنے

بیوی کو ایک آنہ۔ وارث چاروں بیٹیوں کو مشترک 5 آنے 4 پائیاں، بھتیجا خیر محمد 10 پائی، بھتیجا اللہ ڈنو 10 پائی۔

پھر مسمات حوا فوت ہوگئی جس کی کل ملکیت کو ایک روپیہ قرار دیا جائے۔

وارث: 4 بیٹیوں کو 8 پائی اور 10 آنے مشترکہ اور خاوند کو 4 پائی اور 4 آنے۔

نوٹ:...... غلام محمد نے جو ملکیت اپنے بیٹے سلیمان کے نام کروائی تھی اس میں سے سلیمان کے وارثوں میں تقسیم کی جائے گی۔

مرحوم سلیمان کل ملکیت 1 روپیہ

وارث	پائیاں	آنے
باپ	08	09
ماں	08	02
دو بیویاں مشترکہ	00	04
چار بہنیں	محروم	
دو چچازاد	محروم	

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

میت بچو کل ملکیت 100

غلام محمد 1 بیٹا عصبہ 50

(بیبان، سونی) 2 بیٹیاں عصبہ 50 فی کس 25

میت بیٹا غلام محمد کل ملکیت 50

4 بیٹیاں $\frac{2}{3}$ 33.333 فی کس 8.333

2 بھتیجے عصبہ 16.667 فی کس 8.333

میت حوا کل ملکیت 100

خاوند $\frac{1}{4}$ 25

4 بیٹیاں $\frac{2}{3}$ 75 فی کس 18.75

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ جان محمد فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک بیٹا، ایک بیٹی اور ایک بیوی، اس کے بعد بیٹا فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے پانچ بیٹے ایک بیوی، دو بیٹیاں بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے سب سے پہلے مرحوم کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے دوسرے نمبر پر اگر میت پر قرض تھا تو اسے ادا کیا جائے۔ تیسرے نمبر پر اگر جائز وصیت کی تھی تو اسے سارے مال کے تیسرے حصے تک سے ادا کی جائے پھر بقیہ ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح سے تقسیم ہوگی۔

فوت ہونے والا جان محمد کل ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیوی 2 آنے، بیٹا 9 آنے 4 پائی بیٹی 4 آنے 8 پائی۔

فوت ہونے والا دھنی بخش کی کل ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیوی 2 آنے، 4 بیٹوں میں سے ہر ایک کو 2 آنے 4 پائی، دونوں بیٹیوں میں سے ہر ایک کو 1 آنے 2 پائی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وان كان لكم ولد فلهن الثمن﴾ (النساء)

قولہ تعالیٰ:﴿للذکر مثل حظ الانثیین﴾ (النساء)

هذا هو عندي والعلم عند ربي

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ بنام یار محمد فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے 2 بیٹے عمر اور عیسیٰ، ایک بیٹی راجبائی بیوی رانی، اس کے بعد عیسیٰ فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک سگا بھائی عمر اور تین بیٹیاں سنگھار، آمنت، مریم اور بیوی فاطمہ، اخیافی بھائی اور اخیافی بھائی کے دو بیٹے رمضان اور ارباب۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک وارث کو کتنا حصہ ملے گا۔

الجواب بعون الوهاب: فوت ہونے والا یار محمد کل ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیٹا عمر	بیٹا عیسیٰ	بیٹی راجبائی	بیوی رانی
5 آنے 7 پائی	5 آنے 7 پائی	2 آنے 10 پائی	صرف 2 آنے

اس کے بعد عیسیٰ فوت ہوا۔ کل ملکیت 5 آنے 7 پائی

وارث: بیوی فاطمہ	3 بیٹیاں	سگا بھائی عمر	اخیافی بھائی کی اولاد
$8\frac{1}{2}$ پائی	3 آنے 9 پائی مشترکہ	$13\frac{1}{2}$ پائی	محروم

الاحیاء

عمر	راجبائی	رانی	فاطمہ
6 آنے $8\frac{1}{2}$ پائی	2 آنے 10 پائی	2 آنے	$8\frac{1}{2}$ پائی

مریم	سنگھار	آمنت
1 آنہ 3 پائی	1 آنہ 3 پائی	1 آنہ 3 پائی

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ نظام تقسیم

میت یار محمد کل ملکیت 100

2 بیٹے عصبہ 70 فی کس 35

1 بیٹی عصبہ 17.5

بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5

ایک بیٹا محمد عیسیٰ فوت کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5

3 بیٹیاں $\frac{2}{3}$ 66.66 فی کس 22.22

سگا بھائی عصبہ 20.9

اخیافی محروم

❊❊❊❊

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ لطف علی اور بلوچ خان دونوں بھائی تھے۔ بلوچ خان فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک بیٹا دودا، اس کے بعد دودا فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے 4 بیٹے غلام شاہ، غلام اللہ، غلام حسین، ابراہیم، اس کے بعد غلام اللہ فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے دو بیٹے خدا بخش اور دودا، ایک بیٹی اور ایک پوتا، اس وقت بلوچ خان کے علاوہ کوئی بھی وارث نہیں ہے۔ شریعت محمدی کے مطابق وضاحت کریں؟

الجواب بعون الوهاب: سب سے پہلے فوت ہونے والے کی ملکیت سے اس کا کفن دفن کیا جائے پھر اگر میت پر قرض تھا تو اسے ادا کیا جائے تیسرے نمبر پر اگر جائز وصیت کی تھی تو اسے ساری جائیداد کے تیسرے حصے سے ادا کی جائے اس کے بعد ساری ملکیت منقول خواہ غیر منقول کو 1 روپیہ قرار دے کر اس طرح تقسیم ہوگی۔ لطف علی 8 آنے، بلوچ خان 8 آنے، پھر ہر ایک کی ملکیت کو اپنی اپنی جگہ ایک روپیہ قرار دیا جائے۔

فوت ہونے والا بلوچ خان ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیٹا، دودا 1 روپیہ

پھر دودا فوت ہوا ملکیت 1 روپیہ

وارث:	غلام اللہ	غلام شاہ	غلام حسین	● ابراہیم
	4 آنے	4 آنے	4 آنے	4 آنے

غلام فوت ہوا ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیٹا بلوچ خان 1 روپیہ

اس کے بعد غلام حسین اور ابراہیم فوت ہوگئے جن کا اور کوئی بھی وارث نہیں صرف بھتیجا بلوچ خان ہے وہی وارث بنے گا۔

ان کے بعد لطف علی فوت ہوگیا۔کل ملکیت 1 روپیہ

وارث:	پائی	آنے
بیٹا خدا بخش	04	06
بیٹا دودا	04	06
بیٹی	02	03
علاتی پوتا بلوچ	محروم	

باقی 2 پائیاں بچیں گی۔ان کے پانچ حصے کرکے ہر بیٹے کو دو حصے اور بیٹی کو ایک حصہ دیا جائے گا۔اس کے بعد مذکورہ شخص فوت ہوگیا جس کا بھتیجے کے علاوہ اور کوئی بھی وارث نہیں ہے۔لہٰذا ساری ملکیت اس بھتیجے کو مل جائے گی۔

جدید اعشاریہ نظام تقسیم

میت بلوچ خان کل ملکیت 100

1 بیٹا عصبہ 100

میت دودا کل ملکیت 100

4 بیٹے عصبہ 100 فی کس 25

میّت ایک بیٹا بنام غلام اللہ کل ملکیت 25

1 بیٹا عصبہ 25

میّت دوسرا بیٹا بنام غلام حسین کل ملکیت 25

بھتیجا عصبہ 25

میّت لطف علی کل ملکیت 100

2 بیٹے 80 فی کس 40

1 بیٹی 20

علاتی پوتا محروم

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ بنام جمال بیگ فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے: ایک بیوی، ماں، باپ دو بیٹے، ایک بیٹی۔ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے سب سے پہلے اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے، دوسرے نمبر پر اگر قرض تھا تو اسے ادا کیا جائے، پھر اگر جائز وصیت کی تھی تو ساری جائیداد کے تیسرے حصے تک سے ادا کی جائے۔ پھر باقی ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر تقسیم اس طرح سے کی جائے گی۔

مرحوم جمال بیگ کل ملکیت 1 روپیہ

وارث	پائیاں	آنے
بیوی	00	02
ماں	08	02

باپ	08	02
بیٹا	$5\frac{1}{2}$	03
بیٹا	$5\frac{1}{2}$	03
بیٹی	09	01

جدید اعشاریہ نظام تقسیم

کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5

ماں $\frac{1}{6}$ 16.66

باپ $\frac{1}{6}$ 16.66

2 بیٹے عصبہ 43.34 فی کس 21.672

1 بیٹی عصبہ 10.836

***

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ بنام ملنٹھار فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے، ایک بیوی، ایک بیٹی، ایک بھائی احمد اور چچا زاد بھائی، اس کے بعد احمد فوت ہوگیا اس نے وارث چھوڑے، ایک بیوی، ایک بیٹی، ایک بھتیجی ایک چچا زاد بھائی اور دو چچا زاد بہنیں، اس کے بعد احمد کی بیوی فوت ہوگئی۔ جس نے وارث چھوڑے ایک بیٹی، ایک بھائی، دو بہنیں۔ شریعت محمدیہ کے مطابق کس کو کتنا حصہ ملے گا وضاحت کریں؟

الجواب بعون الوهاب: یاد رہے کہ سب سے پہلے فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے، پھر اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے پھر اگر جائز وصیت کی تھی کو ساری ملکیت کے تیسرے حصے تک سے پوری کی جائے، پھر باقی ملکیت منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر ورثاء میں اس طرح تقسیم ہوگی۔

فوت ہونے والا ملنٹھار کل ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیوی 2 آنے، بیٹی 8 آنے، بھائی احمد 6 آنے چچازاد محروم

حدیث مبارکہ ہے:

((الحقو الفرائض بأهلها فما بقى فلأولى رجل ذكر.)) ❶

احمد فوت ہوا ملکیت کو ایک 1 روپیہ قرار دیا جائے گا۔

وارث: بیوی 2 آنے، بیٹی 8 آنے، بھتیجی محروم، دو چچازاد بہنیں محروم چچازاد بھائی 6 آنے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فان كان له ولد فلهن الثمن﴾

احمد کی بیوی فوت ہوگئی ساری ملکیت کو 1 روپیہ قرار دیا جائے گا۔

وارث: بیٹی 8 آنے، بھائی 4 آنے، دونوں بہنیں مشترکہ 4 آنے

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فان كانت واحدة فلها النصف مما ترك﴾

والله اعلم بالصواب

جدید اعشاریہ نظام

میت منٹھار کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8}$ = 12.5

بیٹی $\frac{1}{2}$ = 50

(احمد) بھائی عصبہ 37.5

چچازاد محروم

میت بھائی احمد ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8}$ = 12.5

بیٹی $\frac{1}{2}$ = 50

چچازاد بھائی عصبہ 37.5

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث ابن الابن اذا لم یکن ابن، رقم الحدیث: ٦٧٣٥ ـ صحیح مسلم، کتاب الفرائض، باب الحقوا الفرائض باھلھا، رقم: ٤١٤١.

بھتیجی محروم

2 چچازاد بہنیں محروم

میّت احمد کی بیوی ملکیت 100

بیٹی $\frac{1}{2}$ = 50

بھائی عصبہ 25

دو بہنیں عصبہ 25 فی کس 12.5

هذا هو عندي والعلم عند ربي

❊❊❊❊

سوال: ❶...... کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مراد خاتون فوت ہوگئی جس نے ورثاء میں ایک بیٹی اور پوتی چھوڑی۔

❷...... مسمات بان فوت ہوگئی جس نے وارث چھوڑے ایک بہن، ایک بھتیجی۔ وضاحت کریں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا۔

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے پہلے اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے، بعد میں اگر قرض تھا تو اسے ادا کیا جائے بعد میں اگر وصیت کی تھی تو کل ملکیت کے تیسرے حصے تک سے ادا کی جائے، پھر بعد میں ساری ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر تقسیم اس طرح ہوگی۔

❶: مسمات مراد خاتون کل ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیٹی 8 آنے، پوتی 2 آنے 8 پائیاں

باقی جو ملکیت 5 آنے 8 پائی بچے گی تین حصے کرکے دو حصے بیٹی کو اور ایک حصہ پوتی کو دیا جائے گا۔

❷: مسمات بھان کل ملکیت 1 روپیہ

وارث: بہن 8 آنے، بھتیجی 8 آنے

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ نظام

کل ملکیت 100

بیٹی	$72.22\frac{1}{2}$
پوتی	$27.78\frac{1}{6}$

میت بھان کل ملکیت 100

بہن	$\frac{1}{2} = 50$
بھتیجی	50

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ بچل شاہ فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک بیٹی، ایک بھائی اور 4 بیویاں، اس کے بعد غلام نبی شاہ وفات پاگیا جس نے وارث چھوڑے 4 بیویاں، ایک بھتیجی۔ بتائیں کہ ہر ایک کو شریعت محمدی کے مطابق کتنا کتنا حصہ ملے گا۔

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے میّت کی ملکیت میں سے میّت کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے، پھر بعد میں اگر قرض تھا تو اسے ادا کیا جائے، پھر اگر جائز وصیت کی تھی تو اسے پورا کیا جائے گا۔ کل مال کے تیسرے حصے تک سے۔ اس کے بعد ساری ملکیت منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح تقسیم ہوگی۔

فوت ہونے والا محمد بچل شاہ ملکیت 1 روپیہ منقول خواہ غیر منقول

وارث: بیٹی 8 آنے، بھائی 6 آنے، 4 بیویاں 2 آنے مشترکہ

اس کے بعد غلام نبی شاہ کی ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر اس کے وارثوں میں اس طرح سے تقسیم کی جائے گی۔

مرحوم غلام نبی شاہ ملکیت 1 روپیہ منقول خواہ غیر منقول

وارث: 4 بیویاں کو 4 آنے مشترکہ۔ بھتیجی 12 آنے

جدید اعشاریہ نظام طریقہ تقسیم

میت بچل شاہ کل ملکیت 100

بیٹی $\frac{1}{2}$ 50

بھائی عصبہ 37.5

4 بیویاں $\frac{1}{8}$ 12.5

میت غلام نبی شاہ کل ملکیت 100

4 بیویاں $\frac{1}{8}$ 12.5

بھتیجی ذوی الارحام 87.5

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ بنام حاجی اللہ بخش فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک بیوی 3 بیٹیاں، 4 بیٹے محمد بچل شفیع محمد، علی محمد، ولی محمد۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے سب سے پہلے فوت ہونے والے کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے پھر اگر مرحوم پر کوئی قرضہ وغیرہ تھا تو اسے ادا کیا جائے پھر اگر مرحوم نے جائز وصیت کی تھی تو اسے کل مال کے تیسرے حصے تک سے پورا کیا جائے اس کے بعد باقی رقم اور ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح تقسیم کریں گے۔

مرحوم حاجی اللہ بخش ملکیت 1 روپیہ 1 روپیہ

وارث: پائیوں آنے

بیوی	00	2
بیٹی	03	1
بیٹی	03	1
بیٹی	03	1
بیٹا بچل	06	2
شفیع محمد	06	2
علی محمد	06	2
ولی محمد	06	2

باقی 3 پائیوں کو 11 حصے کر کے ہر بیٹے کو دو اور ہر بیٹی کو ایک دی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فان كان لكم ولد فلهن الثمن﴾

دوسرا فرمان: ﴿للذكر مثل حظ الانثيين﴾

جدید اعشاریہ نظام تقسیم

کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5

4 بیٹے عصبہ 63.630 فی کس 15.909

3 بیٹیاں عصبہ 23.863 فی کس 7.954

هذا هو عندي والعلم عند ربي

❀❀❀❀

(سوال) کیا فرماتے ہیں اس مسئلہ میں علماء کرام کہ حاجی جمن فوت ہوگیا اور وارث چھوڑے دو بیٹیاں، دو بہنیں، تین بھائی، بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: فوت ہونے والے کے کفن دفن کا خرچہ، اور قرضہ اور

وصیت مال کے تیسرے حصے میں سے ادا کرنے کے بعد کل ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح تقسیم ہوگی۔

وارث	پائیاں	آنے
دونوں بیٹیوں کو مشترکہ طور پر	08	10
تین بھائیوں کو مشترکہ طور پر	00	04
دو بہنوں کو مشترکہ	04	01

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ تقسیم نظام

کل ملکیت 100

2 بیٹیاں	$66.66\frac{2}{3}$	فی کس 33.33
3 بھائی	25	فی کس 8.33
2 بہنیں	8.34	فی کس 4.17

❋❋❋❋

سوال: کیا فرماتے ہیں کہ علماء دین اس مسئلہ میں کہ الهداد فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے: ایک بیوی، ماں اور دو بھائی، بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: یاد رہے کہ سب سے پہلے فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے گا، دوسرے نمبر پر اگر مرحوم پر قرضہ تھا تو اسے ادا کیا جائے۔ تیسرے نمبر پر اگر جائز وصیت کی تھی تو کل مال کے تیسرے حصے تک سے پوری کی جائے۔ اس کے بعد ساری ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح تقسیم ہوگی۔

فوت ہونے والا الهداد ملکیت 1 روپیہ

وارث	پائیاں	آنے
بیوی	00	04
ماں	08	02
دونوں بھائی مشترکہ	04	09

هذا هو عندي والعلم عند ربی

جدید اعشاریہ فیصد نظام تقسیم

کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{4}$ 25

ماں $\frac{1}{6}$ 16.66

2 بھائی عصبہ 58.34 فی کس 29.17

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں محمد عمر فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے دو بیویاں، ایک بیٹی، ایک بھائی محمد عثمان اور چچا زاد کا بیٹا اس کے بعد محمد عثمان وفات کر گیا۔ جس نے وارث چھوڑے دو بیویاں، ایک بیٹی اور چچا زاد کے 7 بیٹے عبدالرحمٰن ولد امیر بخش، عبدالرزاق، عبدالجبار، عبدالرشید، عبدالستار، عبدالرؤف، محمد صدیق ولد محمد مراد۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالنے اور قرضہ اگر تھا تو ادا کرنے، تیسرے نمبر پر اگر جائز وصیت کی تھی تو ساری جائیداد کے تیسرے حصے تک سے پوری کرنے کے بعد وراثت اس طرح تقسیم ہوگی۔

فوت ہونے والا محمد عمر کل ملکیت ایک روپیہ یعنی 191 ایکڑ

وارث: دونوں بیویاں 2 آنے یعنی 11 ایکڑ 15 دیسہ، بیٹی 8 آنے یعنی 145 ایکڑ 20

ویسہ، بھائی 6 آنے یعنی 134 ایکڑ 5 ویسہ، چچازاد کا بیٹا محروم۔

اس کے بعد محمد عثمان فوت ہوگیا جس نے اپنے مرحوم بھائی محمد عمر کے حصے میں سے 34 ایکڑ 5 ویسے حاصل کیے اور اس کی اپنی زمین 191 ایکڑ ٹوٹل 125 ایکڑ 5 ویسے کی تقسیم۔

وارث: دونوں بیویاں 15 ایکڑ 26 ویسہ، بیٹی 162 ایکڑ 26 ویسہ، چچازاد کے بیٹا محمد صدیق 16 ایکڑ 28 گھنٹہ، عبدالرزاق 16 ایکڑ 28 گھنٹہ، عبدالرحمٰن 16 ایکڑ 28 گھنٹہ، عبدالستار 16 ایکڑ 28 گھنٹہ، عبدالرؤف 16 ایکڑ 28 گھنٹہ، عبدالرشید 16 ایکڑ 28 گھنٹہ، عبدالجبار 16 ایکڑ 28 گھنٹہ۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد نظام تقسیم

میّت محمد عمر کل ملکیت 100

2 بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5 فی کس 6.25

1 بیٹی $\frac{1}{2}$ 50

بھائی (عثمان) عصبہ 37.5

چچازاد کا بیٹا محروم

میّت محمد عثمان کل ملکیت 100

دو بیویاں $\frac{1}{8}$ 12.5 فی کس 6.25

1 بیٹی $\frac{1}{2}$ 50

چچازاد کے 7 بیٹے عصبہ 37.5 فی کس 5.357

❀❀❀❀

(سوال): کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ محمد عرس کی وفات ہوگئی جس نے وارث چھوڑے 2 بیٹے محمد اور محمد حسین اور 4 بیٹیاں۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق سب

کو کتنا کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوھاب: یاد رہے کہ مرحوم کی ملکیت میں سے مرحوم کے کفن دفن کا خرچہ نکالنے کے بعد اگر قرض تھا تو اس کو ادا کیا جائے پھر بعد میں اگر وصیت کی تھی تو مال کے تیسرے حصے تک ادا کی جائے پھر باقی ملکیت منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح تقسیم کریں۔

مرحوم محمد عرس کی ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیٹا محمد 4 آنے، بیٹا محمد حسین 4 آنے، بیٹی 2 آنے، بیٹی 2 آنے، بیٹی 2 آنے، بیٹی 2 آنے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿للذکر مثل حظ الانثیین﴾

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ نظام تقسیم

میت محمد عرس کل ملکیت 100

2 بیٹے عصبہ 50 فی کس 25

4 بیٹیاں عصبہ 50 فی کس 12.5

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ محمد عثمان فوت ہوگیا اور وارث چھوڑے ایک بیٹا محمد صدیق اور ایک بیٹی، اس کے بعد محمد صدیق فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے دو بیویاں بنام ست بائی اور خیر بانو اور ایک بیٹا سکندر اور ایک بہن۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوھاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے فوت ہونے والے کی ملکیت سے مرحوم کے کفن دفن کا خرچہ کیا جائے پھر اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے پھر اگر

جائز وصیت کی ہے تو کل مال کے تیسرے حصے تک سے ادا کی جائے اس کے بعد مرحوم کی وراثت منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح تقسیم ہوگی۔

فوت ہونے والا محمد عثمان کل ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیٹا محمد صدیق 10 آنے 8 پائیاں، بیٹی 5 آنے 4 پائیاں

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿للذكر مثل حظ الانثيين﴾

اس کے بعد محمد صدیق فوت ہوا۔ ملکیت 8 پائیاں 10 آنے

وارث: بیوی ست بائی 8 پائی، بیوی خیر بانو 8 پائی، بیٹا سکندر 9 آنے 4 پائی۔ بہن محروم۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فان كان لكم ولد فلهن الثمن﴾

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ نظام تقسیم

میّت محمد عثمان کل ملکیت 100

بیٹا (صدیق) عصبہ 66.66

بیٹی عصبہ 33.34

میّت محمد صدیق کل ملکیت 66.66

2 بیوی $\frac{1}{8}$ 8.332 فی کس 4.166

بیٹا عصبہ 58.328

بہن محروم

❋❋❋❋

(سوال): ❶ ...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ بنام محمد صدیق فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک بیوی، ایک بیٹی، 2 بھتیجے اور 3 بھتیجیاں بتائیں کہ شریعت

محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا۔

۲ ...... یوسف فوت ہوا جس کے بیٹے بھی ہیں اور بیٹیاں بھی بتائیں کہ بچیوں کا حق ولایت کس کو ہے اور وارث کون ہے؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے اس کے کفن دفن کا خرچہ کیا جائے، بعد میں اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے پھر اگر وصیت کی تھی تو سارے مال کے تیسرے حصے تک سے پوری کی جائے گی اس کے بعد باقی مال منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر تقسیم اس طرح سے ہوگی۔

مرحوم محمد صدیق کل ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیوی 2 آنے، بیٹی 8 آنے، بھتیجا 3 آنے، بھتیجا 3 آنے، بھتیجی محروم، بھتیجی محروم۔

بھتیجیوں کو حصہ نہیں ملے گا کیونکہ حدیث مبارکہ میں ہے: ((الحقوا الفرائض باهلها فما بقي فلا ولى رجل ذكر.)) [1]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وان كان لكم ولد فلهن الثمن﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿وان كانت واحدة فلها النصف﴾

۲ ...... باقی یوسف کی ملکیت کے اور اس کی بیٹیوں کے وارث یوسف کے بیٹے ہیں یوسف کی بیٹیوں کے حق ولایت یوسف کے بیٹوں کو ہے کیونکہ یہی حق دار ہیں حق ولایت بھائیوں کو حاصل ہے کسی اور کو نہیں باقی ملکیت میں یوسف کی بیٹیاں بھی شامل (شریک، حصے دار) ہیں فوت ہونے والے محمد صدیق نے اپنے بھائی محمد یوسف کی جگہ بیچ ڈالی۔ حالانکہ اس جگہ کے حقدار یوسف کی اولاد تھی، لہٰذا سب سے پہلے محمد صدیق کی ملکیت میں سے اس جگہ کی قیمت محمد یوسف کی اولاد کو دی جائے گی۔ اس کو ادا کرنے کے بعد وارثوں میں تقسیم ہوگی۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث ابن الابن اذا لم یکن ابن، رقم الحدیث: ٦٧٣٥ ۔ صحیح مسلم، کتاب الفرائض، باب الحقوا الفرائض باهلها، رقم: ٤١٤١ ۔

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5

بیٹی $\frac{1}{2}$ 50

2 بھتیجے عصبہ 37.5 فی کس 18.75

3 بھتیجیاں محروم

❋❋❋❋

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ بنام حاجی محمد رمضان فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں سے ایک بیٹا (بڈھو) (5) بیٹیاں اور ایک بیوی چھوڑی اس کے بعد بڈھو خان نے اپنے بھانجے ولی جان کو بچپن میں ہی اپنے پاس رکھا بالآخر ولی جان بڑا ہوا اور اپنی کمائی بھی ماموں کے ساتھ رکھی پھر ولی جان کی کمائی سے دوسرے 40 ایکڑ زمین خرید کی گئی اس وقت محمد رمضان بھی زندہ تھا اور ولی جان اپنے ماموں کے ساتھ ہی کماتا تھا اب بڈھو فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے تین بیویاں، دو بیٹیاں، ماں اور چچا زاد اور پانچ بہنیں۔ شریعت محمدی کے مطابق بتائیں کہ ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب بعون الوهاب بشرط صحة السوال: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے فوتی کی ملکیت سے کفن دفن پر خرچ کیا جائے گا پھر اگر اس پر قرضہ ہے تو اس کو پورا کیا جائے گا اس کے بعد اگر وصیت ہے تو اس کو بھی ثلث مال سے ادا کیا جائے گا۔ پھر منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر ملکیت اس کے ورثاء میں اس طرح تقسیم کی جائے گی۔

فوتی محمد رمضان کل ملکیت ایک روپیہ

ورثاء: بیوی 2 آنہ، بیٹا 4 آنہ، (5) بیٹیاں 2 آنہ ہر ایک بیٹی کو۔

اب جو 140 ایکڑ زمین ہے اس سے 120 ایکڑ ولی جان کو ملیں گے کیونکہ اس نے ہی

کمائے ہیں اور قبضہ رکھا باقی 120 ایکڑ رمضان کو ملیں گے۔ اس کے بعد بڈھو فوت ہوگیا کل ملکیت کو ایک روپیہ قرار دیا گیا۔

ورثاء: تین بیویاں 2 آنہ، 2 بیٹیاں 10 آنہ 8 پائی، ماں 2 آنہ 8 پائی، پانچ بہنیں 8 پائی۔

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

میّت رمضان کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8} = 12.5$

بیٹا عصبہ 25

5 بیٹیاں 62.5 فی کس 12.5

میّت بڈھو کل ملکیت 100

3 بیویاں $\frac{1}{8} = 12.5$ فی کس 4.166

2 بیٹیاں $\frac{2}{3}$66.66 فی کس 33.33

ماں $\frac{1}{6} = 16.66$

5 بہنیں عصبہ مع الغیر 4.18 فی کس 0.836

هذا هو عندي والعلم عند ربي

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بنام حاجی محمد خان فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں سے ماموں کی اولاد یعنی بیٹا، بیوی ماکتا (ماں کی طرف سے) بھتیجا اور بھتیجی۔ شریعت کے مطابق بتائیں کہ ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟ (بینوا توجروا)

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے فوتی کی ملکیت سے کفن دفن، قرضہ وصیت (اگر ہوتو) اس کو پورا کیا جائے گا اس کے بعد منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر اس کے ورثاء میں اس طرح تقسیم کی جائے گی۔ کل ملکیت (1) روپیہ

ورثاء: بیوی 4 آنہ، بھتیجا 12 آنہ اور ایک بھتیجی (دونوں ماں کے رشتے سے) محروم

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{4}$

بھتیجا عصبہ

بھتیجی محروم

هذا هو عندي والعلم عند ربي

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ بنام حاجانی جیندل عرف نسیم تقریباً ایک مہینہ پہلے انتقال کرگئی جس کی اولاد نہیں ہے۔ اس کے تہائی ملکیت 39-136 ایکڑ زمین ہے اور ایک جگہ (مکان وغیرہ) شہر میں ہے، اوپر مذکورہ مرحومہ نے درج ذیل وارثوں کو چھوڑا ہے۔ دو سگی بہنیں، ایک خاوند، شریعت محمدی کے مطابق وضاحت کریں کہ مذکورہ ملکیت مذکورہ ورثاء میں کس طرح، کتنی کتنی تقسیم ہوگی۔

الجواب بعون الوهاب: یاد رہے کہ سب سے پہلے میّت کی ملکیت میں سے اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے، پھر اگر کوئی قرض تھا تو اسے ادا کیا جائے، اس کے بعد اگر کوئی وصیت کی تھی تو اس کو کل مال کے تیسرے حصے سے پورا کیا جائے، پھر باقی ملکیت کو ایک روپیہ تصور کر کے مذکورہ ملکیت منقولہ غیر منقولہ کو وارثوں میں اس طرح تقسیم کریں گے۔

فوت ہونے والی جیندل عرف نسیم کل ملکیت 1 روپیہ

وارث: خاوند 8 آنے، بہن 4 آنے، بہن 4 آنے

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ نظام تقسیم

کل ملکیت 100

خاوند	$\frac{1}{2}$	50
2 بہنیں	$\frac{2}{3}$	25.50 فی کس

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں مسمات حلیمہ فوت ہوگئی جس نے وارث چھوڑے 2 بیٹے محمد اور عمیر اور تین بیٹیاں اور ایک خاوند بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے مرحوم کی ملکیت میں سے اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے، دوسرے نمبر پر اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے تیسرے نمبر پر اگر وصیت کی ہے تو سارے مال کے تیسرے حصے تک سے پوری کی جائے اس کے بعد باقی مال منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح سے تقسیم ہوگی۔

مرحوم حلیمہ — ملکیت 1 روپیہ

وارث:	پائیاں	آنے
خاوند	00	4
بیٹا	$5\frac{1}{4}$	3
بیٹا	$5\frac{1}{4}$	3
تین بیٹیاں مشترکہ	$1\frac{1}{2}$	5

قولہ تعالیٰ: ﴿فان كان لهن ولد فلكم الربع﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿للذكر مثل حظ الانثيين﴾

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید طریقہ تقسیم اعشاریہ فیصد

کل ملکیت 100

خاوند $25\frac{1}{4}$

2 بیٹے عصبہ 42.857 فی کس 21.428

3 بیٹیاں عصبہ 32.124 فی کس 10.714

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ بنام حاجی ابوطالب فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک بھائی جان محمد اور بھتیجے۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا۔ (سائل جان محمد) (1) گواہ حاجی محمد صادق۔ (2) نور محمد۔(3) محمد قاسم۔(4) حاجی غلام قادر۔

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے مرحوم کی ملکیت میں سے اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے اس کے بعد اگر مرحوم پر قرض تھا تو اسے ادا کیا جائے اور پھر اگر مرحوم نے کوئی وصیت کی تھی تو کل مال کے تیسرے حصے تک سے پوری کی جائے۔ اس کے بعد باقی مال منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر وارثوں میں اس طرح سے تقسیم ہوگی۔

مرحوم حاجی ابوطالب ملکیت 1 روپیہ

وارث بھائی کو مکمل 1 روپیہ بھتیجا مرحوم

جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے:((الحقوا الفرائض باهلها فما بقى فلاولى رجل ذكر.)) [1]

هذا هو عندي والعلم عند ربي

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث ابن الابن اذا لم یکن ابن، رقم الحدیث:٦٧٣٥۔ صحیح مسلم، کتاب الفرائض، باب الحقوا الفرائض باهلها، رقم: ٤١٤١.

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100

سگا بھائی عصبہ 100

بھتیجا محروم

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ بچایو اور کوڈو دونوں بھائی اور ولی محمد چچا زاد تینوں نے مل کر زمین خریدی بعد میں ولی محمد کو اس کا حصہ دیا اس کے بعد ولی محمد فوت ہوگیا تو بچایو اور کوڈو دونوں دھوکے سے ولی محمد کے گھر سے زمین کے کاغذ اٹھا کر لے گئے اور یہ کھاتہ اپنے نام کروالیا اب ولی محمد کی بیوی اور بیٹی کو حصہ نہیں دے رہے۔ وضاحت کریں کہ شریعت محمدی کے مطابق ولی محمد کی بیوی اور اولاد حقدار ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے مرحوم کی کل ملکیت میں سے اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے گا، اس کے بعد اگر مرحوم پر قرضہ تھا تو اسے ادا کیا جائے گا، پھر اگر وصیت کی تھی تو سارے مال کے تیسرے حصے میں سے پوری کی جائے گی اس کے بعد مرحوم کی منقولہ اور غیر منقولہ ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر اس کے ورثا میں اس طرح سے تقسیم کیا جائے گا۔

مرحوم ولی محمد کل ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیٹی کو 8 آنے، بیوی کو 2 آنے ملیں گے اور باقی جو 6 آنے بچیں گے، وہ ولی محمد کے چچا زاد بھائیوں بچایو اور کوڈو دونوں کو مشترکہ طور پر ملیں گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿فان كانت واحدة فلها النصف﴾

حدیث مبارکہ: ((الحقوا الفرائض باهلها فما بقى فلا ولى رجل ذكر.)) [1]

[1] صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث ابن الابن اذا لم یکن ابن، رقم الحدیث: ٦٧٣٥۔ صحیح مسلم، کتاب الفرائض، باب الحقوا الفرائض باهلها، رقم: ٤١٤١.

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

میت بچایو کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5

بیٹی $\frac{1}{2}$ 50

2 چچازاد عصبہ 37.5 فی کس 18.75

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک عورت وفات پاگئی جس نے درج ذیل وارث چھوڑے: خاوند، باپ، ماں، 2 بیٹے، 2 بیٹیاں۔ مرحومہ کی جائیداد زمین (1) زمین 12 ایکڑ۔ (2) سونا 10 تولے، نقدی 5 ہزار۔ اب عرض یہ ہے کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک وارث کو کتنا کتنا حصہ ملے گا۔

الجواب بعون الوهاب: اوّلاً مرحومہ کی ملکیت میں سے کفن دفن کیا جائے اس کے بعد اگر مرحومہ پر قرضہ تھا تو اس کی ادائیگی کی جائے، پھر اگر جائز وصیت کی تھی تو ساری جائیداد کے تیسرے حصے سے ادا کی جائے اس کے بعد مرحومہ کی باقی ملکیت منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر تقسیم اس طرح ہوگی۔ ❶: خاوند کو چوتھا حصہ 4 آنے ملیں گے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فان كان لهن ولد فلكم الربع مما تركن﴾ ❷: باپ کو چھٹا حصہ 2 آنے 8 پائی ماں کو بھی 2 آنے 8 پائی ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ولابويه لكل واحد منهما السدس مما ترك﴾ ❸: باقی 6 آنے 8 پائی باقی بچیں گے اس کے 6 حصے کرکے ہر بیٹے کو 2 حصے اور ہر بیٹی کو 1 حصہ دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يوصيكم الله فى اولادكم للذكر مثل حظ الانثيين﴾

مرحومہ کی ملکیت متحرک خواہ غیر متحرک 1 روپیہ

وارث: خاوند 4 آنے، باپ 2 آنے 8 پائی، ماں 2 آنے 8 پائی، بیٹا 2 آنے 2 پائی، بیٹا 2 آنے، 2 پائی، بیٹی 1 آنہ، 1 پائی، بیٹی 1 آنے 1 پائی۔

باقی دو پائیوں کے 6 چھ حصے کر کے 2 حصے ہر بیٹے کو اور ایک حصہ ہر بیٹی کو دیئے جائیں گے۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100

خاوند۔	$\frac{1}{4} = 25$	
باپ	$\frac{1}{6} = 16.66$	
ماں	$\frac{1}{6} = 16.66$	
2 بیٹے عصبہ 27.786		فی کس 13.893
2 بیٹیاں عصبہ 13.893		فی کس 6.946

❀❀❀❀

سوال: ❶ ...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ مسمات غلام صغریٰ فوت ہوگئی جس نے وارث چھوڑے ایک سگی بہن دو باپ کی طرف سے بہنیں اور غلام صغریٰ کے والد کا چچا زاد بھائی محمد علی۔

❷ ...... مسمات غلام صغریٰ نے اپنی زندگی میں ہی بغیر کسی زور اور زبردستی کے سالم دماغ کے ساتھ ہوش وحواس میں کچھ ملکیت اپنے بھانجے کو ہبہ کردی اور کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں یہ ملکیت میرے قبضہ میں رہے گی۔ میری وفات کے بعد یہ ملکیت میرے بھانجوں کو دے دی جائے اور باقی جتنی بھی غیر ہبہ ملکیت ہے وہ محکمہ اوقاف کو دے دی جائے۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق کس طرح سے ملکیت تقسیم ہوگی۔

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مسمات غلام صغریٰ مرحومہ کی ملکیت میں سے سب سے پہلے اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے، پھر اگر اس پر کوئی قرض تھا تو اسے ادا

کیا جائے، پھر اگر وصیت کی تھی تو اسے سارے مال کے تیسرے حصے تک سے پورا کیا جائے اس کے بعد منقولہ خواہ غیر منقولہ مال کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح سے تقسیم کی جائے گی۔

مسمات غلام صغری کی ہبہ برقرار نہیں رہے گی بلکہ یہ وصیت میں تبدیل ہو جائے گی۔ کیونکہ غلام صغری نے ہبہ تو کی مگر قبضہ اپنے ہاتھ میں رکھا اب یہ ہبہ وصیت میں تبدیل ہو کر کل مال کے تیسرے حصے تک ادا کی جائے گی اب مسمات غلام صغری کی جو ہبہ کی ہوئی زمین تھی اس کا تیسرا حصہ یعنی 4 پائیاں، 5 آنے بھانجوں کو دیے جائیں باقی 8 پائی 10 آنے بچے گی جو اس طرح وارثوں میں تقسیم ہو گی۔

مسمات غلام صغریٰ ملکیت 8 پائیاں 10 آنے

وارث: سگی بہن 4 پائی 5 آنے، باپ کی طرف سے بہن $6\frac{3}{4}$ پائی 1 آنہ مشترک، باپ کا چچازاد 8 پائیاں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وله أخت فلها النصف﴾

حدیث پاک ہے: ((الحقوا الفرائض باهلها فما بقى فلا ولى رجل ذكر.)) ❶

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100

سگی بہن	$\frac{1}{2} = 50$
علاتی بہن	$\frac{1}{6} = 16.66$

باپ کا چچازاد عصبہ 33.34

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث ابن الابن اذا لم یکن ابن، رقم الحدیث:٦٧٣٥۔ صحیح مسلم، کتاب الفرائض، باب الحقوا الفرائض باهلها، رقم: ٤١٤١.

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ بنام واحد بخش فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے 2 بیویاں، ایک بیٹی، ایک بھائی، ایک بہن اور یہ وصیت بھی کی تھی کہ میری ملکیت کی وارث میری بیٹی ہے۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے مرحوم کی ملکیت میں سے اس کے کفن دفن کا خرچہ کیا جائے، پھر اگر قرض تھا تو اس کو ادا کیا جائے اس کے بعد اگر جائز وصیت کی تھی تو کل مال کے تیسرے حصے سے ادا کی جائے۔ اس کے بعد مرحوم کی منقولہ اور غیر منقولہ ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر وارثوں میں وراثت اس طرح سے تقسیم ہوگی۔

مرحوم واحد بخش ملکیت 1 روپیہ

وارث: دونوں بیویاں 2 آنے مشترکہ، بیٹی 8 آنے، بھائی 4 آنے، بہن 2 آنے، فی فقہ بھائی کی وجہ سے بہن ﴿للذكر مثل حظ الانثيين﴾ کے قاعدے سے عصبہ بنے گی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿فان كان لكم ولد فلهن الثمن﴾، ﴿فان كانت واحدة فلها النصف﴾

نوٹ: ......مرحوم نے جو وصیت کی تھی وہ ناجائز ہے کیونکہ بیٹی ذوی الفروض میں سے ہے جس کا حصہ شریعت نے مقرر کیا ہے اس لیے بیٹی کے حق میں وصیت جائز نہیں۔ حدیث مبارکہ ہے: ((لا وصية لوارث.))

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100

2 بیویاں $\frac{1}{8}$ 12.5

بیٹی $\frac{1}{2}$ 50

بھائی عصبہ 25

بہن 12.5

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام بیچ اس مسئلہ کے کہ ایک شخص محب نامی فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک بیوی ساواں، دو بیٹیاں، سنگھار اور بھاگ بھری، اور ایک پوتی عرب خاتون اور ایک بھانجا دین محمد۔ محب نے بیماری کی حالت میں اپنی زمین اپنی پوتی عرب خاتون اور اپنے بھانجے دین محمد کو ہبہ کردی، مگر یہ ساری جائیداد ملی جلی تھی اسی حالت میں محبؔ فوت ہوگیا۔ زمین کا قبضہ فوت ہونے والے کے پاس ہی تھا۔ جواب کی وضاحت کریں۔ جزاکم اللہ خیرا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے فوت ہونے والے کی ملکیت سے اس کے کفن دفن کا خرچ کیا جائے گا، پھر اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے گا، پھر اگر وصیت کی ہے تو کل مال کے تیسرے حصے تک کی وصیت کو پورا کیا جائے گا۔ اس کے بعد ساری جائیداد (خواہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ) کو ایک روپیہ قرار دے کر تقسیم اس طرح ہوگی۔

فوت ہونے والے محبؔ کی کل ملکیت 1 روپیہ

ورثاء: ایک بیوی کو 2 آنے، دو بیٹیوں سنگھار اور بھاگ بھری کو مشترکہ طور پر 10 آنے 8 پیسے، پوتی عرب خاتون محروم، بھانجا دین محمد محروم۔

باقی جو ملکیت 3 آنے 4 پیسے بچی رہے اسے دوبارہ بیٹیوں میں برابر برابر تقسیم کیا جائے گا یعنی ہر ایک بیٹی کو 10 آنہ 8 پیسے دیے جائیں گے۔ باقی ہبہ برقرار نہیں رہے گی کیونکہ ابھی تک فوت ہونے والے کے قبضہ میں تھی۔ واللہ اعلم بالصواب

موجودہ اعشاری فیصد نظام میں یوں ہوگا

100 روپے

بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5

2 بیٹیاں $\frac{2}{3}$ 87.5

پوتی محروم　　　　بھانجا محروم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ محمد ہاشم نے پہلے اپنے دادا کی ملکیت تقسیم کر کے اپنے حصہ لے لیا تھا بعد میں اس کا چاچا محمد فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک بیوی، بیٹی، بھتیجا محمد ہاشم اور ایک بھتیجی اور ایک چچا زاد میر حسن اور بہن کی اولاد۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے مرحوم کی ملکیت میں سے اس کے کفن دفن کا خرچہ کیا جائے، اس کے بعد اگر قرض تھا تو اسے ادا کیا جائے، پھر اگر جائز وصیت کی تھی تو سارے مال کے تیسرے حصے تک سے پوری کی جائے۔ اس کے بعد منقول خواہ غیر منقول ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح سے تقسیم ہوگی۔

مرحوم محمد	ملکیت 1 روپیہ	
وارث	پائیاں	آنے
بیوی	00	2
بیٹی	00	8
بھتیجا	00	6
بھتیجی	محروم	
چچازاد	محروم	
بہن کی اولاد	محروم	

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید طریقہ تقسیم فیصد اعشاریہ نظام

کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5

بیٹی $\frac{1}{2}$ 50

بھتیجا عصبہ 37.5

بھتیجی محروم

چچازاد محروم

بہن کی اولاد محروم

❊❊❊❊

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ محمد ملوک نے عقل اور ہوش و حواس درست ہونے کی حالت میں ایک ایکڑ زمین اپنی بیوی کو بطور ہبہ دی ہے اور وصیت کی ہے کہ میری وفات کے بعد ملکیت میں سے اسے حصہ دیا جائے۔ محمد ملوک فوت ہوگیا وارث چھوڑے بیوی، 4 بیٹے دو بیٹیاں۔ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک وارث کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوھاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مرحوم کا ہبہ (ہبہ اور وصیت) دونوں جائز ہیں اس لیے جو ایکڑ بطور ہبہ دیا گیا پہلے اسے علیحدہ کریں اور پھر وصیت کو کل مال کے تیسرے حصے تک پوری کریں۔ اس لیے اس حصے میں سے پوتے کو دینے کے بعد باقی ماندہ ملکیت وارثوں میں اس طرح سے تقسیم ہوگی۔ مرحوم کی کل ملکیت منقول یا غیر منقول ایک روپیہ قرار دیں۔ پھر بیوی کو آٹھواں حصہ یعنی 2 آنے دیئے جائیں باقی 14 آنوں کو دس حصے کرکے ہر بیٹے کو 2 حصے اور ہر بیٹی کو ایک حصہ دیں۔

دلیل: ❶: ﴿فان کان لکم ولد فلھن الثمن﴾

❷: ﴿یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین﴾

واللہ اعلم بالصواب

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5

4 بیٹے عصبہ 70 فی کس 17.5

2 بیٹیاں عصبہ 17.5 فی کس 8.75

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ محمد اسمٰعیل فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک سوتیلا بھائی، ایک سگا بھائی محمد قاسم، تین ماں کی طرف سے بھائی اسحٰق، جمعو، حسین اور ایک اخافی بہن آمنت ایک بیوی مائی آست۔ مرحوم محمد اسمٰعیل نے ترکہ میں دکان، مکانات چوپائے، زیور، نقدی رقم کی صورت میں چھوڑا۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا۔

الجواب بعون الوھاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مرحوم کے مال میں سے پہلے نمبر پر اس کے کفن دفن کا خرچہ ادا کیا جائے، پھر اگر اس پر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے، تیسرے نمبر پر اگر اس نے جائز وصیت کی تھی تو اسے کل مال کے تیسرے حصے تک سے ادا کیا جائے۔ اس کے بعد محمد اسمٰعیل کی منقولہ اور غیر منقولہ ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر نیچے دیے گئے نقشہ کے مطابق ملکیت کو وارثوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

مرحوم محمد اسمٰعیل ملکیت 1 روپیہ

وارث: سوتیلا بھائی محروم، سگا بھائی محمد قاسم 8 پائی 6 آنے، تین اخیافی بھائی اور بہن 4 پائی 5 آنے۔ چاروں میں ایک جتنا برابر تقسیم ہوگا۔ بیوی 4 آنے۔

هذا ما عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100

سوتیلا بھائی محروم

سگا بھائی عصبہ 41.67

3 اخیافی بھائی اور بہن یعنی (4) $33.33\frac{1}{3}$

بیوی $25\frac{1}{4}$

****

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ بنام حاجی حمل فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک بیوی بنام وسندی، ایک بہن بنام آدن اور ایک ماں کی طرف سے بھائی اور ایک کزن اسمٰعیل۔ مسمات وسندی کو 14 بڑے جانور اپنے ماں باپ کی طرف سے ملے ہوئے ہیں۔ وضاحت کریں کہ شریعت محمدی کے مطابق کس کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے فوت ہونے والے کی ملکیت سے اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالنے کے بعد اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے پھر اگر جائز وصیت کی ہے تو اسے کل مال کے تیسرے حصے تک سے ادا کیا جائے۔ پھر باقی ملکیت منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر وارثوں میں وراثت اس طرح تقسیم ہوگی۔

فوت ہونے والا حاجی حمل ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیوی وسندی 4 آنے، بہن 8 آنے، ماں کی طرف سے بھائی 2 آنے 8 پائی، چچازاد کزن 1 آنہ 4 پائی۔

باقی مسمات وسندی کو ماں باپ کی طرف سے ذاتی طور پر 14 بڑے جانور ملے ہیں ان کی مالک خود مسمات وسندی ہے کسی اور کا اس میں حصہ نہیں ہوگا۔

نوٹ:...... اگر مذکورہ سوال صحیح ہے تو جواب بھی درست ہے۔ اور اگر سوال غلط لکھوایا گیا ہے تو اس کا جواب یہ نہیں ہے۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ نظام تقسیم

کل ملکیت 100

بیوی $25\frac{1}{4}$

اخیافی بھائی $\frac{1}{6}$ 16.66

بہن $\frac{1}{2}$ 50 چچازاد کزن عصبہ 8.34

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ بنام کموں فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے 2 بیٹے عمرالدین اور میر خان اور ایک بیوی بنام خاتون، اس کے بعد میر خان فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ماں اور بھائی عمر الدین۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے مرحوم کی کل ملکیت میں سے اس کا کفن دفن کا خرچہ کیا جائے اس کے بعد اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے، پھر اگر جائز وصیت کی ہے تو کل مال کے تیسرے حصے تک سے پوری کی جائے گی اس کے بعد باقی مال منقول یا غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر مرحوم کے وارثوں میں اس طرح سے تقسیم ہوگی۔

مرحوم کموں کی بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وان كان لكم ولد فلهن الثمن﴾ یعنی مسمات خاتون کو 2 آنے ملیں گے۔ باقی جو ملکیت بچی اس میں آدھی یعنی 7 آنے عمرالدین کو ملیں گے اور دوسرا آدھا حصہ یعنی 7 آنے میر خان کو ملیں گے۔

اس کے بعد میر خان فوت ہوا، وارث: ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اللہ کا فرمان ہے: ﴿ولا بويه لكل واحد منهما السدس مما ترك﴾ باقی جو ملکیت بچے گی وہ عمرالدین کو ملے گی۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

میّت کمو ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8}$ 12.5

2 بیٹے 87.5 فی کس 43.75

اس کے بعد ایک بیٹا میر خان فوت ہوا کل ملکیت 43.75

ماں $14.583\frac{1}{3}$ بھائی عمر الدین عصبہ 29.167

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ رب ڈنو فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے 2 بیٹے، ایک بیٹی بیٹوں کے نام عبداللہ، حاجی فقیر محمد تھے، عبداللہ فوت ہوگیا وارث چھوڑے 2 بیٹے رب ڈنو اور فاروق اور دو بیٹیاں، اس کے بعد حاجی فقیر محمد فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک بہن، ایک بیوی، 2 بھتیجے اور دو بھتیجیاں بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک وارث کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مرحوم کے مال میں سے اس کا کفن دفن اور قرض کی ادائیگی کے بعد اگر وصیت کی تھی تو سارے مال کے تیسرے حصے تک سے پوری کرنے کے بعد باقی مال کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح تقسیم ہوگی۔

مرحوم رب ڈنو کل ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیٹا کو 40 پیسے بیٹا کو 40 پیسے بیٹی کو 20 پیسے

عبداللہ فوت ہوا ملکیت 40 پیسے

وارث: بیٹے رب ڈنو کو $13\frac{1}{2}$ پیسے، بیٹے فاروق $13\frac{1}{2}$ پیسے، بیٹی کو $6\frac{1}{2}$ پیسے، بیٹی $6\frac{1}{2}$ پیسے

فقیر محمد فوت ہوا ملکیت 40 پیسے

وارث: بیوی کو 10 پیسے، بہن 20 پیسے دو بھتیجے 10 پیسے مشترکہ دو بھتیجیاں محروم

قولہ تعالیٰ: ﴿وان لم يكن له ولد فلهن الربع﴾

نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((الحقوا الفرائض باهلها فما بقى فلاولى رجل ذكر .))

(الحديث)

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

میّت رب ڈنو کل ملکیت 100

2 بیٹے عصبہ 80 فی کس 40

1 بیٹی عصبہ 20

پہلا بیٹا عبداللہ فوت ہوا کل ملکیت 40

2 بیٹے عصبہ 26.666 فی کس 13.333

2 بیٹیاں عصبہ 13.333 فی کس 6.666

دوسرا بیٹا فقیر محمد بھی فوت ہوا کل ملکیت 40

بیوی $\frac{1}{4} = 10$

بہن $\frac{1}{2} = 20$

2 بھتیجے عصبہ 10 فی کس 5

2 بھتیجیاں محروم

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں عبد فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے دو بیٹے ڈنو اور مصری اور دو بیٹیاں آمنت اور سنگھار اس کے بعد مصری فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک بیوی، بھائی ڈنو، دو بہنیں آمنت اور سنگھار اس کے بعد سنگھار فوت ہوگئی اور وارث چھوڑے خاوند مجنوں، ایک بہن آمنت، ایک بھائی ڈنو، بیٹا نور محمد بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے مرحوم کی ملکیت میں سے مرحوم کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے، پھر اگر مرحوم پر قرض تھا تو اسے ادا کیا جائے اور بعد میں اگر جائز وصیت کی تھی تو اسے ساری جائیداد کے تیسرے حصے تک سے پورا کیا جائے۔ اس کے بعد باقی مال منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح سے

وراثت تقسیم ہوگی۔

مرحوم عبد کل ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیٹے ڈنو کو 5 آنے 4 پائی، بیٹے مصری کو 5 آنے 4 پائی، بیٹی آمنت کو 2 آنے 8 پائیاں، بیٹی سنگھار کو 2 آنے 8 پائیاں ملیں گی۔

ان کے بعد مصری فوت ہوا ملکیت 4 پائی، 5 آنے۔

وارث: بیوی کو 1 آنہ 4 پائیاں، بھائی کو 2 آنے، بہن کو 1 آنہ بہن کو 1 آنہ۔

اس کے بعد سنگھار فوت ہوگئی۔ ملکیت 8 پائیاں، 3 آنے

وارث: خاوند کو 11 پائیاں، بیٹے کو 2 آنے 9 پائی، بہن 7 پائی بھائی۔ 1 آنہ 2 پائی۔

نوٹ:...... باقی ایک پائی بچے گی اس کے 3 حصے کرکے دو حصے بھائی کو اور ایک حصہ بہن کو دیا جائے۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ تقسیم طریقہ

میّت عبد کل ملکیت 100

2 بیٹے (ڈنو، مصری)	66.666 فی کس	33.333
2 بیٹیاں (آمنہ، سنگھار)	33.334 فی کس	16.667

میّت بیٹا مصری کل ملکیت 33.333

بیوی $\frac{1}{4} = 8.332$

بھائی (ڈنو) عصبہ 12.50

2 بہنیں (آمنہ، سنگھار) عصبہ 12.50 فی کس 6.250

میّت بہن سنگھار کل ملکیت 22.91

خاوند

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ بنام دودو ایک عورت مسمات مکھن (جو کہ حاملہ تھی) کو بھگا کر لے گیا اور اس سے نکاح کیا اس کے بعد دودو میں سے تین بیٹے ننگر، جان اور بچایو اور ایک بیٹی مسمات بیگم پیدا ہوئے اس کے بعد دودو کے نکاح والی بیوی مسمات آمنت بنام مٹھو کے ساتھ بھاگ گئی، مسمات آمنت کے گھر ایک بچی پیدا ہوئی پھر مسمات آمنت کو دودو کچھ عرصے تقریباً 15 سال کے بعد اپنے گھر لے آیا اس کے بعد دودو فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک بیوی مسمات آمنت اور ایک بھائی گیلو، اب ننگر والے کہتے ہیں کہ دودے کی وراثت کے مالک ہم ہیں۔ وضاحت کریں کہ دودے کی ملکیت کا حقیقی وارث کون ہے؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے سب سے پہلے فوت ہونے والے کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے۔ پھر اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے، پھر اگر وصیت کی ہو تو سارے مال کے تیسرے حصے تک سے ادا کی جائے۔ اس کے بعد باقی ملکیت منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح سے تقسیم ہوگی۔

فوت ہونے والا دودو ملکیت 1 روپیہ

وارث: بھائی گیلو 2 آنے، بیوی مسمات آمنت 4 آنے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ﴾

باقی ننگر اور خان والے دودو کے وارث نہیں ہوسکتے اور مٹھو میں سے جو بچی پیدا ہوئی اس کو بھی کچھ نہیں ملے گا۔ کیونکہ جب یہ نکاح نہیں ہوا تو حصہ کیسے ملے گا۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

کل ملکیت 100

بیوی	$\frac{1}{4} = 25$
بھائی گیلو عصبہ	75

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ محمد کریم شاہ وفات پا گئے جس نے درج ذیل وارث چھوڑے ایک بیٹی، 4 بھائی 2 بہنیں۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کیا حصہ ملے گا مرحوم کی جائیداد اور زیور اور نقدی بینک میں رکھے ہوئے ہیں؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مرحوم کی ملکیت میں سب سے پہلے کفن دفن کا خرچہ نکالیں، پھر اگر قرض ہے تو اسے ادا کریں، پھر اگر جائز وصیت کی تھی تو کل مال کے تیسرے حصے تک سے پوری کی جائے۔ اس کے بعد باقی ملکیت منقول یا غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح تقسیم کی جائے گی۔

فوت ہونے والا محمد کریم شاہ ملکیت 1 روپیہ

وارث:	پائیاں	آنے
بیٹی	50	00
بھائی	10	00
بھائی	10	00
بھائی	10	00
بھائی	10	00
بہن	05	00
بہن	05	00

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد نظام تقسیم

کل ملکیت 100

بیٹی 50

4 بھائی عصبہ 40 فی کس 10

2 بہن عصبہ 10 فی کس 5

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں منگی لدھو شاہ فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے۔ ایک بیوی بی بی امام زادی، 4 بہنیں مسمات بی بی میر زادی، بی بی آمنہ، بی بی بچو، بی بی زینب اور چچا زاد بہن کا بیٹا سیّد نور شاہ، اس کے بعد مسمات میر زادی فوت ہوگئی جس نے وارث چھوڑے تین بہنیں بی بی آمنہ، بی بی بچو، بی بی زینب اور چچا زاد بہن کے بیٹے ولی محمد، مقارو، وڈل، حاجی شاہ محمد، میرل، حسن، اس کے بعد بی بی آمنہ فوت ہوگئی جس نے وارث چھوڑے 2 بہنیں بی بی زینب اور بی بی بچو، اور چچا زاد بہن کے بیٹوں کے بیٹے ولی محمد، شارو، وڈل، شاہ محمد، میرل، حسن، اس کے بعد بچو بی بی اور زینب فوت ہوگئی جس نے وارث چھوڑے چچا زاد بھائیوں کی اولاد کے بیٹے جو کہ اوپر ذکر ہوئے ہیں۔ وضاحت کریں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: سب سے پہلے میّت کی جائیداد میں سے کفن دفن اور قرض کی ادائیگی کی جائے، پھر اگر جائز وصیت کی تھی تو ساری جائیداد کے تیسرے حصے سے پوری کی جائے پھر ساری ملکیت منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر تقسیم اس طریقے پر ہوگی۔

فوت ہونے والا منگی لدھو شاہ ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیوی کو 4 آنے، بہن میر زادی کو 2 آنے 8 پائی، بہن آمنہ 2 آنے 8 پائی، بہن بچو 2 آنے 8 پائی، بہن زینب 2 آنے 8 پائی، چچا زاد کا بیٹا نور شاہ کو 1 آنہ 4 پائی ملیں گے

اس کے بعد میر زادی فوت ہوئی کل ملکیت 8 پائی، 2 آنے

وارث: بہن $7\frac{1}{4}$ پائی، بہن $7\frac{1}{4}$، بہن $7\frac{1}{4}$، ولی محمد، متارو

وڈل شاہ محمد حسن میرل

باقی اوپر مذکورہ تمام چچا زاد $10\frac{1}{4}$ پائی کے اندر برابر برابر حصے دار ہوں گے

اس کے بعد آمنہ فوت ہوئی ملکیت $3\frac{1}{4}$ پائی 3 آنے

وارث: بہن 1 آنہ 1 پائی، بہن 1 آنہ 1 پائی، چچا زاد کی اولاد میں شارو، ولی محمد، وڈل شاہ محمد، حسن میرل سب کے سب 1 آنے $1\frac{1}{4}$ پائی میں برابر کے حصے دار ہیں۔

اس کے بعد بچو فوت ہوگئی ملکیت $3\frac{1}{4}$ پائی 3 آنہ

وارث: بہن کو 1 انہ 1 پائی۔ باقی 1 آنہ $4\frac{1}{4}$ پائی میں سب چچازاد کے بیٹے ولی محمد، شارو، وڈل، شاہ محمد، حسن، میرل برابر کے حصے دار ہیں۔

اس کے بعد زینب فوت ہوئی ملکیت $6\frac{1}{2}$ پائیاں 6 آنے

وارث: چچازاد کے بیٹے متارو، وڈل، ولی محمد، شاہ محمد، حسن میرل، 6 آنے $6\frac{1}{2}$ پائیوں میں برابر کے حصے دار ہوں گے۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ نظام تقسیم

میت منگی لدھو شاہ کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{4} = 25$

4 بہنیں $\frac{2}{3} = 66.66$ فی کس 16.665

چچازاد بیٹا (نور شاہ) عصبہ 8.34

ان میں ایک بہن میر زادی فوت کل ملکیت 16.665

3 بہنیں $\frac{2}{3}$ 11.11 فی کس 3.703

6 چچازاد بہن کے لیے عصبہ 5.555 فی کس 0.925

پھر دوسری بہن آمنہ فوت کل ملکیت 20.368

2 بہنیں $\frac{2}{3}$ 13.578 فی کس 6.789

6 چچازاد بہن کے بیٹے عصبہ 6.79 فی کس 1.131

❀❀❀❀

سوال: ❶ ...... کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ بنام محمد سلیمان فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں ایک بیوی، ایک بھائی محمد حسن کو چھوڑا ان کے علاوہ اور کوئی بھی

وارث نہیں ہے۔

❷ ...... مرحوم نے اپنی زندگی میں ہی تحریر کر دیا تھا کہ پیسے، مال اور گھر میں اپنی بیوی کو دیتا ہوں جو میرے مرنے کے بعد میری بیوی کو دیئے جائیں، باقی زمین کو شریعت محمدی کے مطابق تقسیم کر دیا جائے یہ دستاویزات تحریر شدہ ہیں؟

الجواب بعون الوھاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے مرحوم کی ملکیت میں سے مرحوم کے کفن دفن کا خرچہ کیا جائے، اس کے بعد اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے، اس کے بعد اگر مرنے والے نے وصیت کی تھی کو کل وراثت کے تیسرے حصے تک سے پوری کی جائے اس کے بعد منقول خواہ غیر منقول جائیداد کو ایک روپیہ قرار دے کر ورثاء میں اس طرح تقسیم ہوگی۔

زمین میں سے 4 آنے بیوی کو اور 12 آنے بھائی محمد حسن کو دیں گے باقی جو ملکیت مرحوم نے اپنی زندگی میں ہی ہبہ کر دی تھی وہ ہبہ برقرار رہے گی کیونکہ مرحوم نے یہ ہبہ کر دی تھی کہ اس کی بیوی کو دیا جائے۔ اسی کی رہے گی۔ واللہ اعلم بالصواب

موجودہ اعشاری فیصد نظام میں یوں بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے

100 روپے ترکہ

بیوی	$\frac{1}{4} = 25$
بھائی عصبہ	75

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ جمال الدین فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک بیوی اور دو خالہ زادان کے علاوہ کوئی وارث بھی نہیں ہے اس کے بعد مسمات بانو نے دوسرے خاوند سے شادی کر لی پھر مسمات بانو درج ذیل وارثوں کو چھوڑ کر فوت ہوگئی 2 بیٹیاں، دو بھائی اور ایک بہن۔ بتائیں کہ شریعت محمدیہ کے مطابق کس کو کتنا حصہ

ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے فوت ہونے والے کی ملکیت سے اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے، پھر اگر قرض تھا تو اس کو ادا کیا جائے پھر تیسرے نمبر پر اگر جائز وصیت کی تھی تو اسے کل مال کے تیسرے حصے تک سے ادا کیا جائے۔ اس کے بعد باقی ملکیت منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر میت کے ورثاء میں اس طرح سے تقسیم ہوگی۔

فوت ہونے والا جمال الدین ملکیت 1 روپیہ

وارث بیوی کو 4 آنے اور دو خالہ زاد کو 12 آنے۔

حدیث میں ہے:((الحقوا الفرائض باهلها فما بقى فلاولى رجل ذكر .))

فوت ہونے والی مسمات بانو کی ملکیت کو 1 روپیہ قرار دیا جائے۔

وارث: دو بیٹیاں 10 آنے 8 پائیاں مشترکہ باقی بچیں گے 5 آنے 4 پائیاں ان کو پانچ حصے کر کے ہر بیٹے کو 2 اور بیٹی کو ایک حصہ دیا جائے گا۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد نظام تقسیم

کل ملکیت 100 میّت جمال الدین

مسمات بانو بیوی $\frac{1}{4} = 25$

دو خالہ زاد ذوی الارحام 75

میّت بانو کل ملکیت 100

2 بیٹیاں $66.66\frac{2}{3}$	فی کس 33.33
2 بھائی عصبہ 26.672	فی کس 13.336
بہن عصبہ 6.668	

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص بنام محمد علی سنجرانی نے اپنی زندگی میں ہی ایک وصیت نامہ لکھا جس میں باور کروایا ہے کہ اس کی اولاد صرف دو بیٹیاں حکیماں اور ملکاں ہیں ان دو کے علاوہ اور کوئی اولاد نہیں، لہٰذا میری وفات کے بعد میری ساری جائیداد میری ان دو بیٹیوں کو ہی دی جائے۔ جب محمد علی فوت ہوا تو اس نے درج ذیل ورثاء چھوڑے دو بیٹیاں، ایک بیوی مسمات سیانی اور ایک بھتیجا ولی محمد۔ اب عرض یہ ہے کہ مرحوم کی تحریر کردہ وصیت نامے کی حیثیت شریعت کے مطابق وصیت نامہ کی ہے یا ہبہ کی، نیز مرحوم کی جائیداد کو ورثا میں کس طرح تقسیم کیا جائے گا؟

الجواب بعون الوهاب: مذکورہ صورت میں مرحوم محمد علی کی وصیت اپنی بیٹیوں کے حق میں بالکل باطل اور نا قابل مردود ہے کیونکہ دونوں بیٹیاں وارث ہیں اور وارث کے لیے وصیت نہیں کی جا سکتی: ((لا وصية لوارث .)) (الحديث) اس لیے اس وصیت کی کوئی حیثیت نہیں، بتائی ہوئی صورت میں مرحوم کی ملکیت میں سے پہلے کفن دفن کا خرچہ، دوسرے نمبر پر قرضہ کی ادائیگی کی جائے گی، اگر قرضہ ہے تو پھر بعد میں باقی ملکیت کو ایک روپیہ تصور کر کے تقسیم اس طریقہ سے ہوگی۔

بیوی مسمات سیانی 2 آنے، دو بیٹیوں کو 10 آنے 8 پیسے باقی بچے 3 آنے 4 پیسے وہ بھتیجے کو دیے جائیں گے اس طرح کی تقسیم قرآن مجید اور حدیث مبارکہ میں وضاحت سے بیان ہوئی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

مندرجہ بالا سوال کو موجودہ اعشاری نظام میں یوں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے کہ اگر میّت کا ترکہ 100 روپے شمار کیا جائے تو ہر وارث کا حصہ یہ ہوگا۔

بیوی	$\frac{1}{8} = 12.5$	
دو بیٹیاں	$\frac{2}{3} = 66.66$	فی کس 33.33
بھتیجا 20.84		

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ بنام مصری فوت ہوا جس نے وارث چھوڑے 6 بیٹے سائیں بخش، جان محمد، سنجر، کمال، رستم علی، عاول اور تین بیٹیاں، مصری خان کی ملکیت مشترک تھی۔ عارضی طور پر سب بیٹوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے تقسیم کیا ہوا تھا۔ اس میں سے اور بھی کافی ملکیت بنی جو کہ سائیں بخش کے کنٹرول اور نگہبانی میں تھی دوسروں کو ملکیت نہیں تقسیم کی تھی کہ خود فوت ہو گیا۔ اب سائیں بخش کے بیٹے باقی چچازاد بھائیوں کو ملکیت نہیں دے رہے وضاحت کریں کہ شریعت محمدی کے مطابق اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے مرحوم کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے اس کے بعد اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے اس کے بعد باقی ملکیت منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر وارثوں میں اس طرح سے تقسیم کی جائے گی اور یہ سب کی سب ملکیت مشترک ہوگی۔

فوت ہونے والا مصری خان ملکیت 1 روپیہ

وارث: 6 بیٹے اور 3 بیٹیاں۔ کل ملکیت کے 15 حصے کر کے ہر بیٹے کو دو اور ہر بیٹی کو ایک حصہ دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿للذکر مثل حظ الانثیین﴾

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید طریقہ تقسیم برائے اعشاری نظام

کل ملکیت 100

6 بیٹے عصبہ	79.999	فی کس 13.333
3 بیٹیاں عصبہ	19.999	فی کس 6.666

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ بنام حاجی امام بخش نے اپنی

زندگی میں ہی اپنے بیٹے مانی خان کے نام پر زمین کروادی تھی حالانکہ مرحوم کے 4 بیٹے تھے اس کے بعد مانی خان فوت ہوا جس نے وارث چھوڑے تین بھائی۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوھاب: یادرہے کہ سب سے پہلے مرحوم کی ملکیت میں سے اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالنے کے بعد اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے تیسرے نمبر پر اگر جائز وصیت کی تھی تو کل مال کے تیسرے حصے تک سے پوری کی جائے۔ اس کے بعد مرحوم کے بقیہ مال منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح تقسیم کی جائے گی۔

مرحوم امام بخش ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیٹا 4 آنے، بیٹا 4 آنے، بیٹا 4 آنے، بیٹا 4 آنے

اس کے بعد مانی خان فوت ہوا۔ ملکیت کو ایک روپیہ قرار دیں گے۔

وارث: بھائی 5 آنے 4 پائی، بھائی 5 آنے 4 پائی، بھائی 5 آنے 4 پائی

هذا هو عندي والعلم عند ربي

نوٹ:......اگر ملکیت باپ کی تھی تو تقسیم ایسے ہی ہوگی۔

جدید اعشاریہ فیصد نظام تقسیم

اس میں مانی خان کی الگ سے ملکیت تقسیم کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے وارث بھی وہی تین بھائی ہیں لہٰذا ان کے والد اور مانی خان کی کل ملکیت کو 100 شمار کر کے تینوں بھائی کو ایک ایک حصہ دے دیں۔ تقسیم یوں ہوگا۔

کل ملکیت 100

3 بھائی عصبہ	100 فی کس	33.333

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ عیسٰی فوت ہوگیا جس نے وارث

چھوڑے ایک بیوی، تین بیٹے غلام رسول، غلام حسین اور حاجی چھچھو اور آٹھ بیٹیاں۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے پہلا کام اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے، دوسرے نمبر پر اگر مرحوم پر قرضہ تھا تو اس کی ملکیت میں سے ادا کیا جائے۔ تیسرے نمبر پر اگر جائز وصیت کی تھی تو سارے مال کے تیسرے حصے تک سے وصیت پوری کی جایئے۔ اس کے بعد مرحوم کی ساری ملکیت منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح سے تقسیم ہوگی۔

فوت ہونے والا عیسیٰ ملکیت 1 روپیہ

وارث	پائیاں	آنے
بیوی	00	02
غلام رسول	00	02
غلام حسین	00	02
چھچھو	00	02
8 بیٹیاں مشترکہ	00	08

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ان كان لكم ولد فلهن الثمن﴾

دوسرا فرمان: ﴿للذكر مثل حظ الانثيين﴾

جدید اعشاریہ فیصد نظام تقسیم

کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8} = 12.5$

3 بیٹے عصبہ 37.5 فی کس 12.5   8 بیٹیاں عصبہ 50 فی کس 6.25

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے متعلق کہ محمد یعقوب خان فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک بیوی، دو بیٹیاں ایک بھتیجا اور بہن۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے اس کے کفن دفن کا خرچہ کیا جائے اس کے بعد اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے۔ تیسرے نمبر پر اگر وصیت کی ہے تو سارے مال کے تیسرے حصے تک سے پوری کی جائے۔ اس کے بعد باقی مال منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر وارثوں میں اس طرح تقسیم کیا جائے گا۔

فوت ہونے والا محمد یعقوب ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیوی 2 آنے، بیٹیاں 10 آنے 8 پائیاں، بہن 3 آنے 4 پائی، بھتیجا محروم

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد نظام تقسیم

کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8} = 12.5$

2 بیٹیاں $\frac{2}{3} = 66.66$ فی کس 33.33

بہن عصبہ مع الغیر 20.84

بھتیجا محروم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ بنام پھوٹا فوت ہوگیا جس نے درج ذیل وارث چھوڑے۔ ایک بیٹی اور دو بھتیجیاں اور مرحوم کا سسر، اب عرض یہ ہے کہ مرحوم کے سسر کا کہنا ہے کہ سب ملکیت میری ہے اور اب تک ساری جائیداد پر قبضہ کیا ہوا ہے۔

بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا۔

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے مرحوم کے مال میں سے مرحوم کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے گا، پھر اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے، پھر اگر جائز وصیت کی ہے تو مکمل جائداد کے تیسرے حصے تک سے پوری کی جائے۔ بعد میں باقی ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر وراثت اس طرح سے تقسیم ہوگی۔

فوت ہونے والا پھوٹا۔ جائیداد 1 روپیہ منقول خواہ غیر منقول

وارث: بیٹی 8 آنے، بیوی 2 آنے، 2 بہنیں 6 آنے، سسر مٹھو محروم

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید طریقہ اعشاریہ فیصد نظام تقسیم

کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8} = 12.5$

بیٹی $\frac{1}{2} = 50$

2 بہنیں عصبہ مع الغیر 37.5 فی کس 18.75

سسر محروم

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص بنام شوکت فوت ہوگیا جس نے درج ذیل وارث چھوڑے۔ ایک ماں، ایک بیوی، تین بہنیں اور ایک چچا۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے فوت ہونے والے کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے، پھر اگر قرض تھا تو اسے ادا کیا جائے پھر اگر جائز وصیت کی تھی تو سارے مال کے تیسرے حصے تک سے پوری کی جائے

اس کے بعد باقی ملکیت منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر وارثوں میں اس طرح سے تقسیم کی جائے گی۔

وارث: بیوی 3، ماں 2، تینوں بہنیں مشترکہ 8۔

نوٹ: ......ایک روپیہ (ساری ملکیت) کے 13 حصے کر کے مذکور نقشہ کے مطابق ملکیت وارثوں میں تقسیم کی جائے گی ایک روپے کے 13 حصے کر کے 3 بیوی کو دیے جائیں اور ماں کو 2 حصے دیے جائیں گے اور تینوں بہنوں کو 8 حصے ملیں گے جو کہ اس میں برابر کی شریک (حصے دار) ہوں گی۔

اللہ تعالیٰ کے فرامین ہیں: ﴿وَ لَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ﴾

﴿ولابويه لكل واحد منهما السدس﴾

﴿فان كانتا اثنتين فلهما الثلثان مما ترك﴾

نوٹ:...... چچا محروم ہوگا

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاری نظام فیصد میں طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100

ماں $\frac{1}{6}$ = 15.38 بیوی $\frac{1}{4}$ = 23.08 3 بہنیں $\frac{2}{3}$ = 61.54 چچا عصبہ محروم

❋❋❋❋

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص بنام علی محمد وفات پا گیا جس نے وارث چھوڑے 5 بیٹے شادی خان، محمود، شمیر، صادق، فقیر محمد اور 6 بیٹیاں خیران، مکھن، گلاں مریم، ملی، سیانی اور دو بیویاں نازو اور جادو۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک وارث کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: یاد رہے کہ سب سے پہلے مرحوم علی محمد کی جائیداد میں سے

ان کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے پھر اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے پھر اگر کوئی جائز وصیت کی ہے تو کل مال کے تیسرے حصے تک سے پوری کی جائے اس کے بعد باقی ملکیت منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح سے تقسیم کی جائے گی۔ دونوں بیویوں کو آٹھواں حصہ 2 آنے ملیں گے، ان کے بعد باقی 14 آنے کو 16 حصے کر کے ہر بیٹے کو دو اور ہر بیٹی کو حصہ ملے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فان کان لکم ولد فلهن الثمن﴾

﴿یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین﴾

مزید وضاحت کے لیے نیچے نقشے میں حصے ذکر کیے جا رہے ہیں۔

مرحوم علی محمد کل ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیٹا 09 پائی 1 آنے، بیٹا 09 پائی 1 آنے، بیٹا 09 پائی 1 آنے، بیٹا 09 پائی 1 آنے، بیٹا 09 پائی 1 آنے، بیٹی $10\frac{1}{2}$ پائی، بیٹی $10\frac{1}{2}$ پائی، بیٹی $10\frac{1}{2}$ پائی، بیٹی $10\frac{1}{2}$ پائی، بیٹی $10\frac{1}{2}$ پائی، بیٹی $10\frac{1}{2}$ پائی، بیوی 1 آنا، بیوی 1 آنا۔

جدید اعشاریہ نظام طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100

2 بیویاں	$\frac{1}{8} = 12.5$	فی کس 6.25
5 بیٹے عصبہ	54.687	فی کس 10.937
6 بیٹیاں عصبہ	32.813	فی کس 5.468

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بنام ہدایت علی بن محمد اسماعیل اور قاسم علی بن محمد اسماعیل دونوں سگے بھائی تھے اور تین بہنیں تھیں جن میں سے دو بہنیں بھائیوں کی زندگی میں ہی فوت ہوگئیں۔ اس کے بعد قاسم علی بن اسماعیل بھی فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں سے ایک بھائی اور ایک بہن چھوڑے۔ قاسم کی وفات کے

بعد بہن نے اپنے بھائی ہدایت علی سے ملکیت کا مطالبہ نہیں کیا اور بعد ازاں فوت ہوگئی جس کے بعد ہدایت علی بھی فوت ہوگیا۔ جس نے ورثاء میں سے صرف ایک کزن بنام عبداللطیف بن غلام مصطفیٰ چھوڑا جس کی بہنیں بھی ہیں۔ شریعت محمدی کے مطابق بتائیں کہ ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا۔ بینوا وتوجروا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ میت کے مال سے سب سے پہلے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے گا۔ اس کے بعد قرضہ ہے تو اس کو پورا کیا جائے گا، اس کے بعد اگر وصیت ہے تو وہ ثلث مال سے ادا کی جائے گی۔ اس کے بعد منقول خواہ غیر منقول جائیداد کو ایک روپیہ قرار دے کر اس کے ورثا میں اس طرح تقسیم کی جائے گی۔ دونوں بھائیوں کو آدھا آدھا حصہ ملے گا یعنی آٹھ آٹھ آنہ اس کے بعد قاسم علی فوت ہوگیا جس کی کل ملکیت 8 آنہ ورثاء ہدایت علی بھائی 5 آنہ، 4 پائی۔ ایک بہن 2 آنہ 8 پائی جبکہ بہن نے اپنے بھائی قاسم بن محمد اسماعیل کی ملکیت کا اپنے بھائی ہدایت اللہ سے مطالبہ نہیں کیا اور اپنی حق داری سے دستبردار ہوئی تو اس کا حصہ بھی ہدایت اللہ کو ہی ملے گا کیونکہ اصل وارث وہی ہے اس کے بعد ہدایت علی فوت ہوگیا جس کی ملکیت ایک روپیہ ہے۔ 1 روپیہ ورثاء: ایک کزن بنام عبداللطیف بن محمد مصطفیٰ جو کہ زندہ ہے کل ملکیت ایک روپیہ۔ عبداللطیف کے بہنوں کو بھی حصہ نہیں ملے گا جو زندہ ہیں کیونکہ حدیث ہے: ((الحقوا الفرائض باهلها فما بقى فلا ولى رجل ذكر.)) اصحاب الفرائض کو اپنے بعد جو بچ جائے وہ مذکر مرد کا ہے جو میت کے زیادہ قریب ہو۔

نوٹ:...... باقی جو عبداللطیف کے بھائی ہیں بنام محمد ابراہیم اور حاجی ریاست علی وہ دونوں ہدایت علی کی زندگی میں ہی فوت ہوگئے تھے، اس لیے ان کو حصہ نہیں ملے گا۔ جب فوتی کزنوں کو حصہ نہیں مل رہا تو ان کی اولاد کو کس طرح ملے گا۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

میّت محمد اسماعیل کل ملکیت 100

بیٹا ہدایت علی 40

بیٹا قاسم علی 40

بیٹی 20

میت قاسم علی کل ملکیت 40

بھائی ہدایت علی عصبہ 40

بہن عصبہ دستبردار

میّت ہدایت علی کل ملکیت 100

1 کزن عبداللطیف عصبہ 100

1 کزن عورت محروم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بنام علی بخش فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں سے ایک بیوی اور ایک بیٹا حمزہ اور تین بیٹیاں نور خاتون، مریم، رحمت اس کے بعد علی بخش کی بیوی فوت ہوگئی جس نے ورثاء میں سے حقیقی بھائی حمزہ خان اور اخیافی بھائی صالح اور حقیقی بہن نور خاتون چھوڑے۔ شریعت کے مطابق بتائیں کہ ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟ بینوا وتوجروا.

الجواب بعون الوهاب بشرط صحة السؤال: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے میّت کی ملکیت سے کفن و دفن اور قرضہ اور وصیت (اگر ہو تو) اس کو ثلث مال سے پورا کیا جائے گا اس کے بعد منقول جائیداد خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر ورثاء میں اس طرح تقسیم کی جائے گی۔

فوتی: علی بخش کل ملکیت ایک روپیہ

ورثاء: بیوی 2 آنہ، بیٹا حمزہ 5 آنہ، 1/5 پائی۔ تین بیٹیاں 2 آنے $\frac{3}{5}$ 9 پائی ہر ایک کو

اس کے بعد فوت ہونے والی اس کی بیوی کی رقم کو ایک روپیہ قرار دیا گیا۔

ورثاء: بیٹا حمزہ 4 پائی 5 آنہ، بیٹا صالح 4 پائی 5 آنہ، بیٹی رحمت 8 پائی، 2 آنہ۔ بیٹی نور

خاتون 8 پائی، 2 آنہ۔

اس کے بعد فوت ہونے والی مسمات رحمت کی کل ملکیت کو ایک روپیہ قرار دیا گیا۔

ورثاء: حقیقی بھائی 10 آنہ 8 پائی۔ اخیافی بھائی محروم۔ حقیقی بہن 5 آنہ 4 پائی۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید طریقہ تقسیم اعشاریہ فیصد نظام

میّت علی بخش کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8} = 12.5$ بیٹا حمزہ عصبہ 35

3 بیٹیاں عصبہ 52.5 فی کس 17.5

میّت زوجہ کل ملکیت 12.5

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص بنام حاجی محمد جمالی فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں سے دو بیٹے بلاول اور عبدالحئی اور دو بیٹیاں خیران اور نعمت اور ایک بیوی جادو چھوڑی۔ شریعت کے مطابق بتائیں کہ ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

بینوا وتوجروا.

الجواب بعون الوهاب بشرط صحة السوال: معلوم ہونا چاہیے کہ فوتی کی ملکیت سے سب سے پہلے کفن ودفن قرضہ اور وصیت (ثلث مال میں سے) کو پورا کیا جائے گا اس کے بعد کل ملکیت منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح تقسیم کیا جائے گا۔ بیوی کو کل مال سے آٹھواں حصہ ملے گا اور بیٹی کے مقابلے میں ہر بیٹے کو دگنا حصہ

ملے گا۔ وضاحت کے لیے فوتی حاجی محمد کل ملکیت 1 روپیہ۔

ورثاء: بیٹا 4 آنہ 8 پائی۔ بیٹا 4 آنہ 8 پائی۔ بیٹی 2 آنہ 4 پائی۔ بیٹی 2 آنہ 4 پائی۔ بیوی 2 آنہ۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید فیصد اعشاریہ طریقہ تقسیم

میّت حاجی محمد جمالی کل ملکیت 100

بیوی	$\frac{1}{8} = 12.5$	
2 بیٹے عصبہ	58.33	فی کس 29.16
2 بیٹیاں عصبہ	29.16	فی کس 14.58

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بنام محمد ابراہیم فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں سے ایک بیوی روشن بیگم پانچ بیٹے امان اللہ، عنایت اللہ، حبیب اللہ، امداد اللہ، رحمت اللہ اور 6 بیٹیاں اشرف النساء، ارشاد بیگم، زرینہ بیگم، شمشاد بیگم، سجیدہ بیگم، رخسانہ بیگم چھوڑے۔ شریعت محمدی کے مطابق بتائیں کہ ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟ اس کے بعد رحمت اللہ فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں سے چار سگی بہنیں اور دو اخیافی بہنیں اور 4 اخیافی بھائی اور ایک ماں چھوڑی۔ اس کے بعد امان اللہ فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں سے ایک بیوی 6 بیٹیاں اور تین بھائی 2 سگی بہنیں اور 4 اخیافی بہنیں چھوڑیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے فوتی کی ملکیت سے کفن ودفن پر خرچ کیا جائے گا اس کے بعد اگر قرضہ ہے تو اس کو پورا کیا جائے گا پھر اگر وصیت ہے تو ثلث مال سے ادا کی جائے گی اس کے بعد منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر اس کے ورثاء میں اس طرح تقسیم کیا جائے گا۔

فوتی محمد ابراہیم: کل ملکیت ایک روپیہ

ورثاء: بیوی روشن بیگم 2 آنے، بیٹے امان اللہ 1 آنہ 9 پائی، عنایت اللہ 1 آنہ 9 پائی، حبیب اللہ 1 آنہ 9 پائی، امداد اللہ 1 آنہ 9 پائی، رحمت اللہ آنہ 9 پائی۔ بیٹیاں اشرف النساء $10\frac{1}{2}$ پائیاں، ارشاد بیگم $10\frac{1}{2}$ پائیاں، شمشاد بیگم $10\frac{1}{2}$ پائیاں، بجیدہ بیگم $10\frac{1}{2}$ پائیاں، زرینہ $10\frac{1}{2}$ پائیاں، رخسانہ بیگم $10\frac{1}{2}$ پائیاں، اس کے بعد رحمت اللہ فوت ہوگیا کل ملکیت 1 آنہ 9 پیسہ۔

ورثاء: ماں روشن بیگم $3\frac{1}{2}$ پائیاں، چار سگی بہنیں 1 آنہ 2 پیسہ مشترک۔ 4 اخیافی بھائی $3\frac{1}{2}$۔

دو اخیافی بہنیں دونوں محروم رہیں گی۔ کیونکہ حدیث میں ہے: "الحقوا الفرائض باهلها فما بقى فلا ولى رجل ذكر."

اس کے بعد امان اللہ فوت ہوگیا کل ملکیت 1 آنہ 9 پیسہ۔

ورثاء: ایک بیوی $2\frac{5}{8}$، 6 بیٹیوں میں سے $2\frac{1}{2}$ پائی ہر ایک کو، 3 سگے بھائی ہر ایک کو 1 پائی۔ ہر ایک کو دو سگی بہنیں۔ سگی بہن 35/64، سگی بہنیں 35/64۔

زاہدہ بیگم فوت ہوگئی کل ملکیت $2\frac{1}{3}$ پائیاں

ورثاء: بیٹی 7/20 پائی، بیٹی 7/20 پائی، بیٹی 7/20 پائی، بیٹا 7/10 پائی، خاوند 7/12 پائی

هذا هو عندي والعلم عند ربي

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بنام محمد صدیق اور محمد الیاس دونوں بھائیوں نے مل کر کچھ ملکیت بنائی۔ اس مشترکہ ملکیت سے کچھ زیادہ ملکیت بنی ہے۔ اب جس کے پاس جو ملکیت ہے وہ کہتا ہے کہ میری ہے۔ شریعت کے مطابق بتائیں کہ یہ تقسیم درست ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ملکیت دونوں بھائیوں کی مشترکہ ہے

اس پوری ملکیت منقول خواہ غیر منقول کے دو حصے کر کے ہر ایک بھائی کو ایک حصہ دیا جائے گا۔

هذا هو عندي والعلم عند ربی

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اسماعیل فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں سے ایک بیٹا عبدالکریم ایک بیوی جمیلہ چھوڑے اس کے بعد عبدالکریم فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں سے دو بیٹیاں مکھن اور سلیمہ اور بیوی رانی اور ماں جمیلہ چھوڑیں۔ اس کے بعد جمیلہ فوت ہوگئیں جس نے چار بھتیجے۔ (1) صالح (2) تاج محمد (3) طاہر (4) قادر چھوڑے، اس کے بعد عورت مکھن بھی فوت ہوگئیں جنھوں نے دو بیٹے عبدالکریم اور حسین اور ماں رانی اور خاوند بچو کو ورثا میں چھوڑا۔ اس کے بعد حسین بھی فوت ہوئے جنھوں نے ورثاء میں والد بچو بھائی عبدالکریم کو چھوڑا۔ شریعت کے مطابق بتائیں کہ ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب بعون الوهاب: فوتی اسماعیل کل ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیٹا عبدالکریم 14 آنہ، بیوی جمیلہ 2 آنہ۔

فوتی عبدالکریم ملکیت (14) آنہ۔

وارث: بیٹی مکھن $11\frac{1}{2}$ پائی 4 آنہ، سلیمہ $11\frac{1}{2}$ پائی 4 آنہ، ماں جمیلہ 4 پائی 2 آنہ۔ بیوی رانی 9 پائی 1 آنہ۔

فوتی جمیلہ: ملکیت 4 آنہ 4 پیسہ

وارث: بھتیجے صالح $4\frac{1}{4}$، تاج محمد $4\frac{1}{4}$، طاہر $4\frac{1}{4}$، قادر $4\frac{1}{4}$

پوتی مکھن پایہ $15\frac{1}{2}$ آنہ اور پوتی سلیمہ پایہ $15\frac{1}{2}$ آنہ۔

فوتی مکھن: ملکیت (6) آنہ (5) پیشہ

وارث: بیٹا عبدالکریم پایہ $10\frac{1}{2}$ 1 1 آنہ، اور حسین پایہ $10\frac{1}{2}$ 1 1 آنہ، ماں رانی 1.1 خاوند بچو 1.7

فوتی حسین: ملکیت $1\text{-}10\frac{1}{2}$

وارث: والد بچو پایہ $1\,10\frac{1}{2}$ آنہ۔ بھائی عبدالکریم محروم

الاحیاء

رانی 2 آنہ 4 پائی، بچو 3 آنہ $4\frac{1}{2}$ پایہ، عبدالکریم ایک آنہ $10\frac{1}{2}$ پائی، سلیمہ 5 پائی 6 آنہ۔ 4 بھتیجی 17 مشترکہ

هذا هو عندی والعلم عند ربی

جدید اعشاری طریقہ تقسیم

میت اسماعیل کل ملکیت 100

بیوی جمیلہ $\frac{1}{8} = 12.5$

بیٹا عبدالکریم عصبہ 87.5

میّت عبدالکریم کل ملکیت 87.5

2 بیٹیاں (مکھن، سلیمہ) $\frac{2}{3}$ = 61.26 فی کس 30.63

ماں جمیلہ $\frac{1}{6}$ = 15.31

بیوی (رانی) $\frac{1}{8}$ = 10.93

میت جمیلہ کل ملکیت 27.81

4 بھتیجے عصبہ 9.27 فی کس 2.317

2 پوتیاں مکھن، سلیمہ $\frac{2}{3}$ 18.54 فی کس 9.27

میت مکھن کل ملکیت 39.9

بیٹا عبدالکریم عصبہ 11.64

بیٹا حسین عصبہ 11.64

ماں (رانی) $\frac{1}{6}$ = 6.65

خاوند	$\frac{1}{4}$ = 9.975

میت حسین ملکیت 11.64

بچو والد عصبہ	11.64
بھائی	محروم

زندہ وارث یہ ہیں:

رانی	17.58
بچو	21.61
عبدالکریم	11.69
سلیمہ	39.9
4 بھتیجے	9.27
	100

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بنام حاجی ریاست علی بن محمد مصطفیٰ فوت ہوگئے جس نے ورثاء میں سے بیوی، پانچ بیٹیاں ایک بھائی اور دو بہنیں چھوڑے۔ شریعت محمدی کے مطابق بتائیں کہ ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟ بینوا توجروا.

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ پہلے میت کے مال سے کفن دفن کا خرچہ اور قرض ادا کرکے یہ وصیت کو دیکھا جائے گا اگر وصیت ہے تو ثلث مال سے اس کی ادائیگی کی جائے گی پھر منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر اس کے ورثاء میں اس طرح تقسیم کی جائے گی۔

فوتی: حاجی ریاست علی بن محمد مصطفیٰ ملکیت 1 روپیہ۔

ورثاء: بیوی 2 آنہ۔ 5 بیٹیاں 8 پیسہ 10 آنہ۔ بھائی 1 آنہ 8 پیسہ۔ دو بہنیں 1 آنہ 8 پیسہ مشترکہ۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاری طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{8} = 12.5$

5 بیٹیاں $66.66\frac{2}{3}$ فی کس 13.33

بھائی عصبہ 10.42

2 بہن عصبہ 10.42 فی کس 5.21

❦❦❦❦

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حاجی محمد خان فوت ہوگیا جنھوں نے ورثاء میں سے ایک بیوی بھتیجا اور بھتیجی (دوسری ماں سے) اور دو ماموں کے بیٹے (ماروث)۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟ بینوا توجروا.

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے پہلے فوت شدہ کے مال سے کفن دفن کا بندوبست کیا جائے گا، اس کے بعد اگر قرضہ ہے تو اس کو پورا کیا جائے گا اس کے بعد اگر کسی کے بارے میں وصیت ہے تو وہ کل ملکیت کے ثلث سے ادا کی جائے گی اس کے بعد منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر اس کے ورثاء میں اس طرح تقسیم کی جائے گی۔

فوتی: حاجی محمد خان کل ملکیت 1 روپیہ

ورثاء: بیوی 4 آنے۔ ماںتا بھتیجا 12 آنے۔ ماںتا بھتیجی محروم۔ ماروث محروم

هذا هو عندي والعلم عند ربي

موجودہ لحاظ سے یوں بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے

کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{4} = 25$

علاتی بھتیجا عصبہ 75

علاتی بھتیجی محروم

2 ماموں زاد محروم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ بنام محمد بلال فوت ہو گئے ہیں جس نے ورثاء میں ماں، بھائی، بہن، اخیافی بہن، بیوی مگر منکوحہ غیر مدخولہ ہے۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر حقدار کتنا حق ملے گا؟ بینوا وتوجروا.

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ پہلے فوتی کی ملکیت سے کفن ودفن کا خرچہ پورا کیا جائے گا اس کے بعد قرضہ ہے تو اس کو ادا کیا جائے گا پھر اگر وصیت ہے تو اس کو بھی ثلث مال سے ادا کیا جائے گا پھر منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر اس کے ورثاء میں اس طرح تقسیم کی جائے گی۔

فوتی: محمد بلال ملکیت 1 روپیہ

ورثاء: ماں 2 آنے 8 پائی، بیوی 4 آنہ، بھائی 2 پائی 6 آنہ، بہن 1 پائی 3 آنہ، اخیافی بہن محروم۔

باقی ایک پائی بچے گی اس کے تین حصے کر کے ان میں سے دو حصے مذکر کو اور ایک مؤنث کو دیا جائے گا۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ محمد کریم شاہ فوت ہو گیا جس کی ملکیت جائیداد، زیور اور نقدی کی صورت میں بینک میں رکھی ہوئی ہے جس کے ورثاء میں ایک بیٹی 4 بھائی، دو بہنیں ہیں جبکہ بیٹی کا کہنا ہے کہ ابو نے مذکورہ ملکیت میں سے مجھے کچھ ہبہ کیا ہے۔ وضاحت کریں کہ شریعت کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: مذکورہ ملکیت کو اس طرح تقسیم کیا جائے گا۔ خواہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ۔ فوت ہونے والی ساری ملکیت کو ایک روپیہ قرار دے کر تقسیم کریں۔

فوت ہونے والا محمد کریم شاہ ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیٹی 50 پائی۔ بھائی 10 پائی۔ بھائی 10 پائی۔ بھائی 10 پائی۔ بہن 5 پائی۔ بہن 5 پائی۔

باقی بیٹی نے جو ہبہ کا دعویٰ کیا تھا اس کے گواہ پیش کرنے پڑیں گے۔ بصورت دیگر اگر گواہ پیش نہیں کرتی تو اس سے قسم لی جائے گی قسم اٹھانے کی صورت میں اس کے دعویٰ کے مطابق ملکیت دی جائے گی۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

موجودہ اعشاری نظام میں یوں بھی ہوسکتا ہے

کل ملکیت 100

1 بیٹی $\frac{1}{2} = 50$

4 بھائی عصبہ 40 فی کس 10

2 بہن عصبہ 10 فی کس 5

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص بنام علی محمد وفات کر گیا جس نے وارث چھوڑے۔ پانچ بیٹے شادی خان، محمود، شھمیر، صادق، فقیر محمد اور چھ بیٹیاں خیراں، مکھن، گلاں، مریم، ملی، سیانی اور دو بیویاں نازو اور جادو۔ وضاحت کریں کہ ہر ایک کو شریعت محمدی کے مطابق کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: یاد رہے کہ سب سے پہلے فوت ہونے والے کی ملکیت سے فوت ہونے والے کے کفن دفن کا خرچہ کیا جائے، پھر اگر میت پر قرض تھا تو باقی مال میں سے

ادا کیا جائے تیسرے نمبر پر اگر میّت (فوت ہونے والے) نے کوئی وصیت کی تھی تو اسے کل مال کے تیسرے حصے سے ادا کیا جائے پھر باقی مال کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح تقسیم کیا جائے گا۔ (1) دونوں بیویوں کو آٹھواں حصہ دیا جائے گا دونوں برابر کی شریک ہوں گی۔ (2) باقی 14 آنے کو 16 حصے کر کے ہر بیٹے کو دو حصے ہر بیٹی کو ایک حصہ ملے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (1) ﴿فان كان لكم ولد فلهن الثمن﴾ (2) ﴿وان كانوا إخوة رجالا ونساءً فللذكر مثل حظ الانثيين﴾ مزید وضاحت کے لیے نیچے نقشہ میں ورثاء کے حصے ذکر کیے جا رہے ہیں۔

فوت ہونے والا علی محمد ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیٹا 1 آنہ 9 پائی، بیٹا 1 آنہ 9 پائی، بیٹا 1 آنہ 9 پائی، بیٹا 1 آنہ 9 پائی، بیٹا 1 آنہ 9 پائی، بیٹی $10\frac{1}{2}$ پائی، بیٹی $10\frac{1}{2}$ پائی، بیٹی $10\frac{1}{2}$ پائی، بیٹی $10\frac{1}{2}$ پائی، بیٹی $10\frac{1}{2}$ پائی، بیٹی $10\frac{1}{2}$ پائی، بیوی 1 آنہ، بیوی 1 آنہ

موجودہ اعشاریہ فیصد نظام میں یوں تقسیم کیا جاسکتا ہے

ترکہ 100

2 بیویاں $\frac{1}{8} = 12.5$

5 بیٹے عصبہ 54.687 — فی کس 10.937

6 بیٹیاں عصبہ 32.812 — فی کس 5.468

***

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ گل محمد اور وھیل دونوں بھائی تھے دونوں نے یکساں کما کر اپنی ملکیت زمین وغیرہ بنائی جس ملکیت کی دیکھ بھال، سنبھال وغیرہ وھیل کے ماتحت ہی رہی۔ جس نے اسی میں سے اور بھی بہت سی ملکیت بنائی ہے، گل محمد فوت ہوگیا اور ورثاء چھوڑے ایک بیٹی بنام حاصلہ اور بھائی وھیل، اس کے بعد وھیل کا انتقال ہوگیا جس نے وارث چھوڑے ایک، بیٹا عبد الہادی، اس کے بعد گل محمد کی بیٹی حاصلہ انتقال کرگئی

اور وارث چھوڑے دو بیٹیاں آمنہ اور تاج خاتون اور سگا چچازاد عبدالھادی، ایک بیٹی بنام مائی سھائی جوکہ حاصلہ کی زندگی میں ہی وفات کر گئی تھی، اس کے بعد عبدالھادی فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے دو بیٹے گل محمد اور حبیب اللہ اور دو بیٹیاں جان بائی اور موول خاتون ایک بیوی فاطمہ، اس کے بعد مائی اماناں کا انتقال ہوگیا جس نے ورثاء میں دو بیٹیاں مائی بیگم اور مائی راجی اور چچازاد بھائی عبدالہادی کے دو بیٹے گل محمد اور حبیب اللہ اور دو بیٹیاں مائی موول اور مائی جان بائی۔ وضاحت کریں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ فوت ہونے والے کی ملکیت میں سے سب سے پہلے اس کے کفن دفن کا خرچہ کیا جائے، دوسرے نمبر پر اگر مرحوم پر قرضہ تھا تو اسے ادا کیا جائے، اس کے بعد اگر جائز وصیت کی تھی تو اسے کل مال کے تیسرے حصے میں سے پورا کیا جائے، اس کے بعد کل ملکیت منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح وارثوں میں تقسیم کی جائے گی۔

دونوں بھائیوں گل محمد اور وھیل کی مشترکہ ملکیت 1 روپیہ

گل محمد کو ملے 8 آنے وھیل کو بھی 8 آنے

گل محمد کی وفات ہوئی ملکیت 8 آنے

وارث: بیٹی حاصلہ 4 آنے بھائی وھیل 4 آنے

وھیل فوت ہوا ملکیت 12 آنے

وارث: بیٹا عبدالہادی 12 آنے

اس کے بعد گل محمد کی بیٹی حاصلہ کا انتقال ہوا ملکیت چھوڑی 4 آنے

وارث: بیٹی امڑاں 1 آنہ 4 پائی، بیٹی تاج خاتون 1 آنہ 4 پائی، چچازاد عبدالھادی 1 آنہ 4 پائیاں۔

بعد میں عبدالہادی فوت ہوگیا اور ملکیت تھی 13 آنے 4 پائیاں

وارث: بیٹا گل محمد 3 آنے $10\frac{1}{2}$ پائی، بیٹا حبیب اللہ 3 آنے $10\frac{1}{2}$ پائی، بیٹی جان بائی

1 آنہ $11\frac{1}{4}$ پائی، بیٹی مول 1 آنہ $11\frac{1}{4}$ پائیاں، بیوی فاطمہ 1 آنہ 8 پائیاں۔

باقی بچی آدھی پائی اس کے چھ حصے کر کے دو حصے ہر بیٹے کو اور ایک حصہ ہر بیٹی کو۔ اس کے بعد مائی امڑاں فوت ہوگئی ملکیت 1 انہ 4 پائی۔

وارث: بیٹی مائی بیگم $5\frac{1}{2}$ پائی، بیٹی مائی راجی $5\frac{1}{2}$ پائی، چچا زاد کا بیٹا حبیب اللہ $2\frac{1}{2}$ پائی، چچا زاد کا بیٹا گل محمد $2\frac{1}{2}$ پائی۔

الاحیاء (جو زندہ ہیں):

حبیب اللہ 4 آنے 1 پائی، گل محمد 4 آنے 1 پائی، جان بائی 1 آنہ $11\frac{1}{4}$ پائی، مول 1 آنہ $11\frac{1}{4}$ پائی، تاج خاتون 1 آنہ 4 پائی، مائی راجی $5\frac{1}{2}$ پائی، مائی بیگم $5\frac{1}{2}$ پائی، فاطمہ (قابل) 1 آنہ 8 پائی۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ تقسیم نظام

میّت گل محمد ملکیت 100

(حاصلہ) بیٹی $\frac{1}{2} = 50$

(وھیل) بھائی عصبہ 50

میّت کے بھائی وھیل کل ملکیت 100

(عبدالہادی) 1 بیٹا عصبہ 100

میّت حاصلہ کل ملکیت 100

2 بیٹیاں $\frac{2}{3} = 66.66$ فی کس 33.33

1 چچا زاد (عبدالہادی) عصبہ 33.34

میّت عبدالہادی کل ملکیت 100

2 بیٹے عصبہ 58.34 فی کس 29.17

2 بیٹیاں عصبہ 29.17 فی کس 14.585

بیوی $\frac{1}{8}$ = 12.5

میت مائی آمنہ کل ترکہ 100

2 بیٹیاں $\frac{2}{3}$ = 66.66 فی کس 33.33

2 چچازاد کے بیٹے عصبہ 33.34 فی کس 16.67

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسمات بھاگل فوت ہوگئی جس نے ورثاء میں سے تین بیٹیاں، پانچ بھتیجے اور ایک پوتی چھوڑی۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا کریم بخش فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں سے ایک بیوی تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں چھوڑیں۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟ بینوا توجروا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے فوتی کی ملکیت سے کفن و دفن کا خرچہ نکالا جائے گا اس کے بعد اگر قرضہ ہے تو وہ پورا کیا جائے گا اور پھر اگر وصیت ہے تو وہ ثلث مال سے پوری کی جائے گی اس کے بعد منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر اس کی وراثت اس طرح تقسیم کی جائے گی۔

فوتی بھاگل کل ملکیت 1 روپیہ

ورثاء: پانچ بیٹیاں 2 آنہ (1) پیسہ اور (12) چھٹانگ ہر ایک کو، ایک پوتی محروم، (5) بھتیجے (5) آنے 4 پیسہ (مشترکہ)

اس کے بعد کریم فوت ہوگیا کل ملکیت کو ایک روپیہ قرار دیا گیا۔

ورثاء: بیوی 2 آنے، تین بیٹے 2 آنہ 6 پیسہ ہر ایک کو، پانچ بیٹیاں 1 آنہ 3 پیسہ ہر ایک کو باقی تین پائیاں بچیں گی ان کو گیارہ حصوں میں تقسیم کر کے ہر ایک بیٹے دو حصے اور ہر ایک بیٹی کو ایک حصہ دیا جائے گا۔

﴿وان كان لكم ولد فلهن الثمن﴾

﴿للذکر مثل حظ الانثیین﴾

حدیث شریف میں:((الحقوا الفرائض باهلها فما بقی فلا ولی رجل ذکر .)) ❶

هذا هو عندی والعلم عند ربی

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

میت بھاگل کل ملکیت 100

پانچ بیٹیاں	$\frac{2}{3}$ = 66.66	فی کس 13.33
1 پوتی	محروم	
5 بھتیجے	33.34	

میت کریم کل ملکیت 100

بیوی	$\frac{1}{8}$ = 12.5	
3 بیٹے عصبہ	47.77	فی کس 15.923
5 بیٹیاں عصبہ	39.73	فی کس 7.946

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اللہ بچایا عرف حاجی فوت ہوگیا جس نے ورثاء میں سے ایک بیوی ایک علاتی بہن اور ایک کزن (سوٹ عورت اور فوتی کے دادے کے دو بھائیوں کی بھی نرینہ اولاد ہے شریعت محمدی کے مطابق بتائیں کہ ہرایک کو کتنا حصہ ملے گا؟ بینوا توجروا؟

الجواب بعون الوهاب: میّت کی ملکیت سے کفن دفن قرضہ اور وصیت کو ثلث مال سے ادا کرنے کے بعد منقول خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر اس کے ورثاء میں اس طرح تقسیم کیا جائے گا۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث ابن الابن اذا لم یکن ابن، رقم الحدیث:٦٧٣٥ـ صحیح مسلم، کتاب الفرائض، باب الحقوا الفرائض باهلها، رقم: ٤١٤١ .

فوتی اللہ بچایا عرف حاجی کل ملکیت 1 روپیہ

ورثاء: بیوی 4 آنہ، بہن 8 آنہ، کزن (عورت) محروم، دادے کے بھائیوں کی نرینہ اولاد 4 آنہ مشترکہ۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وان كان لكم ولد فلهن الثمن﴾

﴿للذكر مثل حظ الانثيين﴾

حدیث شریف میں: ((الحقوا الفرائض باهلها فما بقى فلا ولى رجل ذكر.)) [1]

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاری طریقہ تقسیم

میّت اللہ بچایا عرف حاجی کل ملکیت 100

بیوی $\frac{1}{4} = 25$

بہن $\frac{1}{2} = 50$

کزن (عورت) محروم

دادا کے بھائیوں کی نرینہ اولاد عصبہ 25

❁❁❁❁

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ حاجی فوت ہوگیا اور اس نے وارث چھوڑے ایک بیوی، دو بیٹیاں، باپ اور بہن وضاحت کریں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ فوت ہونے والے کی ملکیت سے اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے بعد میں اگر میت پر کوئی قرض تھا تو اسے ادا کیا جائے، بعد میں اگر جائز وصیت کی تھی تو کل مال کے تیسرے حصے تک ادا کی جائے بعد میں باقی ملکیت منقول

---

[1] صحيح بخاری، كتاب الفرائض، باب ميراث ابن الابن اذا لم يكن ابن، رقم الحديث: ٦٧٣٥ - صحيح مسلم، كتاب الفرائض، باب الحقوا الفرائض باهلها، رقم: ٤١٤١.

خواہ غیر منقول کو ایک روپیہ قرار دے کر تقسیم اس طرح سے ہوگی۔

فوت ہونے والا حاجی ملکیت 1 روپیہ

وارث: بیوی کو 2 آنے، دونوں بیٹیوں کو مشترکہ 10 آنے 8 پائیاں، باپ 3 آنے 4 پائیاں۔ بہن محروم۔

قولہ تعالیٰ: ﴿فان كان لكم ولد فلهن الثمن﴾ (النساء)

﴿وان كن نساء فوق اثنتين فلهن ثلثا ما ترك ﴾ (النساء)

حدیث مبارکہ ہے: ((الحقوا الفرائض باهلها فما بقى فلا ولى رجل ذكر .)) ❶

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ نظام تقسیم

میت حاجی کل ملکیت 100

بیوی	$\frac{1}{8} = 12.5$
2 بیٹیاں	$\frac{2}{3} = 66.66$
باپ $\frac{1}{6}$ عصبہ	20.84
بہن محروم	

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مسمات سعیداں کو اس کی ماں کی ملکیت میں سے جو حصہ ملا تھا جو اس (سعیداں) نے اپنی حیاتی میں ہوش وحواس کی حالت میں اپنے دو ماموں کو ہبہ کر دیا، ہبہ نامہ دستاویزی صورت میں تحریر شدہ ہے جس کے گواہ بھی موجود ہیں لیکن اس جائیداد کا قبضہ علی خان اور جعفر کو ابھی تک نہیں ملا، بلکہ قبضہ دوسرے لوگوں کے پاس ہے۔ اب مسمات سعیداں فوت ہوگئی ہے جس نے ورثاء چھوڑے ایک سوتیلا بھائی

❶ صحيح بخاری، كتاب الفرائض، باب ميراث ابن الابن اذا لم يكن ابن، رقم الحديث:٦٧٣٥ - صحيح مسلم، كتاب الفرائض، باب الحقوا الفرائض باهلها، رقم: ٤١٤١ .

اور ایک سوتیلی بہن، ایک سوتیلی ماں اور دو سگے ماموں علی خان اور جعفرو۔ وضاحت کریں کہ شریعت محمدی کے مطابق مرحومہ سعیداں کی ملکیت کا حقدار کون ہے؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مرحومہ کی کل ملکیت میں سے سب سے پہلے مرحومہ کے کفن دفن کا خرچہ کیا جائے گا، پھر اگر قرض ہے تو اسے ادا کیا جائے اس کے بعد اگر میّت نے کوئی وصیت کی تھی تو اسے کل مال کے تیسرے حصہ تک پورا کیا جائے، اس کے بعد منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد کو ایک روپیہ قرار دے کر تقسیم اس طریقے سے کی جائے گی۔ 5 آنے 4 پیسے کی وصیت جو مرحومہ نے کی تھی اسے ادا کیا جائے، اس کے بعد جو 10 آنے 8 پیسے باقی بچے وہ وارثوں میں تقسیم کیا جائے ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔

واللہ اعلم بالصواب

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص بنام عبدالحق وفات پا گیا جس نے درج ذیل وارث چھوڑے۔ باپ، ماں، ایک بیوی ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مرحوم کی ملکیت میں سے اوّلاً اس کا کفن دفن کا خرچہ ادا کیا جائے، اس کے بعد اگر مرحوم پر قرض تھا تو اسے ادا کیا جائے اس کے بعد اگر وصیت کی تھی تو ساری جائیداد کے تیسرے حصے تک سے ادا کی جائے۔ اس کے بعد مرحوم کی مکمل ملکیت منقولہ خواہ غیر منقولہ کو ایک روپیہ قرار دے کر اس طرح سے تقسیم ہوگی۔

وارث باپ کو چھٹا حصہ 2 آنے 8 پائی، ماں کو بھی چھٹا حصہ 2 آنے 8 پائی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ولابويه لكل واحد منهما السدس مما ترك ان كان له ولد﴾

بیوی کو آٹھواں حصہ 2 آنے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فان كان لكم ولد فلهن الثمن﴾ باقی جو 8 آنے 8 پائی بچیں گے اس کے تین حصے کر کے 2 حصے بیٹے کو 1 حصہ بیٹی کو

دیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿یوصیکم اللّٰہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین﴾

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100

باپ	$\frac{1}{6} = 16.66$	ماں	$\frac{1}{6} = 16.66$
بیوی	$\frac{1}{8} = 12.5$	بیٹا عصبہ	27.09
دو بیٹیاں عصبہ	27.09	فی کس	13.54

❀❀❀❀

سوال: ❶ ...... کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ غلام مصطفیٰ فوت ہوگیا جس نے وارث چھوڑے 2 بیٹیاں، ایک بیوی، ایک بھائی، دو بہنیں اور ایک بیٹی جو کہ مرحوم کی زندگی میں ہی وفات پاگئی تھی اور اس مرحومہ کا بیٹا۔

❷ ...... مرحوم نے ایک مکان (جگہ) 446، 447 مکمل کو تین حصے کرکے اپنی تین بیٹیوں کو ہبہ کردی ان کو لکھ کر دے دی اور باقی وارثوں کو نہیں دی۔ اس پر قبضہ بھی بیٹیوں کا ہے۔

❸ ...... مرحوم کی زندگی میں ہی جس بیٹی کا انتقال ہو چکا تھا جگہ میں اس کا حصہ بھی مقرر کیا گیا اس وقت اس بیٹی کا بیٹا موجود ہے کیا وہ وارث بنے گا؟ اور دیا ہوا تحفہ وارثوں سے واپس لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ مرحوم کی ملکیت میں سے کفن دفن اور قرض کی ادائیگی اور مال کے تیسرے حصے میں سے وصیت پوری کرنے کے بعد وراثت تقسیم کی جائے گی۔

مرحوم غلام مصطفیٰ ملکیت 1 روپیہ

وارث: دو بیٹیاں 10 آنے 8 پائی مشترکہ، بیوی 2 آنے، بھائی 1 آنہ 8 پائی، دو بہنیں 1 آنہ 8 پائی، نواسا محروم۔

(2) مرحوم نے جو تقسیم کی تھی وہ غلط ہے کیونکہ دوسرے حصے دار بھی موجود ہیں اور چونکہ بیوی وغیرہ کے حصص مقرر ہیں، اس لیے سب کو مقررہ حصے دیے جائیں گے۔

(3) جو بیٹی مرحوم کی زندگی میں فوت ہوگئی تھی اس کا حصہ نہیں ہے۔

(4) تحفہ یا ہبہ کی ہوئی چیز واپس لینا ناجائز ہے۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100

2 بیٹیاں	$\frac{2}{3}$ = 66.66	
بیوی	$\frac{1}{8}$ = 12.5	
بھائی عصبہ	10.42	
دو بہنیں عصبہ	10.45	فی کس 5.21
نواسا محروم		

❀❀❀❀

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص وجیہ الدین وفات پا گیا جس نے اپنے پیچھے وارث چھوڑے دو بیٹے رب رکھا اور سائیں رکھا، ایک بیٹی حور چھ پوتے اور چھ پوتیاں بتائیں کہ شریعت محمدی کے مطابق ہر ایک وارث کو کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب بعون الوهاب: معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے مرحوم وجیہ الدین کی ملکیت میں سے اس کے کفن دفن کا خرچہ نکالا جائے پھر اگر مرحوم پر قرض ہو تو اسے ادا کیا جائے پھر اگر جائز وصیت کی تھی تو مکمل جائیداد کے ثلث (تیسرے) حصے تک سے ادا کی جائے اس کے بعد باقی ملکیت متحرک غیر متحرک کو ایک روپیہ قرار دے کر ورثاء میں اس طرح

سے تقسیم ہوگی۔

مرحوم وجیہ الدین ملکیت 1 روپیہ

وارث:	پائیاں	آنے
بیٹا ربّ رکھا	04	06
بیٹا سائیں رکھا	04	06
بیٹی حور	02	03
چھ پوتے	محروم	
چھ پوتیاں	محروم	

باقی 2 پائیاں بچ گئیں ان کے پانچ حصے کرکے ہر بیٹے کو دو حصے اور بیٹی کو ایک حصہ دیا جائے گا۔

هذا هو عندي والعلم عند ربي

جدید اعشاریہ فیصد طریقہ تقسیم

کل ملکیت 100

2 بیٹے عصبہ 80 فی کس 40

1 بیٹی عصبہ 20 6 پوتے محروم 6 پوتیاں محروم